ماہنامہ

صبا

حیدرآباد

مخدوم نمبر

Rs.5

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

(مخدوم نمبر)

ترتیب :- سلیمان اریب

تزئین :- سعید بن محمد

کتابت :- محمد مظہر

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

جلد ۱۱

شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

ماہ اکتوبر، نومبر، دسمبر

سنہ ۱۹۶۶ء

قیمت پانچ روپے

زرِ سالانہ دس روپے

ششماہی چھ روپے

بیرونِ ہند سے ۲۵ شلنگ

فون :- ۴۲۴۰۲

دہلی آفس :- ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶

بمبئی آفس :- ۵۰/۴ بی پی ڈبلیو ڈی کالونی۔ باندرہ ایسٹ بمبئی ۵۱..

پرنٹر پبلشر اینڈ ایڈیٹر و پروپرائٹر سلیمان اریب ۱۷، مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار کمان

ہجومِ بادہ و گل

چہرہ نما	۷	
پیش رس	۱۵	
پیامات	۱۷	
چیف منسٹر کی تقریر کا اقتباس	۲۴	
مخدوم — بہ یک نظر	۲۵	
مخدوم نامہ	۳۷	
صدائے تیشہ	۴۱	
مخدوم	۴۳	قاضی عبدالغفار
مخدوم کی شاعری	۴۵	محبوب حسین جگر
مخدوم محی الدین	۵۱	پروفیسر عزیز احمد
مخدوم — سرخ سویرے کا شاعر	۵۷	سردار جعفری
ہم صفیر انقلاب — مخدوم	۶۹	پروفیسر احتشام حسین
مخدوم — ایک عہد — ایک شاعر	۷۸	پروفیسر عبدالقادر سروری
مطالعہ مخدوم بتوسط شعر	۸۲	پروفیسر عالم خوندمیری
مخدوم کی ایک نظم — چاند تاروں کا بن	۹۱	پروفیسر عالم خوندمیری
مخدوم — جدید شاعری کے آئینے میں	۹۴	ڈاکٹر عبادت بریلوی
مخدوم — فکر و فن کے کچھ پہلو	۹۸	ڈاکٹر سید محمد عقیل
مخدوم محی الدین کی شاعری کا سرسری جائزہ	۱۰۸	ڈاکٹر سلام سندیلوی
مخدوم کی زندگی، مخدوم کی شاعری	۱۱۴	ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
مخدوم ایک مکمل فنکار	۱۱۹	مصطفےٰ علی اکبر گرامی
مخدوم کی شاعری میری نظر میں	۱۲۳	یٰسین علی خاں
مخدوم کے فکری عناصر کا تجزیہ	۱۲۵	معین الدین

ترتیب

تجزیہ

گلِ تر کی رعنائیاں	۱۳۱	نجمہ سمیع
گلِ تر اور اس کے بعد	۱۳۷	داؤد اشرف
کچھ مخدوم کے فن اور شخصیت کے بارے میں	۱۴۳	رؤف خلش
مخدوم کی شخصیت شعر کے آئینے میں	۱۴۹	حسن فرخ
ذکرِ یار چلے	۱۵۷	
ذکرِ یار چلے	۱۵۹	مرزا ظفر الحسن
مخدوم اقامت خانے میں	۱۶۴	یحییٰ صدیقی
مخدوم — ایک آواز	۱۸۱	اکبر وفا قانی
مخدوم — چند یادیں	۱۸۴	بدر شکیب
مخدوم — پرانی یادیں	۱۸۷	مرزا شکور بیگ
مخدوم — شریکِ جرم	۱۹۲	شہریار کاوس جی
او مجنوں!	۱۹۵	محی الدین غازی
من ترا حاجی بگویم	۱۹۸	زینت ساجدہ
سدا بہار مخدوم	۲۰۳	یوسف ناظم
جامعہ کا ایک مایہ ناز فرزند	۲۰۷	پروفیسر مبارز الدین رفعت
جب کبھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے	۲۱۵	
مخدوم بندہ	۲۱۷	عبدالرحمن چغتائی
لندن سے مخدوم	۲۱۹	علامہ حیرت بدایونی
مخدوم — شاعر، ادیب، رہبر، استاد	۲۲۱	احسان دانش
تاثرات	۲۲۳	ماہر القادری
مخدوم	۲۲۵	علی جواد زیدی
غزل کا ایک عمدہ شعر	۲۲۷	کوثر چاند پوری
مخدوم محی الدین — ایک ذاتی تاثر	۲۲۹	سلام مچھلی شہری
اک بہار، کچھ کرنیں	۲۳۳	حکیم یوسف حسین خاں
پیارا شاعر	۲۳۶	احمد جمال پاشا

مخدوم ۔ انقلابی شاعر اور محبوب عوامی رہنما	۲۳۸	غلام حیدر
شاعرِ نغمہ	۲۴۱	جی ایم عمر خاں
منفرد حیثیت کا مالک		ڈاکٹر سلامت اللہ
حدی خواں	۲۴۳	ظ ۔ انصاری
حقیقی شاعر		ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی
مطربِ انقلاب	۲۴۴	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
زندہ و تابندہ		شجاعت علی سندیلوی
کردار کا غازی		پروفیسر مسیح الزماں
میم سے مخدوم ـــ میم سے محبت	۲۴۵	واجدہ تبسم
معصوم بزرگ	۲۴۶	جوگندر پال
دھنک	۲۴۷	
حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک اور مخدوم	۲۴۹	سجاد ظہیر
مخدوم محی الدین ۔۔ استاد، شاعر، دوست	۲۵۳	پروفیسر صفی الدین صدیقی
مخدوم محی الدین بحیثیت استاد	۲۶۳	امان ارشد
چچا بابا	۲۶۷	نصرت محی الدین
ہمارے ادا کار	۲۷۰	یحییٰ صدیقی
مخدوم ـــ ایڈیٹر	۲۷۴	شجاع احمد نائر
مخدوم سے انٹرویو	۲۷۷	نریش کمار شاد
مخدوم محی الدین سے انٹرویو	۲۸۳	امیر عارفی
پیمانِ وفا	۲۹۱	
مدعیانِ انصاف سے	۲۹۳	تمکین سرمست
میں نے گو تجھ کو دیکھا نہیں ہے مگر	۲۹۴	عزیز قیسی
ایک فنکار	۲۹۵	علی احمد جلیلی
مخدوم کے پہلی بار غزل کہنے پر		ابن احمد تاب
آج کی رات نہ جا	۲۹۶	شمس الدین تاباں

اک قدم اور		راشد آذر
سبزہ خواب	۲۹۷	بالوطاہرہ سعید
نقش ہے حیراں حیراں		سعیدہ عروج مظہر
شمع منزل	۲۹۸	برق یوسفی
سیلِ بہ بردوش		وقار خلیل
ایک صدا	۲۹۹	رئیس اختر
بولتی لکیریں	۳۰۰	غیاث متین
خوشبو کا پجاری	۳۰۱	رؤف خلش
دھنک کا خالق	۳۰۲	حسن فرخ
آتشِ نوا موسیٰ		مسعود عابد
نورِ سحر	۳۰۳	علی الدین نوید
دعا		رگھویندر راؤ جذب
پنکھڑیاں	۳۰۴	ابوالخیر صبا
لوک دوانہ	۳۰۵	سلیمان خطیب
گنجِ گراں مایۂ عمر	۳۰۷	
سرخ سویرا کا دیباچہ	۳۰۹	سبطِ حسن
ہندی رسم الخط میں انتخاب کا پیش لفظ	۳۱۶	پرکاش پنڈت
گلِ تر کا دیباچہ	۳۲۱	مخدوم محی الدین
انتخابِ کلام	۳۲۵	
انتخابِ نثر	۳۴۹	
روداد جشنِ مخدوم	۳۹۲	

چہرہ نما

صبا پیش خدمت ہے۔ حسب معمول ایک طویل غیر حاضری کے بعد۔ لیکن اس دفعہ تاخیر کے لیے ہم اپنے قارئین سے شرمندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات پر فخر ہے کہ ہم ان کی خدمت میں صبا کا مخدوم نمبر پیش کر رہے ہیں۔ ایک عرصہ سے صبا کا کوئی خاص نمبر نکالا نہ جا سکا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نمبر اس کی تلافی کر دے گا۔ یہ ایک طرف اردو کے مشہور اور مایہ ناز شاعر کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت ہے۔ تو دوسری طرف اردو ادب کے طالب علموں اور اس سے شغف رکھنے والوں کے لیے شاعر کی زندگی اور فن کے تمام گوشوں کا جائزہ لینے والی ایک دستاویز بھی۔

دسمبر کے دوسرے ہفتے میں حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر جشن مخدوم منایا گیا۔ جشن کے انتظامات کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی تھی جس کا خیال تھا کہ اس موقع پر جہاں مخدوم کا سارا کلام ایک کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ وہیں ایک کتاب ایسی بھی شائع کی جائے جس میں ان پر لکھے گئے تمام مضامین یکجا کر دیے جائیں۔ جشن کے سلسلے میں بے شمار مضامین، تاثرات اور خطوط وصول ہو رہے تھے۔ آخر کو فیصلہ یہ ہوا کہ بجائے کتاب کے اس موقع پر صبا کا خصوصی نمبر شائع کیا جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق اس نمبر کو جشن کے افتتاح کے دن چھپ جانا چاہیے تھا اور وہ لیے یہ اسی دن شائع ہو کر منظر عام پر آ بھی سکتا تھا لیکن اس صورت میں اس کی حیثیت صرف ایک سوونیر کی سی رہتی۔ اتنی کم مدت میں ایک معیاری نمبر پیش کرنا عملاً ممکن نہ تھا ایسے نمبر کی تیاری کے لیے کم سے کم چھ ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اتنا وقت ملنے پر ہم اور بھی شاندار نمبر پیش کر سکتے۔ مگر اس مختصر سی مدت میں بھی جو نمبر ہم پیش کر رہے ہیں وہ معیاری ہے۔ اس نمبر میں مخدوم کی زندگی اور شخصیت پر بھی مضامین ہیں اور ان کی شاعری اور فن پر بھی۔ طالب علمی کے زمانے کے بے تکلف دوستوں نے ان کی زندگی کے کئی واقعات اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں اردو کے مشہور نقادوں نے مضامین لکھے ہیں۔ جشن کے سلسلے میں موصول ہونے والے پیامات اور مختلف اہل قلم کے تاثرات بھی اس نمبر میں شامل ہیں۔ آخر میں مخدوم کی نثر اور نظم کا انتخاب دیا گیا ہے اور پھر جشن کی روداد۔ اس طرح یہ نمبر خود ایک علیحدہ کتابی حیثیت رکھتا ہے اور جو آئندہ مخدوم پر کام کرنے والوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ بظاہر تصویروں کی کمی اس نمبر میں ضرور محسوس ہوتی ہے۔ مگر سعید بن محمد جیسے عالمی شہرت رکھنے والے آرٹسٹ نے اپنے بنائے ہوئے خاکوں سے جو جدت پیدا کی ہے وہ داد طلب ہے۔ یہ خاکے مخدوم کی شخصیت اور لکھنے والوں کے انداز فکر و تحریر سے بے تعلق نہیں ہیں۔ بلکہ یہ خود دراصل لکیروں اور نقاط کے ذریعہ شاعر کی شخصیت اور اس کے فن پر اظہار رائے ہیں۔ اس مختصر مدت میں صبا کا یہ بلند پایہ معیاری نمبر شاید ہم پیش نہ کر پاتے اگر ہمیں حیدرآباد کے نوجوان شعرا رؤف خلش اور حسن فرخ کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ انھوں نے بڑی محنت سے اس نمبر کے لیے مواد بکھرے رسالوں اور کتابوں سے حاصل کیا اور مخدوم کے حالات زندگی مختلف ذرائع سے جمع کیے۔ جشن مخدوم ہی کے سلسلہ میں مضامین کا ایک انعامی مقابلہ بھی رکھا گیا تھا۔ اس مقابلہ میں ان ہی دونوں نوجوانوں نے انعامات بھی حاصل کیے۔

ہماری محنت کا حاصل آپ کے سامنے ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

ایک شاندار عہد کی کہانی

ہم ایک یادگار عہد سے گزر رہے ہیں۔ آج ہندوستان ایک نظریاتی مہم کی قیادت کر رہا ہے اور بہت سے قومی اور بین قومی مسئلے غور و بحث اور فیصلے کے طالب ہیں۔

جو تبدیلیاں اس طرح واقع ہو رہی ہیں اور جو تاریخ آج بنائی جا رہی ہے اس سے واقف ہونے کے لیے:

رسالہ **"آندھرا پردیش"** کا مطالعہ کیجئے

ایک باتصویر ماہنامہ جو چار زبانوں
انگریزی، تلگو، اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہوتا ہے

اشاعت (۷۲،۰۰۰)

قیمت فی پرچہ (۳۰) پیسے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش سے شائع ہوتا ہے

ناظم

اطلاعات و تعلقات عامہ آندھرا پردیش حیدرآباد

آندھرا پردیش کی سیر کیجئے

خوبصورت جھیلوں، کولیرو، رامپا اور پاکھال

عالی شان مندروں، سری کاکلم، سری سیلم، تروپتی، کالاہستی اور بھدراچلم کی سرزمین

دیکھے بغیر نہ رہیئے:

وشاکھاپٹنم میں ملک کا جہاز سازی کا واحد کارخانہ، نجکنڈ پروجکٹ، ناگ ارجن ساگر پروجکٹ اور قدیم بدھی یونیورسٹی کے آثار، بھاپلی، کونڈاپلی، ورنگل، کریم نگر اور نرمل کی دیسی مصنوعات۔

آندھرا پردیش کے گھنے جنگل

شکاریوں کے لیے جنت ہیں جہاں ہر قسم کا شکار اسنائپ سے لے کر شیر تک، ہر موسم میں مل سکتا ہے۔

شہر حیدرآباد، جو آندھرا پردیش کا دارالحکومت ہے سمندر کی سطح سے (۲۰۰۰) فیٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اکتوبر سے مارچ تک اس شہر کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔ گولکنڈے کا تاریخی قلعہ، الوکھا سالار جنگ میوزیم، عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارتیں اور ماضی کی عظمت اور شان کو یاد دلانے والے قدیم محل سب آپ کے دیکھنے کے قابل ہیں۔

تمام قابل دید مقامات پر عصری طرز کے ہوٹل، مسافر بنگلے اور ریسٹ ہاوس موجود ہیں جہاں حمل و نقل کی پوری پوری سہولتیں حاصل ہیں۔

تفصیلات کیلیے لکھیئے:

ناظم

اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

نئے سماج کی تشکیل

کشمیر میں ایک نئے سماج کی تشکیل ہو رہی ہے جس کی بنیاد انصاف، عوام کی خوشحالی اور معاشی ترقی کے ان اصولوں پر قائم ہے جن کا پرچار مہاتما گاندھی، شری جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ موجودہ حکومت نے وزیر اعلیٰ مسٹر غلام محمد صادق کی سرکردگی میں پچھلے دو برس میں انتظامیہ اور دیگر شعبوں میں کئی دور رس اصلاحات کی ہیں۔ جو بجائے خود انقلابی نوعیت کی ہیں۔ اور جن کے نفاذ سے لوگوں میں ایک نیا اعتماد اور ایک نیا ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ آجکل ریاست میں ایک نئی بیداری پائی جا رہی ہے اور لوگ اپنے جمہوری حقوق کا استعمال کرتے ہوئے ترقی کے منازل تیزی سے طے کر رہے ہیں۔

جاری کردہ :- کشمیر بیورو آف انفارمیشن (حکومت جموں و کشمیر)

کشمیر میں تعمیر و ترقی کا دور

ریاست جموں و کشمیر ملک کی حسین ترین ریاست ہے جس کے ہر پہلو سے حیات نو کے حسین نقوش اُبھر رہے ہیں۔ پچھلے پندرہ برس میں ریاست میں تعمیر جدید کا ایک نیا دور شروع ہوا اور تعلیم، صحت، زراعت اور صنعت اور دیگر شعبوں میں لوگوں نے نمایاں ترقی کی ہے۔

صرف تعلیم کے میدان میں ترقی کی رفتار اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پرائمری اسکولوں کی تعداد چند سو سے بڑھ کر پانچ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد ۲۱۵ سے ۱۲۱۸ تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۴۰۰ ہائی اور ہائر سیکنڈری اسکول ۱۲۰۰ مڈل اسکول، ۱۶ کالج، ایک میڈیکل اینڈ زراعتی کالج اور دیگر فنی ادارے قائم کیے گئے ہیں۔

صحت عامہ کے شعبے میں ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پچھلے پندرہ برس میں علاج و معالجہ پر فی کس خرچ ۴۱ پیسے سے بڑھ کر ۴ روپے ۸۰ پیسے ہو گیا ہے۔

ریاست کی بجلی کی پیداوار ۱۹۴۷ء میں تین ہزار کلوواٹ تھی جو کہ اب ۳۵ ہزار کلوواٹ تک پہنچ گئی ہے۔ امید ہے کہ اگلے پانچ برس میں ریاست میں ڈیڑھ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا ہوگی۔

صنعت کے شعبوں میں نمایاں ترقی ہوئی ہے اور ریاست کے خام مال کو تیزی کے ساتھ صنعتی اشیا تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

ریاست کا چوتھا پنج سالہ منصوبہ اس سال شروع ہوا ہے جس پر ۱۲۹ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ اس منصوبے کی تکمیل سے ریاست ایک نئے مستقبل میں داخل ہوگی، جو اور زیادہ درخشندہ اور زیادہ تاباں ہوگا۔

جاری کردہ:۔ کشمیر بیورو آف انفارمیشن (حکومت جموں و کشمیر)

کوئلہ

صنعت کی بنیاد ہے

اعلیٰ معیار اور بہتر خدمت کیلیے یاد رکھیے

دی سنگارینی کالریز کمپنی لمیٹڈ

مہر منزل، ریڈ ہلز - حیدرآباد ۴ (اے پی)

فون :- ۳۲۷۶۶، ۳۲۸۴۲، ۳۶۷۷۱، اور ۳۴۷۷۵ - ٹیلیگرام: "COALMINES"

رجسٹرڈ آفس :- کتہ گوڑہ، کتہ گوڑہ کالریز - پوسٹ آفس

کانیں :- کتہ گوڑہ، اُدرام پور، بلندو، تانڈور، بیلم پلی، راماگنڈم

منڈا مری اور رام کرشنا پور

دی حیدرآباد کیمیکلز اینڈ فرٹیلائزرس لمیٹڈ

رجسٹرڈ آفس :-

۱۰۰، بشیر باغ۔ حیدرآباد ۲۹

فون نمبر: ۳۵۱۲۸ اور ۳۲۰۲۷

ٹیلیگرام :- "CHEMICALS"

کارخانے :

مولا علی (سنٹرل ریلوے

فون نمبر :- ۱۳۴۱

ٹیلیگرام :- "CHEMICALS"

بودھن (سنٹرل ریلوے)

فون :- ۳۶ - ٹیلیگرام : "CHEMICALS"

مینوفیکچررس برائے :

(i) سلفیورک ایسڈ - کمرشیل گریڈ

(ii) سنگل فاسفیٹ گیارنٹیڈ ۱۶ %

WS P2 06

(iii) تمام نقد اور اناج کی فصلوں کیلیے مسکڈ فرٹیلائزرس

جو بھی غلہ آپ اُگانا چاہیں

آپ کو حیدرآباد کیمیکلز فرٹیلائزرس کے معیاری فرٹیلائزرس کی ضرورت لاحق ہوگی

تاکہ زیادہ پیداوار کا آپ کو یقین ہو

ری انفورسڈ کنکریٹ سمنٹ

پریشر پائپس

کیلئے

ربط پیدا کیجئے

آئی۔ اے۔ ال اینڈ کمپنی

ملا پورم۔ قریب مولا علی۔ سکندر آباد۔ ۱۷

تیارکنندگان :۔

ہمہ اقسام اور سائزکے اسپن آرسی سی پائپس برائے کلورٹس واٹر سپلائی وغیرہ

مطابق آئی ایس آئی اسپیسیفکیشنس

فون نمبر فیکٹری (۷۱۰۲۳) فون نمبر رہائش (۳۸۱۰۲)

DONATED BY ... 1906-19

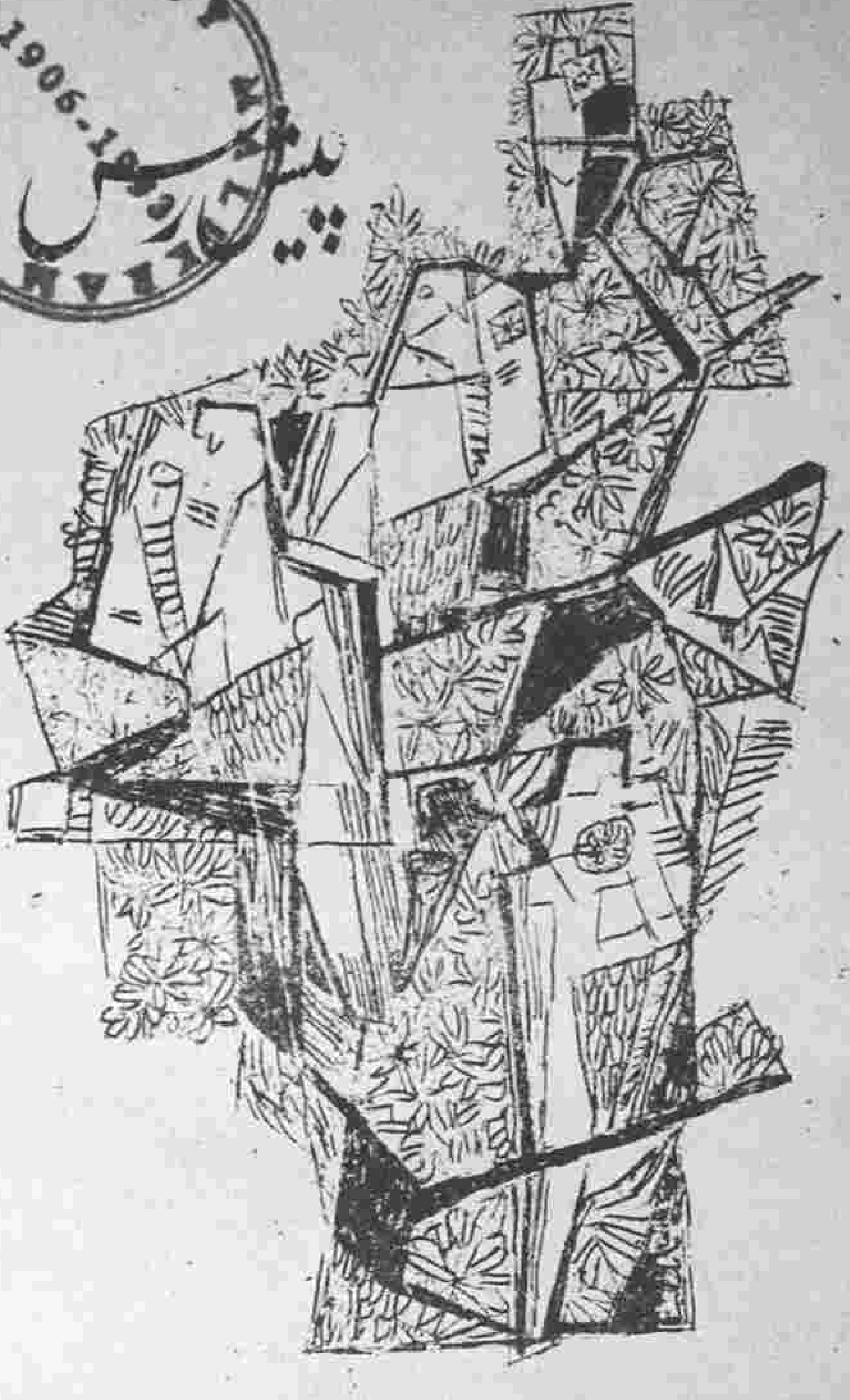

صبا

پیش رس

پیامات

چیف منسٹر کی تقریر کا اقتباس

مخدوم بہ یک نظر

مخدوم نامہ

پیامات

—راشٹرپتی بھون ۔ نئی دہلی

ڈاکٹر ایس رادھاکرشنن صدر جمہوریۂ ہند

—صدر جمہوریہ کو یہ جان کر مسرت ہوئی کہ شری مخدوم محی الدین کی ادبی خدمات کے لیے ۱۰ اکتوبر ۶۶ء کو حیدرآباد میں "جشن مخدوم" منایا جا رہا ہے ۔ اس موقع پر صدر جمہوریہ کی نیک تمنائیں شری مخدوم محی الدین کے ساتھ ہیں ۔

سکریٹری برائے صدر جمہوریہ ہند

نواب مہدی نواز جنگ ۔ سابق گورنر گجرات ۔ حیدرآباد

مخدوم محی الدین سماجی زندگی میں ایک غازی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ سیاسی زندگی میں ان کا مقام ان ہی کو معلوم ہے ۔ انسان دوستی ایک بڑی صفت ہے جو عبادت کا درجہ رکھتی ہے ۔ یہ صفت مخدوم محی الدین میں موجود ہے بحیثیت شاعر ان کا مقام ادب کی دنیا میں ایسا ہے کہ خاص و عام ان کی فکر و تخلیق سے مستفید ہوتے ہیں ۔ دعا ہے کہ کامرانی ان کے ہم قدم رہے ۔

مہدی نواز جنگ

آئی ۔ بینی ڈکٹاف ۔ روسی سفیر متعینہ ہندوستان ۔ دہلی

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ممتاز اردو شاعر مخدوم محی الدین کو اہل ملک کی جانب سے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جشن مخدوم کی تقاریب منائی جا رہی ہیں ۔ میں بانیان جشن مخدوم کے اس اقدام کو تہہ دل سے قابل مبارک باد سمجھتا ہوں ۔ سوویت دیس کے عوام ہندوستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی

کامیابیوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادب کو آگے بڑھانے میں مخدوم نے نہایت اہم اور موثر حصہ لیا ہے۔

میں سوویت سفارت خانے کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے بھی اس تمنا کا اظہار کرتا ہوں کہ مخدوم صحتمند رہیں، ان کی تخلیقی قوت میں اضافہ ہوتا کہ وہ اپنی شعری تخلیقات سے ہندوستان میں ترقی پسند شاعری کا اور زیادہ بلند مقامات تک پہنچا سکیں۔

آئی۔ بینی ڈکٹاف

کامریڈ ایس۔ اے ڈانگے۔ صدر نشین ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی۔ دہلی

مخدوم شاعر انقلاب ہے مگر وہ رومانی شاعری سے بھی دامن نہیں بچاتا بلکہ اس نے زندگی کی ان دونوں حقیقتوں کو اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ انسانیت کے لیے بے پایاں محبت کو انقلاب کے مورچوں پر ڈٹ جانے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مخدوم شیشے کے محل میں رہنے والا شاعر نہیں وہ انقلاب اور اس کے آدرش کی حمایت میں بڑی بے باکی سے لکھتا ہے اسی لیے اس کی شاعری اتنی پُر اثر ہے کہ لاکھوں کے دل کی آواز بن گئی ہے۔

مخدوم کی شاعری اور خیالات نہ تو آسمان سے ٹپکے ہیں نہ حقے کے کش سے نکلے ہیں، بلکہ وہ عوام کے لیے لڑ رہا ہے اس نے تلنگانہ کے کسانوں کی روپوش اور چھاپہ مار لڑائیوں میں ان کا ساتھ دیا ہے اس نے انقلاب اور اس کے آدرش کو اس وقت اپنایا جب کہ وہ باعزت استاد تھا۔ مخدوم نے پہلے ذہنی طور پر یہ راہ اختیار کی اور پھر عملی طور پر مزدور طبقہ کی لڑائیوں میں شریک ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا شاعر ٹریڈ یونینوں کی شرح اجرت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے نئے نغمے سنانے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس موقع پر ہم مخدوم کی درازی عمر اور مزید کامیابیوں کے متمنی ہیں۔

ایس۔ اے۔ ڈانگے

نواب علی یاور جنگ۔ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مخدوم میرے بڑے پرانے دوست ہیں اور میں ان کی نظموں کا بڑا مداح ہوں۔ آج وہ یقیناً اردو کے ممتاز شعرا میں سے ایک ہیں۔ میری یہ خواہش تھی کہ آپ جو خاص نمبر شائع کر رہے اس کے لیے ایک مضمون لکھوں۔ مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ میں اپنی بھاری ذمہ داریوں کے باعث شاید اس کے لیے وقت نہ نکال سکوں گا۔

تاہم آپ کے خصوصی نمبر کی کامیابی کے لیے میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

علی یاور جنگ

صبا

مولانا عبدالماجد دریابادی۔ صدق جدید۔ دریاباد (ضلع بارہ بنکی)

مخدوم کی شاعری پر یہ خادم کیا عرض کرے؟ اور تقریب جشن میں شرکت کی ہمت کہاں سے لائے۔ استفادہ کے لیے مہلت ہی کبھی نصیب میں نہ آئی۔ ہاں ادھر ادھر اتفاق سے جو دو ایک شعر نظر سے گزر گئے ان سے دل کو انبساط اور طبیعت کو اہتزاز ہی ہوا۔ اور اہل تجربہ کا بیان ہے کہ بریانی کی دیگ کا اندازہ دو ایک چاولوں ہی سے ہو جاتا ہے۔ والسلام۔ عذر خواہ

عبدالماجد

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

میں مخدوم محی الدین صاحب کی بہ حیثیت شاعر اور بہ حیثیت انسان دل سے قدر کرتا ہوں، اور ایک مجھ پر کیا موقوف ہے ان کی دلکش شخصیت اور شاعری کا جادو ہر صاحب دل اور صاحب ذوق کو مسخر کر لیتا ہے۔ ممکن ہوتا تو اس موقع پر کوئی مضمون لکھ کر نذر کرتا۔ مگر افسوس ہے کہ طرح طرح کے کاموں کا اس قدر ہجوم ہے کہ اس خدمت سے معذور ہوں۔ اس لیے ہدیۂ تبریک و تہنیت اور دعائے صحت و عافیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

مخلص

سید عابد حسین

ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ الہ آباد

ادبی، سیاسی اور سماجی غرض ہر لحاظ سے مخدوم ہم سب کے اظہار و اعتراف تشکر کے مستحق ہیں۔ علاوہ قابل قدر شاعر ہونے کے وہ ایک بڑے مخلص اور زبردست وطن پرست انسان بھی ہیں۔ ان ہی خصوصیات کے زیر سایہ مخدوم کی شخصیت پروان چڑھتی ہوئی آج اتنی بلند نظر آتی ہے کہ ہندوستان بالخصوص دنیائے اردو میں اس تیزی اور قابلیت سے سربلند ہونے والے شعرا بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ یہ امتیاز اس لیے بھی ان کا حصہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنے تجربات و عملی خدمات و مشاہدات کے سرچشمے سے اپنے جذبات و فن کی آبیاری کرتے ہیں۔ آدمی کو آدمی اور شعر کو شعر سمجھنا مخدوم کا انفرادی کارنامہ ہے۔ فنکاری اور سماجی خدمات نے ان کو ہر طبقہ میں ایسا ہر دل عزیز بنا دیا ہے کہ یہ دعا بار بار لب پہ آتی ہے کہ ایسے بہت سے خوشی کے مواقع مخدوم کو دیکھنا نصیب ہوں۔

اعجاز حسین

صب

پنڈت آنند نرائن مُلّا ۔ سابق جج الٰہ آباد ہائیکورٹ لکھنؤ

میں مخدوم کی شاعری سے بھی نہیں اُن کی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوں۔ لیکن یہ ایک ہی تاثر کی دو شکلیں ہوں کیوں کہ مخدوم ان چند شاعروں میں ہیں جن کی شاعری اور زندگی ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ان کے دردمند دل کی دھیمی آنچ اور وطن کے اشعار میں مظلوم انسان کے لیے جو پُرخلوص پیام ملتا ہے وہ انھیں اس دور کے ممتاز شعرا میں بھی ایک ممتاز مقام آسانی سے دلا دیتا ہے۔

آنند نرائن مُلّا

فیض احمد فیض ۔ حاجی عبداللہ ہارون کالج ۔ کراچی

عزیزی اریب اور مکرمی میر حسن صاحب کے خطوط ملے۔ جشن مخدوم کے سلسلہ میں ایک فرمائش پہنچ چکی ہے اور لکھنے کی فکر میں ہوں۔

آپ لوگوں سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ اگر حیدرآباد جانا ہو سکے تو کیا کہنا۔ شرکت کی کوشش کروں گا ورنہ کچھ لکھ بھیجوں گا۔

مجھے یقین ہے کہ اس جشن میں مخدوم کی خدمات اور کارناموں کا اعتراف کیا جائے گا۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

فیض

ڈاکٹر معین احسن جذبی ۔ علی گڑھ

جشن مخدوم میں شریک نہ ہونے کا افسوس ہے۔ کئی سبب تھے۔ ایک تو اتنے پیسے پاس نہ تھے، دوسرے اتنی دور کے سفر کے تصور ہی سے ہمت ٹوٹ جاتی ہے لیکن ایک طرح میں بھی اس جشن میں شریک ہو گیا گلِ تر شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ کیسا پیارا شاعر حیدرآباد نے پیدا کیا ہے۔ خدا اسے مدتوں زندہ رکھے۔ اس کی شخصیت اور اسی جذبے کے ساتھ۔

جذبی

الیکسی سرکوف سکریٹری یو ایس ایس آر رائٹرس یونین ماسکو

اپنے جشن پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ کی تصنیف پر بارہا نظریں لگی ہوئی

ہیں۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔ الکسی سرکوف

ای۔ پی۔ چیلیشیف۔ وائس پریسیڈنٹ سوسائٹی آف سوویت انڈین کلچرل ریلیشنز۔ دہلی

اردو کے ممتاز شاعر اور عوامی قائد مخدوم محی الدین روس میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ان کی نظموں کا ترجمہ سوویت یونین کی کئی زبانوں میں کیا گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب فاشسٹ طاقتوں نے ہمارے ملک پر جارحانہ حملہ کر دیا تھا تو مخدوم نے فاشسٹ خطرہ کو شکست دینے میں روسی سپاہیوں کی دلیرانہ جنگ کی تعریف میں نظمیں کہی تھیں۔ میں روسی ادیبوں اور اسکالرز کی جانب سے "جشن مخدوم" کے موقع پر مخدوم محی الدین کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔ ہماری تمنا ہے کہ مخدوم طویل حیات پائیں، انھیں خوشیاں ملیں اور وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کریں۔

آپ کا

ای۔ پی۔ چیلیشیف

آلِ احمد سرور۔ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ

مخدوم ان شاعروں میں ہیں جو فن کی ایک خاص سطح پر آ کر ٹھہر نہیں جاتے بلکہ مستقل اور مسلسل ترقی کرتے رہتے ہیں جو "سرخ سویرا" سے "گلِ تر" تک مخدوم نے فن کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔

ایک سرگرم سیاسی کارکن ہونے اور ایک خاص سیاسی فلسفے میں ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ مخدوم نے شاعری اور سیاست کے علیحدہ علیحدہ رول کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حسن بھی ہے اور اثر بھی۔

مجھے امید ہے "جشن مخدوم" میں مخدوم کے ادبی کارناموں کا صحیح اعتراف کیا جائے گا۔ میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مخلص

آلِ احمد سرور

حبیب الرحمٰن۔ معتمد انجمن ترقی اردو (حیدرآباد)

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ہمارے محبوب شاعر مخدوم محی الدین کی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک تقریب منعقد کر رہے ہیں۔ انسان کی خوبیوں کا بروقت اعتراف اس کا حوصلہ

صبا

بڑھاتا ہے اور یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ اس کا خونِ جگر رائیگاں نہیں گیا۔ مخدوم جیسے شاعروں کا اعتراف کر کے ہم ان پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اپنے صاحبِ ذوق ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس لیے میں اس تقریب کو حیدرآباد کے عوام اور ادب دوستوں کے حسنِ ذوق کا مظہر سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس جشن میں ہر طبقے، ہر خیال اور مسلک کے لوگ شریک ہوں گے۔

میں مخدوم کی مخلص شخصیت اور سحر انگیز شاعری کا دلدادہ ہوں۔ اس لیے ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں اور جشن کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

مخلص

حبیب الرحمٰن

مالک رام۔ ساہتیہ اکیڈیمی۔ دہلی

مخدوم نے ہماری شاعری کو جو رنگ و روغن اور گہرائی اور تہ داری دی ہے وہ ان کا اپنا حصہ ہے۔ ان کے کلام کا نرم اور دھیما لہجہ اور سوز جو دل کی گہرائیوں سے نکلتا معلوم ہوتا ہے بالکل ان کا انفرادی ہے۔ انھوں نے تخیل سے بھی کام لیا ہے اور ان کے ہاں رمزیت کی بھی کارفرمائی ہے۔ لیکن نہ اتنی کہ کلام دور از کار اور بے معنی ہو کر رہ جائے جس طرح آج کل کے بیشتر نظم نگاروں کا شیوہ ہے۔

انھوں نے ۲۵، ۳۰ برس میں اردو نظم میں توانائی کا احساس بڑھانے میں جو کام کیا ہے ہم سب اس کے لیے ان کے ممنونِ احسان ہیں۔ خدا انھیں تا دیر سلامت رکھے کہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکیں۔

خاکسار

مالک رام

ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ۔ معتمد عمومی ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد

احباب نے بڑی دیر میں سہی مگر اس دورِ آلِ عثمانی کو یاد تو رکھا۔ مولوی ڈاکٹر عبدالحق مولوی وحید الدین سلیم، ڈاکٹر سجاد، اور ڈاکٹر زور سب اللہ کو پیارے ہو گئے مگر ان اساتذۂ گرامی کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ شاگردوں کا ایک محدود ہی سہی مگر شہرت و قابلیت کے اعتبار سے ہندوستان گیر شہرت کے حامل اصحاب کا وجود آج بھی اردو شعر و ادب کی اشاعت، ترویج اور بقا کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

مخدوم، وجد اور میر حسن جامعۂ عثمانیہ کی اس ذہین نسل کی تثلیث ہے جو آج بھی اپنی شخصیت اور فکر و فن کے سبب اردو سماج کے لیے مینارِ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اب تو مخدوم برصغیر کی محبوب شخصیت بن گئے ہیں یہ بجائے خود حیدرآباد کی عزت و توقیر ہے۔

میں کارکنان و احباب ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے جشنِ مخدوم کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں اور اس کی تہ دل سے کامیابی کا خواہاں ہوں۔

ہیندر راج سکسینہ

ڈی۔ راماچ راؤ۔ نائب صدر آندھرا سرسوت پریشد۔ حیدرآباد

جشنِ مخدوم کا دعوت نامہ ملا۔ مگر میری خرابی صحت کے باعث ڈاکٹروں نے طبی مشورہ دے رکھا ہے کہ میں شام میں چھ بجے کے بعد کسی عام جلسہ میں شرکت نہ کروں ورنہ میں شخصی طور پر حاضر ہوتا اور مخدوم کو مبارک باد دیتا۔ براہ کرم میری اور آندھرا سرسوت پریشد کی جانب سے نیک تمنائیں مخدوم تک پہنچا دیجیے۔ مخدوم ہمارے ملک کے ممتاز شاعر ہیں ہر چند کہ وہ ایک مخصوص سیاسی نظریے سے وابستہ ہیں۔ لیکن ان کی پہلو دار شخصیت کے باعث وہ ہر طبقہ میں عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ آندھرا سرسوت پریشد مخدوم کی درازیٔ عمر اور خوشحالی کی نیک تمنائیں رکھتی ہے تاکہ وہ ہندوستان کے ادب اور ہندوستانی قوم کی طویل عرصہ تک خدمت کرتے رہیں۔

ڈی۔ راماچ راؤ

جشن مخدوم کے افتتاحی اجلاس میں
چیف منسٹر آندھرا پردیش کے برہمانند ریڈی کی تقریر کا اقتباس

"مخدوم محی الدین پیار و اخلاص اور ایثار و خدمت کا پیکر ہیں۔ ایسے مخلص اور ایماندار عوامی خدمت گزاروں کی جمہوریت کے ارتقا کے لیے شدید ضرورت ہے۔ میں مخدوم سے قریبی طور پر دس سال سے واقف ہوں۔ ان کی خدمات عوام بالخصوص غریب طبقات کے لیے نہایت شاندار رہیں۔ قانون ساز کونسل، مختلف تقاریب شخصی ملاقاتوں اور دیگر مواقع پر جب مجھ میں مخدوم سے ملا ہوں، ان سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود مخدوم انتہائی پیارے آدمی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس قبیل کا شخص کس طرح کمیونسٹ پارٹی میں رہ سکتا ہے؟ قانون ساز کونسل کے باہر میں نے انھیں زیادہ معقولیت پسند پایا ہے۔ قانون ساز کونسل میں مخدوم کی تنقیدیں زیادہ سخت، جارحانہ اور ایجی ٹیشنل ہونے کے باوجود میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مخدوم اپنی پارٹی کی ترجمانی اور اپنے فرائض کی ادائیگی بہترین طریقے پر کرتے ہیں مخدوم نے عوام کی خدمات کے لیے سختیاں جیلیں اور قربانیاں دی ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے نقطۂ نظر کو میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں خواہ ان کا تعلق کسی بھی نظریہ سے کیوں نہ ہو۔ بدبختی سے مخدوم نے "ایک غیر ضروری برت" رکھا تھا۔ میں ایمانداری کی بات کہتا ہوں کہ اس برت کی وجہ سے سب سے زیادہ متفکر بہ حیثیت چیف منسٹر میں خود تھا۔ اس وجہ سے بھی کہ ایک ۶۰ سالہ شخص نے برت رکھا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج کی اس تقریب کے افتتاح کے لیے مجھے دعوت دی گئی ہے۔ جس میں مخدوم کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ خدا سے میری دعا ہے کہ مخدوم کی عمر دراز ہو۔ وہ صحت مند اور خوشحال رہیں اور عوام کی بہتر سے بہتر خدمت کرتے رہیں ان کی صحت مند اور تعمیری تنقیدوں سے حکومت بھی اپنی غلطیوں کی اصلاح کر سکتی ہے۔"

مخدوم محی الدین

(زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ بہ یک نظر)

نام ۔ سن پیدائش و جائے پیدائش

● خاندانی نام "ابوسعید محمد مخدوم محی الدین" خدری ہے۔ مخدوم کے جد اعلیٰ آنحضرت صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری تھے۔ میٹرک تک مخدوم کا یہی نام چلتا رہا۔ اب بھی انہیں "خدری بھائی" پکارنے والے موجود ہیں۔ پیدائش حیدرآباد کے ضلع میدک کے تعلقہ اندول میں ہوئی۔ ان کے والدہ کا کہنا ہے کہ جب موسیٰ ندی میں طغیانی (ستمبر ۱۹۰۸ء) آئی تھی اس وقت مخدوم کی عمر آٹھ ماہ کی تھی۔ لیکن ہائی اسکول سرٹیفکٹ کے لحاظ سے مخدوم کا سن پیدائش ۱۹۱۰ء ہے۔

آباو اجداد کا مختصر تعارف

مخدوم کے دادا رشید الدین اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے حیدرآباد آگئے تھے۔ نانا سید جعفر علی، ۱۸۵۵ء میں شاہجہاں آباد سے دکن کی طرف چلے آئے اور ضلع میدک میں قیام کیا۔ مخدوم کی نانی پٹھانی تھیں اور نانا سید۔ ددھیال شیخوں کا ہے۔

مخدوم کے پردادا "مخدوم الدین" مکہ مسجد (حیدرآباد) کے قاری اور بہت اچھے پیراک تھے۔

مخدوم کا خاندان استادوں قاریوں، خطاطوں اور مذہب پرستوں کا خاندان رہا ہے جسے آج بھی تلنگانہ میں "پدا پنتلو" (بڑے پنڈت) کا گھرانہ کہا جاتا ہے۔

مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول میں تحصیل کے صیغہ دار تھے۔ مخدوم ابھی چار سال ہی کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چنانچہ ان کی پرورش ان کے چچا بشیر الدین کی سرپرستی میں ہوئی۔ مخدوم کے چچا کنبہ پرور اور دردمند آدمی تھے۔ خاندان کی بیوہ بہنوں اور یتیموں کی نگہداشت اپنا فرض سمجھتے تھے یہ بھی اپنے بھائی کی طرح تحصیل کے صیغہ دار تھے لیکن ترقی کرتے کرتے تحصیلدار ہو گئے تھے۔ مخدوم کے دو بھائی بھی تھے لیکن وہ کم عمری میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ مخدوم کے والد کے انتقال کے بعد مخدوم

کی والدہ نے دوسری شادی کر لی اور حیدرآباد چلی گئیں۔ مخدوم اپنی والدہ سے پھر اس وقت ملے جب وہ اپنی ابتدائی تعلیم ختم کر کے کالج میں داخلہ لینے کی غرض سے حیدرآباد آئے۔

گھریلو ماحول

مخدوم کے گھر میں سخت مذہبی پابندیاں تھیں۔ پابندی سے نماز ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان "ختم خواجگان" پڑھنا بھی لازمی تھا۔ اس کے علاوہ مسجد میں نمازیوں کے لیے وضو کا پانی بھرنا اور مسجد میں جاروب کشی مخدوم کے فرائض میں داخل تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد پڑھائی اور خطاطی کے لیے بیٹھ جانا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ مخدوم نے حسب روایت خوش خطی کی چالیس سطریں نہیں لکھیں بلکہ پہلی سطر کے نیچے ایضاً ایضاً ڈال دیا۔ مخدوم کی اس حرکت پر چچا پہلے تو کچھ لطف اندوز ہوئے لیکن بعد میں سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔

مخدوم اپنے چچا سے بے حد متاثر رہے۔ چچا کی زندگی اور کردار نے مخدوم کی شخصیت کی تعمیر پر گہرا اثر ڈالا۔ چچا کی ذات مجمع الصفات تھی۔ وہ جیسا سوچتے اور جو کہتے اس پر زندگی میں عمل بھی کرتے۔ وہ مساوات کے حامی اور سادگی پسند تھے اور "تحریک خلافت" کے مؤید۔ چچا عام طور پر دسترخوان پر بیٹھ کر اہم اہم خبریں سنایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بارے میں انھوں نے بتایا تھا کہ روس میں انقلاب آگیا ہے غریبوں نے زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے اور لینن کی رہنمائی میں بالشویک پارٹی اقتدار حاصل کر چکی ہے جس کے نتیجے میں وہاں مساوات قائم ہوگئی ہے اور سب ایک دسترخوان پر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ مخدوم کو اس وقت لینن، بالشویک پارٹی اور عوامی اقتدار کے معنی سمجھ میں نہیں آئے لیکن یہ بات بہت دلچسپ معلوم ہوئی کہ وہاں سب ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔

مخدوم اور عاشقانہ خطوط

مخدوم اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک نواب صاحب کے لیے جو ایک اینگلو انڈین لڑکی کے عاشق تھے انگریزی میں عاشقانہ خطوط لکھا کرتے تھے۔ مخدوم اس وقت معاملات عشق سے واقف نہ تھے۔ انھیں اہم اور مشہور شخصیتوں کے عاشقانہ خطوط کا مطالعہ کرنا پڑا۔ یہ مطالعہ مخدوم کے پہلے مضمون "گوئٹے کے مکتوبات محبت" کی تخلیق کا محرک ثابت ہوا۔

ابتدائی و اعلیٰ تعلیم

مخدوم کی ابتدائی تعلیم قرآن اور گلستاں بوستاں کے درس سے شروع ہوئی ان کے پہلے استاد ان کے دادا تھے۔ مخدوم نے منول انڈول اور حیدرآباد دھرم ونت ہائی اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی اور سنگاریڈی کے ہائی اسکول سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ ان کے چچا چاہتے تھے کہ یہ مولوی بنیں چنانچہ چیلاپورہ حیدرآباد کے شیعہ مدرسہ سے منشی کا امتحان بھی پاس کرایا لیکن مخدوم نے ۱۹۲۹ء میں جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔

انٹرمیڈیٹ میں ان کے اختیاری مضامین اردو فارسی اور معاشیات تھے۔ ان دنوں جامعاتی درجوں میں دینیات کی تعلیم لازمی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مخدوم کو دینیات پڑھایا کرتے تھے اور ان سے آئے دن مخدوم کی بحث و حجت ہوا کرتی تھی جس کی بنا پر مخدوم کو اکثر کلاس سے نکال دیا جاتا تھا۔ چنانچہ دینیات کی جماعتوں میں غیر حاضری کی بابت انٹرمیڈیٹ میں انھیں ایک سال کے لیے روک دیا گیا۔ امتحان میں عدم شرکت اور ایک سال کے ضائع ہو جانے کے بعد مخدوم نے اپنے رشتہ داروں پر مزید بار رہنا پسند نہیں کیا جن کے ہاں ان کے قیام و طعام کا انتظام تھا اس گھر کو چھوڑنے کے بعد انھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیوشن کیے اور اسی زمانے میں انھیں ایک عجیب کام بھی ملا۔ ایک نواب صاحب کو کسی اینگلو انڈین لڑکی سے عشق تھا وہ مخدوم سے انگریزی میں عاشقانہ خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ مخدوم اس وقت کم عمر بھی تھے اور معاملات عشق سے ناواقف بھی، اس لیے انھیں اہم اور مشہور شخصیتوں کے... عاشقانہ خطوط کا مطالعہ کرنا پڑا۔ یہ مطالعہ مخدوم کے پہلے مضمون "گوئٹے کے مکتوبات محبت" کا محرک ثابت ہوا جو مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کے ماہنامہ "مکتبہ" میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ مخدوم نے اسی اثنا میں دو مہینے کے لیے دفتر ملکی و مال میں تھرڈ گریڈ کلرک کی حیثیت سے ملازمت بھی کی۔ مختلف اخبارات مثلاً "مشیر دکن"، "دوالاعظم" اور "پیام" میں کام بھی کیا۔ ہاکر بن کر تصویریں بھی فروخت کیں جو کھینچی تھیں بعد کو سینما ایکٹریسوں کی تصویریں بھی بیچیں۔

ان دنوں وہ سلطان بازار کی بڑی مسجد میں سویا کرتے تھے اور وہیں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ مخدوم نے ۱۹۳۷ء میں ایم اے پاس کیا۔

مخدوم کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت

۱۹۳۵ء میں مخدوم اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ عثمانیہ میں ایک ڈرامہ "مہوش کے ناخن" اسٹیج کیا تھا۔ ڈرامہ دیکھنے والوں میں رابندر ناتھ ٹیگور بھی موجود تھے اس ڈرامے میں مخدوم کا پارٹ سب سے بہتر مانا گیا۔ ٹیگور نے اس موقع پر کہا تھا کہ مخدوم بی اے کرنے کے بعد شانتی نکیتن آجائیں۔ سروجنی نائیڈو نے ٹیگور سے مخدوم کا تعارف کرایا تھا

ڈرامہ نگاری

جامعہ عثمانیہ میں مخدوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ جن میں میر حسن، عزیز احمد نورالہدیٰ، شنکر جی، ظفر الحسن، اشفاق حسین، شہریار کاؤس جی اہم ہیں۔ اسی زمانے میں بہار میں زلزلے نے تباہی مچائی تھی۔ مخدوم اور ان کے چند ساتھیوں نے سوچا کہ کوئی ڈرامہ اسٹیج کیا جائے اور اس کی آمدنی بہار کے مصیبت زدگان کی امداد کے لیے دی جائے۔ چنانچہ مخدوم نے ایک طبع زاد اور ایک ایکٹ کا ڈرامہ "مرشد کامل" بھی لکھا جو ساگر ٹاکیز حیدرآباد کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ مخدوم نے مرشد کا میک اپ خواجہ حسن نظامی کے حلیہ کے مطابق کیا تھا۔ اس ڈرامے کے ناظرین میں مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، اور نظام دکن

معہ اپنے ناپور سے خانوادے اور ریذیڈنٹ کے موجود تھے۔ بعد میں مخدوم سے "پیلا دوشالہ" سنانے کی بھی فرمائش کی گئی۔ اس کے بعد اشتیاق حسین قریشی کا ایک ڈرامہ بھی سینٹ جارج گرامر اسکول کے جمنازیم ہال میں پیش کیا گیا۔ اس میں ہیرو کا پارٹ خود مخدوم نے ادا کیا تھا۔ اس ڈرامے کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

پروفیسر حسین علی خاں مرحوم کے مشورے پر برنارڈ شا کے ڈرامے "وڈورس ہاؤزس" کو اردو میں "ہوش کے ناخن" کے عنوان سے منتقل کیا۔ حیدرآباد میں پہلی دفعہ اس ڈرامے میں نوکروں کے کرداروں کو دکنی زبان دی گئی تھی۔ ڈرامہ بہت کامیاب رہا۔ مخدوم کا پارٹ سب سے بہتر مانا گیا۔ رابندر ناتھ ٹیگور ان دنوں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ سروجنی نائیڈو، اور سر اکبر حیدری (وزیر اعظم اور جامعہ کے چانسلر) بھی حاضرین میں شامل تھے۔ ڈرامہ کے آخر میں گرودیو اسٹیج پر تشریف لائے اور حیدرآباد میں پہلی مرتبہ "من گن من" سنایا۔ ٹیگور نے اس موقع پر مخدوم سے کہا تھا کہ وہ بی اے کرنے کے بعد شانتی نکیتن آئیں۔

علم و مطالعہ

مخدوم کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا۔ وہ ابھی وسطانی درجوں ہی میں تھے لیکن عبدالحلیم شرر کے بیشتر ناول پڑھ چکے تھے۔ گھر میں ناول بینی ممنوع تھی اس لیے چوری چھپے پڑھتے تھے۔ ماہنامہ "نگار" (لکھنؤ) کا پابندی سے مطالعہ کرتے۔ میٹرک تک وہ شبلی نعمانی کی تقریباً تمام کتابیں سرسید کی "آثار الصنادید" حالی کی تصنیفات، نیاز فتح پوری کا ایک ایک لفظ اور قاضی عبدالغفار اور پریم چند کی اکثر تخلیقات پڑھ چکے تھے۔ اس دوران میں ان کی فارسی کی استعداد اتنی ہو چکی تھی کہ شاہنامہ، دیوانِ غالب، دیوانِ حافظ اور اخلاقِ محسنی ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں وہ مارکسزم سے واقف ہوئے اور حیدرآباد میں اپنے طور پر مارکسی تعلیمات کا حلقہ بنالیا۔

پہلی مطبوعہ نظم

۱۹۳۴ء میں مخدوم کے ایک دوست نے انھیں رسالہ "ایوان" (جس کے ایڈیٹر پروفیسر مجنوں گورکھپوری تھے) دکھایا جس میں مخدوم کی نظم "طور" چھپی تھی۔ مخدوم نے وہ نظم رسالے کو نہیں بھیجی تھی بلکہ ان کے کسی دوست نے بھیج دی تھی۔

اساتذہ

یونیورسٹی میں مخدوم کے اساتذہ مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عبدالحق، پروفیسر حسین علی خاں ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ان کے استاد تو نہیں تھے لیکن ان کے ساتھ علمی مباحثے ہوا کرتے تھے۔ مخدوم مناظر احسن گیلانی کے کردار اور خلیفہ عبدالحکیم کی ذہانت کے اب بھی مداح ہیں۔ ایم اے کرنے کے بعد مخدوم اپنے تقرر کے سلسلے میں جامعہ کے وائس چانسلر قاضی محمد حسین کے

یہاں لگ گئے تو ایک گھنٹہ تک چپ چاپ بیٹھے رہے اور پھر اپنے مدعا کا اظہار کیا۔ قاضی صاحب نے ایک گھنٹے کے توقف کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

پہلی شعری تخلیق

مخدوم کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ ہوا۔ ان کی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" تھی جو کہیں شائع نہیں ہوئی۔ اس نظم کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک صاحب نے (جو نئے نئے جامعہ میں داخل ہوئے تھے) اپنے سینئر طالب علموں کو حسبِ روایت پارٹی نہیں دی تھی۔ جوابی کارروائی کے طور پر ان صاحب کا محبوب پیلا دوشالہ غائب کر دیا گیا۔ مخدوم کی نظم "پیلا دوشالہ" اسی شال کے کھو جانے کا مزاحیہ مرثیہ تھی۔ ان کی پہلی مطبوعہ نظم "طور" ہے جو ۱۹۳۴ء میں رسالہ "ایوان" میں شائع ہوئی تھی جس کے ایڈیٹر مجنوں گورکھپوری تھے۔

شادی اور بچے

ان دنوں جب مخدوم کو انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں روک دیا گیا تھا، وہ اپنے سرپرست رشتہ دار کا گھر چھوڑ چکے تھے اور ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ ایک دن ان کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا جس کی وجہ سے انھیں ۴۸ گھنٹوں کا فاقہ کرنا پڑا۔ انھوں نے اس کا ذکر کسی دوست سے بھی نہیں کیا۔ البتہ اپنے ایک رشتہ کے چچا کے ہاں گئے۔ وہاں بھی وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ اس گھر کی ایک لڑکی نے مخدوم کے تھکے اور اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کھانا کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مخدوم تیار ہو گئے اور ۴۸ گھنٹوں کا "روزہ" ختم ہونے کے بعد اسی گھر میں چھ سات گھنٹے تک سوتے رہے۔ مخدوم کے لیے اس روز اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر لانے اور کھلانے والی یہی لڑکی بعد کو مخدوم کی شریکِ حیات بن گئی اور مخدوم کی مستقل دیکھ بھال اس کا مقدر بن گئی۔

مخدوم کی شادی ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ان کی تین اولادیں بقیدِ حیات ہیں۔ ایک لڑکی ذکیہ اساوری (جس کی شادی ہو چکی ہے) اور دو لڑکے نصرت محی الدین اور ظفر محی الدین۔ ایک لڑکے آصف کا انتقال بہت چھوٹی عمر میں ہوا۔ اس کی موت سے متاثر ہو کر مخدوم نے نظم "پرسہ" لکھی تھی۔ ایک اور لڑکی رفیعہ لبنیٰ، دو تین سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئی۔ اس کی موت مخدوم کے دل و دماغ پر بہت شاق گزری تھی۔ مخدوم اب بھی بادیدۂ تر اپنی بچی کا ذکر کرتے ہیں کہ جب میں اس سے کہتا تھا کہ "لال فوج ہماری فوج" تو وہ کہتی کہ "لال موز ہمارا موز"۔

انجمن ترقی پسند مصنفین (حیدرآباد)

۱۹۳۶ء میں مخدوم نے حیدرآباد میں سبطِ حسن، اختر حسین رائے پوری اور ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ انجمن کی نشستیں سروجنی نائیڈو کے بنگلے "گولڈن تھریشولڈ" پر ہوا کرتی تھیں۔ مگر سروجنی دیوی ان پروگراموں میں عملی حصہ نہیں لیتی تھیں تاہم

وہ اس تحریک کی مؤید تھیں۔ قدامت پسند اس تحریک کے سخت مخالف تھے لیکن نوجوانوں میں یہ تحریک بہت مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ پرانے خیالات رکھنے والے ان ترقی پسندوں کو مذہبی، سماجی اور ادبی اعتبار سے مضر اور قابلِ مذمت قرار دیتے تھے اس کے باوجود مولانا حسرت موہانی اور قاضی عبدالغفار جیسے بزرگوں کی حمایت انھیں حاصل تھی۔

۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور ۱۹۴۵ء میں پہلی بار اردو زبان کے ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ اور آج تک انجمن کی اس سے زیادہ کامیاب کانفرنس نہیں ہو سکی ہے۔ اس کانفرنس کے کچھ عرصہ بعد حیدرآباد کے ادارۂ شرفیہ نے ترقی پسند ادیبوں کی مذمت کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا جس کے داعی ماہر القادری، تسنیم جینائی اور مولانا قمر تھے۔ ان لوگوں نے مولانا حسرت موہانی کو قدامت پسند اور رجعت پرست سمجھ کر جلسے اور مشاعرے کی صدارت کے لیے بلایا تھا۔ مخدوم بھی اس میں بحیثیت شاعر مدعو تھے مشاعرے سے پہلے مخالفانہ مقالے بھی پڑھے گئے جن کا مقصد ترقی پسندوں کو بے دین اور دہریے ثابت کرنا تھا۔ پروگرام کے اختتام پر مولانا حسرت موہانی نے صدارتی تقریر میں کچھ اتنی شدت سے ترقی پسندوں کی تعریف کی کہ مجمع بپھر گیا۔ اس موقع پر مخدوم نے عوام سے اجازت لے کر اپنی تقریر میں یہ واضح کیا کہ ترقی پسندی دہریت نہیں بلکہ انسان دوستی حب الوطنی اور آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کا دوسرا نام ہے۔

مخدوم مخالفین کے نرغے میں

۱۹۴۵ء میں حیدرآباد کے بعض قدامت پرستوں نے ترقی پسندوں کے خلاف ایک جلسہ کیا تھا جس میں مخدوم بحیثیت شاعر مدعو تھے۔ حسرت موہانی نے جو صدر جلسہ تھے ترقی پسندوں کی اتنی شدت سے تائید کی کہ مجمع بپھر گیا۔ اس موقع پر مخدوم نے یہ واضح کر دیا کہ ترقی پسندی دہریت نہیں بلکہ انسان دوستی اور جدوجہد آزادی کا نام ہے۔ آخر میں سارا مجمع مخدوم کا حامی ہو گیا۔

نہرو اور گاندھی سے ملاقات

۱۹۳۰ء میں جب مخدوم طالب علم تھے انہوں نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی تھی۔ پنڈت جی ان دنوں حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور سروجنی نائیڈو کے مکان پر ٹھہرے تھے ۱۹۳۹ء میں گاندھی جی کی ستیہ گرہ کے زمانے میں مخدوم نے ایک نظم "مسافر" کہی تھی۔ وہ سیواگرام (احمدآباد) گئے جہاں ان دنوں گاندھی جی کا چپ کا روزہ تھا۔ مخدوم نے اپنی یہ نظم گاندھی جی کو سنائی۔ وہ انھیں اجتماعی ستیہ گرہ کے لیے آمادہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان سے یہ بات نہ ہو سکی۔ کانگریس کے بائیں بازو کے اراکین اس ستیہ گرہ کے خلاف تھے۔

۱۹۴۵ء میں مخدوم اسا دری کے ساتھ فرینڈس آف سوویت یونین کی کانفرنس میں شریک ہونے بمبئی گئے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے گاندھی جی سے مخدوم کا اس طرح تعارف کرایا تھا: "یہ میرا بیٹا ہے اور یہ اس کی بیٹی ہے۔"

ملازمت، سیاسی سرگرمیاں

۱۹۳۹ء میں مخدوم کا تقرر سٹی کالج میں بہ حیثیت استاد اردو عمل میں آیا۔ اس وقت تک مخدوم ایک شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی نظم "انقلاب" پر علمائے دکن کی جانب سے کفر کا فتویٰ صادر ہوا تھا۔ مخدوم نے سٹی کالج میں کوئی دو سال تک کام کیا۔ اس دوران میں ان کے سیاسی رجحانات کا رنگ تیزی کے ساتھ ابھرتا جا رہا تھا اور ان کی سیاسی مصروفیات روز بروز بڑھنے لگی تھیں، کالج کے ارباب مجاز کو یہ شکایت تھی کہ مخدوم اپنے لکچروں میں اشتراکی خیالات و نظریات کا پرچار کرنے لگے ہیں۔ اس صورت حال اور دوسرے مصالح کی بنا پر انہیں دونوں پارٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ کالج میں اپنا استعفا پیش کر دیں چنانچہ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں استعفا پیش کر دیا۔

مخدوم جب عملی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو ریاست حیدرآباد جدوجہد آزادی کے میدان میں دوسری ریاستوں کی طرح بہت پیچھے تھی۔ مخدوم پہلے ہی سے شاہی مطلق العنانی کے خلاف اور جاگیرداری اور زمین داری کے سخت مخالف تھے۔

حیدرآباد میں اس وقت سوائے مجلس اتحاد المسلمین کے کسی سیاسی پارٹی کا وجود نہیں تھا کیوں کہ دوسری سیاسی پارٹیوں پر امتناع عائد تھا۔ اس وقت حیدرآباد میں آندھرا مہاسبھا، مہاراشٹر پریشد اور کرناٹک پریشد جیسی تہذیبی انجمنیں تھیں۔ سیاسی سرگرمیوں سے ان کا تعلق نہیں تھا۔ مخدوم، جے سوریا نائیڈو، اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، اور جے وی نرسنگ راؤ نے مل کر ایک مارکسٹ اسٹڈی سرکل قائم کیا۔ یہ تمام افراد سروجنی نائیڈو کی رہائش گاہ پر ملا کرتے تھے۔ جہاں بحث و مباحث ہوتے۔ اس انجمن کے علاوہ حیدرآباد میں اشتراکی خیالات رکھنے والے افراد کی ایک اور بھی انجمن کامریڈ ایسوسی ایشن، تھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جواد رضوی، عالم خوندمیری، جھگڑے اور اونکار پرشاد اس کے اراکین میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ روشن نارائن زیدی چند ساتھیوں کے ساتھ علیحدہ کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو ایک دوسرے کی مصروفیات کا علم نہیں تھا۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی سیاسی نصب العین کے لیے کام کر رہے تھے۔

حیدرآباد میں پوشیدہ طور پر ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی سے اس کا الحاق کر دیا گیا۔ آندھرا مہاسبھا جو ایک تہذیبی تنظیم تھی اسے سیاسی تنظیم کے لیے استعمال کیا گیا۔ بعد کو یہ تنظیم کمیونسٹ تحریک کے ذریعہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد تک پہنچی۔ اس تنظیم کا اہم مقصد حیدرآباد میں جمہوری حکومت کا قیام اور شاہی حکومت کا خاتمہ تھا۔

ٹریڈ یونینیں، گرفتاری اور روپوشی

۱۹۴۲ء میں پارٹی کی ایما پر مخدوم ریلوے ورکرس یونین گئے اور چیف وائس پریسیڈنٹ چنے گئے

سٹی کالج کی لکچرری سے استعفیٰ کے بعد مخدوم کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور تین ماہ کی سزا دی گئی تھی۔

۱۹۴۵ء میں پہلی بار مخدوم ہی نے ٹن ورکرس کی تنظیم قائم کی اور سات ہزار مزدوروں کو اجرتوں کے معاملے میں احتجاجی مہم کے لیے آمادہ کیا۔ "اعلیٰ حضرت بندگان عالی" کی حکومت کے خلاف مزدوروں کی طرف سے پرانے شہر میں یہ پہلا احتجاجی مظاہرہ تھا۔ اُسی زمانے میں ایک مہینے کے اندر اندر الکٹری سٹی یونین، میونسپل یونین، گول مائنس یونین اور دیگر (۴۲) ٹریڈ یونینیں قائم کی گئیں جو مخدوم کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ اسی بنا پر انھیں مزدوروں کے حلقہ میں "دو پتا ہوا" کہا جاتا ہے۔ مخدوم آج بھی ایک ممتاز ٹریڈ یونین لیڈر مانے جاتے ہیں اور برسوں آندھرا پردیش ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں پہلی بار "آل حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس" کا جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کے لیے پہلے ہی اجازت حاصل کرلی گئی تھی۔ اس کے باوجود مخدوم کو جلسہ کی کارروائی کے دوران گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں انھیں رہا کردیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مخدوم شاہ آباد سمنٹ فیکٹری ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں شاہ آباد میں تھے کہ پارٹی کی جانب سے انھیں اطلاع ملی کہ ان کے نام گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہے وہ روپوش ہو جائیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ روپوش رہے۔ ان کی روپوشی ہی کے زمانے میں حیدرآباد میں کمیونسٹ تحریک اور تلنگانہ جدوجہد نے زور پکڑا اور اس کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد ہند یونین میں شامل ہوا۔ لیکن زمیندارانہ نظام کے خلاف تلنگانہ کے کسانوں کی جدوجہد میں کمی نہیں ہوئی۔ پولیس ایکشن سے قبل جدوجہد نظام شاہی کے خلاف تھی اور بعد میں کسانوں کے حقوق کی موافقت میں اور زمینداروں کے خلاف۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد تحریک تھی۔

مخدوم — مادھو بھائی

۴۶ء سے ۵۱ء کے دوران جب مخدوم روپوش رہے، وہ بمبئی کے ایک گجراتی برہمن گھرانے میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو برہمن ظاہر کیا تھا لیکن اس گھرانے کی ایک خاتون کو اس کا یقین نہیں تھا۔ کیوں کہ مخدوم برہمن رسم و رواج کو ٹھیک طرح سے ادا نہ کر پاتے۔ مخدوم نے اپنا نام "مادھو راؤ" بتایا تھا اور گجراتی انھیں "مادھو بھائی" پکارتے تھے۔

انتخابات

روپوشی کے بعد جب وہ حیدرآباد آئے تو انھیں پھر دوبارہ مارچ ۱۹۵۱ء میں گرفتار کرلیا گیا اور انتخابات سے کچھ عرصہ پہلے رہا کردیا گیا۔ حصول آزادی کے بعد ملک میں پہلی بار عام انتخابات ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوئے۔ حیدرآباد میں کانگریس پارٹی کے خلاف ایک عوامی جمہوری محاذ قائم کیا گیا جس کے ارکان میں زیادہ تر کمیونسٹ اور دوسرے بائیں بازو کے عناصر تھے۔ مخدوم اسمبلی اور پارلیمنٹ

دونوں کے امیدوار تھے۔ مخدوم کی رہنمائی اور ان کی عوام میں بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے عوامی جمہوری محاذ کو تو زبردست طاقت ملی لیکن مخدوم دونوں نشستوں میں سے کوئی بھی حاصل نہ کر سکے۔ البتہ اسمبلی کے لیے ضمنی انتخابات میں حضور نگر سے منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں پارٹی نے انھیں قانون ساز کونسل کے لیے اپنا امیدوار بنایا اور ایم ایل سی بننے کے بعد وہ قانون ساز کونسل آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے اور اب تک وہ کونسل میں کمیونسٹ گروپ کے قائد ہیں۔

فلمی دُنیا میں

مخدوم ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بار بار فلم کے لیے لکھنے کی دعوت دی لیکن مخدوم نے ایسی کسی بھی پیش کش کو کبھی قبول نہ کیا۔ کیوں کہ وہ فلم کی چکاچوند اور مالی پیش کش کے باوجود عوامی اداروں، یونینوں اور اسمبلی میں عوام کی نمائندگی کو ٹھکرانا نہیں چاہتے تھے۔

۱۹۵۸ء میں مشہور فلم ساز گرودت (مرحوم) نے انھیں مستقل طور پر بمبئی میں رہ کر گیت لکھنے کی دعوت دی اور اتنے معاوضہ کی پیش کش کی جو اس زمانے کے سب سے زیادہ دیے جانے والے معاوضے سے تقریباً دگنا تھا۔ پھر بھی مخدوم بمبئی میں رہنے کے لیے راضی نہ ہوئے۔ اس سے پہلے مشہور فلم ساز دیوآنند نے اپنی کسی فلم کے لیے ان کی نظم "اک چنبیلی کے منڈوے تلے" (چارہ گر) منتخب کی تھی لیکن کسی وجہ سے وہ نظم فلم میں شامل نہ ہو سکی۔ بعد کو یہی نظم فلم ساز چندر شیکھر نے اپنی فلم "چاچاچا" میں شامل کر لی۔ اس نظم کا ریکارڈ سارے ملک میں بے حد مقبول ہوا۔

مخدوم کی ایک اور نظم "جانے والے سپاہی سے پوچھو" (سپاہی) فلم ساز بمل رائے کی فلم "اس نے کہا تھا" میں آچکی ہے۔ فلم دیکھنے اور گیت سننے والوں کا عام تاثر یہی ہے کہ یہ گیت فلم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ایک مرتبہ بمل رائے جب حیدرآباد آئے تھے تو ایک ملاقات میں انھوں نے مخدوم سے کہا کہ وہ ٹیگور کے ایک ناول کو فلمانا چاہتے ہیں اور اس کے گیت اور اسکرپٹ مخدوم سے لکھوانے کے خواہش مند ہیں لیکن اس فلم کی ابتدائی تیاریوں سے پہلے ہی بمل رائے کا انتقال ہوگیا۔

شخصیت، ادبی و سماجی حیثیت

مخدوم کی شخصیت و کردار پر وہ تمام نشیب و فراز ابتدا ہی سے اثر انداز نظر آتے ہیں جن سے وہ گزرے۔ اعلیٰ تعلیم، ارباب علم و دانش کے ماحول اور وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی فطری صلاحیتوں نے ان نقوش کو اور بھی چمکایا۔ شاعر اور عوامی رہنما کی حیثیت سے جوں جوں مخدوم کا قد بلند ہوتا گیا ان کے اعلیٰ کردار میں بھی پختگی آتی گئی۔ آج انھیں سب ایک خوددار، خوش مزاج، ملنسار، سادگی پسند، مخلص و مہربان شخص سمجھتے ہیں جس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں جو دوسروں کی برائی یا غیبت نہیں کرتا اور اگر دوسرے اس کی غیبت یا برائی کرتے ہیں تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ بے غرضی و اعلیٰ ظرفی کا وہ سچا نمونہ ہے

جدید انقلابی خیالات کا حیدرآباد کے تہذیبی ماحول میں اگر کسی شخصیت نے اپنی تہذیب کے اعلیٰ ورثے اور بلند اقدار سے بہترین امتزاج پیدا کیا ہے تو وہ بلاشبہ مخدوم کی شخصیت ہے۔ مخدوم نے حیدرآباد کے تہذیبی آداب اور رکھ رکھاؤ کو انقلابی رجحان کے دھارے سے پرے بہہ جانے نہیں دیا بلکہ اس طرح ہم آہنگ کر لیا کہ لوگ مخدوم کو نئے حیدرآباد کی تہذیب اور زندگی کا بہترین نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔

دہریت اور مادہ پرستی کا بڑے سے بڑا مخالف بھی مخدوم کے حلقۂ احباب اور ہجوم یاراں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخدوم کے اندر جو انسان ہے اس کی کشش انھیں اپنی طرف بلاتی ہے۔

مخدوم نے شہر حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقوں میں جو بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ حیدرآباد میں مخدوم کے لیے ایک ایک لاکھ کے دیوانہ وار ہجوم اور جلوس بھی دیکھے گئے۔ ان اجتماعات کے محبوب اور ہیرو مخدوم کی زندگی، کردار اور فن پر عوام کے اس خلوص اور پیار کی چھاپ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ مخدوم جانتے ہیں کہ انھیں چاہنے والے بے شمار ہیں جواب میں وہ اپنے چاہنے والوں کو بھی اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ شدت سے چاہتے ہیں۔ مخدوم کا شمار ملک کے صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ حیدرآباد کے ترقی پسند ادیبوں کے ہیرو کہلائے جا سکتے ہیں۔ کٹر سے کٹر نقاد بھی ان کی شاعری موسیقی اور ان کے اسلوب اور لہجے کی انفرادیت کا منکر نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں نظم کی ہیئت میں تجربے ہو رہے تھے مخدوم ترقی پسند گروپ کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے آزاد نظم کے آہنگ کو اپنایا۔ اور اپنی پہلی آزاد نظم "اندھیرا" کہی اس کے بعد بھی اپنی بیشتر آزاد و غیر مقفیٰ نظموں کے ذریعے اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا کہ آزاد نظمیں اپنے اسلوب کی بنا پر سپاٹ اور کھردری ہوتی ہیں۔

نظم "قید" کا پہلا سامع

اہ ۹ء میں جب مخدوم سنٹرل جیل حیدرآباد میں نظربند تھے، ان کی نظم "قید" ہوئی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ نظم جیل کے چوکیدار عمر خان کو سنا کر داد طلب کی۔ چوکیدار نے کہا "صاحب یہ نظم تو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔" اور خوش ہو کر بیڑی پیش کی۔ ان ہی دنوں یہ نظم حیدرآباد کے کسی رسالے میں مخدوم کے نام کے بغیر چھپی تھی۔

بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ مخدوم کی نثر میں بھی اسی قدر دلکشی اور دل پذیری ہے جتنی کہ شاعری میں۔ انھوں نے مختلف ادبی موضوعات پر متعدد مضامین اور اپنے سفر کے حالات کو رپورتاژ کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔ جن میں بلا کی روانی، سلاست اور شگفتگی ملتی ہے۔

طالب علمی کے زمانے میں مخدوم نے ڈرامے کے تعلق سے چند مضامین بھی لکھے تھے لیکن بعد میں انھوں نے اس جانب توجہ نہ دی۔

سیاحت و سفر: بین الاقوامی حیثیت

امن عالم اور دنیا کے مزدوروں کی عالمگیر تحریک W.F.T.U کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں مخدوم ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے روس، ایشیا، افریقہ، مشرقی و مغربی یورپ کے کئی ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ ان کا یہ سفر مارچ ۱۹۵۲ء سے جولائی ۱۹۵۵ء تک رہا۔ اس دوران انھیں کہیں ایک بار اور کہیں ایک سے زائد بار جانے کا موقع ملا۔ اہم مقامات میں چیکوسلواکیہ کے شہر پراگ، برونو کارلوی واری اور ویانا ــــ چین کے شہر ہانگ کانگ، کینٹن اور پیکنگ ــ سیلون کے شہر کولمبو اور کینڈی اور لبنان کے شہر بیروت کے علاوہ افریقہ کے کئی ملکوں اور شہروں مثلاً گھانا، عکرہ، رونے ہا اور نائجیریا کے شہر لاگوس کا انھوں نے دورہ کیا ہے۔

قاہرہ، بڈاپیسٹ، روم، نورمبرگ، مشرقی برلن، لندن، پیرس، لینن گراڈ، ماسکو اور تاشقند کی بھی انھوں نے سیاحت کی اور مختلف کانفرنسوں میں وہاں لوگوں کو مخاطب کیا اگرچہ مخدوم نے ہندوستانی ٹریڈ یونین کے نمائندے کی حیثیت سے یہ سفر کیا تھا۔ تاہم مختلف ممالک میں انھیں بحیثیت شاعر بھی پہچانا جاتا تھا خصوصاً تحریک آزادی کی حمایت میں لکھی ہوئی ان کی نظمیں وہاں پہلے ہی سے مقبول تھیں۔ سفر کے دوران جرمن کے مشہور ادیب لیکوماسکی نے انھیں وہ کتاب پیش کی جس میں مخدوم کی نظم "جنگ آزادی" کا جرمن ترجمہ شامل ہے یہ کتاب JAI HIND کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

مخدوم اور آچاریہ کرپلانی

۵۲ء اور ۵۵ء کے دوران جب مخدوم مشرقی یورپ کے دورے پر تھے، ان کے ایک مصور ساتھی جارج نے مخدوم کی تصویر پینٹ کی جب کچھ دنوں بعد تصویر مکمل ہو گئی تو مخدوم نے اسے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر کہا "یہ تو میری نہیں اچاریہ کرپلانی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔" لیکن جارج اس بات پر مصر رہا کہ وہ تصویر مخدوم ہی کی ہے۔

نثری اور شعری تصانیف

مخدوم کی پہلی نثری کتاب "ہوش کے ناخن" ہے جو برنارڈ شا کے ڈرامے کا ترجمہ ہے جو بیر حسن کے اشتراک سے لکھا گیا اور ۱۹۳۴ء میں ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) سے شائع ہوا۔

اس کتاب کے بعد "ٹیگور اور اس کی شاعری" ۱۹۳۵ء میں ادارۂ ادبیات اردو سے ہی شائع ہوئی مخدوم کی یہ دوسری نثری تصنیف بے حد مقبول ہوئی اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کا دوسرا ایڈیشن اقبال اکیڈیمی نے شائع کیا۔

۱۹۴۵ء میں مخدوم نے "سوویت یونین کی بالشویک پارٹی کی تاریخ" نامی کتاب کے جدلیاتی باب کا ترجمہ کیا۔ مترجمین میں احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن اور ڈاکٹر عبدالعلیم بھی شامل تھے۔ یہ ترجمہ کتاب کی صورت میں قومی دارالاشاعت بمبئی سے شائع ہوا۔

اس کے علاوہ مخدوم نے بیشتر ادبی مضامین، سفرنامے اور رپورتاژ بھی لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مخدوم کا پہلا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" ۱۹۴۴ء میں دکن بک ڈپو کی طرف سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "گل تر" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں مکتبۂ صبا کی جانب سے شائع ہوا۔

انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی جانب سے ان کی نظموں کا انتخاب ۱۹۵۲ء میں چھپا۔ اس کے اب تک متعدد اڈیشن آ چکے ہیں۔

راج پال پبلشرز دلی نے ہندی رسم الخط میں مخدوم کی نظموں کا انتخاب ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی ۱۹۵۸ء میں "حیدرآباد کے شاعر" نامی تذکرے میں ان کا کچھ کلام شامل کیا ہے اور ۱۹۶۰ء دلی ساہتیہ اکیڈیمی نے بھی اپنے شعری تذکرے میں ان کا انتخاب کلام شائع کیا ہے۔

ادارۂ مطبوعات مخزن حیدرآباد نے ۱۹۵۲ء میں مخدوم کے سو شعر" نامی کتابچہ بھی چھاپا تھا۔

ان کے اب تک کے کلام پر مشتمل ایک شعری مجموعہ "بساط رقص" کے نام سے جشن مخدوم کمیٹی نے ۱۰ اردیبہشت ۱۹۶۶ء کو پیش کیا ہے۔

مخدوم کی بعض نظموں کے ترجمے ہندی، تلگو، مراٹھی، بنگالی اور بیرونی زبانوں میں انگریزی، روسی جرمن اور چیک میں شائع ہو چکے ہیں۔

مخدوم پر تحقیقی مقالہ

۱۹۶۵ - ۱۹۶۶ء کے تعلیمی سال کے دوران جامعہ عثمانیہ کے ایم اے (فائنل) کے ایک طالب علم داؤد اشرف نے مخدوم پر اپنا تحقیقی مقالہ DISSERTATION پیش کیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے مخدوم کی زندگی شخصیت اور ان کے فن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

مخدوم نامہ

یعنی مخدوم محی الدین کی زندگی، شخصیت اور فن پر شائع شدہ اہم تذکروں، تبصروں اور مضامین کی تفصیلی کتابیات اور خود ان کی کتابوں اور مضامین کی تفصیل

کتابیں

تصنیف	مصنف یا مرتب	ناشر یا ملنے کا پتہ	سن اشاعت
شعرائے عثمانیہ (مرقع سخن)	معین الدین قریشی۔ عبدالقیوم خاں باقی	ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۹۳۹ء
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	اردو اکیڈیمی سندھ۔ کراچی	۱۹۴۲ء
ترقی پسند ادیب	عزیز احمد	مکتبہ ابراہیمیہ۔ حیدرآباد	۱۹۴۵ء
نئے پرانے چراغ	آل احمد سرور	اردو اکیڈیمی۔ سندھ۔ کراچی	۱۹۴۶ء
نئے ادب کے معمار (مخدوم)	سردار جعفری	کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی	۱۹۴۸ء
روایت اور بغاوت	احتشام حسین	ادارہ اشاعت اردو۔ حیدرآباد	۱۹۴۷ء
ترقی پسند ادب	سردار جعفری	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۲ء
نیا ادب	کشن پرشاد کول	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی	۱۹۴۹ء
انتخاب کلام (سنکلن)	پرکاش پنڈت	راج پال پبلشرز۔ دہلی	۱۹۵۸ء
تنقیدی جائزے	احتشام حسین	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد	۱۹۵۱ء
حیدرآباد کے شاعر (جلد اول)	خواجہ حمید الدین شاہد	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد	۱۹۵۸ء
تنقید اور عملی تنقید	احتشام حسین	ادارہ فروغ اردو۔ لکھنو	۱۹۵۲ء
حیدرآباد کے ادیب (جلد اول)	زینت ساجدہ	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی۔ حیدرآباد	۱۹۵۸ء
روایت کی اہمیت	عبادت بریلوی	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی	۱۹۵۶ء
روشنائی	سجاد ظہیر	آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی	۱۹۵۹ء
اردو شاعری کا انتخاب	ڈاکٹر محی الدین قادری [illegible]	ساہتیہ اکیڈیمی۔ دہلی	۱۹۶۰ء

ادبی اشارے	سلام سندیلوی	عشرت پبلشنگ ہاؤس ۔ لاہور	۱۹۶۴ء
جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو دنیا ۔ کراچی	۱۹۶۱ء
ادب اور شعور	ممتاز حسین	اردو اکیڈمی ۔ سندھ کراچی	۱۹۶۱ء
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	نسیم بک ڈپو ۔ لکھنو	۱۹۶۳ء
جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری	شیخ غلام علی اینڈ سنز ۔ لاہور	۱۹۶۲ء
ہوش کے ناخن (ڈرامہ)	مخدوم محی الدین ۔ میر حسن	ادارہ ادبیات اردو ۔ حیدرآباد	۱۹۳۴
ٹیگور اور ان کی شاعری	مخدوم محی الدین	ادارہ ادبیات اردو ۔ حیدرآباد	۱۹۳۵ء
سرخ سویرا	مخدوم محی الدین	اشاعت گھر ۔ حیدرآباد	۱۹۴۴ء
سوویت یونین کی بالشویک پارٹی کی تاریخ	مخدوم ، احتشام حسین نور الحسن ، عبدالعلیم	قومی دار الاشاعت ۔ معین روڈ بمبئی ۴	۱۹۴۵ء
مخدوم (انتخاب کلام)	مخدوم محی الدین	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۲ء
مخدوم کے سو شعر	مخدوم محی الدین	ادارۂ مطبوعات مخزن ۔ حیدرآباد	۱۹۵۲ء
گلِ تر	مخدوم محی الدین	مکتبہ صبا ۔ معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد	۱۹۶۱ء
بساطِ رقص	مخدوم محی الدین	جشنِ مخدوم کمیٹی ۔ حیدرآباد	۱۹۶۶ء

رسالے

عنوان یا مضمون	مصنف	رسالہ	سن اشاعت
ہمارے ادا کار	سید محمد یحییٰ صدیقی	مجلہ عثمانیہ ۔ حیدرآباد	۱۹۳۵ء
ٹیگور اور ان کی شاعری ۔ تبصرہ	مرزا سرفراز علی	مجلہ عثمانیہ ۔ حیدرآباد	۱۹۳۵ء
مخدوم کی شاعری	محبوب حسین جگر	ماہنامہ نگار ۔ لکھنو	۱۹۴۰ء
اردو کے نظم گو شاعر	عمر جاجر	سب رس حیدرآباد	۱۹۴۰ء
سرخ سویرا ۔ تبصرہ	ساحر لدھیانوی	ماہنامہ ادب لطیف لاہور	۱۹۴۵ء
مخدوم	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	داستان ادب ۔ حیدرآباد	۱۹۵۱ء
"سرخ سویرا" کا شاعر	یوسف امتیاز	نظام ادب ۔ حیدرآباد	۱۹۵۴ء

مخدوم، اردوس اور نئے چین میں	شیخ محمد	ماہنامہ سب رس۔ حیدرآباد	۱۹۵۴ء
اردو شاعری کے چند مسئلے	سجاد ظہیر	ہفتہ وار عوامی دور۔ دہلی	۱۹۶۳ء
مخدوم کی نظم۔ چاند تاروں کا بن	عالم خوندمیری	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۵۸ء
جدید نظم نگاری میں ہیئتی تجربے	اویس احمد دوراں	ماہنامہ شاعر۔ بمبئی	۱۹۶۳ء
مخدوم کی شاعری اور شخصیت	عالم خوندمیری	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۶۰ء
نئی شاعری اور جدید شاعری	شیخ ملک محمد	فنون۔ لاہور	۱۹۶۳ء
گُل تر کی رعنائیاں	نجمہ سمیع	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۶۴ء
اردو شاعری کے جدید میلانات	جمیل الرحمٰن زخمی	ماہنامہ شاعر۔ بمبئی	۱۹۶۴ء
مخدوم کی رومانیت	سید رشید الحسن	ماہنامہ سب رس۔ حیدرآباد	۱۹۶۵ء
گرنٹے کے مکتوبات	مخدوم محی الدین	ماہنامہ مکتبہ۔ حیدرآباد	۱۹۳۱ء
ٹیگور کی شہرت	مخدوم محی الدین	مجلہ عثمانیہ، حیدرآباد	۱۹۳۵ء
کھوئے ہوئے تارے (افسانہ)	مخدوم محی الدین	ہفتہ وار "داستان گو" حیدرآباد	۱۹۳۵ء
اردو ڈرامے کا دورِ جدید اور حیدرآباد	مخدوم محی الدین	مجلہ عثمانیہ۔ حیدرآباد	۱۹۳۷ء
پھول اور پتھر (انشائیہ)	مخدوم محی الدین	ماہنامہ سب رس۔ حیدرآباد	۱۹۳۹ء
مجاہد اقبال	مخدوم محی الدین	سب رس (اقبال نمبر) حیدرآباد	۱۹۳۹ء
اندر سبھا سے پہلے	مخدوم محی الدین	مجلہ عثمانیہ۔ حیدرآباد	۱۹۴۰ء
سبط حسن کے نام خط	مخدوم محی الدین	ماہنامہ نیا ادب۔ لکھنو	۱۹۴۱ء
ادب کا مقصد اور ترقی پسند ادب	مخدوم محی الدین	ماہنامہ سب رس۔ حیدرآباد	۱۹۴۴ء
یورپ کا لکھنو ــــ ویانا	مخدوم محی الدین	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۵۷ء
ویانا میں	مخدوم محی الدین	سیاست (روزنامہ) حیدرآباد	۱۹۵۷ء
تحفہ۔ قلم	مخدوم محی الدین	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۵۷ء
تحفہ۔ اجنبی	مخدوم محی الدین	سیاست (روزنامہ) حیدرآباد	۱۹۵۷ء
چاندنی چوک کا ایک گمنام شاعر	مخدوم محی الدین	سیاست (روزنامہ) حیدرآباد	۱۹۵۷ء
اپنا کھانا، اپنا گانا	مخدوم محی الدین	سیاست (روزنامہ) حیدرآباد	۱۹۵۷ء
راحت جاں	مخدوم محی الدین	سیاست (روزنامہ) حیدرآباد	۱۹۵۷ء
جیداد رخودکشی	مخدوم محی الدین	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۵۷ء
شاعر	مخدوم محی الدین	ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد	۱۹۵۷ء
آندھرا پردیش میں اردو (انگریزی)	مخدوم محی الدین	ہفتہ وار "السٹریٹیڈ ویکلی" بمبئی	۱۹۶۶ء

ہند
سوویت
دوستی کے
کرشموں
کے بارے میں
واقفیت کے لئے

پڑھیے
سوویت دیس
پندرہ روزہ

جو بارہ ہندوستانی زبانوں، انگریزی اور نیپالی میں شائع ہوتا ہے
شرح چندے میں خصوصی رعایت

ایک سال کیلئے	۸ روپے	انگریزی	۵ روپے — دوسری زبانوں میں
تین سال کیلئے	۲۰ روپے		۱۰ روپے

تحفہ

تمام خریداروں کو ۱۹۷۸ء کے لئے
ایک سہ رنگی کیلنڈر ملے گا۔
تین سال کے لئے خریدار بننے
والوں کو اس کے علاوہ
۱۹۷۸ء کیلئے ایک سوویت لینڈ
ڈائری تحفتاً پیش کی جائے گی۔

چندہ ہمارے با اختیار ایجنٹ کو یا
براہ راست ہمیں اس پتے پر بھیجئے:

دفتر سوویت دیس
۲۵۔ بارہ کھمبا روڈ
نئی دلی۔ ۱

سوویت دیس بذریعہ وی۔ پی بھی منگایا جا سکتا ہے

صدائے تیشہ

صدائے تیشہ

فکروفن

لکھنے والے

قاضی عبدالغفار
محبوب حسین جگر
پروفیسر عزیز احمد
سردار جعفری
پروفیسر احتشام حسین
پروفیسر عبدالقادر سروری
پروفیسر عالم خوندمیری
ڈاکٹر عبادت بریلوی
ڈاکٹر سید محمد عقیل
ڈاکٹر سلام سندیلوی
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
مصطفیٰ علی اکبر گرامی
یٰسین علی خاں
معین الدین
مجمد سمیع
داؤد اشرف
رؤف خلش
حسن فرخ

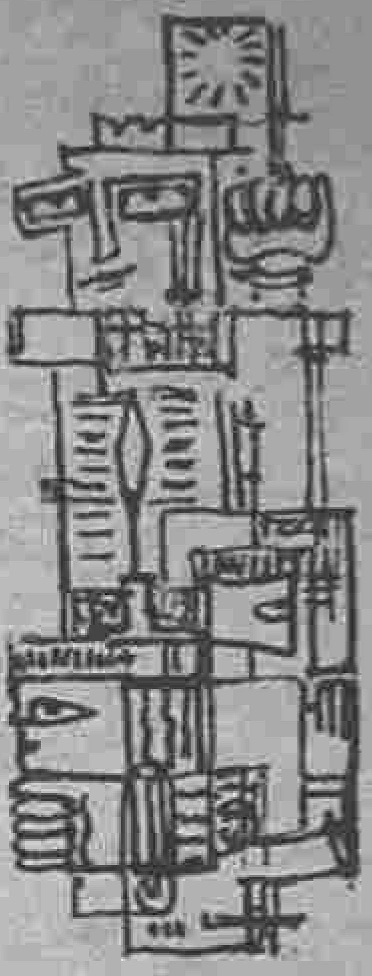

مخدوم

قاضی عبدالغفار

• مخدوم کے افکار میں نئے ادب کی روح بے چین ہے۔ قدامت کی اس تاریکی میں جو حیدرآباد پر چھائی ہوئی ہے وہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جو بہت سے بھولے بھٹکے مسافروں کو "شب تاریک و بیم موج" میں بھٹکتے ہوئے مسافروں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ حیدرآباد میں مخدوم کا وجود بجائے خود ہندوستان کی بہت بڑی برادری 'نوجوان' برادری کی علامت ہے۔ عروض و قواعد اور زبان کی شرطوں کے مطابق مخدوم کوئی بڑے شاعر نہیں۔ استادوں کی محفل میں ان کے کلام کی خامیوں پر "استادانِ فن" کی تکبر آمیز تنقید میں نے سنی ہے لیکن وہ جو ایک شاعر کی روح مخدوم کے کلام میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہے۔ وہ بے چین، مجروح، بے محابا اور بے پناہ روح، وہ ان کے ہر مصرعے کی رگ رگ میں گرم خون کی طرح دوڑ رہی ہے، اور عہد جدید کے شاعر کا یہی سب سے بلند مقام ہونا چاہیے۔

شاعر مخدوم کی صحیح تعریف ہے وہ ایک مغنی آتش نفس ہے بعض اوقات اس کا جنون ادب اور عروض کی تمام پابندیوں کو ٹھکراتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہ بے باک مغنی اپنی آواز کو سوکھے ہوئے بانس کے ٹکڑے کی قدیم موسیقی کا پابند کرنا شاید اپنے وجدان کی توہین سمجھتا ہے۔ وہ اپنی سماج کے گندے حقائق کو دیکھتا ہے اور تحقیر کے ساتھ ان کو ٹھکراتا اور اچھالتا ہوا گزر جاتا ہے۔ مخدوم جو کچھ لکھتا ہے بے اختیار ہو کر لکھتا ہے، اور جو کچھ کہتا ہے وہ اسی کے دل کی آواز ہے۔ اس کی رائے اور اس کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی شاعری سے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کوئی مصرعہ بھی "آزاد" ہے۔

مخدوم کی شاعری کا کوئی رہنما نہیں سوائے اس کے اندرونی احساس اور خارجی ماحول کے۔ البتہ اس کی شاعری کے جتنے قدرداں ہیں۔ شاید اتنے ہی نکتہ چیں بھی موجود ہیں۔ ہم مخدوم کی شاعری کے وکیل نہیں لیکن ان کے کلام میں ایک سرخ سویرے کا سچائی اور بحرانی تصور دیکھتے ہیں اور مخدوم کی شاعری کے مزاج میں ایک ایسی گرمی

محسوس کرتے ہیں جس کو صرف جدید ادب ہی پیدا کر سکتا ہے۔ جو لوگ مخدوم کی شاعری کو پڑھیں وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ مخدوم کی شاعری انسانیت کے ان پریشان افکار کی انسانی روشدہ ادب ہے جو دنیا کے موجودہ انقلابی دور میں بہت بے چین اور مضطرب ہیں۔

مخدوم کی زندگی میں وہ بھی وقت بہت جلد آگیا جب اس نے اپنے ہر ربط کے لمحہ پرور تاروں سے انگلی ہٹائی اور اسے شعر و ادب کی لذتوں سے روگرداں ہو کر زندگی کے ویرانوں میں قدم رکھنا پڑا۔ لیکن میں جو شاعری کو کسی قسم کے قافیہ اور ردیف کا پابند نہیں سمجھتا، کس طرح کہوں کہ شاعر صرف اسی وقت شاعر ہوتا ہے جب تک وہ شعر لکھا کرے۔ میرے تصور میں شعر اور شاعری کا مقام اس سے زیادہ بلند ہے۔ شاعری اگر ایک فطری رجحان ہے اور بلاشبہ ہے، اگر وہ سوچنے کا کوئی خاص ڈھنگ ہے اور اگر وہ زندگی کے مطالعہ کا ایک مخصوص زاویہ ہے تو شاعر شعر کہے بغیر یقیناً شاعر ہو سکتا ہے۔ مخدوم اس عالم میں ہے جہاں وہ چاہتا ہے کہ ؎

غلط آہنگ ساز زندگی برباد ہو جائے
جہانِ نغمہ قیدِ ساز سے آزاد ہو جائے

اس نے اپنے نغمہ کو زندگی کی بے پناہ کشاکش میں اس طرح منتقل کر دیا ہے کہ اب ہم اس کی شاعری کی روح کو کتابوں کے اوراق کی پابندیوں سے آزاد پاتے ہیں اور اس کی شاعری کے پھولوں کو اب ہم صرف زندگی کے کانٹوں کی نوک ہی پر پا سکتے ہیں۔ شاعر کے اس ارتقاء سے ہماری دنیا ابھی کس قدر نامانوس اور ناواقف ہے۔

BOMBAY WOOLLEN MILLS · PRIVATE LTD.

بومبے وولن ملز کے بنائی کے اُون ۱۹ مختلف اقسام کے
دیدہ زیب رنگوں میں ملتے ہیں
کولا چھاپ دیکھ کر ہی اون خریدیے اور یقین رکھیے کہ اس
میں کیڑا نہیں لگتا۔ یہ سکڑتا نہیں اور اس کا رنگ پکا ہوتا ہے

دی بومبے وولن ملز پرائیویٹ لمیٹڈ
۲۰ - حمام اسٹریٹ بمبئی ۱

مخدوم کی شاعری

محبوب حسین جگر

محبوب حسین جگر کے ذیل کے مضمون کو اس لحاظ سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہ مخدوم پر پہلا مضمون ہے جس میں پہلی بار مخدوم کے فکر و فن کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

یہ مضمون "نگار" لکھنؤ کے فروری ۴۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

(ادیب)

● جب کسی قوم کی حالت تباہی اور بربادی کے عبرت انگیز انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ پستی اور تنزل کے احساسات اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کو برقرار رکھنے کے لیے زمانہ کروٹیں بدلتا ہوا ایسے ایسے پیغمبرانِ سخن اٹھاتا ہے جن کا پیام احساسات کو جگاتا اور ذہنی انقلاب برپا کرتا ہے۔ ہمیشہ سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی یونہی رہے گا۔

ادب جدید کے پیغمبر میکسیم گورکی نے ادب کے دھارے کو انسان کی بے چارگی اور زندگی کی نوحہ خوانیوں سے روک کر یہ کہنے کے لیے مجبور کیا کہ:

"زندگی ابد الآباد تک رہے گی ہم اس کے کارسازِ حقیقی ہیں۔ قیامت یہی ہوگی کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کر دے۔"

گورکی سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتا ہوا ایک پیام دے گیا کہ ستم رسیدہ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کر دیا جائے اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے۔ نہ صرف ترجمانی بلکہ اپنے جہد و عمل کے لیے راہیں بھی تلاش کرے۔ اس کا یہ پیام زمانے کے معاشرتی حالات، سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ دار تھا۔ اسی لیے اس کے پیام میں زندگی ہے۔ اس کے تاثرات میں نہ صرف اس کا

92797

وطن بلکہ ساری دنیا بھی گردشیں لگا رہی ہے۔ اس پیام کو سمجھنے والوں نے تنزل و انحطاط کو فنا کی گود میں سلانے کے لیے انقلاب کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا۔ احساسات کی ان بیداریوں نے ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام کو پیدا کیا جو برائیوں کے اندھیرے، خوفناک انتشار اور آتشکدۂ استبداد کے جہنم کو سرد کرنے کے لیے آہنی عزم سے میدان میں چلے آئے قاضی کے آتشیں گیتوں نے ادب کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ ملک کے سنجیدہ ادیبوں اور شاعروں نے قاضی کے دبستاں میں اپنے لیے جگہ کرلی اور اپنی استعداد سے جدید ادب کو عمارت بنالیا۔ مخدوم بھی ان کے مقلدین میں سے ایک ہیں اور اپنے لیے ایک رفیع مقام رکھتے ہیں۔

مخدوم حیدرآباد کے باشندے اور جامعہ عثمانیہ کے ایم اے ہیں اور جدید ادب کے علمبرداروں یا ترقی پسند شعرا میں حیدرآباد کی واحد نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا جب کہ یہ بی اے میں تھے۔ کالج کی آزاد اور رنگین زندگی میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ ادیب یا شاعر جو کچھ لکھتا ہے وہ زمانے کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔ مخدوم پر بھی یہی بنی۔ مزاحیہ نظموں اور رومانی شاعری سے اس عرصہ میں مشق ہوتی رہی — "پیلا دوشالہ" مخدوم کی پہلی شاہکار طنزیہ نظم ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ ادبی لطافتوں سے مملو یہ ایک بہترین طنزیہ نظم ہے اور ادب میں اپنے لیے ایک رفیع مقام رکھتی ہے۔ اس کے بعد مخدوم رومانی شاعری کے میدان میں گھومتے رہے۔ مخدوم بہت کم کہنے والوں میں سے ایک ہے۔ اور اسی وقت کہتے ہیں جب کہ زندگی ان سے تقاضہ کرتی ہے اور حیات انھیں اکساتی ہے۔ وہ اسی وقت کہتے ہیں جب کہنے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری میں ایک خاص اثر اور خاص جوش ہے۔ ان کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے ہوتا ہے — یہیں اظہارِ حرفِ مدعا کی جرأت کرتے ہیں — سرور سرمدی سے معمور زندگی میں مئے دوآتشہ کے مزے لیتے ہوئے خلوتِ معصوم کو رشکِ خلد بناتے ہیں۔ وہ اسی پریم سنسار میں:

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں　　تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں　　مئے دوآتشہ کے مزے آتے تھے جینے میں

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

شاعر کو رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب جب آتا تو کہہ دیتے کہ

وہ کیا آنا کہ گویا دور میں جام شراب آنا
وہ کیا آنا رنگیلی راگنی، رنگیں سحاب آنا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مستِ شباب آنا

جب وہ آتا اور حیا کے بوجھ سے ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں تو فضا میں اس رنگین بدن کی لرزشیں منتشر ہو جاتیں جس سے شاعر کے رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشوں کا آغاز ہو جاتا۔ مخدوم اسی پریم سنسار میں کبھی

کبھی انتظار میں وہ گداز بھری تانیں الاپتے ہیں کہ سارا ماحول بھی انتظار میں محو ایک بے کلی سی محسوس کرتا ہے۔ جاگے ہوئے تارے بھی نیند کی مستی میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن مخدوم چشم براہ اور نقش حیرت بنے ہوئے گداز کے عالم میں کہہ دیتے ہیں کہ:-

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی — او صبا! تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب! مری نیند اڑانے والے — میرے مسجود! مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تاکہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

ان کی اس رومانی شاعری میں میں نے ایسا محسوس کیا ہے کہ ہر شخص کے دل کی دھڑکنیں پنہاں ہیں۔

کالج کی زندگی بھر یہ اسی ماحول میں رہے۔ کالج کے آخری ایام میں جب مستقبل سے قریب ہو رہے تھے اور جدید ادب انھیں متاثر کر رہا تھا۔ ان کے تصور حیات میں ایک تبدیلی پیدا ہوئی۔ انسانیت کا اندرونی اضطراب، مسلسل غلامی ذہنی بربادی، بھوک، غریبی، بے روزگاری، ظلم و استبداد زندگی کی قدامت اور بجھا ہوا پن یہ سب اپنی چتا سنانے لگے سارے ہندوستان میں ہر طرف یہی بربادیاں نظر آنے لگیں۔ مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھوک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مسان بے روایت ۔ ۔ کا غلام ہے اور جس میں صدیوں کا جذام پرورش پا رہا ہے۔ مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے، ایک خون میں لتھڑا ہوا لقمہ ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ اِل، کچھ بھی نہیں۔ ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ یہاں ایک ایسی مسلسل رات ہے جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ:-

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

وہ اس دنیا کو ڈھا دینا چاہتے ہیں، وہ یہاں کی فرسودہ زندگی کے نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔ ان کا وطن جس کی بے کاریوں سے وہ کبھی نہیں تھکے۔ وہی وطن جہاں کبھی ؎

عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی

ہاں اسی جگہ مخدوم کے دلِ زار نے یہ دیکھا کہ:-

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ وہ بدنصیب واقعہ تھا جس نے مخدوم کو للکار کر کہا کہ وہ اس نظام کی دھجیاں اڑا دے۔ اصلاح مرض کا صحیح علاج

صبا

نہیں بلکہ انقلابی درد کا صحیح درماں ہے۔

مخدوم نے محسوس کر لیا کہ ظلمتِ کفر کو ایمان ــــ سگِ خونخوار کو انسان اور دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہا جا سکتا وہ کہہ اٹھتے کہ سہ

عرشش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
موربے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

اب یہ کھیل نہیں ہو سکیں گے کیوں کہ یہ بہت کھیلے جا چکے .... ہم اب
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

مخدوم ایسے سماج کے فرد ہیں جو نزع کے عالم میں ہے جس کے مکیں، جہاجن، امیر، کاشی کے برہمن اور کعبہ کے فقیر ہیں۔ جن کے ناخن کی خلش سے اقوام عالم واقف ہیں۔ انگلی رکھنے کا کیا ذکر ــــ یہی خندہ و تبسم ہیں ان کی حویلیاں سہ

رہزنوں کا قصرِ شورہ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھلکھلاتے ہیں جرائم، جگمگاتے ہیں گناہ

انہیں حویلیوں میں روز و شب انسانیت کا نیلام ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اور بے نان و بے پوشش گداؤں کا ایسا گروہ نظر میں آتا ہے سہ

جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

ان کی خانماں برباد اور المناک زندگی سے شاعر کو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ ان کے سہ

کوڑ معد کے دہکتے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اس بربادی پر وہ کڑھ کر نہیں رہ جاتے۔ وہ انقلابی ہیں۔ وہ ایمان کے قائل نہیں۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ نوعِ انسان کے ہر مسئلہ کو تاریخ نے استبداد سے ٹکرایا ہے اس لیے ان کی حیات کا مدعا یہ ہے کہ سہ

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں

وہ کاسۂ دہر کو معمور کرم کر کے اور قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر کر ختم ہونا نہیں چاہتے وہ رجائی ہیں۔ تباہیوں اور بربادیوں میں بھی مسکراتے ہیں۔ ثبات قدمی سے دلیرانہ میدان میں آ کر اپنا مدعا سناتے ہیں کہ سہ

دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا

وہ اس نئی دنیا اور نئے آدم کے لیے اور ان کلنڈروں پر آزادی کے پرچم کھولنے کے لیے علمبرداران آزادی یعنی ہندی نوجوانوں سے عقیدت رکھتے ہیں۔ جو کہ ان کی نظر اور ذوق یقیں سے زنداں کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ ان کا نوجوان آندھیوں میں پلا اور طوفانوں میں پروان چڑھا۔ وہ مرد مجاہد ہے۔ اس کی ٹھوکر سے گیتی لرزہ براندام ہوتی ہے۔ ان کا نوجوان ان سارے فرسودہ نظام کی دھجیاں اڑا دے گا اور ناپاکیوں کا جنازہ نکال دے گا۔

مخدوم نشأۂ ثانیہ کے لیے سرمایہ داری کو اُمّ الخبائث اور گرسنگی کو ایک بدترین لعنت سمجھتے ہیں۔ وہ غداران وطن اور ان کی نعشوں کے جہنم کو سرد کرنے کے لیے قیامت کا جوش لیے ہوئے آتے ہیں۔

خدا نے فرشتوں کے نام کہیں فرمان دیا ہے کہ:-

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!!

داور محشر اس کھیت کے خوشۂ گندم ہی کو جلائے گا۔ حکم کیوں دیتا ہے کہ کھیت کے اس مالک کو فنا کر دیا جائے جس نے دہقاں کو روزی میسّر ہونے نہیں دی۔ شاید وہ اپنی شیریں سخنی سے ایک دور دراز عرصہ تک ہمیں فریب دیتا رہے گا۔ لیکن اب ہمارا فریب کھانا مشکل ہے۔ دنیا کی عمر کافی دراز ہو چکی۔ ہمارے تجربے پختہ ہو چکے اور سچ پوچھیے تو اب جبر و استبداد کی انتہا ہو چکی۔ اب یہ وعدے اور سارے فرمان طاق نسیاں ہو جائیں گے۔ اب وہیں جہاں:-

قصرِ شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لیے

وہیں — اس دنیا میں احساسات کی بیداریاں جدوجہدِ عمل کے لیے آئیں گی اور کہیں گی کہ:-

پھونک دو قصر کو گر کوئی کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

اب نہ بانس رہے گا کہ بنسیا بجے گی — استبداد کا وہ دیوتا خوشۂ گندم کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نئی دنیا اور نئے آدم پیدا ہوں گے جو دنیا کو حیات افروز حالت میں رکھیں گے۔

مخدوم اس بربادی اور فنائیت میں اس نظام کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں زلزلوں، آندھیوں گرجدار کڑکوں اور جہنم کی ہواؤں کے شور محشر سے مدد لے کر سرمایہ اور استبداد کے ناپاک جنازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ پھر کبھی نہ ابھر سکے۔ ان کا انقلاب ایک قیامت صغرا کا نمونہ ہوگا۔ جس کا نتیجہ کائنات کے لیے ایک متوازن نظام ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے میں ذرا بھر بھی نہیں ڈرتا کہ مخدوم اپنے THEME (مرکزی تخیل) کے جوش اور اثر کی وجہ سے

اپنے ہم عصروں سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ایسے شعور مجسم ہیں جن میں اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ زندگی کی آگ میں تپتے ہیں۔ وہ ساحل پر ٹھہر کر دریا کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگاتے بلکہ تہہ کی ساری ترکیبوں سے بطورِ خود واقف ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں بلا کا جوش ہے۔ مخدوم کے راسخ عقیدے، اور اعجاز بیانی نے قوم کے جذبۂ عمل کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کے پیام میں عظمت ہے، چونکہ وہ زندگی کے عمیق مسائل بیان کرتے ہیں تخیلات کے اسی اعجاز میں انسانیت اپنے لیے راہِ عمل ڈھونڈ لیتی ہے۔

مخدوم نے کہنے کی باتیں صاف صاف کہی ہیں۔ ان کے پاس ادب اور زندگی دونوں میں ہم آہنگی ہے وہ ابھی نوخیز ہیں۔ ان کی اس انقلابی شاعری کو جنم لیے ہوئے تین چار سال ہوئے ہوں گے۔ مخدوم کے پاس ان ہیجانی و انقلابی احساسات کے باوجود فن کارانہ ضبط ہے جو ان کی کامیابی کا ایک بڑا سبب ہے اسی وجہ سے ان کا کلام اوروں کے لیے اثر پذیر ہوا ہے۔ وہ انقلاب کے بہت بڑے نقیب ہیں۔ مخدوم کی پختہ مشقی انھیں بہت بلند بنا دے گی ——— وہ دن دور نہیں جب کہ مخدوم اپنے اس پیام میں اس مہم میں رہبری کے لیے سب سے ممتاز رہیں گے۔

دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ

ہندوستان کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری

اعلیٰ قسم کی سفید شکر اور ینفا براانڈ کنفکشنری کی تیار کنندہ
خالص اور لذیذ سوئیٹس اور ٹافیاں نہایت ترقی یافتہ فیکٹری کے
ذریعہ صاف ستھرے طریقے پر تیار کی جاتی ہیں

ہیڈ آفس
فتح میدان روڈ۔ پی بی نمبر ۱ خیریت آباد
حیدرآباد۔ اے۔ پی

کنفکشنری
اعظم آباد۔ حیدرآباد (اے۔ پی)
فون ۳۴۴۰۱

فیکٹری
شکر نگر سنٹرل ریلوے
آندھرا پردیش

کیبلس اور گرامس، "SUGAR"
فون:- ۳۳۱۷۷، ۳۴۰۵۹، ۳۳۴۸۶، ۳۳۴۸۵

JAMIA LIBRARY

MALIKRAM COLLECTION

مخدوم محی الدین

عزیز احمد

● مخدوم محی الدین کی شاعری، تمام انقلابی شاعری کے مقابل اپنے خلوص، جوش، کردار اور انقلابی جذبے کی وجہ سے ممتاز ہے، خالص شاعری کی حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کلام نہیں ہوسکتا اور یہ زبان محاورے اور اوزان کی بے شمار غلطیوں کے باوجود نظمیں تھوڑی ہی ہیں لیکن وہ عشقیہ ہوں یا انقلابی، ایک آتش فشاں اندرونی حرارت ایک سچے مخلص جذبہ ان کا محرک ہے۔

مخدوم کے کلام کا مجموعہ "سرخ سویرا" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان کی ایک ابتدائی عشقیہ نظم "طور" سے معلوم ہوتا ہے: "طور" مخدوم کے لیے مجازی محبت کا ایک رمز ہے۔ یہ اس کا انتہائی نقطہ یا مقام یا کیفیت ہے جس کے اظہار کے لیے انھوں نے عشق حقیقی سے ایک تلمیح مستعار لی ہے۔ مخدوم کا عشق جسمانی آرزوؤں کا عشق ہے اس میں انفرادیت ہے اور ان دونوں حیثیتوں سے وہ حسرت موہانی سے متاثر ہے۔ اس عشق کی واردات کے بیان میں ایک ناقابل انکار واقعیت ہے۔ "سجدہ" "انتظار" "وہ" اور ایسی کئی نظموں کی جان یہی واقعیت ہے، ان نظموں کو پڑھ کر یقین آجاتا ہے کہ اس شخص نے سچ مچ محبت کی ہے۔ "لمحہ رخصت" اور "نامہ حبیب" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ کی نفسیات کو اپنی داخلیت کی روشنی میں دیکھ کر اس میں جوش و حرارت الھڑپن اور جدت پیدا کردی ہے۔

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا باہوں میں
وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زلیخائی
انداز تغافل تیور سے رسوائی کا سا ماں آنکھوں میں
(لمحۂ رخصت)

اور "نامہ حبیب" میں آوارہ ہواؤں کی زبانی عاشق کی شکایتوں پر محبوبہ کا جواب ہے

سنا ہے ضبط کو تم دل کی سنگینی سمجھتے ہو
ادائے خوف رسوائی کو خودبینی سمجھتے ہو

لیکن محبت "کبھی گلی کی بے زبانی" پر غالب آجائے گی۔

جنوں پرور اداؤں کے سنورنے کے ارادے ہیں
خدا کے عرشِ الفت سے اترنے کے ارادے ہیں
زمین و آسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں

آخری شعر سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ عشق میں بھی ایک انقلابی کیفیت بڑھتی جاتی ہے ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب شاعر کسی کی بھی اپنے معشوق کی بھی غلامی نہیں کرسکتا ؎

آہ پہلے نارسا تھی اب کہیں رکتی نہیں — اب کسی کے آستانے پر جبیں جھکتی نہیں

اس کے بعد ایک مقام ایسا آتا ہے کہ انقلاب اور عشق ایک ہو جاتے ہیں۔ انقلابی خیالات کی رفتار شروع میں تو زیادہ تیز نہیں یعنی "باغی" اور "جنگ" میں لیکن "مشرق" میں اپنے ماحول سے بیزاری مخدوم کی انقلابی حرارت میں جوالامکھی کا ساز اور اشتعال پیدا کر دیتی ہے، وہ مشرق جس کو ڈا: اقبال نے آسمان سے جا ملایا ہے اس کی اصلیت اس نئے شاعر کے نزدیک یہ ہے ؎

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام — پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں — خوابِ اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

اجتماعی زندگی کی طرح خانگی زندگی میں بھی شاعر کو ہر طرف موت کے سڑتے ہوئے آثار نظر آتے ہیں ؎

گھر کے ہر ذرے سے ناسور کی بو آتی ہے — قبر کی عود کی، کافور کی بو آتی ہے

اس اشتعال کا پہلا مقصد تخریب ہے "اول آں بنیاد را ویراں کنند" جوالامکھی کا پہلا کام اس پرانے نظام کو جلا کے خاک کرنا ہے ؎

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں — ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں — (موت کا گیت)

نہیں صرف نظام نہیں بلکہ پوری کائنات تباہ کر دیئے جانے کی مستحق ہے کیوں کہ اس نے ایسا وحشیانہ نظام پیدا کیا ہے ؎

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی — (موت کا گیت)

لیکن "مشرق" اور "موت کا گیت" دونوں تخریبی نظموں کا خاتمہ ایک نئی انسان پرست اور عدل پرست دنیا کی بنیاد کے تصور پر ہوتا ہے۔ بہت جلد نئی دنیا کی تعمیر کے اہم فرائض کا احساس شاعر کے جوشِ تخریب کو ایک تعمیری راستہ دکھاتا ہے۔ "جہانِ نو" اور اس کے بعد کی نظموں کی روحِ عمل تعمیری ہے۔

جب ایک بار مخدوم نے محسوس کر لیا کہ شاعری کا بہت بڑا فرض مزدوروں کے بڑے بڑے جتھوں کو جگانا ہے تو ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض ذہنی گورکھ دھندوں کی انقلابی شاعری، ترقی پسند بورژوا حلقوں میں تو مقبول

ہوسکتی ہے لیکن اپنا اصلی فرض انجام نہیں دے سکتی۔ انگلستان کے بعض ترقی پسند شاعروں نے بھی اس طرح کی نظموں کی ضرورت محسوس کی تھی جو کم علم مزدوروں میں مقبول ہوسکیں۔ ۱۹۳۶ء میں برٹگوم یہ اڈون نے مجھے سترھویں صدی کے گیتوں کا مجموعہ دکھلایا اور کہا تھا :

"اب میں اس قسم کی شاعری کا زیادہ تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، اس کے بغیر وہ عوام کے کام کی نہیں ۔"

مخدوم محی الدین نے انقلابی گیت کی اہمیت کو بہت جلد معلوم کر لیا۔ "مسافر" "سپاہی"، "جنگ آزادی" اور "بنگال" ان کے اچھے خاصے کامیاب گیت ہیں۔ "سپاہی" میں بلند تر ذہنی شاعری کا پیرایۂ اظہار ایسے سیدھے سادے الفاظ میں کہ عالم کی طرح ان پڑھ سپاہی بھی محسوس کرتا ہے کہ ساری کائنات اس لڑائی کو خوف سے دیکھتی ہے جو غلامی کے لیے لڑی جائے لیکن اس لڑائی سے ہمدردی رکھتی ہے جو مساوات اور آزادی کے لیے ہو ؎

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
جانے والے سپاہی سے پوچھو ۔ وہ کہاں جا رہا ہے

لیکن جو لڑائی مساوات اور آزادی کے لیے ہو، اس سے کائنات ہمدردی رکھتی ہے ؎

گر رہا ہے سپاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
اے وطن چھوڑ کے جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا!

"جنگ آزادی" مخدوم کا سب سے جوشیلا گیت ہے جس کا کورس یہ ہے ؎

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی!   آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند میں رہنے والوں کی   محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی   دہقانوں کی مزدوروں کی

لیکن اس جنگ کی بنیاد قوم پرستی نہیں بین الاقوامیت ہے ؎

سارا سنسار ہمارا ہے   پورب، پچھم، اُتر، دکھن
ہم افرنگی، ہم امریکی   ہم چینی جاں بازانِ وطن

صبا

ہم سرخ سپاہی ظلم شکن ... آہن پیکر فولاد بدن

اسی طرح بنگال کا کورس ایک ایسے ہندوستانی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے جس میں تمام سیاسی جماعتوں کو بجائے ایک دوسرے کی مخالفت کے ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اس کے لیے بڑی بے تعصبی، وسیع نظری اور بے لوث ہمدردی کی ضرورت ہے۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بحر پورا دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو، لیگ کو بیدار کر سکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم

گیت کے کورس میں اس خیال کی بڑی اہمیت ہے، کیوں کہ یہ اس طرح عوام کے دل تک پہنچ سکتا ہے
مخدوم محی الدین کے یہاں ایک طرح کی طنز نگاری بھی ہے ۔

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہ کار کس مشکل میں ہے
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں اطلس دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

مخدوم محی الدین کے انقلابی محاکات اور تشبیہات میں ایک ایسی پر جوش ندرت ہے جو مشرقی اور مغربی تشبیہوں کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔ تشبیہیں کبھی کبھی ایک آدھ شعر میں وہ سب کہہ جاتی ہیں جس کی تشریح میں صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں ۔

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھو
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھو

دہشت کی تصویر کھینچنے میں شاعر کو کمال حاصل ہے ۔

ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو

اور ۔
جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پامال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال

کبھی کبھی ان کی تشبیہیں انوکھی، مگر اپنی اندرونی حقیقت کی وجہ سے بڑی سچی ہوتی ہیں ۔

خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

اکثر استعارے ایسے ہیں کہ پوری کائنات ان کا پس منظر بن جاتی ہے اور اس پس منظر سے پسماندہ انسانوں کا درد اور زیادہ نمایاں ہوتا ہے ۔

فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے جزیروں میں
زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر

"روحِ فغفور" کی یہ غیر مرئی تصویر ملاحظہ ہو ۔

دخترِ خواجگی، روحِ غارت گری
موت کی ہمسفر مرگھٹوں کی پری

بعض اوقات ان تشبیہوں کے پیچھے علمی دُنیا کا پس منظر ہوتا ہے۔ مثلاً یہ شعر جس میں آزادیٔ گفتار کے فقدان کی مثال دی گئی ہے۔ عبرانی اور یونانی علم الاصنام کی یاد دلاتا ہے اور تصویر کیسی دلفریب ہے ؂

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے

یہی انقلابی استعارے اور تشبیہیں مخدوم محی الدین کی انقلابی رمزیت کا راستہ کھولتی ہیں۔ "اندھیرا" اس کی بڑی اچھی مثال ہے۔ یہ اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے۔ جہاں ہر چیز مانگی ہوئی ہے۔ اصلی مالک سے حاصل کی ہوئی ؂

رات کے ہاتھوں میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں، مانگے کے اُجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی اُن کا کفن!

اس کے بعد اس تمدن کے پیدا کیے ہوئے جنگ کی تصویریں ہیں اور ایک تصویر بہت نئی اور دہشت ناک ہے ؂

لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں

یہاں تک کہ معاشی نظام کائنات بن کر بھی ماتم کرنے لگتا ہے ؂

چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

"انقلاب" میرے خیال میں مخدوم کی کامیاب ترین اور سب سے زیادہ موثر نظم ہے۔ اس نظم میں انقلاب اور عشق ایک ہو جاتے ہیں۔ سرراہ لوگ انقلاب کے رقیب اول کا اس طرح انتظار کر رہے ہیں گویا وہ کوئی معشوق ہے۔ اس کی آمد کا انتظار عشقیہ انتظار ہے۔ عشق، حسن، نغمے اور روحانی زندگی کے تمام پرانے معیار اس کی سواری کے گزرتے ہی خاک بسر ہو جائیں گے ؂

اے جانِ نغمہ! جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے؟

سب

اس انتظار میں حسن پر مردنی سی چھا گئی ہے۔ جمادات اور نباتات، ذرے اور پھول ساری کائنات مغموم ہے ؎

نہ تابناکیِ رخ ہے، نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں، کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن، ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے؟

"ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم" اس مصرعے میں وہ درد و سوز ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کسی غزل میں یہ مصرعہ شاید کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن شاعر نے اُسے عشقیہ موضوع سے اٹھا کر انقلابی موضوع میں کچھ اس خوبی سے رکھ دیا ہے کہ اس کا گداز دہ چند ہو گیا ہے۔

(ترقی پسند ادب۔ مارچ ۱۹۴۵ء)

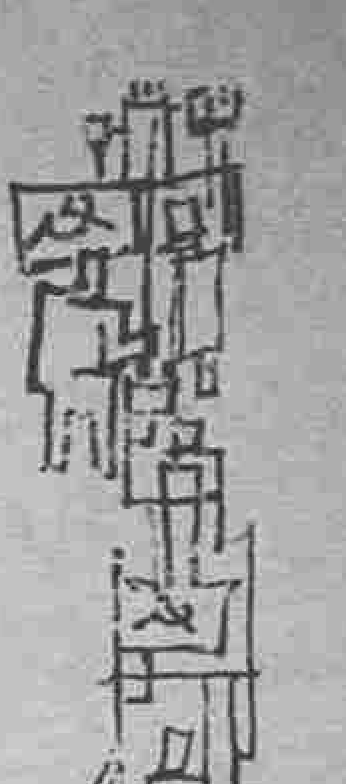

مخدوم

سُرخ سویرے کا شاعر

سردار جعفری

● رات ایک دوست کے گھر دعوت تھی جس میں تین سیلونی، ایک پنجابی، چار گجراتی، ایک بنگالی اور پانچ ہندوستانی شریک تھے۔ اس چھوٹی سی ٹولی میں کئی زبانوں کے ادیب اور فنکار تھے جن میں لنکا کا سب سے بڑا مصور بھی شامل تھا۔ اس کی بنائی ہوئی چند تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔

کھانے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے بنگالی مہمان سے گانا سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے ٹیگور کے کئی گیت اور نظمیں سنائیں۔ پھر خود ہی یہ تجویز پیش کی کہ کوئی ایسی چیز گائی جائے جس میں سب شریک ہو سکیں۔ پہلے ٹیگور کا "جن گن من" شروع ہوا۔ ایک ہندوستانی اور ایک سیلونی خاتون نے اپنی آواز گانے والے کے ساتھ ملا دی۔ کچھ اور لوگ زیرِ لب گنگناتے رہے۔ بنگالی مہمان نے کہا "اچھا اب ہم اقبال کا ترانۂ ہندی گائیں گے۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اب گانے والا تنہا تھا۔ اس کی آواز کمرے میں اکیلی پھڑپھڑا رہی تھی۔ دو تین شعروں کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ پھر یکایک جیسے سوکھی ہوئی ڈالی سے ہری کونپل پھوٹ نکلے اس نے مخدوم کا گیت "جنگِ آزادی" چھیڑ دیا۔ کئی آوازیں اور بلند ہوئیں اور دھیمی پڑ گئیں گیت کئی بار شروع ہوا اور کئی بار بیچ سے ٹوٹ گیا آخر کئی کوششوں کے بعد سب ایک ساتھ گانے لگے۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

صب

سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ دیوار پر لگی ہوئی لنکا کی ساکت و جامد تصویروں کے رنگین ہونٹوں میں بھی جان سی پڑ گئی اور وہ بھی گانے لگیں۔ کھڑکی کے باہر ساحل سے ٹکراتی ہوئی سمندر کی موجوں نے تھوڑی دیر تال دی پھر اس گیت کے مترنم الفاظ کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر ہندوستان کی آواز کو پھیلانے چلی گئیں ؎

سارا سنسار ہمارا ہے　　　پورب پچھم اتر دکن
ہم افرنگی ہم امریکی　　　ہم چینی جانبازِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن　　　آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سمندر کی موجوں کے ہر تھپیڑے میں یہ مصرعے گونج رہے تھے۔

آج سے تین برس پہلے جب مخدوم نے یہ نظم رسالہ نیا ادب کے لیے بھیجی تھی تو لکھا تھا کہ "وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب یہ نظم سارے ہندوستان کی زبان پر ہوگی"۔ اس کے ایک سال بعد سبطِ حسن نے مخدوم کو ایک خط میں لکھا تھا:

"تمھیں معلوم ہے کہ وہ کون سی نظم ہے جس نے تمھیں ہندوستان کے عوام کا محبوب اور مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نظم کا لکھنے والا کون ہے لیکن جلسوں کی جو روئداد ہمارے اخبار میں شائع ہونے کے لیے یہاں آتی ہے اس میں اکثر لکھا ہوتا ہے کہ جلسے کی کارروائی "جنگِ آزادی" سے شروع ہوئی جسے پانچ لڑکوں کے ایک جتھے نے یا دس لڑکیوں کی ایک ٹولی نے مل کر گایا۔ شاید نامہ نگار کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔ قبولِ عام کی یہ سند ہزاروں ادبی تنقیدوں پر بھاری ہے۔ میں نے خود ایسے کئی جلسوں میں شرکت کی ہے اور میں نے دیکھا ہے جب گانے والوں کی ٹولی اس بند پر پہنچی ہے کہ ؎

لو سرخ سویرا آتا ہے　　　آزادی کا آزادی کا

تو اکثر ایسا ہوا ہے کہ جلسے کے مختلف گوشوں سے یہی مصرعے دہرائے گئے ہیں اور سننے والے خود سنانے والوں میں بدل گئے ہیں"۔

(سبطِ حسن کے اس بیان پر ہندوستان کا ہر گوشہ شہادت دے گا۔ حیدرآباد کے اس گرلز کالج کا ذکر تو بیکار ہے جس میں لڑکیوں نے ایک مستقل مخدوم کا رنر بنا لیا ہے۔ جہاں ہفتے میں ایک بار سب لڑکیاں جمع ہوکر "جنگِ آزادی" ہی نہیں گاتی ہیں بلکہ مخدوم کی دوسری نظموں کی بھی تلاوت کرتی ہیں۔ حیدرآباد میں تو خیر مخدوم کی پرستش ہوتی ہے اس کی زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وہاں کے باشندوں کے دلوں پر نقش ہو گیا ہے لیکن میں بنگال میں چٹ گاؤں میں کرنال کے قصبوں میں، یوپی کے دیہات میں، بمبئی کے مزدور علاقے میں ہر طرح کے آدمیوں کو "جنگِ آزادی"

گاتے سنا ہے۔

شروع شروع میں مخدوم کا ترانہ سن کر بہت سے جنسی اور نفسیاتی امراض کے شکار اعصابی ادیبوں اور شاعروں نے کہا تھا کہ "یہ پروپگنڈا ہے، اس کا موضوع ابدی نہیں ہے جنگ ختم ہونے کے بعد کسی کو اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں رہے گا"۔ یورپ کی ہیبت ناک جنگ ختم ہو گئی لیکن ہماری جنگ آزادی جاری ہے بلکہ اور زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ مخدوم کی نظم آج بھی ہندوستان کی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ اس میں انقلاب فرانس کے مشہور ترانے "لا مارسیز" کی سی شدت اور بین الاقوامی مزدور تحریک کے گیت "انٹرنیشنل" کا سا جوش و خروش اور اٹھان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو صرف ہندوستان کی تحریک آزادی نے نہیں بلکہ ساری دنیا کی جنگ آزادی نے متاثر کیا ہے۔ پھر بھی اس میں ہندوستان کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہے۔

میں مخدوم سے پہلی بار ۱۹۴۲ء میں ملا تھا۔ نیا ادب کی ادارت کے سلسلے میں مخدوم سے خط و کتابت ضرور ہوئی تھی لیکن صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں لکھنؤ میں تھا اور مخدوم حیدرآباد میں۔ سبطے اکثر مخدوم کا ذکر بڑے پیار سے کیا کرتا تھا۔

"یار بڑا اچھا دوست ہے وہ"

اس سے زیادہ مجھے مخدوم کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ریڈیو کے مشاعرے کے سلسلے میں مخدوم لکھنؤ آنے والا ہے۔ میں نے اور سبطے نے مل کر بہت سے منصوبے باندھے۔ شامیں کہاں گزاریں گے، راتوں کو کیا کیا دھومیں مچائیں گے۔

میں دو تین دن بعد جنگ دشمن پروپگنڈے کے سلسلے میں گرفتار کر لیا گیا۔

میں بنارس سنٹرل جیل میں پڑا ہوا ریڈیو کے مشاعرے کی رات کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اور جب وہ رات آئی تو میری بے تابی اور زیادہ بڑھ گئی۔ میں بارک کے صحن میں کئی گھنٹے ٹہلتا رہا۔ لیکن ریڈیو کی آواز کہیں سے نہیں آئی۔ صرف ایک کربیہ صدا تھی جو ساری رات جیل کی دیواروں سے ٹکراتی رہی۔

صبح میں نہا دھو کر ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا جیل کے پھاٹک پر آیا تو سینکڑوں ملاقاتیوں کے اجنبی ہجوم میں صرف مجاز کی پہچانی ہوئی شکل نظر آئی۔ سبطے کا حسب معمول کہیں پتہ نہیں تھا۔ میں کچھ افسردہ سا ہو گیا مگر مجاز کی موجودگی باعث تسکین تھی۔ میں اس طرف بڑھا اور اس سے لپٹ گیا۔ مجاز کے برابر کھڑا ہوا ایک دبلا پتلا سیاہ رنگ کا نوجوان مسکرا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے چپکے سے میرے دل میں کہا کہ یہ مخدوم ہے اور میں مجاز کو چھوڑ کر مخدوم سے لپٹ گیا۔

مخدوم بولا کہ "مجاز نے مجھے دھوکا دینے کے لیے ایک سفید پوش قیدی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ دیکھو وہ آ رہا ہے سردار لیکن میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ سردار ایسا نہیں ہو سکتا"۔

مخدوم کی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں مسلسل مسکراتی رہیں۔ اس کی نظروں میں عقاب کی آنکھوں کی تیزی تھی۔ آبنوسی چہرہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے تراش دیا ہو۔ اس کے پورے چہرے پر سنگ تراش کی چھینی کے نشانات تھے رخساروں کی ہڈیوں کا ہلکا سا ابھار، بلند پیشانی زوردار ٹھوڑی اور بھنچے ہوئے ہونٹ ایک سخت گیر اور سخت اصولی آدمی کی شخصیت ظاہر کر رہے تھے۔ اس کی آواز میں عزم اور رعب و استادی تھی۔ صرف دو چیزیں مخدوم کی شخصیت میں لچک اور لطافت پیدا کر رہی تھیں ایک اس کا تبسم جس سے بھنچے ہوئے ہونٹوں ہی پر نہیں بلکہ سخت لیکن چمکدار دانتوں پر بھی نرمی دوڑ جاتی تھی اور دوسری اس کی تیز نظروں میں گھلی ہوئی محبت معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں کے گلابی ڈوروں سے ٹپک پڑے گی اور اس کی سرمئی رنگ کی شیروانی کو بھگو دے گی۔

جب مجاز باتیں کرتا اور مخدوم چپ بیٹھتا تو وہ پتھر کا خوبصورت بت معلوم ہونے لگتا تھا جسے کسی سنگ تراش نے دکن کی نیلی پہاڑیوں سے کاٹ کے بنایا ہو۔ لیکن جیسے ہی اس کے ہونٹ بات کرنے کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہوتے اور اس کی زبان کھلتی۔ ویسے ہی اس کی ساری ہستی اپنا چولا بدل لیتی تھی اور اس کے گہرے خط و خال سے معصومیت ٹپکنے لگتی تھی۔

وہ اپنی ساری شخصیت کو سمیٹے ہوئے بیٹھا تھا۔ پھر بھی بار بار اس کا لاابالی پن ظاہر ہو جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی شیروانی کے بٹن ہی نہیں بلکہ کالر کے ہک بھی بند تھے۔ شاید اس کے پیچھے کو الٹے ہوئے مہین نرم لیکن لمبے لمبے بال اس کی چغلی کھا رہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھ کو مخدوم سے بے تکلف ہوتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ میں نے کہا تم پر عثمانیہ یونیورسٹی کی پوری چھاپ ہے اور رگوں میں کہیں سے حبشی خون آ گیا ہے۔"

مخدوم نے ہنس کر جواب دیا کہ "میرے جدِ امجد بلالِ حبشی رسول اللہؐ کے صحابی تھے۔"

سال بھر بعد مخدوم سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ نومبر ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن نے "نو وارد شعراء" کا تعارف کرانے کے لیے ایک مشاعرہ کیا۔ مخدوم بھی حیدرآباد سے آیا تھا اور ایک ہفتے تک لکھنؤ میں ٹھہرا رہا۔ مشاعرے کی شام ہم نے "قبلۂ رندانِ جہاں" (جوش) کے ساتھ گزاری، اور رات سڑکوں اور اپنے گھر پر۔ اس رات بڑی ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم لوگ سڑکوں پر گھومتے رہے۔ کہیں کہیں دم لینے کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ دریا کے کنارے پلیا پر مجاز نے اپنی نظم "آوارہ" سنائی۔ "اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں" اس وقت یہ سوال ہم سب کے سامنے تھا۔ ہم زندگی کے نئے راستے ڈھونڈ رہے تھے۔ نظم ختم ہونے کے بعد دریا کے دوسرے کنارے سے داد ملی۔ ہماری ہی طرح کا کوئی اور آوارہ گرد دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔

نصف شب کے قریب ہم گھر واپس آئے۔ مکان کے سامنے کھڑا ہوا اُجڑا سا املی کا درخت دیو کی طرح جھوم رہا تھا۔ مخدوم نے اس پرانے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کہا: "مجھے طوفان بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

ہم لوگ کمرے کا دروازہ بند کر کے زمین پر فرش بچھا کر بیٹھ گئے۔ دیوار سے لگی ہوئی میز کے نیچے ایک اوندھی ہوئی بالٹی کے پیندے پر تین موٹی موٹی موم بتیاں جل رہی تھیں جن کی وجہ سے میز کا سایہ ترچھا ہو کر دیوار پر بلند ہو گیا تھا۔ اور اسپین کی مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر کو چھونا چاہتا تھا جس کی دونوں مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں سینہ ابھرا ہوا تھا، آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور جوش میں اینٹھے ہوئے ہونٹ کہہ رہے تھے "موت کی طرف ملو"۔

یہ تصویر ہماری اس وقت کی جذباتی کیفیات کی ترجمان تھی، ہمارا پورا "نیا ادب گروپ" اسپین کی خانہ جنگی سے بہت متاثر تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں اسپین کے شاعر لورکا کی کچھ نظمیں اور نوجوان انگریزی ادیب کاڈویل رالف فاکس اور جان کرافورڈ کے حالات پڑھے تھے اور ہمارے دل میں بھی یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔ اس خیال میں رومانیت زیادہ تھی۔ جان دینے کے مواقع تو ملے نہیں اور اگر کہیں تھے تو ہم ان تک پہنچ نہیں سکے اس لیے ہم اپنے پچھلے درمیانی طبقے کی تمام قدروں کو پیروں تلے روند کر انتقام لے رہے تھے ہم سمجھتے تھے کہ یہی سچی ترقی پسندی ہے اور یہی ہمارے لاابالی پن کا راز تھا۔

باہر ہوا کے سائیں سائیں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی دروازے کھڑکھڑا اٹھتے تھے اور کسی دروازے سے گزر کر ٹھنڈی ہوا تیر کی طرح آ کر لگتی تھی اور ہم اپنے کمبلوں میں سمٹ جاتے تھے۔ کمرے میں ایک ہنگامہ تھا۔ جذبی اپنی نظم "موت" سنا چکا تھا اور اب ناچ ناچ کر فیض کی نظم "موضوعِ سخن" گا رہا تھا۔

آج پھر حسنِ دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھوں پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

فیض کو اپنی نظم کی اس سے بہتر داد کبھی نہیں ملی تھی۔ فیض کا اداس چہرہ اور کھوئی ہوئی آنکھیں خوشی اور محبت سے چمک رہی تھیں۔ جذبی گاتے گاتے نڈھال ہو گیا۔ مگر محفل اب بھی گرم تھی۔

مجاز چپکے سے کوئی فقرہ کہہ کر زیرِ لب مسکراتا تھا اور سبطے بار بار ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔ مخدوم کے ہاتھوں میں دیوانِ حافظ کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی میٹھی آواز میں لہک لہک کر پڑھ رہا تھا ؎

شاہ شمشاد قداں خسروِ شیریں دہناں کہ بہ مژگاں شکند قلبِ ہمہ صف شکناں
بر جاں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خور و نازک بدناں

رات ڈھلنے لگی تھی۔ پچھلا پہر آگیا تھا۔ موم بتیاں پگھل پگھل کر موٹے موٹے ادھنّوں کے برابر ہوگئیں۔ اسپین کی مجاہد خاتون کی تصویر پر موم بتیوں کی جھلملاتی ہوئی روشنی تھرتھرانے لگی۔ کچھ لوگ سو گئے، کچھ اونگھنے لگے

اس وقت مخدوم کے چہرے پر بلا کی اداسی تھی۔ وہ کچھ کھوسا گیا تھا۔ میں سمجھا کہ مخدوم بھی سونے والا ہے لیکن وہ جاگتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ دیوان حافظ اب بھی اس کے سامنے کھلا پڑا تھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں آنکھوں سے اس کے دل کے اندر اتر گئی تھیں اور اس کے چہرے پر عجیب قسم کا درد و کرب چھوڑ گئی تھیں۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے مخدوم"

اس نے میری طرف دیکھا، کوئی جواب نہیں دیا اور بڑی دیر بعد جب لوگ سو رہے تھے، جب موم بتیاں بجھ چکی تھیں، جب کھڑکی میں سے صبح کا ہلکا نور اندر داخل ہو رہا تھا اور ہسپانوی خاتون کے اینٹھے ہوئے ہونٹوں پر بکھر رہا تھا تو مخدوم نے اپنا ایک شعر گنگنایا ؎

خلوت رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

وہ مخدوم کے لاابالی پن کی آخری رات تھی۔ آج کا مخدوم مشاعرے والی رات کا مخدوم نہیں ہے۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر اور حیدرآباد کا سب سے بڑا مزدور لیڈر ہے۔ اسے وہ محاذ مل گیا ہے جہاں فن کے ساتھ جان دی جاسکتی ہے۔ وہ اپنے طبقے کے کھوکھلے پن سے اکتا کر بھاگ گیا ہے لیکن اب وہ صرف پرانی قدروں کو پیروں تلے روند کر تسکین حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے نئی قدروں کی تلاش ہے جس کی چھاؤں میں وہ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ایک نئی زندگی تعمیر کر رہا ہے۔ مخدوم کے سینے میں کاڈویل، رالف فاکس، جان کرافورڈ سب زندہ ہو گئے ہیں۔ لورکا اپنی قبر سے پکار کر کہہ رہا ہے "میں اسپین کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ میں عوام کا دکھ درد نظم کرتا تھا۔ ان کے بھولے بھالے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا۔ پھر بھی میں سیاست سے بھاگتا تھا لیکن سیاست نے میرا پیچھا کیا اور فاشزم کی ایک مہلک گولی نے میری جان لے لی۔ کوئی شاعر سیاست سے نہیں بھاگ سکتا۔"

دوسرے دن مخدوم مجھ سے طالب علموں کی تحریک اور حیدرآباد کی غلامی، پستی اور بدحالی پر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے مجھے وہاں کی شخصی استبدادی حکومت کے مظالم کی بہت سی داستانیں اور ان سے متعلق اپنی ایک نظم "دھواں" سنائی ؎

جنتیں خاک پہ جس رات اتر آئی تھیں
بدلیاں رحمت یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روح جہاں بانی تھی

ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھی
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

یہ مخدوم کے مزاج کا فطری انکسار تھا کہ وہ ایک نظم سنا کر چپ ہو گیا۔ میں اس کی تمام نظمیں اسی کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ اس کے پڑھنے کا انداز اتنا دلکش ہے کہ جی ہی نہیں بھرتا۔ اس کے علاوہ مجھے مخدوم کی نظمیں پسند بھی ہیں۔

میں نے پوچھا: "تم نے سامراجی جنگ پر کوئی نظم نہیں کہی؟"

اس نے اپنی چند مطبوعہ نظموں کا نام لیا اور پھر ایک غیر مطبوعہ نظم سنائی ؎

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے
سرخ ہے آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

برآمدے کے سامنے املی کے پیڑ کے نیچے مٹی سے کھیلتا ہوا ایک چھوٹا سا بچہ مخدوم کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا اور پھر پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ مخدوم نظم ادھوری چھوڑ کر بچے سے کھیلنے لگا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا کہ: جب میں تخلیقی کام کرتا ہوں تو بالکل تنہائی چاہتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی محبوبہ کے وجود کو بھی برداشت نہیں

نہیں کر سکتا۔ لیکن بچے میری تنہائی میں کبھی مخل نہیں ہوتے۔ وہ ہر وقت میرے پاس آسکتے ہیں۔"

ننھا سا بچہ اپنی ماں کے ساتھ چلا گیا اور مخدوم شعر و شاعری کی دنیا میں واپس آگیا۔ میں نے کہا کہ تمھاری نظم میں اداسی اور افتادگی ہے۔ اس میں انقلابی آگ نہیں ہے۔"

اس نے کہا: "ابھی ایک بند باقی ہے۔ اسے بھی سن لو۔

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کے جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

وہ زمانہ عجیب تھا۔ یورپ میں سامراجی حکومتوں کو جرمنی کے ہاتھوں شکست پر شکست ہو رہی تھی۔ سارا یورپ جرمنی کی جھولی میں چلا گیا تھا اور دنیا پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہندوستان اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ جنگ چھڑنے پر بمبئی کے مزدوروں نے جنگ کے خلاف بہت بڑی ہڑتال کی تھی۔ سارا ملک برطانوی سامراج کے خلاف اٹھنے پر آمادہ تھا۔ لیکن قومی رہنماؤں نے اس ابھار اور ابال کو دبا دیا اور جنگ آزادی کو صرف آزادی خیال اور آزادی تقریر کی جنگ بنا کر انفرادی ستیہ گرہ شروع کی اور جیلوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ حکومت نے اس سے فائدہ اٹھا کر ساری قومی تحریک کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ ہزاروں بہترین مجاہد جیلوں کے اندر بند پڑے تھے اور ہر طرف ایک عجیب قسم کی بے بسی کا احساس طاری تھا۔ مخدوم کی اس زمانے کی تمام نظموں پر اس کا اثر تھا۔

لکھنؤ سے حیدرآباد جانے کے کچھ دن بعد مخدوم نے اپنی مشہور نظم "اندھیرا" کہی۔ یہ اس کی شاعری اور زندگی کا ایک بہت بڑا موڑ ہے۔

اس نظم کی جذباتی جڑیں جنگ کے اس سامراجی دور میں پائی جاتی ہیں جس میں قومی رہنماؤں کی ناکارہ ستیہ گرہ اور برطانوی شہنشاہیت کی سخت گیری نے ہندوستان کو کچل دیا تھا لیکن یہ نظم کہی گئی ہے اس دور میں جب روس پر جرمنی کے حملے سے جنگ کے حالات میں ایک انقلابی تبدیلی ہو چکی تھی اور دنیا کی سیاست نے ایک نئی کروٹ بدل لی تھی۔ انسانیت کا قافلہ ایک نئے موڑ پر آگیا تھا۔ ہندوستان میں قومی رہنما جیلوں سے رہا ہو رہے تھے اور ملک کی فضا میں "عوامی جنگ" کا نعرہ بلند ہو رہا تھا اور یہ سب محسوس کر رہے تھے کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک طرف ترقی پسند قوتیں ہیں جن کی رہنمائی چین اور روس کر رہے

تھا اور دوسری طرف جاپان، جرمنی اور اٹلی کی رہنمائی میں دنیا کی بدترین رجعت پرستی ماضی کے ویرانوں اور کھنڈروں کو برقرار رکھنے کے لیے کیڑوں مکوڑوں کی طرح امڈ رہی ہے۔

"اندھیرا" مخدوم کی سب سے زیادہ مقبول نظم "جنگِ آزادی" کا پیش خیمہ تھی۔ اس کا آخری شعر ہے

رات کے ہاتھ پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کی زندگی کی نئی کروٹ اور اس کے راستے کی نئی سمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس میں یہ اعتماد جھلک رہا ہے کہ پرانی دنیا باقی نہیں رہ سکتی جس کے پاس "اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں" اور نئے عہد کے سورج کو طلوع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

شاید اس وقت تک مخدوم نے اپنی زندگی میں تبدیلی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کے لیے وہ بہت دن پہلے سے بے تاب تھا اور جس کا اظہار لکھنؤ کے مشاعرے والی رات کو ہوا تھا۔

جون ۱۹۴۲ء میں میں بمبئی چلا آیا اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار "قومی جنگ" میں کام کرنے لگا سبطے لکھنؤ ہی میں رہ گیا تھا اور "نیشنل ہرالڈ" میں کام کر رہا تھا۔ مخدوم حیدرآباد کے سٹی کالج میں لیکچرر تھا لیکن یہ پرسکون زندگی اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔

ملک پہلے سے بھی زیادہ بے بسی اور مصائب کا شکار تھا۔ ہندوستان میں نیا ہنگامہ اور نیا جوش تھا۔ روس میں جرمن فوجیں آگے بڑھ رہی تھیں۔ جاپانی فوجیں برما کو پامال کر کے ہندوستان کی سرحد پر چڑھی آ رہی تھیں۔ ہرے بھرے کھیتوں پر قحط کی پرچھائیاں منڈلانے لگی تھیں، چور بازاروں کا بیوپار بڑھنے لگا تھا۔ قومی رہنما جیلوں میں دوبارہ بند کر دیے گئے تھے۔ کانگریس غیر قانونی جماعت قرار دے دی گئی تھی۔ عوام جوالا مکھی کی طرح ابھر رہے تھے اور حکومت نے بندوقوں اور سنگینوں سے انھیں کچلنے کا انتظام کر دیا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگی ہوئی تھی اور سارا ملک خون میں ڈوب گیا تھا۔ روز پھانسی کے نئے پھندے بنتے تھے اور قربانیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔

اب کی بار جب مخدوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ "میں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا ہے اور کمیونسٹ پارٹی کا کل وقتی کارکن ہو گیا ہوں۔"

مخدوم نے دن رات ایک کر دیا اور حیدرآباد کے نوجوانوں اور مزدوروں کی تنظیم کرنے لگا یہاں سے اس کی شاعری کو نئے موضوع ہی نہیں اس کے خیال کو نئی بلندیاں بھی ملیں۔

دو تین برس سے ہندوستان کے ترقی پسند شاعروں کی اکثریت خاموش تھی۔ بہت سی پھلجھڑیاں چھوٹ کر بجھ چکی تھیں۔ کچھ نئے شاعر ابھر رہے تھے اور کچھ اعصابی ادب کی تخلیق کر کے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے تھے

اس زمانے میں مخدوم نے اپنی نظم "جنگ آزادی" کہی

یہ زمانہ وہ تھا جب درمیانی طبقے کے لال بجھکڑ جرمنی کی فتح کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ قحط کے آثار شروع ہو چکے تھے اور کلکتہ اور چٹ گاؤں پر جاپانی بمباری ہو رہی تھی۔ جرمن فوجیں اسٹالن گراڈ تک بڑھ آئی تھیں اور قفقاز کو عبور کر کے ایشیا میں گھسنا چاہتی تھیں۔

اس عالم میں مخدوم کی معرکۃ آلارا نظم "اسٹالن کی آواز" آئی۔ یہ مخدوم کی شاعری کا سب سے بلند مقام ہے کہنے کو تو یہ نظم قازقستان کے بوڑھے شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مخدوم کے دل کا نغمہ ہے جس کو چھیڑنے میں جمبول جابر نے مدد دی ہے ؂

ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو مہمیز کرو
سرخ فوجوں میں ملو
جذبۂ پر جوش بنو برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشسٹ خنازیر کو
فی النّار کرو۔

اس نظم کا اُبال کچھ بڑا طوفانی تھا۔ ایسے تیرہ و تار زمانے میں مخدوم کی رجائیت حیرت خیز تھی لیکن یہ اس اعتماد سے پیدا ہوئی تھی جو ایک کمیونسٹ کو عوام پر ہوتا ہے۔ عوام قوت کا بے پناہ ذخیرہ ہیں وہ اپنے منظم عمل سے صرف دشمن کو پیچھے نہیں ہٹا سکتے بلکہ تاریخ کی رفتار کو بھی بدل سکتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مخدوم میں یہ اعتماد حوصلہ اور یقین پیدا ہوا کہ برطانوی سامراج کے خونیں مظالم اور بنگال کے ہولناک قحط کے باوجود ہندوستانی کچلے ہوئے اور نیم جان ہندوستانی اس قوت سے اٹھیں گے کہ برطانوی اقتدار کی دھجیاں اڑ جائیں گی یہی اعتماد اور یقین تھا جس نے مخدوم کو یہ کہنے کی بھی ہمت عطا کی کہ جرمن فوجیں آخر کار سوویت یونین کی مزدور سرزمین سے نکال دی جائیں گی۔

ایک مہینے میں جنگ کا رخ پلٹ گیا اور وہ جرمن فوجیں جو آندھی اور طوفان کی طرح یوکرین کے ہرے بھرے میدانوں سے گزر کر اسٹالن گراڈ پر ٹوٹ پڑی تھیں، مچھروں کی طرح منتشر ہو گئیں اور فاشزم کے درندے کی کمر ٹوٹ گئی۔

مخدوم اپنی نظمیں کہنے کے بعد بمبئی آیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں محبانِ سوویت کی انجمن میں

مدن پورے کے مزدور علاقے میں وہ اپنی نظمیں کئی دن تک سناتا رہا۔ اور گانے والوں کی ٹولیوں کو "جنگِ آزادی" کی دھن سکھاتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی زندگی کا تضاد دور ہو چکا تھا۔ وہ عوام کے سمندر میں جا ملا تھا اور اب ایک بے تاب اور خوبصورت موج کی طرح طرارے بھر رہا تھا۔

میں نے مخدوم سے کہا کہ "تمھاری نظمیں لوگوں کو بہت پسند ہیں۔ ان کو سن کر حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور دل میں ایک امنگ پیدا ہوتی ہے۔"

مخدوم نے اپنے دل نشین انداز میں مسکرا دیا۔ میں نے کہا کہ "تمھاری پرانی نظموں میں نہ یہ حسن تھا نہ یہ جوش اور اُبال۔ ان نظموں نے وہ کمی پوری کر دی ہے۔"

اس نے جواب دیا کہ "ہاں میں پہلے عوام سے دور تھا اور درمیانی طبقے کی بزدلی اور قنوطیت کا شکار تھا اب میری جڑیں زمین میں ہیں اور میرے پاس انسپریشن کی کمی نہیں۔"

مخدوم روز بروز مزدوروں کے کام میں ڈوبتا گیا۔ اس نے اپنا دل و دماغ، روح سب کچھ مزدور تحریک کو دے دیا۔ اس نے یہ راز جان لیا تھا کہ دنیا کو منظم مزدور طبقے کی جدوجہد کے سوا اور کوئی چیز نجات نہیں دلا سکتی۔ اب اسے صرف ایک دھن تھی۔ مزدور تحریک کی تنظیم اور حیدرآباد کی شخصی استبدادی حکومت سے نجات۔ ہندوستان کی آزادی۔ مخدوم کی شاعری جب اپنے شباب پر آ رہی تھی تو وہ عملی کام میں اتنا غرق ہو گیا کہ اسے شعر کہنے کی فرصت نہیں رہ گئی۔ اسے کھانا کھانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا۔

اس کے بعد جب کبھی مخدوم سے ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اب آرٹ اور ادب کی باتیں ذرا کم کرتا ہے۔ وہ غریبوں کی زندگی کی طویل داستانیں سناتا تھا۔ مزدوروں کے بے پناہ خلوص کی قصیدہ خوانی کرتا تھا۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھ لیتا تھا۔ "کوئی نظم کہی ہے؟" اور پھر دوسری باتیں کرنے لگتا تھا۔

اکثر ہمارے اخبار "قومی جنگ" پر اس کی تنقیدیں بہت سخت ہوتی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ ادبی صفحے پر۔ "تم لوگ بڑی مشکل زبان لکھتے ہو۔ مزدور اسے نہیں سمجھتا۔ مزدوروں کے پاس جاؤ اور ان سے سیکھو ان کا اندازِ بیان بڑا سیدھا سادا اور موثر ہوتا ہے۔"

اب مخدوم کے نزدیک ہر چیز کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچانا۔ اسی لیے اردو کے نام نہاد ترقی پسند ادیبوں سے وہ بہت خفا تھا جن کے لیے ان کی ذاتی ناکامیاں بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہیں۔ جوش سے بھی اسے اکثر یہ شکایت رہی کہ وہ ادب کی صحیح امامت نہیں کر رہے ہیں۔

عوام میں آزادی کی جدوجہد کے لیے کام کرنے کے بعد مخدوم کا ذاتی برتاؤ اور اخلاق کا معیار بھی بدل گیا ہے۔ اب اس میں دکھاوا نام کو باقی نہیں۔ صرف خلوص ہی خلوص ہے۔ جب میں پہلی بار حیدرآباد گیا تو میرا خیال تھا کہ وہ اسٹیشن پر ضرور آئے گا۔ لیکن اسٹیشن پر اور بہت سے احباب تھے مخدوم نہیں تھا۔

میں نے پوچھا " مخدوم کہاں ہے ؟ "

کسی نے جواب دیا : " سکندرآباد کے ٹریڈ یونین آفس میں "

شام کو مخدوم آیا ۔ گرد میں اٹا ہوا ۔ اس نے دن بھر نہ ملنے کی معذرت تک نہ کی ۔ صرف اتنا پوچھا " کوئی تکلیف تو نہیں ہے " اور پھر حیدرآباد کی تحریک اور اردو کانفرنس کے متعلق باتیں کرنے لگا ۔

حیدرآباد میں مخدوم سے یا تو محبت کی جاتی ہے یا نفرت ۔ کوئی غیر جانبدار نہیں ہے ۔ نفرت کرنے والوں کا گروہ چھوٹا ہے لیکن طاقتور ہے ۔ محبت کرنے والوں کا گروہ بہت بڑا ہے اور مستقبل کی دنیا کا مالک ہونے والا ہے ۔ لیکن نفرت کرنے والے بھی مخدوم کی ذاتی زندگی پر انگلی نہیں اٹھا سکتے ۔ انھیں مخدوم کے خلوص اور ایمان داری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔

دسمبر ۱۹۴۶ء

ستائیسویں کل ہند صنعتی نمائش

یکم جنوری تا ۱۰ فروری سنہ ۱۹٦۷ء

ہندوستان کی سب سے بڑی ہمہ مقصدی نمائش

بہترین ایجادات کا مقابلہ

∴ کاریگروں کے مقابلے
∴ نمائش باغبانی
∴ نمائش مویشیاں
∴ نمائش مرغبانی

گیمس اسپورٹس اور کلچرل پروگرام

تفصیلات کیلئے :

اعزازی معتمد نمائش سوسائٹی ۔ مکرم جاہی روڈ حیدرآباد

ہم صفیرِ انقلاب

مخدوم

سید احتشام حسین

● کبھی شاعر اپنی شاعری سے پہچانا جاتا ہے اور کبھی شاعر کی ذات اور شخصیت اس کی شاعری کے سمجھنے میں معین ہوتی ہے۔ دونوں کا رشتہ اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ انھیں مکمل طور سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر بھی موجودہ عہد کے بعض نقادوں کا مطالبہ ہے کہ شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے، اُسے اس کے خالق کے ذریعہ نہیں اُن لفظی علامتوں کے ذریعہ پہچاننا چاہیے جو شعر کے روپ میں ڈھل گئی ہیں۔ معمولی، سطحی، اور لذتیاتی مطالعہ میں تو یہ بات کچھ دیر کے لیے ممکن ہے لیکن شاعری کی تہوں کو کھولنے، اس کی معنوی خصوصیتوں کو سمجھنے اس کے فنی محاسن اور معائب کا اندازہ لگانے اس کی ندرتوں اور امتیازی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے میں شاعر کی ذات، اس کے ذہن اس کے نفسیاتی اور سماجی رجحانات، اس کے شعور اور جذباتی محرکات سے واقف ہوئے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ مطالعہ کی مختلف سطحوں پر شاعر یا شاعری کو علاحدہ علاحدہ پرکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مطالعہ ہر حال میں ادھورا اور یک طرفہ ہی رہے گا۔ تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے کیونکہ عملِ تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں، ایک سے دوسرے کا پتہ چلتا ہے۔ شاعری اگر انکشافِ ذات ہے تو ذات سے حجابات کا اٹھنا ضروری ہے یقیناً رواتی اور میکانکی انداز کی شاعری پر اس حقیقت کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں ہنر سینہ خراشی کا مطالبہ نہیں کرتا لیکن جذبہ اور ذہن میں کرید پیدا کرنے والی شاعری خیالوں کو شاعر کی طرف موڑ دیتی ہے۔ کوئی نظم کیوں کہی گئی، کن حالات میں کہی گئی، کہنے والے کی

ذات اور خیالات سے اس کا کیا تعلق ہے، اس کی تاثیر کا کیا راز ہے، اس میں کس حقیقت کا اظہار ہے، یہ دوسروں کی ایسی ہی نظموں سے مختلف کیوں معلوم ہوتی ہے اسی طرح کے ہر سوال کا جواب شاعر کے حالات، ماحول، مشاہدہ، مطالعہ، شعور، فن اور جذبۂ اظہار میں ملے گا۔ یہی بات مخدوم محی الدین کی شاعری کے لئے بھی درست ہے۔ شاعری ان کی پوری زندگی کی مظہر نہیں ہے لیکن جتنی ہے وہ ان کے دامِ تمنا میں کسی صید زبوں کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ شعورِ حیات کی جیتی جاگتی تصویر اور فکر و عمل کی سچی ترجمان ہے۔

شاعری ذات اور کائنات کی دریافت کا عمل ہے اور دونوں صورتوں میں انتخاب کی باگ ڈور شاعر ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر مکمل طور سے ماحول کا مجبور ترجمان نہیں ہے۔ ذات کی حد تک تو یقیناً نیم شعوری عمل کی کارفرمائی بھی جاری رہتی ہے۔ لیکن اپنی ذات کے باہر کی دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرتے وقت شاعر بہت کچھ شعور سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی آزادی یہی ہے کہ وہ سماج کے متصادم اور پیچیدہ عناصر میں سے کسی کے ساتھ اپنی ذات کا رشتہ قائم کرے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس کا اظہار اپنے فن میں کس طرح کرے۔ ہر فنکار کی طرح ابتدا میں مخدوم کو بھی اپنے سادہ، عاشقانہ، یا جذباتی اور ذہنی تجربات کو پیش کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کا ذوق اور علمی سرمایہ، جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوقِ اظہار اس شاعری کے لئے کافی تھا جس کے نمونے طور، ساگر کے کنارے، تلنگن، طور، رخصت، جوانی، سجدہ، یاد ہے وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ ایسی نظمیں تقریباً ہر نوجوان شاعر کہہ لیتا ہے کیونکہ یہ تجربے عام ہیں۔ لیکن اسی دور میں (جو غالباً ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۹ء تک ہوگا) ان کی بعض نظمیں ایک ایسی گونج بھی پیدا کرتی ہیں جس میں تھوڑی بہت انفرادیت ہے جیسے پچھلے پہر کے چاند سے، انتظار، برسات، اور پیلی شام۔ اس زمانہ میں مخدوم نے ٹیگور اور ورڈسورتھ کو بھی پڑھا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے ذہن نے ان شعراء کے اثرات بھی قبول کئے ہوں۔ اسی طرح ان کے پہلے مجموعہ سرخ سویرا (۱۹۴۴ء) کی ابتدائی نظمیں ایک ایسے شاعر سے روشناس کراتی ہیں جو اپنی ذات، محبوب کی ذات، اور دونوں کی مسرور و سرشار کرنے والی فطرت کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہے۔ رات کی تنہائیوں میں محبوب کے بت بنا کر پوجتا اور خود اپنی خیالی میں گیتوں کے جال بنتا ہے کہ یہی اس کی دنیا ہے۔ یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہی اس کی دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ زندگی کے ہنگاموں سے یکسر بے خبر ہے لیکن اس کے خیالوں کا مرکز خود اس کی ذات ہے۔ اور وہ مخصوص کیفیات جو اس کی ذات سے وابستہ ہیں۔ رومانیت کا فطری انداز، جوانی کے تقاضے، ٹیگور اور ورڈسورتھ سے دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ حقیقتوں کو تخیل کی راہ سے پانے کا رجحان نمایاں ہو گیا یہاں تک کہ جب ہندوستان کی سیاسی جدوجہد نے بغاوت کی راہ دکھائی تو اس میں بھی تخیلی اور جذباتی و خود اظہار پر حاوی ہے۔ وہ نظم جس کا عنوان باغی ہے قطعاً اسی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی خود پرستاری ایک خام کار سیاسی ذہن پر چھائی ہوئی ہے اور اظہار کو غصہ اور جوش میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس موضوع پر جوش، احسان دانش، مجاز، سردار جعفری سبھی کی ابتدائی نظمیں شعور پر جذبہ کے غلبہ کی غماز ہے۔ اس کی نفسیاتی اور سیاسی توجیہہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ اشارہ صرف اس بات پر کی طرف کرنا ہے کہ نفسی ارتقا

کی اس منزل میں فکری یا فنی پختگی کی جستجو تحصیل حاصل ہے تاہم جو چیز نمایاں ہے وہ ایک خاص قسم کا صحت مند جذباتی توازن ہے جو عمر کی فطری کیفیات سے ہم آہنگ کہا جا سکتا ہے۔

آج ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کے جائزے میں اس کے ہم نوا اور مخالف دونوں الجھی الجھی باتیں کر رہے ہیں دونوں فریق یہ بھول گئے ہیں کہ وہ تحریک ہندوستانی اور عالمی کش مکش حیات کا ایک منطقی اظہار تھی اور زندگی میں ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی جبر کے خلاف حشر انگیز صدائے احتجاج تھی شعر و ادب کی دنیا میں ضمیر کی وہ گونج آواز تھی۔ جو حق، انصاف اور ارتقا کے لئے بلند ہوئی تھی۔ اسے ہر احساس انسان نے اپنے ظرف کے اور ہر ادیب اور شاعر نے اپنے شعور کے مطابق قبول کیا تھا۔ یہ عالمی سطح پر آزادی، مساوات اور ترقی کا پرچم بلند کرنے کی وہ کوشش تھی جس کے فکری پہلو کو ادب نے بھی اپنی بقا کے لئے مفید پایا اور اس کے ذریعہ سے سبھی زبانوں اور ملکوں کے ادیبوں کو ایک عالمی انسانی نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے پر اکسایا۔ اس لئے آج جو کچھ بھی کہا جائے اس صدی کی تیسری دہائی میں اس کی آواز ہر آواز پر بالا تھی اور اکثر ذہین ادیب اور انسان دوست دانشور اس میں اپنے درد کا مداوا اور اپنی تخلیقی لگن کے لئے سازگار فضا پاتے تھے اسی وجہ سے اردو کے بیشتر ادیب یا تو اس تحریک سے وابستہ ہو گئے یا اس سے متاثر ہوئے۔ مخدوم جن کے یہاں سیاسی اور سماجی شعور کی ابتدا ہو چکی تھی، جنہوں نے فاشزم کے گھناؤنے پن کا ذکر اپنی نظم جنگ میں کیا تھا ترقی پسند تحریک میں اپنی پوری شعوری قوت سے شریک ہو گئے۔ اس کے پہلے اثرات مشرق اور موت کا گیت نامی نظموں میں ظاہر ہوئے جہاں شعور محض جذبے پر غالب ہے اور گہرے تاثرات کے اظہار سے فن کی جلا ہو رہی ہے۔ تبدیلی کے اس عمل میں دوسری جنگ عظیم نے نہ صرف اور تیزی پیدا کر دی بلکہ غور و فکر اور شعور فن کے نئے راستے کھول دیئے۔ کوئی شاعر اپنی ذات کو نظر انداز کر کے تخلیق تو کر ہی نہیں سکتا، ہاں ذات سے ماحول اور کائنات کے رشتے کو نئی طرح جوڑ کر اظہار ذات کے طریقوں کو نیا فنی پیکر عطا کر سکتا ہے۔ مخدوم نے بھی یہی کیا کبھی آزادی وطن کے سپاہی کے روپ میں کبھی مستقبل کے خواب دیکھنے والے کے بھیس میں اور کبھی کٹھن راہوں پر چلنے والے مسافر کی شکل میں اپنے کو دیکھا کیونکہ وہ اپنی شاعری کو اپنی زندگی کے وسیع تر مقصد اور عظیم تر نصب العین سے ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے۔ وقت انھیں بدل رہا تھا اور وہ اسے اپنی شاعری میں قید کرنا چاہتے تھے۔

عقیدے اور فن کے باہمی تعلق پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی اتنا کہنا ضروری ہے کہ اچھے شاعر اور ادیب کی راہ میں عقیدہ رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ اکثر اسے قوت اظہار بخشتا ہے۔ نہ تو کسی سیاسی یا فلسفیانہ عقیدہ رکھنے والے پر یہ پابندی عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ ایوان ادب میں داخل ہی نہ ہو اور نہ کسی کو یہ حکم دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کسی عقیدہ یا نظریہ کا اظہار ہی نہ کرے زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ادبی تخلیقات کو پرکھتے وقت بھی فن کی وہی کسوٹی استعمال کی جائے جو کسی شاعر یا ادیب کے لئے کی جاتی ہے۔ تجربوں کی صداقت اور جذبات کی قدر و قیمت کی پرکھ، الفاظ کی معنوی حیثیت، زبان و بیان کی قوت اظہار، ہر چیز پر نگاہ رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی

پسندی کسی طرح فن کاری کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ ادبی حسن کی کمی اور فنی خامیاں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں کے یہاں ہو سکتی ہیں۔ اس بظاہر غیر ضروری بحث کا مطلب صرف یہ ہے کہ مخدوم کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ مارکسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں، عملی سیاست میں کمیونزم کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کی اشاعت اور تبلیغ سے کسی وقت غافل نہیں ہیں۔ اس کی صداقت اور حق پسندی پر ان کا اس طرح ایمان ہے کہ وہ اس سے انحراف کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا بالکل عبث ہوگا کہ ان کی شاعری کی پرکھ میں ان حقائق کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اس نظریہ سے وابستگی نے ان کی تخلیقات کو قوت بخشی یا نقصان پہونچایا۔

جب دوسری جنگ ۱۹۳۹ء میں چھڑی تو نہ صرف دنیا کے ترقی پسندوں نے بلکہ ہر طرح کے صاحبان ہوش نے یہی سمجھا کہ یہ بڑی بڑی طاقتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے اور غلام ممالک اس کی چکی میں اپنے آقاؤں کا وقار قائم رکھنے کے لئے جھونکے جا رہے ہیں۔ پھر جب اس جنگ کی نوعیت بدلی اور وہ کھلم کھلا فاشزم کے دنیا پر مسلط کر کے رہی سہی جمہوریت کے ختم کرنے کی جنگ بن گئی تو انسانیت کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے ترجیحات میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گناہگاروں کے گناہ دھل گئے اور سامراجی جمہوریت نواز بن گئے بلکہ انسانی حیثیت سے بڑے اور چھوٹے خطروں سے باری باری نجات حاصل کرنے کا سوال پیدا ہو گیا۔ مخدوم نے جنگ کے ان دونوں ادوار میں نظمیں لکھیں، ان میں نہ تو اپنے عقائد سے انحراف کیا اور نہ اس بات کو بھولے کہ ان کی شاعری شعور کے افق کو وسیع کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے سپاہی اور جنگ آزادی دونوں کے لئے وجہ جواز نکل آتی ہے۔ دونوں نظمیں پر اثر، مترنم، پر جوش اور سادگی کے باوجود پرکار ہیں۔ دونوں میں ایسا غنائی حسن پیدا ہو گیا ہے جو ان دلوں کے علاوہ ہر دل کو متاثر کرے گا جنہیں ان سیاسی تصورات ہی سے اختلاف یا نفرت ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی انقلاب ہے جو شاعری اور سیاست، اظہار اور عقیدہ کا خوبصورت سنگم ہے۔ اس میں آفاقی انسان کی وہ تمنا ابھر کر سامنے آگئی ہے جو بہتر سے بہتر کی جستجو میں اسے بے چین رکھتی ہے اور وہ تبدیلی اس لئے چاہتا ہے کہ دنیا سوگوار نہ رہے کلی کا غم اور ذروں کی پریشانی دور ہو، مسموم ہواؤں کا چلنا بند ہو، حیات بخش ترانے آزاد ہوں، ذہن کے سودائے خام اور توہمات کی غلامی ختم ہو، قحبائے سیم و زر سے آزادی ملے اور شمیم عدل سے کوچہ و بازار مہکیں۔ اگر یہ محض سیاسی تبلیغ ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ انسانی تمنا اور کیا ہوگی!

اسی دور میں مخدوم نے استعاروں اور علامتوں کی قوت بھی پہچانی اور ان سے کام لے کر اظہار کے ذرائع کو اور وسیع کر دیا۔ اس طریق کار کا فائدہ یہ ہے کہ اگر علامتیں شاعرانہ شعور سے چھنی جائیں تو خیالات اور تصورات میں زیادہ توانائی اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کا استعمال نئی معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔ سرخ سویرے کے دور میں اس کی طرف توجہ کم تھی لیکن پھر بھی حویلی، روح مغفور، قمر اور اندھیرا اس طرز اظہار کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ پہلی نظم جس میں مخدوم نے آزاد نظم کی تکنیک سے کام لیا وہ اندھیرا ہے جس میں جنگ کے ہولناک اثرات کی موثر تصویریں ہیں۔ نظم معرّیٰ اور مقفّیٰ انداز میں شروع ہوتی ہے جذبہ اظہار کی شدت سے مصرعے ٹوٹتے ہیں اور روانی میں

اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہی کیفیت ان کی مشہور نظم اسٹالین میں بھی نظر آتی ہے۔

سرخ سویرا میں تقریباً سنہ ۱۹۴۳ء تک کی نظمیں شامل ہیں۔ پھر دوسرا مختصر مجموعہ گل تر سولہ سترہ سال بعد سنہ ۱۹۶۱ء میں نکلا۔ ایک بدلے ہوئے رنگ میں۔ مجموعوں کے ناموں کا فرق بھی بہت کچھ کہتا ہے اور خود مخدوم کے خیالات گل تر کے دیباچہ (پڑھنے والوں سے) میں مل جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں اگر ایک نظم سنہ ۱۹۳۸ء کی اور دو نظمیں سنہ ۱۹۴۳ء کی شامل نہ کرلی گئی ہوتیں تو یہ مکمل طور پر ان کے دس سال کے ذہنی اور فنی ارتقا کی تصویر ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں عملی شرکت، قید اور مصروفیتوں کی وجہ سے .... سنہ ۱۹۴۳ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک انھوں نے بہت کم نظمیں لکھیں۔ اس زمانے کی نظموں میں قید سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے کیونکہ اس کا تخیلی عنصر مخدوم کے ماضی اور حال دونوں کو یکجا کردیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ گل تر کی بعض نظموں کے متعلق کچھ کہا جائے مخدوم کے ان خیالات پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا جو انھوں نے کتاب کے شروع میں ظاہر کئے ہیں کیونکہ ان سے طرز اظہار کے نئے پن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ عمر، تجربہ اور زمانے کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ ابھر آیا ہے۔ پرانے رنگ سے اور نئے رنگ میں جو قدر مشترک ہے۔ وہ "انسان دوستی اور سمٹا ہوا جدلیاتی اثر" ہے۔ انسان دوستی واضح ہے لیکن سمٹے ہوئے جدلیاتی اثر سے مراد غالباً علامتوں، استعاروں یا مترنم بندشوں کا وہ استعمال ہے جس کا اثر سرخ سویرا میں ہوچکا تھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "زماں و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIMELESS) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشوونما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنون لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔" یہاں شاید جبلت کا لفظ کچھ الجھن پیدا کرے کیونکہ اسی لفظ کا سہارا لے کر انسان کو درندہ اور تہذیبی ارتقاء کو محض وقتی ملمع کاری قرار دیا گیا ہے لیکن غالباً مخدوم نے اسے اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس سے فطرت کی وہ ابتدائی منزل مراد ہے جسے جمالیاتی عمل سے تہذیب یافتہ بنایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کیوں کہتے کہ وہ انسان جسے سماجی ارتقا میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملتا وہ محض اپنی جبلتوں پر زندہ رہتا ہے۔ حقیقتاً ان کا مقصد یہی ہے کہ جس طرح انسان سماجی عمل میں شریک ہوکر زمانے کو بدلتا ہے اسی طرح وہ خود بھی بدل جاتا ہے اور اظہار کی نئی تکنیک دریافت کرکے اپنے خیالوں کو نئی طرح پیش کرتا ہے یہ صورت سیدھے سپاٹ طریقہ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نفس کے اندر اور مادی دنیا میں زبردست کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہی کشمکش تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرتی ہے۔ تخلیق فن کا یہ نظریہ شاعر کے دل کے اندر جاری رہنے والی

جنگ اور کائنات سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی جد و جہد، دونوں کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے کیونکہ اسی طرح اُلجھ کر آخر کار شاعر اپنے زخموں اور گیتوں کے ساتھ ابھر آتا اور انسانی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہے۔ شروع میں جو یہ بات کہی گئی تھی کہ مخدوم کی شاعری ان کی زندگی کی مظہر ہے اس کا یہی مطلب تھا۔ شروع کی سادہ نگاری اور بعد کی علامتی شاعری کے اندرونی ربط کا سلسلہ شعور کے وسیع اور عمیق تر ہونے سے مل جاتا ہے۔ اس بات کو مخدوم نے خود بھی اسی طرح ظاہر کیا ہے "شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فرد معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی قوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب ہو کر ہم کلام ہو۔ باہم اور بے ہم کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب انا اور انفرادیت سے تعبیر کرتا ہے۔"

عمل تخلیق کے اس واضح اعلان میں انکشاف ذات کے جس نئے پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے وہ بہت غور طلب ہے۔ اس میں ان نئے شاعروں کے لئے بھی غور و فکر کا سامان ہے جو ماحول کے اجالے اور ذہنی نفسیاتی کیفیات کے اظہار کو تخلیق کی آخری منزل سمجھتے ہیں۔ مخدوم فن اور عقیدہ دونوں کے باطنی رشتے سے واقف ہیں اس لئے انہیں ڈوب کر ابھرنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ گل تر کی اکثر و بیشتر نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار اسی جہد حیات کی علامتی تصویریں ہیں۔ اگر چارہ گر محبت کے سماجی پہلو کی عکاسی ہے تو آج کی رات نہ جا اپنی ذاتی خواہش کی ترجمان۔ پہلی نظم کا انفرادی پہلو محبت کے سماجی المیہ کی تنقید اور تفسیر ہے تو دوسری نظم کا سماجی پہلو یہ ہے کہ فرد کو محبت کی بیکراں کیفیت سے لطف اندوز ہونے کا حق اور موقع ملتے رہنا چاہئے۔ انکشاف ذات اور درد کائنات بالکل الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ زندگی کا صحت مند نقطہ نظر اور شعور فن چاہئے زندگی کے تجربے، واقعات کو ان کے پس منظر میں سمجھنے کی صلاحیت، خواہش اور حقیقت کی کشمکش، جدت اظہار کی خواہش۔ یہ تمام چیزیں فنی شعور کو بھی وسعت عطا کرتی ہیں اور طرز ادا میں خاص قسم کی تبدیلی نظر آنے لگتی ہے۔ اس لئے اگر گل تر کی نظمیں سرخ سویرا کی نظموں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں تو کوئی تعجب نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ نفس مضمون اور جمالیاتی اظہار کے لحاظ سے یہ تبدیلی کس حد تک ترقی اور قدرت بیان کا پتہ دیتی ہے اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ چارہ گر، آج کی رات نہ جا، رقص، چاند تاروں کا بن، جان غزل، پیار کی چاندنی، اور چپ نہ رہو خاص توجہ کی مستحق ہیں کیونکہ ان کا علامتی حسن اور جمالیاتی انداز ہی نہیں، ان کے بنیادی موضوعات بھی مخدوم کے نظریہ حیات اور ارتقائے فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سرخ سویرا کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ مخدوم کے یہاں ایک صحت مند جذباتی توازن ہے جو عقیدے کی گرمی سے

پیدا ہوا ہے۔ اس کی ایک روشن مثال چاند تاروں کا بن ہے۔ اس مختصر نظم کے تینوں حصے کم سے کم جگہ میں بہت سے حقائق کو سمیٹ لیتے ہیں اور اندھیروں سے گزرتے ہوئے مستقبل پر نگاہیں جمائے رہتے ہیں۔ اس نظم کے لفظ الفاظ میں علامتی تاثر اور فکری گہرائی نے نئی قوت پیدا کر دی ہے۔ آزادی سے پہلے کی تشنگی اس تشنگی سے مختلف تھی جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی۔ بیرونی سیاست نے آزادی کی روشنی کو تاریکی میں کس طرح بدل دیا اس کا لطیف بیانِ اظہار کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر اماں اے صد تمر وفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

اس طرح صبحِ آزادی طلوع ہونے کے باوجود اندھیرے کی گھٹن رہ گئی اور صبح کے لیے جدوجہد کے دروازے کھلے رہ گئے۔ شاعر کو دکھ ہوا لیکن مایوسی نے اسے پسپا نہیں کیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنے ہمدموں کو پھر پکارا کہ آخری حملہ کر کے اس اندھیرے کی دیوار کو بھی ڈھا دیا ہے۔

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

اس طرح کی نظموں میں خیال اظہار سے اس طرح دست و گریباں ہو جاتا ہے اور علامتی الفاظ حقائق کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کر کے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت ان کی مختصر نظم چپ نہ رہو میں بھی ہے جو لوصبا کے وحشیانہ قتل پر لکھی گئی۔ آزادیٔ وطن کا وہ حامی سامراجی سازش کا شکار ہو گیا۔ اس سازشی ماحول، قید و بند، درندگی، الناکی کی مرقع کشی چند الفاظ میں کرنے کے بعد مخدوم نے پھر انسانی ضمیر کو امید کا کرنوں سے چھوا ہے تاکہ پھر ایسی ناپاک سازشیں اور ایسے بے گناہ قتل نہ ہو سکیں۔

اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے

روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو، چپ نہ رہو

میں نے جان بوجھ کر دو ایسی نظموں کا انتخاب کیا ہے جن کو عام طور سے سیاسی نظمیں کہا جائے گا تاکہ عقیدہ اور شاعری کے اس باہمی ربط کا اندازہ ہو سکے جو تخلیقی کا کرب بن کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور ایسی نظموں کو کسی طرح دوسرے موضوعات پر اس طرح لکھی ہوئی نظموں سے کمتر درجہ کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مخدوم کی نظموں میں جو غنائیت اور صوتی آہنگ کا حسن ہے اس نے "گلِ تر" میں کمال کی جانب قدم بڑھائے ہیں۔ جب تک زبان اور خیال دونوں پر قدرت نہ ہو خوبصورت شاعرانہ ہیئت وجود میں نہیں آتی گو انھیں پوری طرح ریاضت کا موقع نہیں ملا لیکن پھر بھی مخدوم نے اُن خامیوں پر قابو پا لیا ہے جو ابتدائی نظموں میں جگہ پا جاتی تھیں۔ غنائیت اور ایمائی اندازِ بیان غزل کا جوہر ہے۔ جب مخدوم کو ان پر دسترس حاصل ہو گئی تو انھوں نے غزل گوئی کی طرف بھی توجہ کی۔ پہلا مجموعہ غزلوں سے بالکل خالی تھا لیکن "گلِ تر" کا تقریباً آدھا حصہ اسی صنف پر مشتمل ہے۔ ان میں بھی مخدوم نے غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اندازِ فکر کو برقرار رکھا ہے اور شعر کہے ہیں جو اُن کی تمام خصوصیتوں کے حامل ہیں جیسے:

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے	دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
یہ کوہ کیا ہے، یہ دشتِ الم فزا کیا ہے	∴ جو اک تری نگہِ دل نواز ساتھ رہے
قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں	سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے
اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے	∴ قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں
تحفۂ برگِ گل و بادۂ بہاراں لے کر	∴ قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں	∴ کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک	درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے
چھلک چھلک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر	لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے
ساز آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ	∴ جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ
چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں	خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ ⁂ انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں
منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے ⁂ اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب
آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے ⁂ گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
اسی ادا سے اسی بانکپن کے ساتھ آؤ ⁂ پھر ایک بار اسی انجمن کے ساتھ آؤ

ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

یہ اشعار تغزل اور معنوی حُسن سے بھرپور ہیں۔ اپنے جمالیاتی اظہار کے اُن حقائق سے محبت پیدا کراتے ہیں جنھیں شاعر عزیز رکھتا ہے۔ شاعر اور قاری کے درمیان مفاہمت اور یگانگت کا یہ رشتہ اظہار کی گیرائی اور بیان کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔ مخدوم اس میں اکثر و بیشتر کامیاب ہیں۔

اگر آپ اپنے مکان یا ڈرائنگ روم کو
دامانِ باغبان و کفِ گُل فروش بنانا چاہتے ہیں
تو ایک بار کیثرول کارنر میں ضرور تشریف لائیے
جہاں عمدہ آرائشی اشیاء اور خوبصورت مصنوعات آپ کا انتظار کر رہی ہیں
کیثرول کارنر۔ چوراہا بشیر باغ۔ حیدرآباد اے پی
CASUAL CORNER
BASHIR BAGH HYD. AP

مخدوم — ایک عہد ایک شاعر

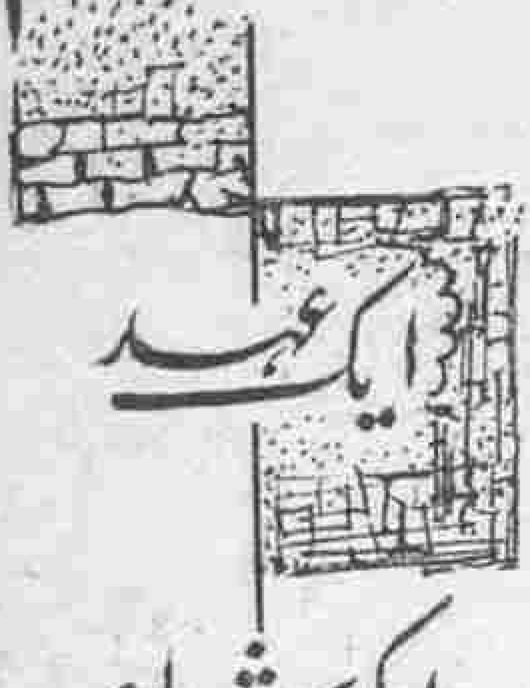

عبدالقادر سروری

● مخدوم محی الدین کے بارے میں کچھ لکھنے کا خیال آیا تو ساری پرانی یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ یادیں جو اس فضا کے ساتھ وابستہ ہیں جس میں مخدوم کی ذہنی نشوونما ہوئی تھی۔ ہماری موجودہ صدی کے ربع اول کے فوراً بعد کا زمانہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کا زمانہ تھا، اس کے ابتدائی دور کے متعلمین کے لیے ایک مشن اور ایک آدرش کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب اس کے دو رُخ ہوگئے ہیں ایک اس کا موجودہ مقام، جو اپنی عمارتوں اور فضا کی وجہ سے یادگار ہے۔ ایک اس کا اگلا رخ جو انسانوں اور ان کے کارناموں کی وجہ سے ایک تاریخ بن گیا ہے۔ توپ کے سانچے میں کرایہ کی عمارتیں جہاں جامعہ نے اپنی زندگی کے ابتدائی معرکۃ الآرا برس گزارے ....

مرحوم دلی کالج کے اولین عہد کی طرح ایک درخشاں ماضی کی درخشاں تاریخ بن گئے ہیں۔ اساتذہ، طلبا غرض جو تھے ایک نئے حال کی تعمیر کی دُھن میں لگے ہوئے تھے اساتذہ میں ایسے مشاہیر زمانہ جیسے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر عبدالرحمن خاں، پروفیسر وحید الدین سلیم، قاضی محمد حسین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر سید عبداللطیف، مولانا عبدالحق، پروفیسر حسین علی خاں، پروفیسر رین جی دکر، پروفیسر عبدالحمید خاں، پروفیسر سید اشرف شمسی، پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر الیاس برنی، چودھری برکت علی علم و دانائی کے مجسمے۔ اور طلبا ایسے جیسے سید حسین، عبدالمجید صدیقی، میر سیادت علی خاں، صلاح الدین، میر ولی الدین، سید فضل الحق، ولایت علی، سید معین الدین قریشی، حبیب اللہ رشدی، سید وقار احمد، سید محی الدین قادری زور، اکبر وفا قانی، عبدالرحمن رئیس، اور نہ جانے کتنے درخشاں ستارے ہیں جن کے نام اب ذہن میں نہیں آرہے ہیں۔ ان کی متحدہ

سعی سے ملک کی سماجی، علمی اور ادبی زندگی میں وہ تجربات پروان چڑھی تھیں، جو اب جامعہ عثمانیہ کی روایات بن گئی ہیں۔

جامعہ کے ملحقہ اداروں میں سے دارالترجمہ بھی ایک درخشاں تاریخ رکھتا ہے۔ پہلے تو مولوی عبدالحق کی قیادت میں بعد کو مولوی عنایت اللہ کی سرکردگی میں یہ ادارہ ایسی ہستیوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، جو اپنے فن میں امامت کا درجہ رکھتے تھے۔ مترجمین میں مولانا عبداللہ العمادی، قاضی تلمذ حسین، ہاشمی فرید آبادی اور وضع اصلاحات کی کمیٹیوں میں پروفیسر وحیدالدین سلیم کے علاوہ علامہ علی حیدر، صدر یار جنگ، نظم طباطبائی کی شخصیت اب اردو ادب کے لیے ایک کلاسیکی شخصیت بن گئی ہے۔ شرر کا بھی اس ادارے سے علمی تعلق رہا اور کچھ عرصہ قبل ایک ادارے کے ناظم کی حیثیت سے علامہ شبلی نے یہیں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی تھی۔ جوش ناظر ادبی کی حیثیت سے دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔

انھیں علمی اور ادبی روایات کے پس منظر میں مخدوم محی الدین اور ان کی نسل کے نوجوان ابھرنے لگے۔ مخدوم شعبۂ اردو کے طالب علم رہے، اور شاید ہی شعبہ ان کی چھپی ہوئی ادبی صلاحیتوں کو صحیح طور پر بروئے کار لا سکتا تھا۔ ان کے یاران پیش گام میں اکبر وفا قانی، حبیب اللہ رشدی، ابوالکلام بدرالدین اور کئی نوجوان سخن سنج، شعر و ادب میں نئے تجربے کر رہے تھے اور تنقید اور تاریخی جائزوں میں نئی تحریک کے بانی ثابت ہو رہے تھے۔

ان نئی تحریکوں کے پس منظر میں مخدوم کے نیم سنجیدہ، نیم مزاحیہ گیت "پیلا دوشالہ" کی صدا گونجی تھی۔ کچھ اور گیت اور نظمیں بھی انھوں نے لکھی تھیں، لیکن "پیلا دوشالہ" جامعہ کی محفلوں کی روح رواں بن گیا تھا۔

اور اساتذہ کی طرح میں بھی مخدوم کی شعری صلاحیتوں سے ان کی ابتدائی نظموں کو سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جامعہ کی ادبی اور شعری روایات ایک اور عہد کی طرف قدم بڑھانے والی ہیں۔ اسی زمانے میں مخدوم اور میں ایک دن صدر کلیہ پروفیسر عبدالرحمٰن خاں کے دفتر میں گئے تھے۔ مجھے مخدوم کا تعارف ایک نودریافت ہونہار شاعر کی حیثیت سے کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے کچھ ایسے الفاظ میں ان کا تعارف کرایا تھا کہ عبدالرحمٰن خاں، قدیم معیار نظم و ضبط کے پابند استادنی، بظاہر مخدوم کے سامنے بہت زیادہ اثر پذیر ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ تاہم ان کے پیچھے ان کی شعری تخلیقات کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ اس وقت اقبال کی شاعری کی روایات میرے ذہن پر بہت حاوی تھیں۔ لیکن حالات نے ایک اور سمت میں میری توقعات کو پورا کیا۔

مخدوم ایم اے پاس کرنے کے بعد سٹی ہائی اسکول میں معلم ہو گئے۔ اس زمانے میں اردو ادب کچھ نئی تحریکوں سے روشناس ہونے لگا تھا۔ کچھ عالم اور ادیب جو یورپ میں کئی برس تک مقیم رہنے کے بعد وطن لوٹے تھے وہاں سے کچھ نئی ادبی اور فنی تحریکوں اور خاص طور پر مارکسی تحریک کے اثرات کو اپنے ساتھ لائے تھے۔

ہندوستان واپس ہونے کے بعد ان کی مساعی نے جس نئی ادبی تحریک کو ابھارا وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ مخدوم کے مارکسی نظریات کے زیر اثر آنے کا یہی زمانہ تھا، گو یہ تاثرات ابھی ان کی نظموں میں پختہ صورت میں ظاہر نہیں ہوئے تھے۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم، مخدوم اور میں ایک تقریب میں شریک تھے۔ کسی نے مخدوم سے اپنی کوئی نظم سنانے پر اصرار کیا۔ مخدوم نے ایک نظم سنائی جس کا عنوان غالباً "قلندر" تھا۔ نظم ختم ہوگئی تو خلیفہ عبدالحکیم نے جیسا کہ ان کی عادت تھی، ایک فقرہ چست کرنا چاہا تھا!

"تو یہ آپ کا نقشہ ہے۔"

اس پر مخدوم نے معاً جواب دیا۔

"کچھ آپ کا کچھ میرا۔"

مخدوم کی نظمیں اپنے تصورات کی ندرت اور اسالیب کی تازگی کی بدولت اسی زمانے میں جاذب توجہ بن گئی تھیں۔ اپنے نئے تصورات کو ظاہر کرنے کے لیے انھیں نئے نئے سانچے بھی برتنے پڑتے تھے۔ کچھ کلاسیکی معیاریت پسند ایسے بھی تھے جو اس غیر معتاد انداز کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک محفل میں مخدوم نے اپنی نظم پڑھی تھی جس میں غالباً "غبار مرمریں" کی ترکیب آگئی تھی۔ اس پر معیار پرست نقاد نے ناک بھوں چڑھا کر فرمایا تھا۔

"نوجوان شاعر، جو اپنے آپ کو استاد سے بے نیاز جانتے ہیں ایسی ہی غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔"

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ روایتی استادی اور شاگردی کا عہد اب بیت چکا تھا۔ اب نوجوان شاعر کی خداداد صلاحیتیں ہی اس کی معلم بن گئی تھیں۔

مخدوم نے اس زمانے میں غالباً یورپ کے بعض فنکاروں اور خاص طور پر فرانس کے فنکاروں کی رعایت سے لمبے بال بڑھائے تھے۔ اونچی ترکی ٹوپی اور گہرے نیلے رنگ کی شیروانی اور لمبے بڑھے ہوئے بال ان کی مقبولیت میں اس زمانے کے اکثر نوجوانوں کا عام لباس اور انداز بن گئے تھے۔

اس عرصہ میں میرا تقرر میسور یونیورسٹی میں ہوگیا، اور کوئی چھ برس تک میں زیادہ تر حیدرآباد سے باہر رہا اور حیدرآباد کی ادبی چہل پہل سے دور سا ہوگیا۔ مخدوم کے مارکسی میلانات نے جلد ہی انھیں سیاست کے میدان میں کھینچا — وہ اس دوران میں تلنگانہ کے دیہات کے ہیرو بن گئے تھے۔ ان کے معتقد نوجوانوں میں ان کے بارے میں کچھ دلچسپ قصے بھی مشہور ہوگئے تھے۔

مخدوم شاعری میں جس نہج پر پہلے پہل پڑ گئے تھے، اس کے اثر کے اہم پہلوؤں میں جذبات کی ملائمت اور غنائیت کو نمایاں جگہ حاصل تھی۔ نئے نظریات اور مارکسی جدلیاتی فلسفہ کے اثر نے ان کے لب و لہجہ میں سیاسی نعرہ بازی کا شائبہ بھی پیدا کر دیا تھا۔ تاہم موسیقیت، جو ان کی شاعری کا سب سے زیادہ موثر وصف ہے، اس

طرح کے اکثر نظموں میں بھی موجود ہے۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے تاثرات جب جزوِ فکر بنتے گئے، ان کی شاعری نئے آہنگ میں ڈھلنے لگی اور اس میں ایک نئی رومانیت ابھرنے لگی جس کا ایک مظہر ان کی غزل بھی ہے۔

مخدوم اپنے معاصر دوسرے سخن سنجوں کی طرح سماجی زندگی میں اونچ نیچ، آقائی، غلامی، جبر و استبداد اور استحصال کے خلاف نعرہ بلند کرتے رہے ہیں۔ ان کے لہجے میں بعض وقت کرختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم ان کے جذبات کے خلوص کی وجہ سے نظم کے تاثر میں استدلال پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر چاہتے ہیں جو طبقاتی نظام کی لعنت اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں سے پاک ہو۔ انھوں نے جس "سرخ سویرا" کا خواب دیکھا تھا، وہ ابھی طلوع نہیں ہوا اور خود ان کی فکر کی افتاد "گل تر" کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ یہ شاعر کے رخ ہیں، ابھی ان کے آگے زندگی ہے۔ ان کی فکر اور تخیل کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کی فکر ان بلندیوں کو چھو لے، جو ان کا آدرش رہی ہیں۔

Phone : { 43997 (General)
45282 (M. D. Personal)

Grams : "COOPGEN"

Co-operative General Insurance Society Limited.

Head Office : "Co-operative General Insurance Buildings"
Narayanguda, P. B. No. 212, Hyderabad-29.

TRANSACTS IN :

FIRE, MARINE, MOTOR, FIDELITY GUARANTEE, CASH-IN-TRANSIT, EMPLOYERS' LIABILITY, PERSONAL ACCIDENT, CATTLE INSURANCE AND ALL OTHER TYPES OF MISCELLANEOUS INSURANCES.

Co-operative Comprehensive Insurance (Package Policy)

SPECIAL SCHEME.

OUR BRANCH OFFICES :

Bombay, Bellary, Belgaum Calcutta, Delhi, Dhulia, Eluru, Guntur, Indore, Lucknow, Madras, Nellore, Nanded and Vizianagram

مطالعۂ مخدوم بتوسط شعر

عالم خوندمیری

یہ مضمون اصل میں مجلہ عثمانیہ کے "عثمانین نمبر" کے لیے لکھا گیا تھا، جب تک ایڈیٹر صاحب اصرار کرتے رہے میں مضمون نہ لکھ سکا اور جب مضمون تیار ہوا تو ایڈیٹر صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نئی شاعری کے افق پر نئے نئے ستارے طلوع ہو رہے ہیں اور اس موقع پر مخدوم کی شاعری اور شخصیت پر ایک اور مضمون کو لکھنے والے کی ذاتی عقیدت پر محمول کیا جائے گا لیکن میرا خیال ہے کہ اس قسم کا گمان مخدوم کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ ایک طرح کی ناانصافی ہوگی کیوں کہ آج بھی مخدوم ایک چمکتا ہوا ستارہ ہیں اور وہ آج بھی اردو شاعری میں اضافہ کر رہے ہیں۔ (عالم)

میں نے اپنے ایک مضمون "اردو ادب [illegible] سے [illegible] تک" میں مخدوم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دہے کی روح مخدوم کی شاعری میں جتنی زیادہ نمایاں ہے اس کی مثال بہت کم شاعروں کے پاس ملتی ہے۔ پانچ سال کے دوران میں یعنی ۱۹۳۵ء سے [illegible] تک مخدوم کے فن اور سماجی شعور نے ارتقاء کی منزلیں جس تیزی کے ساتھ طے کی ہیں اس کا اندازہ ان کی چند نظموں "جنگ"، "مشرق"، "زوال"، "آزادیٔ وطن"، "حویلی" اور "زلف چلیپا" سے ہو سکتا ہے۔ "جنگ" شاید ان کی پہلی سیاسی نظم ہے اور "زلف چلیپا" اس دہے کی آخری نظم۔ ان پر موت کی افسردگی اور خواہش مرگ نے کبھی حملہ نہیں کیا کیونکہ ان کا سماجی شعور اپنے دور سے ہم آہنگ تھا اور انھیں موت کے رقص میں بھی زندگی کا حسن نظر آتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کا سماجی شعور بڑھتا گیا ان کے اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ "اور گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے" گاتے گاتے وہ عملی انقلابیوں کی صف میں جا ملے۔" مخدوم کی زندگی میں یہ پانچ سال انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو بہت دیر میں دریافت کیا اور بہت تیزی سے حساب چکانے کی کوشش کی۔ ایک معصوم رومانی شاعر کی حیثیت سے اپنی شعری زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن شعری زندگی کا آغاز "حال" کے حسین تجربات کے اظہار سے نہیں کیا بلکہ حسین ماضی کی یادوں سے ان کی شاعری "عیش رفتہ" کے مرثیے سے شروع ہوئی۔ نہ جانے وہ کون سی

یاد تھی جس نے لاشعور کے تاروں کو چھیڑا اور ایک بڑی عمر کا الھڑ "نوجوان" ایک دم سے شاعر میں تبدیل ہوگیا اسی "یاد" کے (MOMENTUM) نے ان سے بہت سی رومانی نظمیں کہلوائیں، لیکن ان سب نظموں کا ایک مشترک عنصر ہے وہ ہے حسین تجربات کی یاد۔ اور شاعر سراپا انتظار ہے۔ اور شعور کی قریبی سطح پر یہ اندیشہ لرز رہا ہے کہ اب وہ "شخص" آنے گا نہیں اور یہ اندیشہ اس غمناک تمنا کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔

وہ آ بھی جاتا ہے کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلا
آ بھی جاتا ہے کہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

جب شعر کے چشمے پھوٹنے لگے تو معصوم محبت کا دور گزر چکا تھا اب صرف محبت کی معصوم یاد ہی کائنات بن سکتی تھی سالکؔ الٰہ کے پہلے دور کی شاعری میں ایک معصوم فضا تو ہے لیکن عشق کا اضطراب اور گرمی نہیں۔ ایک جنون انگیز کیفیت نہیں وہ وحشت و سراسیمگی نہیں جو واقعی عشق کی ایک لازمی کیفیت ہے۔ سجدہ تو ہے لیکن معشوق کے قدموں پر نہیں بلکہ ایک حسین یاد کے حضور میں۔ حسن کی قربت کا احساس تو ہے لیکن جسمانی سطح پر نہیں بلکہ ذہنی سطح پر۔ حسن کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ دن اور عشق میں بسر کی ہوئی چند راتیں شاعر کا سرمایہ حیات بن جاتی ہیں۔ یادیں واقعی تجربات کا بدل نہیں ہو سکتیں عشقیہ شاعری واقعی جسمانی عشق سے حاصل کے حسین تجربات سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔ یاد ایک سوگواری کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ نشاط کا حقیقی جذبہ نہیں لیکن یہاں شاعر کا ایک شخصیت کی حیثیت سے ایک حزنیہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں کہ یاد ہی اس کی کائنات ہے وہ حال کے ایک بے گیاہ دشت کو ماضی کی یادوں کی رو سے ایک چمن زار میں تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ بہت جلد ایک (BAD FAITH) کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے شعر کے تقاضوں کے بارے میں فرض کر لیتا ہے کہ وہ اُس کے نشہ میں چور ہیں اپنے آپ کو کبھی تو آغاز کلیوں اور کبھی ہی خوشبو اور پھولوں کا محبوب تصور کرنے لگتا ہے مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ دور طویل ہو جاتا تو شاعر کے دل میں ہوس کی آگ جلنے لگتی، اور عشق کا آتش کدہ ہوس کے جہنم میں جل جاتا لیکن شاعر کے ذوق سلیم نے اسے "خودکشی" سے محفوظ کر لیا اور اپنے سینے میں بغاوت کی آگ کو دہکتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اب وہ شاعر کی حیثیت سے ماضی کی غیر حقیقی رومانی یادوں کا محکوم نہیں، اب وہ "آزاد" ہے اس کا "حال" مفہوم کا حامل بن گیا ہے۔ وہ بغاوت کے شراروں سے نور حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی "انا" منور ہو جاتی ہے۔ اب وہ ماضی سے اپنا رشتہ یکسر منقطع کر لینا چاہتا ہے۔ اور "حال" اس کی توجہ کا مرکز بننے لگتا ہے۔ زمانے کے شعور کی بیداری کا لمحہ شاعر کی آزادی کا لمحہ ہے۔ زمانہ کا شعور حقیقت کے ادراک کے لیے ایک نئی آنکھ فراہم کرتا ہے۔ زمانے کے شعور کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے آپ کو ایک مخصوص تاریخی زمانے میں موجود پاتا ہے۔ اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص زمانے میں ہے۔ اور اسے یہ زندگی بسر کرنی ہے۔ زمانے کے تقاضے تیزی سے اس سے اپنے تقاضے منوانے لگے اور اس دور میں یہ سب عمل نظریہ کی سطح پر نہیں بلکہ "شعری شعور" کی سطح پر ہوا۔ اگر شاعر نے ایک نظریے کے ذریعہ اپنے عصر کی سب سے بڑی حقیقت کا ادراک کیا ہوتا تو شعر نظریے کے وزن کے نیچے دب جاتا لیکن اس کا شعور زندگی کے تجربات کا

آخر یہ وہ تھا اس کے دل کی دھڑکنیں زمانے کے اضطراب کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئیں، شاعر نے شعر کو "نجات" کا ایک ذریعہ بنا لیا اور شعر اجتماعی انتشار پر غالب آنے کا ایک وسیلہ بن گیا۔ اب اس کا ادب LITERATURE OF ENGAGEMENT کا ادب بن گیا، لیکن ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ زمانے کے ساتھ یہ تعلق خاطر ادب کے ادبی معیارات کی قربانی کا باعث نہ بنا۔ صرف چند نظموں میں لہجے کا جلال شعریت پر غالب نظر آتا ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی شعریت انقلابیت پر غالب ہے۔ خواہ جو یا زلف چلیپا، مشرق ہو یا انقلاب، ان نظموں میں نہ صرف روحِ عصر موجود ہے۔ بلکہ ایک ایسی شعری فضا ہے جو اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ شاعر در روحِ عصر کا ایک جزو نہ بن جائے۔ اس دور میں مخدوم بھی اپنے عہد کے دوسرے انقلابی شعراء کی طرح اپنے عہد کی یکتائی (UNIQUENESS) کا گہرا ادراک رکھتے ہیں، وہ بھی اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن اپنے عہد سے اس حد تک بلند ہونے کی کوشش نہیں کرتے، جہاں پہنچے بغیر اعلیٰ شاعری کی تخلیق ممکن نہیں، آنے والے دور کا ایمان انھیں تاریکی میں بھی نورِ سحر دیکھنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور موت کے رقص میں بھی انھیں ایک نئی زندگی کے ابھرنے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یقین اور ایمان کی یہ شدت انھیں مایوس ہونے سے بچا لیتی ہے۔ لیکن زندہ حقیقت سے دور کر دیتی ہے۔ اس دور کی صرف ایک نظم ایسی ہے جس میں مخدوم روحِ عصر کی نمائندگی کرتے ہوئے بھی شعری حیثیت سے اپنے قریبی ماضی سے بہت دور جا نکلتے ہیں۔ یہ نظم اندھیرا ہے۔ یہ ان کی پہلی آزاد نظم ہے۔ اور اب ماضی سے ان کا ربط پوری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ ہیئت کی یہ انقلابی تبدیلی شاعر کے مزاج کی بھی ایک اہم انقلابی تبدیلی ہے۔ یہ نظم کسی ایک مخصوص جنگ کے خلاف نہیں ہے بلکہ جنگ کے خلاف ایک ابدی صدائے احتجاج ہے۔ اس نظم کے ساتھ شاعر کی آزادی مکمل ہو جاتی ہے اور غالباً اپنے گروہ کے شعراء میں پہلی بار مخدوم نے اس ہیئت کا استعمال کیا۔ اس کمال کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت میں ایک تعطل پیدا ہو گیا، اس دور کی آخری قابلِ ذکر نظم "استالین" ہے جو قازقستان کے ایک شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں شاعر کی کشمکش اور اس کا ذہنی خلفشار پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند سال پہلے شاعر نے شاعری کو جو ذریعہ نجات بنایا تھا اب اس سے وہ مطمئن نہیں ہے۔ اب روحانی کشمکش اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ شعر اس کشمکش میں اس کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ "استالین" کا یہ بند صرف جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ نہیں بلکہ خود مخدوم کی ذہنی کشمکش کا ترجمان ہے۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا میں مجاہد نہ بنوں ؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
مرے پیارے ہیرے فردوس بدن کی خاطر

اب وہ اپنے دور کی کشمکش کا ایک زیادہ ذمہ دار مجاہد بننا چاہتا ہے۔ نغمہ سرائی اس کے ذوقِ عمل کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کر سکتی وہ اپنی زندگی کے ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں صرف عمل اس کی تشفی کر سکتا ہے اب تک وہ اپنی ذہنی

کشمکش اور اپنے دور کی سیاسی کشمکش کا شاعرانہ حل تلاش کرتا رہا تھا۔ تخلیق شعر کے لیے باہمہ و بے ہمہ رہنا ضروری ہے، شاعر وہی ہو سکتا ہے جو رزمگاہ کے قریب بھی ہو، اور حلقہ سے باہر بھی۔ انسانوں کے ہجوم میں نہ شعر کی تخلیق ہوئی اور نہ مذہب کی، حالانکہ ان دونوں کے مخاطب یہی انسانی ہجوم ہیں۔ ہجوم میں مل جانے کی آرزو اصل میں شاعر کے شعری حوصلے کی کمی کا ثبوت ہے۔ اب بہرحال اس نئی کشمکش کا حل ضروری تھا۔ شاعر نے حل ڈھونڈھ لیا لیکن بدقسمتی سے یہ حل "سیاسی" تھا۔ شعری کشمکش کے لیے سیاسی حل تلاش کیا گیا اور شاعر ایک طویل عرصے کے لیے سو گیا۔ زندگی کے ہنگاموں کو اس نے قریب سے دیکھنے کی کوشش کی یہ قرب کا نتیجہ ظاہر ہے کہ شاعرانہ سطح نہ ہو سکتی تھی۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ اس کے نغمے اس کے ہم وطنوں کے دل میں زندگی اور مسرت بن کر سما جائیں لیکن اب انسانوں کے ہجوم میں شامل ہو کر اس نے محسوس کیا کہ ان انسانوں کو اس کے نغموں کی نہیں، اس کی خطابت کی ضرورت ہے۔ خطابت شعر کی قربانی کی طلبگار ہوئی اور شاعر کی بارگاہ میں اپنی شاعرانہ صلاحیت کو جو اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، نذر کر دیا۔ شاعر نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ اس نے اپنی اصل شخصیت کو قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہجوم میں مل جانا اپنی شخصیت کو کھو دینا اور بے نام (ANONYMOUS) ہو جاتا ہے۔ اب اس نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کو ایک بے نام اجتماعیت میں ضم کر دیا، شاعر اصل میں شعر کے ذریعہ اپنی انفرادی بقا چاہتا ہے اور اسی لیے ایک سنجیدہ شاعر کے لیے "شعر" "ذریعہ نجات" بن جاتا ہے۔ شاید شعر شاعر کے اکسیر نہ بن سکا۔ اس نے عمل اور خصوصاً سیاسی عمل میں ایک اکسیر کی تلاش کی وہ نہ صرف خود فنا سے محفوظ رہنا چاہتا تھا بلکہ ایک نئی دنیا کی تخلیق کے عمل کو سیاسی جدوجہد میں شریک ہو کر تیز تر کرنا چاہتا تھا۔ برسوں اس پر یہ نشہ طاری رہا۔ اب اس نے ایک ایسے فلسفۂ حیات کو قبول کر لیا تھا جس میں قطعیت، حتمی یقین تھا اور جامعیت بھی۔ برسوں کے تھکے ہوئے ذہن کو جسے کشمکش نے پارہ پارہ کر دیا تھا ایک سکون ملا۔ جذبے کی شدت دور ہو چکی تھی، یعنی شعر کے سرچشمے خشک ہو چکے تھے، لیکن شاعر نے اپنے شعری خلوص کو باقی رکھا اور اپنی قربانی کی قدر کی۔ اب یہ بات آسان تھی کہ وہ مارکسزم کو منظوم کرتا یا مزدوروں کے لیے ولولہ انگیز نظمیں لکھتا، جن کے لیے فن پر ذرا سی قدرت کافی تھی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۰ء تک کے پورے دور میں مخدوم کا سب سے زیادہ قابل ذکر شعری کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کوئی نظم نہیں لکھی اور کوئی شعر نہیں کہا۔ بحری ملاحوں کی ہڑتال بھی ہوئی اور ہندوستان کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ فرقہ داری فسادات بھی ہوئے اور خود اس کے وطن میں "تلنگانہ" کی جدوجہد بھی بڑھتی رہی، لیکن شاعر سوتا رہا، صرف ایک بار خفت مٹانے کے لیے اس نے ایک نظم کہی جس کا عنوان تھا "تلنگانہ"۔ "تلنگانہ" پر سب ہی ترقی پسند شاعر نظمیں لکھ رہے تھے افسانہ نویس افسانے لکھ رہے تھے اور صحافی اپنے آتشیں قلم سے آگ بکھیر رہے تھے ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جنھوں نے صرف تلنگانہ کا نام سنا تھا اور جدوجہد کی داستانیں اڑتے اڑتے سنی تھیں۔ شاید اس کی "حمیت" نے گوارا نہ کیا کہ وہ ایسے "ہنگام قیامت" میں خاموش رہے۔ لیکن ہنگام قیامت صرف اعمال کا محاسبہ ہو سکتا ہے۔ شعر نہیں کہا جا سکتا۔ مسلح جدوجہد ایک ایسے موڑ پر آئی جہاں وہ خود اپنی نفی کرنے لگی اور بہت جلد اس کی بے اثری ظاہر ہونے لگی، اس جدوجہد کا زور ٹوٹا مخدوم جیل پہنچے۔ اب انھیں پہلی بار اپنے محبوب یعنی عوام سے فراق نصیب ہوا۔ یہ فراق "شاعر" کے لیے ضروری تھا۔ تخلیق عزلت چاہتی ہے۔ شاعر نے دور سے

صبا

عوام کی آوازیں سنیں، شاہراہوں پر راہروؤں کے ہجوم کو چشم تخیل سے دیکھا، ماضی کی یاد پھر سے اُبھرنے لگیں، جدوجہد کی شکست، در بدری کا غم عوام کی دوری سے پیدا ہونے والا سکون، ماضی کی یادوں کا ہجوم ان سب عوامل نے شعری تخلیق کو اکسایا اور پھر ایک بار شاعر نے اپنی ذہنی کش مکش کا علاج شعر میں تلاش کیا۔ "قید" مخدوم کی (SYMBOLIC) اشاریاتی نظم ہے۔ اب شاعر واپس آچکا تھا، اور دائرہ مکمل تھا۔ اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قید خانے میں لکھی گئی۔ لیکن اس میں زنداں کی گھٹن اور مایوسی نہیں ہے۔ قید نے شاعر کے لیے ایک "عزلت" فراہم کی جس کی شاعر کو لاشعوری طور پر خواہش تھی، وہ ایک طویل میعاد کی قید چاہتا تھا، تاکہ وہ حقیقت کا موضوعی حیثیت سے ادراک کرسکے۔ زندگی کے یہ لمحات جب زندگانی کی ایک ایک بات کی یاد آتی تھی، سیاسی مصروفیت کے ان لمحات سے بہتر نظر آنے لگے جب حال بھی اور مستقبل سے پوری طرح کٹ چکا تھا۔ قید نے شاعر کو پھر ایک بار انفرادیت بخشی اور انسانوں کے ہجوم سے نکالا لیکن شاعر کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ قید جس کے بارے میں اس کا خیال یہ تھا کہ اس کی کوئی میعاد نہیں ہے۔ مختصر ثابت ہوئی۔ شاعر انسانوں کے ہجوم میں مل گیا۔ اور شعری تخلیق کا یہ لمحہ ایک طویل عرصے تک واپس نہ آسکا۔ سیاسی واقعات نے کام ان کی ایک غیر حقیقی فضا پیدا کردی۔ اور پھر ایک بار شاعر سمندر کی ایک موج بن گیا۔ شعری حس کی بیداری کے لیے اس غیر حقیقی فضا کا ختم ہونا اور شکست کے احساس کا پھر ایک بار ابھرنا ضروری تھا، لیکن محض سیاسی شکست اور اجتماعی نقصان شاعر کو بیدار نہیں کرسکتا، یہ ضرب بہت گہری تھی اور ایک خاتون ضرب ہی شاعر کو بیدار کرسکتی تھی۔ "قید" اور "چارہ گر" کے درمیان پانچ یا چھ سال کا وقفہ ہے۔ اور اب "چارہ گر" کا "خالق" وہ نہیں ہے جو استالین یا انقلاب کا عاشق تھا۔ صرف زندہ شخصیت کے ان دو رخوں کو جدا نہیں کرنا بلکہ ایک نئی شخصیت ابھرتی نظر آتی ہے، چارہ گر کا مصنف زندگی کی ایک نئی حقیقت کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ ابھی تک یہ حقیقت اپنی شدت کے ساتھ شاعر پر ظاہر نہ ہوسکی تھی۔ اب تک "اجتماعی نجات" اور "انفرادی نجات" ہم معنی تھے، شاعر اس عظیم فریب کا شکار تھا کہ اس کے "چارہ گر" کے پاس ایک ایسا اکسیر اعظم موجود ہے جو ہر قسم کی تشنگی کو سیراب کرسکتا ہے۔ لیکن زندگی کے موڑ پر اس نے یہ بات سیکھی کہ انسانی حیات کے چند ایسے ابدی سوال بھی ہیں جو ہر سماجی تنظیم کے لیے اور نظریۂ حیات کے لیے ایک چیلنج بن سکتے ہیں۔ وہ پرانے عالم کا ایک فرد تھا نئی دنیا کا علمبردار، اس کی یہ نئی دنیا صرف خوابوں اور تمناؤں کی دنیا نہیں تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ انسانوں نے ایک خطۂ ارض پر اس نئی دنیا کی تعمیر کرلی ہے جو تمام ترقی ہے۔ اور جہاں انسانوں نے وہ تمام مسائل حل کرلیے ہیں جو وہ مسائل پرانی دنیا میں ابھی تک انسانی ذہانت کے لیے چیلنج بنے ہوئے ہیں، اس نے اس "نئی دنیا" کو اکسس... "ارض حسین" کو قریب سے دیکھا اور "تو تسخیر" سے ایک سیاست داں کی حیثیت سے نہیں (جو وہ کبھی نہ بن سکا) بلکہ ایک بیدار ذہن رکھنے والے شاعر کی حیثیت سے دیکھا، کہتے ہیں کہ اس نئی دنیا نے اس "سیاح" کا شاندار استقبال کیا لیکن وہ ایک مطمئن قلب کے ساتھ واپس نہ آسکا۔ شاید اس نے یہ محسوس کیا کہ انسانی زندگی کے بے شمار تجربوں میں ایک تجربہ ایسا بھی ہے جو مکانی اور زمانی حدود کو توڑ دیتا ہے اور یہ تجربہ "انسانی محبت" کا ہے۔ "چارہ گر" کے دو جلن انسانی محبت کے ازلی اور ابدی حزنیے کی علامت ہیں۔

اس نظم کا یہ حصہ۔

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے میناروں نے دیکھا انہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
مےکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں

ازل تا ابد

یہ حصہ اس نظم کا بلکہ شاعر کی زندگی کا ایک فیصلہ کن موڑ ہے۔ یہ ایسی معصوم محبت نہیں جس پر خدا مسکرائے۔ اس محبت پر نہ حوریں غزل خواں ہو سکتی ہیں اور نہ یہ محبت سرور سرمدی سے زندگی کو معمور کر سکتی ہے۔ یہ وہ محبت ہے۔ جو زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ اور جس کا انجام "موت" ہے۔ یہ انسان کی خود تخریبی (SELF DISTRUCTION) میلانات کی آفریدہ ہے اور اسی لیے یہ محبت ہر سماج کے لیے ایک چیلنج ہے۔ یا ہر سماجی تنظیم ایسی محبت کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے انسانی زندگی کے سب سے زیادہ بنیادی سوال کو پیش کیا ہے۔ اور نظم کی خوبی یہ ہے کہ وہ سوال پر ختم ہوتی ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں کسی صبح نو کی بشارت ملتی ہے اور نہ شاعر پیغمبرانہ انداز سے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اب تک عوام اس کی نظم کا موضوع تھے اب انسانی فرد اس کا موضوع سخن ہیں، وہ انسانی فرد جن کا سماجی لباس اتار دیا گیا ہے جو نہ تو تاریخ کے آفریدہ ہیں اور نہ تاریخ بناتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں مظلوم رہے ہیں کیوں کہ تاریخ کے دور نے انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وہ انسانی فرد ہیں جو دور حجر (STONE AGE) کے انسان کو جوہری دور کے انسان سے مربوط کرتے ہیں، یہی وہ انسانی وجود ہیں جو مشرق اور مغرب کی "مشترک قدر" ہیں۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں جو "چاند تاروں کا بن" کے بارے میں لکھا تھا اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "چارہ گر" میں ایک صحت مند تشکیک کا آغاز ہوا تھا" چند دنوں سے اردو کے ادبی حلقوں میں تشکیک کا لفظ موضوع بحث بن گیا ہے۔ لیکن اب میرا خیال یہ ہے کہ یہ نظم تشکیک کے دور کے گزر جانے کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں شک نہیں ہے یقین اور اس یقین سے پیدا ہونے والا غم ہے کہ انسانی وجود کی گتھیوں کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ کوئی ماحول ایسا نہیں ہو سکتا جس میں انسان، کائنات اور سماج میں "اجنبیت" کے احساس سے نجات حاصل کر سکے۔ انسان اور کائنات انسان اور انسان اور انسان اور سماج کا تصادم چند ایسے واقعات ہیں جو انسانی زندگی ہی سے وابستہ ہیں۔ صرف محبت کے مختصر لمحات میں ایک نسبتاً حقیقی ربط قائم ہو سکتا ہے "انسانی جسم" اور جسموں کے اتحاد" ہی سے انسان اور کائنات اور انسان اور انسان میں ربط قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسرے غیر معقول رشتے جن کی نمائندگی مندر، مسجد اور سماج کرتے ہیں۔ اس ربط کے دشمن ہیں۔ اس نظم کے تحت شاعر ایک نئی دنیا کا مسافر بن جاتا ہے۔ اس سے پہلے اس کے ذہن میں نئے سوالات ابھرتے تھے، اور نئی حقیقتوں کی اس نے جھلک دیکھی تھی۔ اس نے اب "قطعیت" کی تمام دیواروں کو توڑ دیا ہے۔ سیاست اور شعر کی دنیا میں

بظاہر الگ ہو جاتی ہیں لیکن ان دونوں میں ایک گہرا ربط بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اب سیاسی عمل کسی اُمید اور تمنا کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بلکہ شخصیت کے تسلسل کو باقی رکھنے کا ایک سہارا ہے۔ اس نئی حقیقت کے انکشاف نے جس کا اظہار "چارہ گر" میں ہوا ہے شاعر کے ماضی اور حال کے درمیان ایک رخنہ پیدا کر دیا ہے۔ سیاست ان دونوں لمحات میں ایک تسلسل قائم رکھتی ہے۔ زندگی کے اس المیے کا احساس "چارہ گر" کے بعد کی تمام نظموں میں مشترک ہے (تمام کا مطلب تین چار نظمیں جو اس کے بعد لکھی گئیں) المیے کا یہ احساس "چاند تاروں کا بن" میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور آزادی کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ نظم انسانی زندگی کے بنیادی المیے کی ایک داستان بن جاتی ہے۔ اب شاعر کا حقیقت کا ادراک اتنا شدید ہو گیا ہے کہ وہ وقتی ہر سوال میں ایک ابدی سوال کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ انسان نے سرور اور مسرت کے حصول کو اپنا انتہائے مقصود بنایا لیکن مسرت اور سرور کے لمحات وہی رہے جب اس کے دوش پر صلیب تھی یوں کہئے کو "چاند تاروں کا بن" مخدوم کی ایک سیاسی نظم ہے اور اس کا موضوع ہندوستانی تاریخ کے چند فیصلہ کن لمحات ہیں، لیکن اس نظم میں شاعر کی ذات کا غم اور تاریخ کا غم ایک خوبصورت آہنگ میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ اگر شاعر تاریخ کا ایک المناک جزو بن جاتا ہے تو تاریخ بھی ایک حساس شاعر کے غم اور اندوہ کی دردناک گواہ بن جاتی ہے۔ تاریخ کے ان تین ادوار میں بظاہر کوئی عنصر مشترک نہیں، ایک دور تو وہ تھا جب چاند تاروں کا بن جگمگا رہا تھا اور "بادہ خوار" تشنگی میں بھی ایک سرشاری محسوس کر رہے تھے، ان کے دلوں میں امید کا ایک چراغ روشن تھا۔ اور "پیاسی آنکھوں کے خالی کٹوروں" میں تمنا کی شراب چھلک رہی تھی، دوسرا لمحہ وہ آیا جب اُمید کے چراغ گل ہو گئے اور وہی عناصر جو رات کی تاریکی میں روشنی کا سامان فراہم کر رہے تھے یکدم انسانوں کی تقسیم کا سبب بن گئے۔ تیسرا دور پھر ایک بار امید اور تمنا کا پیامبر بنتا ہے۔ لیکن اب شاعر نے زندگی کے مکتب سے ایک نیا سبق سیکھا ہے۔ اور وہ کسی ایسی صبح نو کا منتظر نہیں جس میں صرف اجالا ہو گا اور یہ صبح اندھیرے سے پاک ہوگی اب کی شاعر کی بصیرت ایسی منزل کا پتہ دے رہی ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے دار سے گزرنا ہو گا، اس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک نئے جنوں کی ضرورت ہے اب خرد کے سہارے بھلانے ٹوٹ چکے ہیں اب وہی کام انہوں کے جنون عشق کا راستہ ہو گا۔ انھیں تنہائیوں کی کٹھن منزلوں سے گزرنا ہوگا۔ یہ سماج اور اجتماعی زندگی کے لیے اجنبی ہوں گے۔ "تنہائی" اور "اجنبیت" کا یہ دردناک احساس مخدوم کی غزلوں میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اب شاعر کی زندگی اس موڑ پر پہنچ گئی ہے جہاں اس کا تخیل منتشر ہو جاتا ہے اور کوئی ایک خارجی عنصر اس کو مزید سہارا نہیں دے سکتا۔ انتشار تخیل، انتشار خیال نہیں ہے۔ کیوں کہ اب کوئی "خیال" ایسا نہیں ہے جو شاعر کی ذہنی اور روحانی نجات کا ضامن ہو سکے۔ وہ اپنے آپ کو انسانوں کے اس ہجوم میں تنہا پاتا ہے لیکن اسے ہجوم سے اتنی محبت ہے کہ وہ ہجوم سے رشتہ توڑ نہیں سکتا۔ عقیدوں میں عقلی اپیل باقی نہیں رہی لیکن شاعر ابھی تک جذباتی طور پر ان عقیدوں سے اس حد تک وابستہ ہے کہ یہی جذباتی وابستگی "خرد" اور "جنوں" کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہوئی ہے۔ اس وقت کے شاعر کا ذہنی موڈ، مجاز کی نظم کے "آوارہ" کے ذہنی موڈ سے مختلف نہیں لیکن فرق یہ ہے کہ ابھی "پاس گریباں" باقی ہے اور اسی عالم میں "پاس گریباں" کا خیال ایک نئے شاعرانہ بحران کی تخلیق کرتا ہے۔ اور اردو ادب کی سب سے قدیم صنف سخن اس کے لیے ایک سہارا بن جاتی ہے۔ اس صنف سخن میں تحریف (DISTORTION) کی جتنی زیادہ گنجائش ہے وہ کسی دوسری صنف سخن میں نہیں، غزل میں تحریف کا عمل اس انداز سے ہوتا ہے کہ

اصل حقیقت تحریف کا شکار ہونے کے بعد بھی اداس نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مخدوم نے غزل کو شعوری طور پر نہیں بلکہ لاشعوری طور پر اپنایا ہے۔ نظم سے غزل کی جانب ان کا سفر ان کے شاعرانہ مزاج کی تبدیلی کا ایک ناگزیر نتیجہ نظر آتا ہے۔ شاعر کو جس "نئی آزادی" کی ضرورت تھی وہ غزل میں اس کو حاصل ہوئی۔ تنہائی، سوگواری، ماحول سے بیزاری، خستگی اور بحران تمام چیزوں کے اظہار میں ایک تامل اور تکلف...... اب ان حالات میں شاعر کے غزل کے دامن میں پناہ لینے کو ایک "حادثہ اتفاقی" نہیں کہا جا سکتا۔ غزل کی جانب رجحان ایک حادثہ اتفاقی نہیں لیکن ایک "اتفاقی حادثہ" نے شاید اس رجحان کو تیز تر کر دیا۔ زندگی کے بیزار کن سفر میں، جس میں یکسانیت اور اکتا دینے والی ایک رنگی پیدا ہو چلی تھی۔ یکایک ایک "اجنبی جانِ غزل" سے تصادم ہو گیا۔ شاعر ان گریز پا لمحات کو مقید کر لینا چاہتا ہے۔ اب زندگی کی تمنا کو باقی رکھنے اور شعلۂ حیات کو بھڑکانے کے لئے ایک "جانِ غزل" ضروری ہے۔ شاعر اس کرب آمیز احساس کا شکار ہے کہ سارے ماحول پر افسردگی، ہزیمت اور شکست خوردگی کے آثار ہیں۔ جل جانے اور پگھل جانے کی تمنا جو زندگی کی علامت ہے، مفقود ہو چکی ہے۔ ایک عشقِ جنون خیز ہی زندگی میں معنی اور مفہوم پیدا کر سکتا ہے۔ رات کٹتی ہوئی نظر نہیں آتی اب زندگی کا مقصد کسی منزل کی تلاش نہیں ہے شاعر کی بصیرت نے آنے والی منزل کی بے مائیگی کا پہلے ہی سے مشاہدہ کر لیا ہے۔ اب رات کا کٹ جانا ہی ایک بڑی بات ہے۔ ماحول سے بیزاری اور خود شاعر کی خستگی کا کتنا خوب صورت اظہار ہے۔

کوئی جلتا ہی نہیں، کوئی پگھلتا ہی نہیں ؎ موم بن جاؤ، پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

کبھی کبھی شاعر ایک دردمند تماشائی بن جاتا ہے۔ جو ہجوم میں شامل تو ہے لیکن اسے اپنی ذات اور ہجوم کے درمیان ایک اجنبیت کی دیوار نظر آتی ہے۔ اس کے شعور کی قریبی سطح پر یہ خوف لرز رہا ہے کہ کہیں وہ ایک اجنبی وجود تو نہیں ہے اسی لئے وہ ہر ایک کے دل میں اتر کر اس انسانیت کی تلاش کرنا چاہتا ہے جو بظاہر انسانوں میں مفقود نظر آتی ہے۔

دل میں اتر کے سیرِ دل رہرواں کریں ؎ آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں

ماحول کی یکسانی اور یک رنگی، راہ روؤں کی بے دلی، انسانوں میں غمگساری کا فقدان، فکر و نظر کے از کار رفتہ معیارات کی مستقل حکمرانی، یہ ایسے واقعات ہیں جنھوں نے شاعر کے شعور کو اس حد تک اندوہناک بنا دیا ہے کہ اب اسے انسانوں کی بستیوں میں زندگی کے آثار تک نظر نہیں آتے۔ انسانوں کے احساس کی موت کا کتنا دردناک منظر ہے کہ

نہ کسی آہ کی آواز، نہ زنجیر کا شور ؎ آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

عصرِ حاضر کے انسانوں کی بے یقینی اور ایک حساس شاعر کے اضطراب کی کتنی مکمل تصویر ہے۔

گل ہے قندیلِ حرم گل ہیں کلیسا کے چراغ ؎ سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

ایسے افسردہ کن ماحول میں جہاں مصروضیت کا سکہ چلتا ہو اور جہاں ہنستے سود و زیاں کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہو، حساس ذہنوں کا مائل بہ جنون ہو جانا ناممکن بات نہیں۔ کون جانے کہ یہی "دیوانے" انسانیت کی اعلیٰ ترین قدروں کے محافظ ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ "جنون" مصروضیت کے استبداد کے خلاف بغاوت کی انتہائی شکل ہو اور ادراک کے غیر معمولی امکانات کا حامل۔

مجاز کا آوارہ اسی قسم کا ایک باغی فرد ہے جو صرف سماج کے چند خارجی اداروں کے خلاف بغاوت نہیں کرتا بلکہ موضوعیت کی ایک انتہائی شکل کو پیش کرتا ہے۔ اسی غزل کے ایک شعر نے جنوں کی پیاری فضا فراہم کردی ہے اور شاعر کی ایک وحشت ناک کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب ؛ کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ

گرد و پیش کے سارے حالات، شاعر کو عام انسانوں سے کامل طور پر "اجنبی" بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن چند ایسے عناصر بھی ہیں جو شاعر کا دامن تھام لیتے ہیں ایک عنصر تو شاعر کا قدیم فلسفۂ حیات ہے جو کبھی کبھی ہی سہی لیکن اندھیرے میں امید کی ایک چنگاری روشن کر دیتا ہے لیکن اس سے زیادہ موثر عنصر وہ "اجنبی جانِ غزل" ہے جس کے رخسار کی چاندنی نے زندگی کی راہوں کے سارے پیچ و خم کھول دیئے اور جس نے زندگی کے نئے امکانات کے چراغ روشن کر دیئے۔ محبت ایک "جذبۂ رائگاں" ہی سہی لیکن اسی کے طفیل چند لمحات کے لیئے انسان اور کائنات کے درمیان ایک روشن تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ شاعر کے لیئے اب محبت ایک اکسیر بن جاتی ہے۔ یہ محبت بنیادی طور پر جسمانی ہے اور جسمانی اتحاد (PHYSICAL SOLIDARITY) کے امکانات ہی زندگی کی اندھیری راہوں میں روشنی کی ایک کرن فراہم کرتے ہیں۔ شاعری اسی امکان کی ترجمانی بن جاتی ہے۔

تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں ؛ کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

ہو سکتا ہے کہ اکثر عمل پسندوں کو ایک شاعرِ انقلاب کا یہ انجام عبرت ناک معلوم ہو لیکن کیا کیا جائے کہ خود انسان ایک "جذبۂ رائیگاں" ہے جسمانی اتحاد کا یہ امکان رنگ و بو کی ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے اور زندگی کا ایک نیا مقصد جنم لیتا ہے۔

تجھی کو دل سے لگا لیں، تجھی کو پیار کریں ؛ شمیمِ پیرہنِ یار کیا نثار کریں

میں یہ نہیں کہتا کہ مخدوم کی غزل ایک نئی آواز ہے۔ نئی آواز کیلئے اور خصوصاً غزل میں نئی آواز کے لیئے ایک بہت بڑی شخصیت کی ضرورت ہے، جب غزل کے اکثر تاجداروں کی آوازیں پرانی آوازوں کی گونج سنائی دیتی ہے تو پھر ایک ایسے نو وارد کے بارے میں جس نے ابھی تک غزل کے فن پر بھی قابو حاصل نہیں کیا ہے یہ جرأت آمیز بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ اس مضمون کا مقصد ادبی تنقید نہیں بلکہ شعر کے آئینے میں ایک شخصیت کا مطالعہ ہے اور اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مخدوم کی غزل صرف روایتی نہیں ہے۔ ہر چند کہ وہ روایت محض سے اپنا دامن بچا بھی نہ سکے، ان کی نظموں کی طرح بہ حیثیت مجموعی ان کی غزلیں بھی حقیقی حادثات کی شاعرانہ صدائے بازگشت ہیں جب کہ یہ حادثہ وہی ازلی اور ابدی حادثہ ہو جسے محبت کہا جاتا ہے اور جو ایک "طفلانہ حرکت" کو بھی خوبصورت شعری پیکر عطا کر دیتا ہے۔

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں ؛ کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

لیکن مشکل یہ ہے کہ محبت ایک منتشر شخصیت کو کچھ دیر کے لیے اپنے "دامنِ عافیت" میں جگہ دے سکتی ہے۔ لیکن اس منتشر شخصیت کے اجزا کو ایک مستقل رشتے میں پرو نہیں سکتی، اور جب شخصیت کا انتشار اس منزل تک پہنچ گیا ہو کہ ہر سایہ پر "جانِ غزل" کا دھوکا ہونے لگے اور ہر نوا پر "شعلہ نوائی" کا گمان ہونے لگے تو پھر نہ صرف غزل کی بلکہ خود شخصیت کی بھی "بے آبروئی" کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کم از کم شاعری کو ایک "جذبۂ رائیگاں" نہیں بننا چاہیئے۔

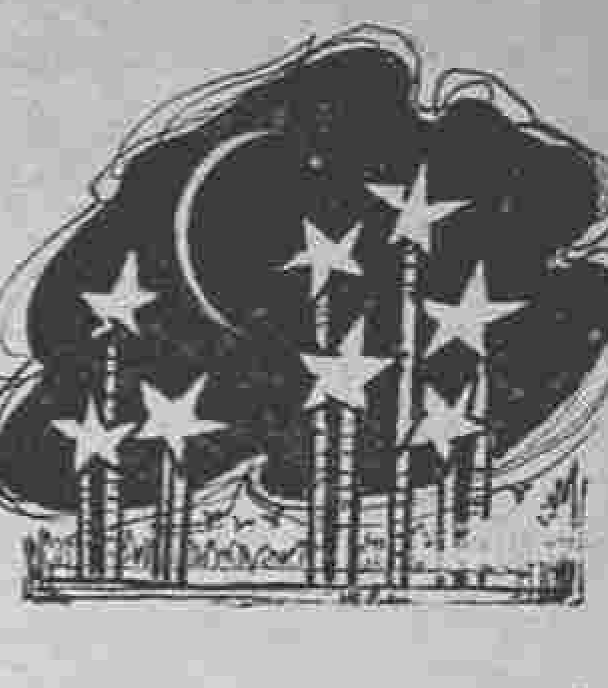

مخدوم کی ایک نظم

"چاند تاروں کا بن"

عالم خوند میری

● اگر میں یہ کہوں کہ پچھلے پانچ چھ سال میں مخدوم نے اتنی خوبصورت اور مکمل نظم نہیں لکھی تو شاید کسی کو اچنبھا نہ ہو یوں بھی اس دوران میں مخدوم نے بہت سی نظمیں نہیں لکھیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ ہماری نسل کی پچھلی بیس سال کی ذہنی اور جذباتی کشمکش، ہمارے روحانی اضطراب، ہمارے خوابوں، ہماری آرزوؤں اور ہماری تمناؤں کے تصادم اور ہماری زمانہ گی اور ہماری حسرتوں کی ایسی خوبصورت اور اتنی مکمل جذباتی تصویر جس میں انتہا درجہ کا فنکارانہ حسن بھی ہے اور حقیقت کا بے پناہ ادراک بھی مشکل ہی سے ملے گی تو ممکن ہے کہ بعض ناقدانِ ادب میرے اس دعوے پر چونک جائیں۔ میں شعر و ادب کے میدان میں مقابلہ اور موازنہ کی افادیت کا بڑی حد تک منکر ہوں اور میں اس بات کا قائل نہیں کہ مختلف شاعروں اور فنکاروں کے درمیان تقابل ادبی تنقید اور تبصرے کا کوئی لازمی عنصر ہے۔ شاید ہی ایسا ہوا ہے کہ کامل حقیقت کا ادراک کسی ایک شاعر یا فنکار نے کیا ہو۔ یہ بات آسان ہے نہ ممکن ـــ شاعر ہو یا فنکار یا عام آدمی ذہن انسانی پر حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ منکشف نہیں ہوتی حقیقت کا انکشاف ایک طویل اور تخلیقی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اس میں ظرف قدح فرار کو بھی دخل ہے اور کچھ قدرت کی فیاضی کو بھی، تو کسی نے کم کسی نے زیادہ ادراک کیا ہو تو اس میں مقابلہ اور موازنہ کی گنجائش کہاں؟ بہر حال میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ پچھلے چند برسوں میں اس سے زیادہ خوبصورت اور اور اس سے زیادہ مکمل نظم نہیں لکھی گئی۔ ایسی بات سمجھنے کے لیے بڑی جہالت اور ایسی جہالت سے پیدا ہونے والی خود اعتقادی کی ضرورت ہے۔ مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس موضوع پر جتنی نظمیں لکھی گئیں ان میں اس نظم کو بہت اونچا مقام حاصل ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مکمل بھی ہے اور مختصر بھی۔ آج کل

جب کہ طویل نظموں کا مذاق عروج پر ہے شاید اس بات کو تسلیم کرنے میں وقت محسوس ہو کہ مختصر نظم میں ایک عظیم موضوع کے ساتھ انصاف ممکن ہے۔ میں طویل نظموں کا مخالف نہیں نئی نسل کے بعض شاعروں نے اردو ادب کو کئی ایک طویل اور خوبصورت نظمیں عطا کی ہیں لیکن اس واقعہ کو نظر انداز کرنا آسان نہیں کہ ایک طویل نظم میں ایک خاص جذباتی رفتار کو قائم رکھنا اور ایک مخصوص جذباتی کیفیت کو باقی رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جذبے کی عمر مختصر ہوتی ہے اور جذباتی کشاکش بہت دیر تک قائم نہیں رہتی۔ اس نظم میں مجھے ایک بہتے ہوئے دریا کی روانی نظر آتی ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے اور ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک ساتھ بڑھتا نظر آتے ہیں یہ ہماری عصری قومی زندگی کے تین لمحوں کی تصویر ہے۔ لمحے جن کا شاعر نے دور سے مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ لمحے ہیں خود شاعر کی روح اور زندگی پر چھائے ہوئے رہے۔ یہ کسی ہم سائے غم کا نہیں جیسے ایک حساس شاعرانہ ذہن نے انتہائی واقعیت، کمال ایمانداری اور صد درجہ فنکارانہ ہمدردی کے ساتھ خوبصورت انداز میں پیش کر دیا ہو۔ اس نظم میں روایتی غم داروں ہے اور نہ روایتی غم جاناں اور نہ جذباتی نوع کا غم ذات۔ یہ تمام غم جو اصل میں ایک گہرے اور وسیع کائناتی غم کے مظاہر ہیں۔ ایک ساتھ کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غم اور امید، آرزو اور شکست آرزو، تاریکی اور روشنی کا توازن اور ترنم اس نظم کی مجھے ایک نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے "موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن"۔ اور رات بھر جھلملاتا رہا۔ چاند تاروں کا بن" اس توازن کی کتنی خوبصورت فراہم کرتے ہیں۔ "موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن"۔ یہ مصرعہ مجھے تاریخ کے ایک ابدی خزینے کی یاد دلاتا ہے شاید انسان کی تقدیر ہے کہ وہ جلتا رہے۔ انسانی تبدیلی اور انقلاب کے خواب دیکھتا ہے۔ ماضی اور حال کے غم سے نجات پانے کے لئے ایک حسین مستقبل کی تمنا کرتا ہے لیکن جب مستقبل حال کا روپ اختیار کر لیتا ہے تو تمنا اور حقیقت خواب اور اس کی تعبیر کی ازلی اور ابدی کشمکش جلوہ گر ہو جاتی ہے پیار کی منزلیں دار کی منزلیں بن جاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ شاعر کے ذہن کی شعوری سطح پر تاریخ کا صرف ایک لمحہ ہو اور اس کی نظر امکان کے ایک نقطہ یا چند نقاط پر مرکوز ہو لیکن انسان آزادی آگ اور خون کا ایک ڈرامہ ہے۔" اس چمن گل میں شعلے بھی ہیں شبنم بھی" بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ صرف شبنم کی حکمرانی ہو۔ زندگی کا خزینہ تو یہ ہے کہ جنت اور جہنم ایک ساتھ رہتے ہیں اور ایک صوفی شاعر کے الفاظ میں "دوزخ کی گرمی ہی سے جنت کے پھل پکتے ہیں"۔ اس نظم میں مجھے ہندوستان کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی کراہیں بھی سنائی دیتی ہیں اور الجزائر کے مظلوموں کی دردناک آہیں بھی۔ ان معصوم عوام کی دلدوز چیخیں بھی جو چند "امامانِ مکر و فن" کے شوق قیادت کی قربان گاہ پر شہید ہوئے اور آزادی کے ان متوالے جانبازوں کی دبی دبی آہیں بھی ابھرتی ہیں جو تاریخ کے جبر کا شکار ہوئے روشنی اور نور کا وہ شہر جو ابھی ابھی بہت قریب نظر آ رہا تھا یکدم نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے یہ اندھیرا صرف ایک ملک میں نہیں، ایک شہر میں نہیں، یہ رات انسانی تاریخ کا ایک طویل ماضی ہے۔ یہ اندھیرا اچھے کا کیونکہ اندھیرے کے بطن سے اجالا نمودار ہوتا ہے۔ لیکن کیا کوئی ایسا اجالا بھی ہے جسمیں اندھیرے کا مطلق گزر نہیں اندھیرے اور اجالے اجالے اور اندھیرے کا تصادم ہی تو کائنات اور انسان کے ارتقاء کا راز ہے۔ نور اور ظلمت

کہ یہ جنگ آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ رات اور صبح کی اس کشمکش میں مقام کی قید نہیں۔ یہ کشمکش ہر جگہ جاری ہے۔ یہاں بھی جہاں ابھی رات نظر آتی ہے اور وہاں بھی جہاں بظاہر اجالا ہے۔ انسانی تاریخ انسانی آزادی کی کہانی ہے۔ ابھی شاید بہت دنوں تک انسانوں کو اپنے دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلنا ہوگا۔ اپنی اپنی صلیبوں کے رمز کی تشریح یہ بڑی سخن گسترانہ بات ہے۔ آج وہی آزاد ہیں جن کے دوش پہ صلیبیں ہیں۔ وہ جنہوں نے یہ سمجھا کہ ہم آزاد ہیں۔ اور اپنی صلیبوں کو پھینک دیا۔ انھوں نے اپنی آزادی کو قربان کر دیا۔ کیا کوئی صلیب پھینک دینے کے بعد آزاد رہ سکتا ہے؟ لیکن کیا کوئی ہمیشہ کے لئے اپنی صلیب پھینک بھی سکتا ہے؟ یہی صلیب ہی تو ہے جو آزادی کی ضمانت ہے!

اس نظم میں مخدوم کا فن اظہار کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے آزادی کے میلے کے انسانوں کی تشنگی ان کے انتظار اور ان کی بے تابی کا اگر ایک بہترین اظہار ہے تو رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو جو جم کے خوں بن گیا۔ آزادی کے بعد کے ہیبتناک حادثات کا انتہائی شاعرانہ اظہار۔

'مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن' ہماری قومی تاریخ کے ایک رنگین باب کا انجام ہے۔ جب ہم محکوم تھے لیکن آزادی کی تمنا سے ہمارے دل بھرپور، ہم تشنہ لب تھے مگر اس تشنگی میں بھی سرشار تھے۔ کہاں وہ خواب اور کہاں یہ حقیقت۔ ۱۹۴۷ء کی ہراسانی اور حیرانی کی کتنی مکمل تصویر ہے۔ کیا یہ صرف ایک دور کا انجام ہے۔ مجھے اس میں ایک شخص کی بھی تاریخ جھلکتی نظر آرہی ہے! نہ جانے کیوں؟ جب میں "مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن" پڑھتے پڑھتے "کچھ امامانِ صد مکر و فن ......" تک پہنچا تو مجھے اس جھوٹے خدا کا قصہ یاد آگیا جس نے اپنے بدنما اور ہیبتناک چہرے پر خوبصورت نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ ہم ایسے ہی موقعوں پر سوچتے ہیں کہ کاش حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھتی۔ ہم زندگی بھر حقیقتوں کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی کشمکش کرتے ہیں اور جب قریب ہوتا ہے کہ نقاب الٹ جائے تو نہ جانے کیوں وحشت اور سراسیمگی سے خود ہمارے ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں۔

مخدوم کی اس نظم کا لہجہ اس کی رمزیاتی زبان ہے مجھے یہ یقین ہے کہ انھوں نے بہت سی حقیقتوں کو بے نقاب دیکھا ہے لیکن انسانی تقدیر پر ان کا بھرپور اعتماد اور ان کا مجاہدانہ عزم کہ انھوں نے ابھی تک اپنی صلیب پھینکی نہیں ہے۔ انہیں غم اور یاس کی اندھیری راتوں میں بھٹک جانے سے محفوظ رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی اس نظم میں مجھے گہری آفاقیت نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ "چارہ گر" میں جس صحت مند تشکیک کا آغاز ہوا تھا، اسی تشکیک نے انھیں تخیل کی اس بلندی پہ پہنچا دیا ہے جس کا اظہار یہ نظم ہے اور "دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو" اس صحت مند تشکیک کا ایک صحت مندانہ جواب ہے! آج اندھا یقین نہیں بلکہ صحت مند تشکیک ہی ہمیں موجودہ ذہنی اور روحانی بحران سے باہر نکال سکتی ہے۔ ایسی صحت مند تشکیک ہماری نئی اردو شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، اور مخدوم نے اپنی اس شاعرانہ خصوصیت کو برقرار رکھا ہے کہ وہ ہر دور کے ذہن کی ترجمانی اور شاعرانہ رہنمائی کرتے رہے ہیں۔

۱۹۵۸ء

مخدوم محی الدین

جدید شاعری کے آئینے میں

عبادت بریلوی

● اقبال، چکبست، اور جوش کے بعد عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، حامد اللہ افسر، احسان دانش، روش صدیقی، ساغر نظامی، منظور حسین شور، اور الطاف مشہدی، جدید شاعری کے صحیح اقدار کو باقی رکھنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان کے ہاں بھی ایک نیا احساس ایک نیا شعور اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے۔ ان سب نے زندگی کے متنوع پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے — غرض یہ کہ اس زمانے کی جذباتی، ذہنی، عملی اور فکری زندگی کے تمام پہلوؤں کی ترجمانی ان کی نظموں میں ملتی ہے اس لیے ان میں جدت کا احساس ہوتا ہے اور وہ جدید شاعری کو آگے بڑھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

یہ شاعر لوں تو آج بھی موجود ہیں اور ان میں اکثر شاعری بھی کر رہے ہیں لیکن ان کے دوش بدوش کچھ اور شاعر بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے ان سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے اور یہ شاعر وہ ہیں جن کی نشو و نما ۳۰ء اور ۳۵ء کے قریب ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں یہ زمانہ حد درجہ سیاسی کشمکش کا زمانہ رہا ہے اس زمانے میں سیاسی اور سماجی شعور میں اضافہ ہوا ہے انقلاب کے تصورات صحیح بنیادوں پر قائم ہوئے ہیں۔ جذباتیت کا خاتمہ ہوا ہے اور اس کی جگہ عقل و شعور نے لے لی ہے زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کے خیالات پھیلے ہیں۔ تاریخی اور طبقاتی شعور بڑھا ہے۔ ایک نئے نظام کو قائم کرنے کے تصورات عام ہوئے ہیں۔ انسانی قدروں کا خیال دلوں میں جاگزیں ہوا ہے اور اس ماحول نے جدید شاعری کی دنیا بدل دی ہے اس میں ایک نیا رنگ و آہنگ اور ایک نیا لب و لہجہ پیدا ہوا ہے۔ فکری اور تکنیکی پہلو اس میں نمایاں ہوئے ہیں۔ تاثیر، فیض

مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، اختر انصاری، سلام مچھلی شہری، سکندر علی وجد وغیرہ ان رجحانات کے علم بردار ہیں۔ ان سب نے بھی اپنے حدود میں رہ کر اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اور عکاسی کی ہے۔

مخدوم محی الدین کی شاعری میں نظریے کی پختگی اور استواری کا احساس سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں گہرے سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے اور انقلابی کیفیت نظر آتی ہے۔ جدید شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے اپنی شعری تخلیقات سے اس میں بعض اہم اضافے کئے ہیں۔ ان کے یہاں رومان و حقیقت کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ زندگی کو وہ بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ جذباتی زندگی سے بھی انہیں گہری دلچسپی ہے۔ اجتماعی معاملات کا بھی وہ گہرا شعور رکھتے ہیں اس لئے ان کے یہاں گہرائی، تنوع، وسعت اور ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو جدید شاعری میں انھوں نے پیدا کی ہیں۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ شاعری میں نئے انداز اور نئی ہیت کی ایجاد کو کسی قوم کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے ـــــ یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔ اور اردو شاعری پر بھی صادق آتا ہے ـــــ اس میں انداز بیان اسلوب اور ہیت کے جو تجربے ہوئے ہیں وہ ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ ہماری بدلتی ہوئی ذہنی اور جذباتی زندگی کی پیداوار ہیں۔ اور انھوں نے خود زندگی کے ان پہلوؤں کو متاثر کیا ہے۔ ان کے لئے نئی راہیں نکالی ہیں اور نئے میدان تلاش کئے ہیں۔ اور اس طرح شاعری نے زندگی اور زندگی نے شاعری کو بدلا ہے۔ اس لئے آج زندگی بھی ایک نئے راستے پر گامزن ہے اور شاعری بھی نئی منزلوں کی تلاش میں رواں دواں ہے۔ اسی صورت حال کو جدت پسندی کہہ سکتے ہیں اور اس جدت پسندی کی روائیت اردو میں بہت پرانی ہے۔

حالیؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، سرور جہاں آبادی، عظمت اللہ خاں، جوشؔ، علی اختر، سیمابؔ اور ان کے بعد آنے والے شعرا یعنی احسان دانشؔ، ساغرؔ، روشؔ صدیقی وغیرہ جدید ضرور ہیں۔ ان کے یہاں جدت بھی پائی جاتی ہے لیکن وہ جدت پسند نہیں ہیں ان کی شاعری میں جو جدت نظر آتی ہے وہ نہ تو روائیت سے تمام تر منحرف ہونے کا نتیجہ ہے اور نہ اس کی نوعیت شعوری ہے وہ تو روائیت کے ارتقائی تسلسل کا ایک نتیجہ ہے۔ جدت پسندی کے علمبردار تو وہ شاعر ہیں جو ان شعرا کے بعد سامنے آتے ہیں۔ اردو شاعری میں جدت پسندی کا میلان اپنے پیش روؤں سے کسی حد تک مختلف ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان کی پیدا کی ہوئی جدتوں کا تسلسل معلوم ہوتا ہے پیش روؤں نے جو روایات قائم کیں اور انھیں آگے بڑھایا اس کو جدت کے علم برداروں نے نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ ان روایات کو سامنے رکھ کر ایسی روایات کی تشکیل کی جو ان کی صحت مند جدت پسندی پر دلالت کرتی ہیں۔ ان روایات کے علمبرداروں میں مخدوم محی الدین نظر آتے ہیں۔ ان میں اپنے پیشروؤں کے مقابلے میں سوچنے کا نیا زاویہ ـــ پیش کرنے کا نیا انداز نظر آتا ہے۔ حالیؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، اور جوشؔ کی آوازیں ان کے یہاں بھی سنائی دیتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی اپنی آواز پہچانی جاتی ہے۔ ان کے یہاں موضوع اور مواد یوں تو اپنے پیش روؤں سے موضوع اور

مواد سے ملتا جلتا ہے لیکن ان کا مخصوص زاویہ نظر اور بڑھا ہوا شعور اسی موضوع اور مواد کو ایک نئی شکل دے دیتا ہے چنانچہ ان کے یہاں حسن و عشق کا موضوع صرف دلچسپی لینے اور محظوظ ہونے کا ذریعہ ہی نہیں بن جاتا وہ اسے زندگی کی اہم حقیقت کی طرح بھی دیکھتے ہیں اور اسی لئے اس کے مختلف پہلوؤں کا اظہار ایک متانت سنجیدگی اور وقار کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر ان کے یہاں ان کے اظہار میں تری جذباتیت کسی سطحیت کو پیدا نہیں ہونے دیتی۔ وہ ان کے اظہار میں مبتذل نہیں ہوتے نیچے نہیں گرتے برخلاف اس کے ان کے یہاں خاصی بلندی کا احساس ہوتا ہے خاصی رفعت اور ترفع کی کیفیت نظر آتی ہے۔

تاثیر، فیض، مجاز، ندیم، جذبی، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، اختر انصاری، سکندر علی وجد، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، عارف عبدالمتین اور مخدوم محی الدین جدت کے علمبردار ضرور ہیں اور جدت پسندی ان میں ایک قدر مشترک ہے۔ لیکن ویسے ان میں سے ہر ایک اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ جدت پسندی کے علمبردار کی حیثیت سے ان میں ہر ایک کا ایک مخصوص مرتبہ ہے۔

مخدوم محی الدین ان سب سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا گہرا شعور ہے۔ تاریخی اور طبقاتی حقائق کو انھوں نے اپنے لئے شمع راہ بنایا ہے جس نے ان کے یہاں نظریاتی صفائی پیدا کی ہے۔ اسی لئے وہ ہر خیال کو بے باکی کے ساتھ مکمل کر لیا کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں ایک جارحانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مخدوم نے کم لکھا ہے لیکن جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی جدت پسندی ایک نئی ایجاد ہونے کی حیثیت سے اس دور کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ ہے اور اس لئے اس کو جدید اردو شاعری میں ایک اہم تحریک سے تعبیر کرنا ایسا کچھ بے جا نہیں۔

ادب اور شاعری میں جدید رجحانات کے چراغ اس وقت روشن ہوتے ہیں جب زندگی کے افق پر انقلابات کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں، جب زندگی اپنے دائرے کو وسیع کر کے نئے نئے افکار و خیالات اور نئے نئے مسائل و مقتضیات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے، جب غور و فکر کے لئے نئی نئی راہیں تعمیر ہوتی ہیں جب تخیل پرواز کے لئے کسی نئے افق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ نئے رجحانات یوں تو کم و بیش تمام نئے شاعروں کے یہاں نظر آتے ہیں لیکن اس کے علمبرداروں میں مخدوم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مخدوم اس سماج کو ایک بوسیدہ حویلی سے تعبیر کرتا ہے جہاں اسے ہر طرف اندھیاریاں ہی اندھیاریاں نظر آتی ہیں۔ اس میں کہیں بے نواؤں کے گروہ ہیں اور کہیں بے نان و پوشش گداؤں کی جماعتیں ——— لیکن وہ اس ماحول میں ایسے نغمے چھیڑنے کے لئے اکساتا ہے جس سے زندگی مسکرا اٹھے۔ اس نے زندگی کے بنیادی موضوعات پر غور و فکر کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور اردو شاعری کے انقلابی رجحان میں گہرائی اور ایک واضح نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔ مخدوم نے نئے نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں سمو کر اسے بہت وسعت دی ہے اگر جوش نے اس میں انقلاب کے نعرے بلند کئے ہیں مظاہر فطرت اور مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی ہیں، حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو حقیقت نگاری کے رنگ میں پیش کیا ہے اور انسانیت کی بلندی کے گیت گائے ہیں تو مخدوم نے انسانیت کی بنیادی قدروں کو اپنا موضوع بنا کر حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔

مخدوم اپنی شاعری میں وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو سموتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری سے موثر کا کام لینا چاہتے ہیں

ان پر عورت سوار نہیں ہے ان کا تعلق حقیقت پسند تحریک اور انسان دوست حلقے سے ہے۔ ان کے یہاں تو عریانی دور تک نظر نہیں آتی۔ یہ زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ اور زندگی کے ضروری اور اہم مسائل کو پیش کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں —— یہ تو عورت تک کا ذکر کم کرتے ہیں اور جہاں عورت کا ذکر کرتے بھی ہیں وہاں عریانی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

مخدوم وقت کے اچھے نباض تھے۔ ان پر مغربی ممالک کی شاعری میں چلتی ہوئی تحریکوں کا بھی اثر پڑا تھا۔ ان حالات میں انھوں نے اپنی شاعری کو قدامت سے ہم آغوش دیکھ کر اپنی راہ الگ بنانی چاہی۔ ان کا اقدام اس فوٹوگرافی کا رد عمل تھا جس کا آغاز جوش نے کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ شاعری درحقیقت فوٹوگرافی نہیں مصوری ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ آگے بڑھے اور شاعری کو فن کاری کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا۔

اب انقلاب کے جذباتی رومانی تصورات تفکر کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ مخدوم کی مختلف نظمیں اس نئے تصور کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں —— ان کے یہاں زندگی کی محبت اس کی زبوں حالی کا احساس اور اس زبوں حالی کو دور کرنے کے ایک نئے نظام اقدار کے قیام کا خیال سب ہی گھل مل جاتا ہے۔

مخدوم اپنی شاعری کی ظاہری صورت اور ہیئت کو بھی ایک نئے سانچے میں ڈھالتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اسالیب کے نئے تجربے ہیں جو مواد کے ساتھ انداز بیان اور طرز ادا کی ہم آہنگی کا نتیجہ ہیں —— ان کی علامتیں نئی ہیں، اشارے نئے ہیں، تشبیہیں نئی ہیں، استعارے نئے ہیں۔ آہنگ نیا ہے لفظی نئی ہے —— غرض اظہار کے ہر پہلو میں ان کے یہاں ایک جدت کا احساس ہوتا ہے —— اسی لئے مخدوم محی الدین کو جدید شاعری میں ایک صحت مند جدت پسندی کا علمبردار کہنا ایسا کچھ بے جا نہیں۔

(جدید شاعری)

جے جوان —— جے کسان

بھارت کی ترقی، خوشحالی اور حفاظت کے لیے

زیادہ کام کیجئے، زیادہ غلہ اگائیے اور زیادہ بلوان بنئیے

وجے آئیل ملز

یادگیر (میسور اسٹیٹ)

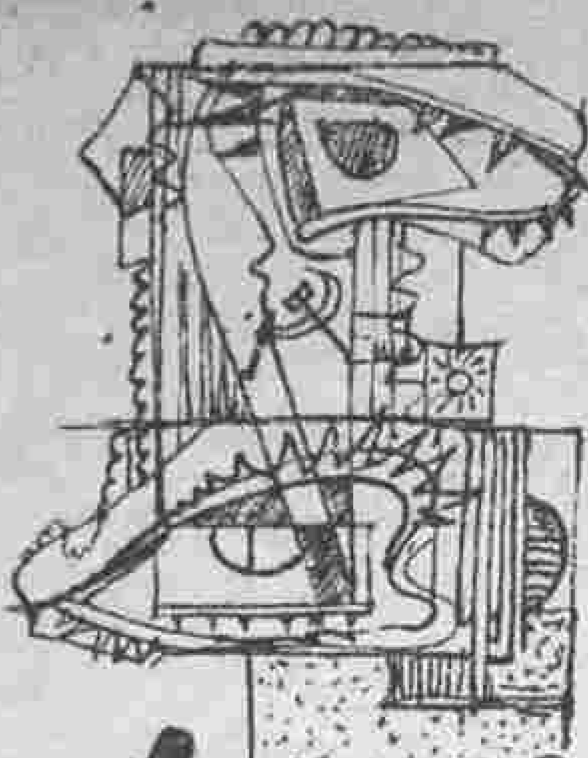

مخدوم

فکر و نظر کے کچھ پہلو

سید محمد عقیل

اردو شعر و ادب کی اس بڑی دنیا میں اگر مخدوم کے اس مختصر شعری سرمائے کو سامنے رکھا جائے تو اُن کی نظموں اور شعروں کو تقریباً انگلیوں پر شمار کیا جاسکتا ہے۔ جدید شعراء میں بھلا ان سے کم کیا کسی کا کلام ہوگا ؟ ان کے دو مختصر مجموعے اور ان مجموعوں میں بھی بائیس سال کا تفاوت۔ لیکن اگر کلام کی ضخامت ہی شاعر کی عظمت کا تعین کر سکتی تو اردو میں ایسے شاعروں کی کمی نہیں جن کے دواوین کی ضخامت داستانوں کو مات دے سکتی ہے۔ تاہم اردو ادب کی تاریخ میں، ان کے متعلق چند سطریں لکھنا بھی مورخ کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

مخدوم کی شاعری کی ابتدا کب ہوئی اس کا حال تو نہیں معلوم لیکن ابتدائی نقوش کم و بیش ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی کے ساتھ نما شروع ہو جاتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے جب عالمی پیمانے پر ایک ذہنی خلفشار کی صورت رونما ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں بھی یہ شعلہ تاریخ کی رفتار کے ساتھ پہنچا اور یہاں کی بھی آگے بڑھنے والی طاقتوں نے قدیم سے باغی ہو کر جدید طرز فکر اور نئی زندگی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز اسی انقلابی غور و فکر کا نتیجہ تھا جو سماج کی نئی طاقتوں اسٹیفن اسپینڈر کی زبان میں اپنے آبا و اجداد کے ان پرانے مکانوں کو ڈھا کر باہر نکلنے کی ترغیب دے رہی تھی، جو اُن کے آبا و اجداد نے ان کے لیے دولت کے سہارے دولت کی افزائش کی خاطر بنایا تھا۔ ترقی پسند نظریات کی وضاحت مقصود نہیں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ مخدوم کی شاعری بھی انھیں خیالات کے ساتھ پروان چڑھی اور جب سنہ ۱۹۴۴ء میں اُن کا پہلا مجموعہ "سرخ سویرا" شائع ہوا تو ترقی پسند تخلیقات میں مخدوم کی ایک منفرد منزل نظر آئی۔ ان کی نظمیں 'یہ جنگ ہے جنگ آزادی'، 'اندھیرا'، 'سپاہی' اور 'انتظار' بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں جن میں ماحول کے تقاضوں اور روح عصر کی گرمی کے ساتھ وہ انقلابی

کیفیت بھی موجود تھی جو اس وقت کی ہندوستانی فضا میں کروٹیں لے رہی تھی۔ جس میں "ماضی کی طرف واپسی" نہیں بلکہ ایک بہتر زندگی اور آزاد فضا کی تلاش شامل تھی مستقبل سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں اور سماج کو اپنے پرانے خول کو توڑ کر باہر آنے پر اکسانے کی جہد۔

دوسری جنگِ عظیم کی ابتدا کے وقت عالمی فضا میں ایک قسم کی ناآسودگی، بے اعتباری، بے یقینی اور شبہات کی کیفیت طاری تھی۔ عالمی کساد بازاری نے اگر ایک طرف عام بیکاری پیدا کر دی تھی تو دوسری طرف نازی خیالات نے قوت پرستی کے زعم میں کمزوروں سے زندہ رہنے کا حق بھی چھیننا شروع کر دیا اور جب یہ کشمکش ضبط و برداشت سے باہر ہو گئی تو عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ان حالات نے، شعراء، ادیبوں اور دانشوروں کو بھی سیاست کی طرف متوجہ کیا کیوں کہ سیاست اس وقت تاریخ کا رخ موڑنے کے لیے میدان میں نکل آئی تھی جس کی عملی صورتیں دنیا کا قلع قمع کر سکتی تھیں۔ جنگ نے وہ صورت پیدا کر دی کہ یا تو جنگ بازوں کا ساتھ دو یا ہمیشہ کے لیے صفحۂ دنیا سے معاشی تہذیب، ایقان اور اصولوں کے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاؤ۔ یا پھر ان طاقتوں کی مدد کرو جو تہذیبِ انسانی کی چمک دمک برقرار رکھنے کے لیے ان فاشستی طاقتوں سے مقابلہ کی تیاری میں مشغول تھیں اور سرمایہ داری و منافع خوری کے اس گھناؤنے رخ کو بے نقاب کرنا چاہتی تھیں جو انسانی آزادی اور بقا کا دشمن تھا۔

جنگ کا آغاز ہوا۔ ہر طرف کشت و خون، شہر شہر گاؤں گاؤں میں فوجی دستوں کی گردش، لڑائی کے اسلحے، توپوں اور ٹینکوں کی گھڑگھڑاہٹ نے تہذیب، کلچر اور انسانوں کی یکسوئی کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ ہر آدمی ایک خوابِ پریشاں کی طرح آوارہ پھر رہا تھا۔ خود کرۂ ارض کا وجود خطرے میں تھا۔ اگر اس دور کے عالمی ادب کو دیکھا جائے تو آڈن کی THE AGE OF ANXIETY خاص طور پر سیسل ڈے لیوس کی جنگ کے دوران کی نظمیں ہمنگ وے اور ارون شا کے ناول THE DEAD اور WATCHING POST کرشن چندر کے افسانوں اور پھر مخدوم کے مجموعے "سرخ سویرا" تک بے چینیوں اور جنگ کی تباہ کاریوں کی ایک دنیا پھیلی ہوئی ہے۔

ہندوستان کی کہانی، عالمی کشمکش کی کہانی سے کسی قدر مختلف تھی کیوں کہ یہاں ابھی تک غیر ملکی حکومت قائم تھی یہ ملک عالمی کساد بازاری اور جنگ کے بھنور میں اس طرح کھنچا جا رہا تھا جس طرح دوسرے آزاد ممالک۔ پرانی قدریں اور تہذیب کے تانے بانے یہاں بھی ٹوٹتے جا رہے تھے اور نئی تہذیب اور قدروں کو جلد اپنا لینا آسان نہ تھا۔ مخدوم اور ان کے ساتھ کے دوسرے شعراء نے اس کشمکش کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ نئی قدروں اور نئے راستوں ہی سے نجات ممکن ہے اور اس لیے جلد از جلد کہنہ روایات اور بکھرتے ہوئے نظام سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ سماج کی بہتری کی صورتیں نئی قدروں کو اختیار کر لینے ہی پر ممکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "سرخ سویرا" میں ATTACK ON THE OLD AND HOPE IN THE NEW کی کیفیت زیادہ ہے۔ مخدوم کی شاعری ایسے ہی پس منظر سے انھیں مسائل کے ساتھ ابھرتی ہے۔ لطیف اشاروں کے ساتھ عام انسان کو باخبر کر کے مخدوم امید کی

ا

اس دنیا میں جانے کی کوشش کرتے ہیں جو ایلیٹ کی زبان میں "مستقبل کا پژمردہ گیت" نہیں ہے بلکہ جہاں ہمت، امید اور شادکامی کی جھلکیاں ہیں اور جو اس تنزل پذیر نظامِ زندگی کے ڈھہ جانے کے بعد انسانوں کی کوشش سے جلوہ نما ہوگی۔ جہانِ نو، ستارے، مشرق، انقلاب اور سپاہی سب میں یہی کوشش ملتی ہے۔

تصوریت اور مثالیت سے ہٹ کر مخدوم نے ان راستوں کو اپنایا جو مادیت کے شعور سے ارضی حقیقتوں کی طرف جاتے تھے جن کا ایک سرا انقلاب سے ملتا تو دوسرا محبت اور رومان کی دھیمی آنچ میں پرورش پا رہا تھا جو بہت کم انفرادی ہوتے ہوئے بھی سیکڑوں نوجوان دلوں کی امنگیں اور آرزو بنا تھا جس پر وقت اور تاریخ کا عکس منعکس تھا۔ یہ ایک تجربہ تھا جس میں شرکت کے لیے فکر و فن کی ان چہار دیواریوں کو پھاندنے کی ضرورت بھی نہ تھی جو مسائلِ حیات کے عام کارناموں سے الگ تھیں یا جن کے لیے کسی مابعد الطبیعاتی فلسفے اور ذہن کی ضرورت پڑتی۔ یہ تجربے ایک طرف تو نوجوانوں کے منتشر اور بے چین ذہنوں کو فکر و عمل کے دائرے اور امکانات فراہم کرتے اور دوسری طرف ہندوستان کی تقدیر بدلنے کے لیے راہِ عمل دکھاتے۔

اس زمیں موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا — اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے — دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو — چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم — صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا — ہو رہا ہے مری جاں سویرا

مستقبل ایک بہتر اور متناسب دنیا پیش کرے گا۔ انسان اس زندگی کا متلاشی ہے جو متجلّی اور منوّر ہو جہاں ادبار اور مفلسی کے تاریک سائے اپنا اندھیرا سمیٹ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔ شاعر اور ادیب کی یہ مستقبلیت کتنی ہی خیالی کیوں نہ ہو مگر بغیر اس امید افزا تصور کے انسان کی عملی قوتوں کو حرکت میں لانا ممکن نہیں۔ مگر بغیر کسی امید اور سہارے کے زندگی کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔ انسانیت کے امکانات اور روحِ عصر کی کارفرمائیوں سے بے خبر اس کا انکار بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ کیا وہ خیالی خاکہ جو ماضی میں بنایا گیا تھا اس میں رنگ بھرا جا سکا؟ کیا اس دور کے انسانوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ شرمندۂ تعبیر ہو سکے؟ عام نظر میں ہو سکتا ہے کہ وہ سب خیالات عملی جامہ نہ پہن سکے ہوں لیکن امید اور بہتر مستقبل کے انھیں عالمی نظریات نے فاشسٹ قوتوں کا قلع قمع کر دیا۔ آج نازیت دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ مخدوم نے جس امید افزا رات کا تصور کیا وہ آیا ہو یا نہ آیا ہو مگر ہندوستان نے ۱۹۴۷ء میں آزادی کا وہ خواب پورا ہی کر لیا جس کا تصور ستر اسّی برس پہلے کے ایسے ہی پُرامید اور حرکت پر یقین رکھنے والے سماج نے کیا تھا اور اشتمالی اور متحدہ قوتوں کے اثرات نے بہت سے مسائل حل کر دیے جن کے لیے جنگ لڑی گئی تھی۔

شاعر کی امید اور آرزوؤں کی ہوائیں روحِ عصر کے ساتھ اپنے رخ اور اپنے محور بدلتی رہتی ہیں۔ یہ کوریا

ویت نام اور روڈیشیا کے حالات بدلنے کے لیے بھی ہو سکتی ہیں اور ہندوستان میں ایک معاشی اور ذہنی انقلاب لانے کے لیے بھی۔ یہ امیدیں اور آرزوئیں بہتر سے بہتر سماج پیدا کرنے کی خواہش مند رہتی ہیں اور جن کا کام تاریخ کے کسی موڑ پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نئی آزمائشوں میں ڈوب کر نئے امکانات تلاش کرتے رہنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیدیں روحِ عصر کو ہمیشہ باقی رکھتی ہیں۔ کیوں کہ امیدوں اور آرزوؤں کا بھی کوئی اختتام نہیں ماضی اور تاریخ، واقعات کے اوراق پلٹ دینے کے باوجود اپنی روح کو لیے ہر دور میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اس روح کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا تو وہ نہ ماضی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ 'حال' کے راز اس پر منکشف ہو سکتے ہیں خواہ وہ اپنے عہد کا ٹوائن بی اور اسپنگلر ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ ادب کی تاریخ میں بھی ماضی کی یہی روح ادبی روایتوں کی شکل میں زندہ رہتی ہے۔ سرخ سویرا کے مسائل اپنی ظاہری شکل میں آج کے مسائل نہ سہی لیکن جب بھی انسان اپنے دور کے نامساعد حالات، آزمائشوں اور کسی نئے انقلاب سے پیشتر کی صورتوں میں گھرے ہوں گے، مخدوم کی آواز ان کا سہارا بنے گی ان کو عمل اور امید کے نئے راستے دکھا کر انھیں شکست خوردگی سے بچانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

سینکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جبرِ شاہی سے غمیں جورِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ وہ دھم سے دھماکہ بن جائیں

امن و اماں کی نبض چھٹی جا رہی ہے کیوں بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں

جھوم جھوم کر گرج گرج بادل بن کر چھانا ہے
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں میں امرت رس برسانا ہے

اور اسی کیفیت کا بقایا "گلِ تر" میں یوں ملتا ہے:

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ اشعار نقیب، حبیب اور راہبر کا کام کرتے ہیں جن میں ماضی کی ادبی روایت اور روحِ عصر سب کچھ موجود ہے۔

مخدوم کی شاعری نے جن راستوں سے ارتقا کی منزلیں طے کی تھیں ان کا تقاضہ یہی تھا کہ ان کی جد و تلاش میں بیرونی کشمکش ہو چنانچہ یہی بیرونی کشمکش اور خارجی حالات کا اثر ان کی رومانی اور انقلابی دونوں طرح کی شاعری میں موجود ہے۔ ان کے یہاں خود سے الجھنے کی کیفیت اور اندرونی گھٹن نہیں ملتی کیونکہ اندرونی گھٹن اور نفس کشی ایک NERVSIS کی شکل اختیار کر کے فن کار کو مختلف پرتوں اور تہوں میں چھپا دیتی ہے۔ اندرونی تلاش فنکار کو مجہول قسم کی تخیل پرستی کی طرف لے جاتی ہے جہاں علیحدگی کے ساتھ ساتھ انسانوں کی دنیا سے ہزاروں میل کا فاصلہ ہو جاتا ہے جہاں نہ ماحول اور سوسائٹی کی اس سطح کا پتہ چلتا ہے جس سے زمانہ گزر رہا ہے اور نہ اس دور کی ذہنی کیفیات کا انعکاس نظر آتا ہے بلکہ بیرونی حالات سے گھبرا کر خود کو برجِ عاج میں محصور کر لینے والی درون بینی ملتی ہے۔ کشمکش کی اس منزل سے گزرنے میں شاعر اور ادیب بھٹک جاتے ہیں اور مصائب و مسائلِ حیات سے گھبرا کر خود کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ بھری پری دنیا انھیں ویرانوں سے زیادہ بیزار کن معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے ان کی تہذیب، ان کے اخلاق و عادات، ان کی گہما گہمی سب محض ایک سایہ نظر آتے ہیں۔ تنہائی کا یہ بے پناہ احساس ادیب کو زندگی کے صالح اصولوں تک سے برگشتہ کر دیتا ہے اور ان میں خارجی حالات سے لڑ کر اپنا راستہ پیدا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادیب شخصی نظر اور فردیت کے راستوں سے عام انسانی سماج اور زندگی کے مختلف الالوان دھارے سے کٹ کر زندگی کے مسائل سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی سماجی سوجھ بوجھ صرف اس کی ذات میں اسیر ہو جاتی ہے پھر اسی راستے ادیب یا شاعر فرار کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا عقیدہ صرف اپنی محدود جذبات آفرینی (EMOTIONAL RESPONSES) اور ہوائی قلعوں (DAY DREAMING) تک محدود ہو جاتا ہے۔ مخدوم اس عقیدے کے شاعر نہیں۔ ان کی خالص عشق کی دنیا بھی جمالیاتی تجربوں کے ساتھ کسی ابدی مسرت کی تلاش میں زندگی کے حقیقی تجربوں کے ساتھ وابستہ رہی ہے جن میں سماجی حالات اور امکانات کی اہمیت واضح ہے۔ انھیں تجربوں سے 'چارہ گر'، 'رقص'، 'جانِ غزل'، 'پیار کی چاندنی'، اور 'گلِ تر' کی کئی نظموں اور غزلوں کی تخلیق ہوئی ہے، جن میں وہ کلاسکیت بھی شامل ہے جو قدیم کی میراث ہے اور وہ رومانیت بھی جو شاعر کی اپنی تخیل کی رو نے پیدا کی ہے مخدوم کے ایسے تجربوں میں:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے ‏ ‏ ‏ گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن ‏ ‏ ‏ ہر صبح مے تلخیِ ایام بھی پی ہے

صبح دم جب مرے دروازے سے گزری ہے صبا

اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گزری ہے

اوپر کہی گئی تقریباً تمام باتیں موجود ہیں۔ ان میں مخدوم کی فکر و نظر، مشق، ذاتی تجربے، خارجی اثرات، فن کا انوکھا برتاؤ اور نئے تجربوں کو دیکھا جا سکتا ہے جن میں نہ وہ عصری کشمکش اور مسائل کے بہاؤ سے الگ ہوتے ہیں اور نہ ان کی آواز وقت کے کورس میں اس طرح مدغم ہوتی ہے کہ پہچانی نہ جا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اشعار اور مصرعے جمالیات کی نرمی اور حسن کی کیف سامانیوں کا حسین مظاہرہ کرتے ہیں۔

جمالیات اور حسن کی تلاش تہذیب یافتہ انسان کی ایسی تلاش ہے جو اس نے اکتسابی طور پر اپنی نسلوں اور اپنے سے پہلے گزرے ہوئے سماج سے حاصل کی ہے۔ ادب اور فن کے لیے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ جمالیات اور حسن کے احساس کا تعلق صرف وجدان سے نہیں اور نہ یہ جذبہ وہبی ہے۔ اسی لیے اکتساب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جمالیات کے نظریوں میں اسی وجہ سے عہد بہ عہد تغیر اور تبدیلی بھی ہوتی رہی ہے۔ کبھی خیال جمالیات کی محک بنا کبھی الفاظ، معنی، حسن صورت، ترنم و موسیقی سے احساسِ جمال کی اہمیت اور گہرائی کو پرکھا گیا اور کبھی ایک والہانہ جذبہ ہی جمالیات کی دنیا کا سب کچھ سمجھا گیا۔ ہر دور میں جمالیات کے نظریے اس دور کی نفسیات، سماجی کیفیات اور آئیڈیالوجی کے تحت بنتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ جمالیاتی حظ اگر صرف حسن و صوت اور الفاظ کی نغمگی ہی سے حاصل ہو سکتا تو خوبصورت اور مترنم الفاظ کے مجموعے کا ترتیب دے لینا ہی کسی شاعر کو سب سے بڑا جمالیاتی شاعر بنا دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حظ ان صورتوں میں پوشیدہ ان قدروں میں شامل ہے جنہیں انسانوں کی فکری و تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور جذبے یا خیال سے ایک طرز میں ڈھال کر کائنات کے ایک بڑے حصے کے مفاد کے لیے ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں نے وقتاً فوقتاً تلاش کیا ہے۔ یہ احساس شعور کی اسی آگہی سے وابستہ ہے جس کا خمیر تاریخیت اور سماج کے ارتقا و مظاہر سے تیار کیا گیا ہے۔ ان اصولوں کے تحت اگر مخدوم کی تخلیقات میں کوئی جمالیاتی حظ کا جائزہ لینے کو تیار ہو تو اسے ان کی نظم سپاہی، اندھیرا، جنگ آزادی اور دوسری نظموں میں بھی وہی کیفیت ملے گی جو گل تر کی نظموں میں ملتی ہے جہاں نرم، نازک اور رومانی فضا کے الفاظ کے ذخیرے موجود ہیں۔ معلوم نہیں کہ خود مخدوم نے اپنی ان دو مختلف تخلیقات کو کس حد تک اس جمالیاتی نظریے کے قریب کر کے دیکھا ہے۔ گل تر میں لکھا ہوا ان کا اپنا دیباچہ شاید اس تجسس کا پورا جواب نہیں دے سکتا۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ مخدوم اپنے اشعار میں صرف ایک وقتی نفسیاتی کیفیت سے حظ نہیں اٹھاتے ہیں کیوں کہ وہ سخن گویوں اور ادیبوں کے ایسے طبقے سے تعلق نہیں رکھتے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے دیباچہ میں یہ دو مختلف عبارتیں

"یہ تھا سرخ سویرا" کا رنگ انگل تر ہیں یہ رنگ ملے گا۔
یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے۔ پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہے۔"

ہمیں ان کے ایقان کے ساتھ ساتھ ان اشعار کا تجزیہ کرنے میں بھی مدد دیتی ہیں جنھیں عام قاری غلطی سے محض ایک نفسیاتی ابال کا نتیجہ سمجھ سکتا ہے۔ زندگی کے ان مسائل تک، ان اشعار سے اس کی نظر نہیں پہنچتی جو شاعر کے گرد و پیش الجھنوں اور آزمائشوں کا ایک جال سا بنتے رہے ہیں۔ جن کا رد عمل شاعر پر ان کیفیات میں ہوا ہے قاری انھیں صرف ابلاغ یا مجرد جمالیاتی حظ سمجھ سکتا ہے۔ وہ ان کیفیات کی باز آفرینی کو محض ترسیل اور اظہار کے لیے سہارا نہیں سمجھتا۔ دو چار مثالیں اس کی وضاحت کر سکتی ہیں۔

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے — بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے — زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے (سپاہی)

نہ تابناکیٔ رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے (انقلاب)

جنھیں ہندوستان میں دوسری جنگ عظیم کا زمانہ یاد ہے۔ شاید ان کے ذہن میں دو ایک ایسے نقشے بھی ہوں گے جب بنگال میں بھوک کے مرنے والے دولت و سرمایہ رکھتے ہوئے بھوک کے مر رہے تھے دوسری طرف جنگ کی آگ میں ایندھن بنانے کے لیے پچاس پچاس روپے پر سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے اور جب وہ لڑائی میں کام آ جاتے ہیں تو ان کی بیواؤں اور یتیموں کو محض چند روپے پنشن کے دے دیتے جاتے۔ وہ نقشے بھی جب سپاہی پرانے گھر والوں سے رخصت ہو کر بر سستی بیٹھے جاتے تھے اور ان کا دل اپنے معصوم بچوں اور بیوی کی حالت دیکھ کر پاش پاش ہو جاتا کیوں کہ کسی جانے والے کو نہیں معلوم تھا کہ موت کے جس غار میں وہ جا رہا ہے وہاں سے واپس ہو کر آ بھی سکے گا یا نہیں۔

لاش جلنے کی بو آ رہی ہے — زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

میں وہ جنگی ماحول اور زندگی کا تضاد صاف عیاں ہے جس میں ایک غریب سپاہی کو اس کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر جھونک دیا گیا ہے۔ محسوسات کی یہ کیفیت اور اس کا بیان انسان کے حواس خمسہ پر اسی طرح اثر انداز

ہوتا ہے جیسے کسی خوشبودار لطیف جسم کا لمس اور اس اظہار سے جنگ و جدل سے نفرت کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہی شاعر کے بیان کی روح ہے۔ اس بیان میں بھی وہی حسن موجود ہے جسے جمالیات سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ برائی اور بدصورتی کا خوبصورت اور موثر اظہار یقیناً کسی خوبصورت ماحول، شخصیت اور اشیا کے بیانات سے کم حسین اور کیف آور نہیں۔ پھر اوپر کے بیانات میں شاعر کے عصری اور سماجی مسائل بھی شامل ہیں۔

دوسری مثال کی وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن شاعر کا اصل مقصد یہاں کی

ہے گل جہاں تعفن ہوائیں سب مسموم

سے زیادہ منسلک ہے نہ کہ 'کاکل'، 'رخ' اور 'کلی' کا حسن اس کے ذہن میں ہے۔ اور نہ وہ حسین عمل جس نے 'کلی'، 'کاکل'، اور 'رخ' کو مصرعے میں باندھ دیا ہے۔

اسی طرح گل تر کے کچھ حصے دیکھے جا سکتے ہیں۔

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

آج کی رات نہ جا (آج کی رات نہ جا)

دراز ہے شب غم سوز و ساز ساتھ رہے
مسافرو! مئے مینا گداز ساتھ رہے (ایک غزل)

ابن آدم کو سولی چڑھاتے رہو
زندگانی سر دار گاتی رہے
بادہ باراں میں اک جام غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل بڑھاتی رہیں پیار کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

(پیار کی چاندنی)

ان ٹکڑوں میں سے پہلا ٹکڑا جو "آج کی رات نہ جا" سے لیا گیا ہے اس میں تاریخ، سماج اور زندگی کی پُرپیچ راہوں سے گزرنے میں جو تلخیاں انسان کو مل رہی ہیں ان سے تھوڑا سکون حاصل کرنے کے لیے

معشوق کی دلکشی اور حسن کا سہارا لیا گیا ہے۔ بیان بات سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا ذہن، زندگی کے نشیب و فراز میں کس طرح الجھا ہوا ہے جس کا احساس مخاطب کو مجبول ہونے یا زندگی سے دامن کشی کا سبق نہیں سکھاتا بلکہ اس طاقت اور توانائی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جو ان تمام تلخ نوائیوں کے مقابلے میں لوگوں کو سینہ سپر کرنے کا راز سمجھائے جو کہ شاعر کے دور کی تاریخیت اور سماج کے ارتقائی مظاہر سے وابستہ ہیں۔ جو صرف وصل کی لذت اور ہوس و کامجوئی کے جذبات پیدا کرے یا مجرد جمالیات کا متلاشی سب کچھ "آج کی رات نہ جا" ہی کو سمجھ سکتا ہے جو اس کے نزدیک صرف ایک وجدان اور لمحاتی نفسیاتی کیفیت کا رد عمل ہے۔ باقی باتیں اس کے لیے لایعنی ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے ٹکڑوں میں جو لطف اسے "مے مینا گداز" "شب غم" "ہاتھ کی نرمیاں" "پیار کی چاندنی" میں مل سکتا ہے۔ اسی کو وہ حاصل نظم و غزل سمجھے اور یہ نہ سمجھے کہ "شب غم" کی تمثیل زندگی کی تلخ نوائیوں کے لیے ہے اور "مے مینا گداز" وہ ہمت اور قوت ہے جو انسان کو ایسے ناسازگار حالات کے برداشت کرنے کی طاقت دیتی ہے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ کوئی کہے کہ شیکسپیئر نے شائیلاک کا کردار یہودیوں کو بدنام کرنے کے لیے پیدا کیا اور یہ نہ سمجھے کہ شائیلاک سرمایہ داری کا وہ گھناؤنا رخ ہے جو اپنی منفعت کی خاطر انسان کے بدن سے گوشت کا ٹکڑا کٹوا کر ہمیشہ کے لیے اپنے حریف کو تجارت کے میدان سے ختم کر دینا چاہتا ہے۔ شائیلاک کے پردے میں شیکسپیئر نے سرمایہ دارانہ ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے نہ یہ کہ مذہبی جذبے سے مغلوب ہو کر یہودیوں کی نسل کو رسوائے عالم بنانا چاہا ہے۔ مجرد جمالیاتی حظ کے متلاشی کا یہی المیہ ہے۔ جمالیات کی مجرد اور مطلق بحث بغیر سماجی اور تہذیبی و عصری مسائل اور عوامل کے کرنا جمالیات کی روح، اس کی تاریخ اور اس کی وسعتوں سے بے خبری کا مظاہرہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خارجی عوامل اور اثرات ہی سے داخلی کیفیات کے وہ نغمے پھوٹتے ہیں جو حسن، جمال اور زندگی کی توانائی اور قوت تسخیر کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو خالص جمالیاتی قدروں کی تلاش میں ہیں وہ انسانی سوسائٹی کو بہکا کر پھر اسی ذہنی حصار میں قید کر دینا چاہتے ہیں جہاں وہ متعفن، مریضانہ اور کج روی کی فضا کو اپنا کر پھر خیال کی اس دنیا میں پہنچ جائے جس کا عام انسانوں کی زندگی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ صرف خلا اور لذت کوشی باقی رہے۔ نجی زندگی، نجی محدود جذبات اور تجربوں کی عکاسی کر کے تمام سماجی رشتے منتشر کر دے۔ مخدوم ایسا جمالیاتی نظریہ نہیں رکھتے کیوں کہ ان کی راہ فکر و عمل کا سلسلہ خارجی محسوسات کے ساتھ ساتھ اس عملی زندگی سے بھی ہے جہاں مجرد اور مطلق جمالیاتی تصور رکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جہاں فرد کے بجائے سماج، شخصی کشمکش کے بجائے بہت سے انسانوں کی بہتری کی فکر اور تہذیب و تاریخ کو ایک روشن مستقبل کی طرف لے جانے کی تمنا ہر وقت گھیرا ڈالے رہتی ہے۔ یہ باتیں ان کی شعری تخلیقات میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ اور انھیں باتوں کا تعلق

دراصل اس جمالیات سے ہوگا بھی جوان پنوں کے فکر و ذہن پر صالح اثر ڈالنے والی جمالیات کہی جائے گی۔

آنے والے دور کی پیش گوئی، اگر زماں و مکاں کی شعبدہ بازیوں اور مسائل سے بے تعلق ہو کر ہو سکتی تو مخدوم کے لیے ایسی پیش گوئی مشکل نہ تھی۔ تاہم ان کے اس نئے طرز، جدید روش حالیہ تخلیقات اور اور اُن کی معروف سیاسی زندگی کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسائل حیات نے انھیں اگر دم لینے کی فرصت دی تو اردو شعر و ادب کی تاریخ انھیں بلند سے بلند تر منزل عطا کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔

اگ ووڈ
جہاں آپ کی
ضرورت، پسند اور مذاق کے مطابق ہر قسم کا
جدید وضع کا چوبی فرنیچر
ہر وقت دستیاب ہو سکتا، اور آرڈر دینے پر
تیار کیا جاتا ہے
شوروم: چوراہا بشیر باغ۔ فون (۳۲۱۲۰)
فیکٹری، اے سی گارڈ۔ فون مکان (۱۸۷۱۴)
EG WOOD
BASIR BAGH HYD. A.P

خوشنما اور خوبصورت
جڑاوی زیورات
کیلیے
مصدی لال تتارو مل
کا نادر یاد رکھیئے
فروخت کرنے کے علاوہ ہم زیورات
اچھے داموں میں خریدتے بھی ہیں
مصدی لال تتارو مل
چار کمان۔ حیدر آباد۔ اے پی
فون دکان (۱۸۷۱۴)۔ فون مکان (۱۸۷۱۴)

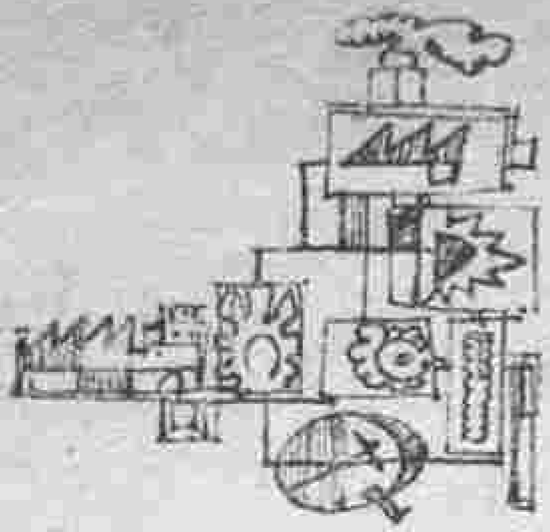

مخدوم محی الدین کی شاعری کا ایک سرسری جائزہ

سلام سندیلوی

● مخدوم محی الدین ترقی پسند شعرا میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے میدانِ سخن کی پُرپیچ راہوں کو طے کر رہے ہیں اور بڑی حد تک اپنی منزل پر پہنچ بھی گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری سے دورِ حاضر کو متاثر کیا ہے اور بذاتِ خود دورِ حاضر سے تاثر حاصل کیا ہے۔ اسی لیے اُن کی شاعری کا سفر

۱

زمانے کی رفتار سے ہم آہنگ ہے۔

مخدوم محی الدین نے شاعری کی ابتداء کوچۂ حسن سے کی اور یہ ایک فطری بات ہے۔ ہر شاعر کا اس کوچہ کی سیر کرنا اور کسی بتِ طناز کے عشق میں چکر لگانا عین فطرت کے مطابق ہے۔ ترقی پسند شعرا نے بھی عام طور سے شاعری کے سفر کا آغاز کوچۂ حسن ہی سے کیا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شاعر میں حسن و عشق کی روح کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ اس کا انحصار شاعر کے مزاج پر ہے۔ عشقیہ شاعری کے لیے شیشہ کی طرح نازک دل کی ضرورت ہے مگر جن شعرا کے مزاج میں سنگ کی سختی موجود ہے عشقیہ شاعری ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے شعرا دبِ عشق کی وادی میں گلگشت کرتے ہیں تو ان کی لغزش یا ظاہر ہو جاتی ہے۔ مخدوم محی الدین کے مزاج میں لوچ اور لچک موجود ہے۔ ان کے پہلو میں دلِ گداختہ ہے اس لیے جب وہ عشقیہ شاعری کرتے ہیں تو اس میں سوز و گداز اور درد و داغ کی کیفیات ملتی ہیں۔ ان کے مزاج اور موضوع میں فاصلہ نہیں پایا جاتا ہے بلکہ دونوں ایک ہی رشتے میں گندھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

مخدوم محی الدین کی عشقیہ شاعری میں ان کی زندگی کی سچی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کا عشق فرضی اور رسمی نہیں ہے جیسا کہ قدیم عہد کے بہت سے شعرا کے یہاں ملتا ہے بلکہ ان کے عشق میں اصلی واقعات کی کڑیوں کی جھنکار موجود ہے۔ انھوں نے "طور" نظم میں اپنے ابتدائے عشق کا

واقعہ یوں بیان کیا ہے :-

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و ادا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

یہی پانی کے کنارے، کھیتوں کی سرزمیں ان کے لیے طور کی حیثیت رکھتی ہے جہاں انھوں نے پہلی بار محبوب کا جلوہ دیکھا تھا اور ہوش و حواس کھو دیے تھے۔

مخدوم محی الدین کے عشق میں خلوص اور صداقت کی جھلکیاں کارفرما ہیں۔ اُن کی عشقیہ شاعری کی معصومیت ہم کو بار بار اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے سادہ خیالات میں حسن و عشق کی داستان کروٹیں لے رہی ہے۔

ہر ادائے حسن پر ہوتا ہے دل جب بیقرار
جب وہ کرتا ملاقاتوں کا اکثر انتظار
جب طبیعت تجھ سے ملنا چاہتی ہے بار بار
یاد ہے وہ نوجوانی کا زمانہ یاد ہے

اس بند میں ابتدائے عشق کی سادگی اور پُرکاری موجود ہے۔ مخدوم محی الدین کے اظہار و بیان میں تصنع اور آورد کو دخل نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا عشق سچا اور پختہ ہے۔ اسی لیے نظم "یاد ہے" میں جن یادوں کا سلسلہ چھڑا گیا ہے وہ حقیقت سے لبریز ہے۔ نظم "سجدہ" میں بھی یہی حقیقت طرازی جلوہ گر ہے۔

پھر اسی شوخ کا خیال آیا — پھر نظر میں وہ خوش جمال آیا
پھر تڑپنے لگا دل مضطر — پھر برسنے لگا ہے دیدۂ تر
یاد آتیں وہ چاندنی راتیں — وہ ہنسی، چھیڑ، دل لگی، باتیں
چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی — آتی آواز اس کی باتوں کی

"چوڑیاں بج رہی ہاتھوں کی" مصرع اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس پردۂ زنگاری میں جو معشوق ہے وہ فرضی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس کا وجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ معشوق ماورائی بھی نہیں ہے بلکہ ارضی ہے جو ہمارے معاشرہ کا ایک حسین جزو ہے۔

مخدوم محی الدین نے اپنی جوانی کے ایام میں حسن و عشق کے تجربے کیے۔ جیوں جیوں ان کا شعور پختہ ہوتا گیا، اُن کے تجربات وسیع ہوتے گئے وہ صرف حسن و عشق کے کوچے ہی میں محدود نہیں رہے بلکہ دیگر مناظر پر

بھی نظر دوڑائی۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو آگے چل کر ان کے یہاں عشق کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی ملتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مخدوم محی الدین نے اشتراکی نظریات کو مکمل طور پر اپنا لیا ہے جس کا خاص موضوع سماج کے معاشی حالات کا تجزیہ اور ان کا حل ہے۔ مگر ان کی نظر زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی پڑتی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ روپ زیادہ روشن اور واضح نہیں ہیں تاہم ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض جگہ مخدوم محی الدین نے ایک فلسفی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

نظم "شاعر" میں انھوں نے شاعر کے مزاج کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ شاعر کے مزاج کی تشکیل میں مختلف عناصر کام کرتے ہیں۔ اس کے مزاج میں قوس قزح کا رنگ، تاروں کا نور، بجلی کی تڑپ، بہاروں کا کیف، پھولوں کی مہک شاخوں کی لچک وغیرہ شامل ہے۔ ان تمام عناصر کے امتزاج سے شاعر کا دل وجود میں آیا ہے اور یہی شاعر کا دل ہے جو پتھروں میں اپنی دھڑکن سمو دیتا ہے اس طرح وہ حیوانات سے لے کر جمادات تک کو جنبش و حرکت میں لے آتا ہے۔ اسی قسم کا فلسفیانہ تجزیہ ان کی نظم "میں" میں بھی ملتا ہے۔

مخدوم محی الدین کے یہاں کہیں کہیں منظر نگاری کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے لیے ان کی نظم "قمر" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

شفق کی پشت کے پیچھے سے آرہا ہے قمر — زمیں پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر
درخت چاندی کے ان کے ثمر بھی چاندی کے — ہر اک حسین کو حسیں تر بنا رہا ہے قمر

ان اشعار میں قمر کی تصویر حسین انداز میں اتاری گئی ہے۔ یہ تصویر اور بھی حسین ہو سکتی تھی اگر قمر کی منظر کشی غزل کے انداز میں نہ کی جاتی بلکہ اس کے لیے نظم کا اسلوب اختیار کیا جاتا۔ کیوں کہ قافیوں کی مسلسل بندشیں اصل خیالات کے اظہار میں رخنہ انداز ہوتی ہیں جب کہ نظم کی فضا زیادہ کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود یہ منظریہ اشعار کامیاب ہیں مخدوم محی الدین نے قمر کی منظر کشی برائے منظر کشی نہیں کی ہے۔ بلکہ اس منظر کشی کے پردے سے مقصدیت کا چہرہ جھلک رہا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے جزیروں میں — زمیں کے درد کو اوپر بلا رہا ہے قمر
یہ کس غریب کے سینے سے ہوک اٹھتی ہے — لرز رہے ہیں محل تھرتھرا رہا ہے قمر
اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے — کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر
کہاں ہے ساقی گل رو کہاں ہے سرخ شراب — فسانۂ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

شاعر نے جب قمر کو بغور دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی فسانۂ غم گیتی سے متاثر ہے۔ کیوں کہ دنیا میں افلاس اداسی اور غلامی پھیلی ہوئی ہے۔ مخدوم محی الدین نے فطرت اور انسان میں ایک رابطہ پیدا کیا ہے۔ چوں کہ فطرت اور

انسان میں روزِ اول سے تعلق موجود ہے۔ اس لیے ظاہری ہیئت میں جدا ہوتے ہوئے بھی دونوں میں باطنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسی لیے انسان کے غم پر قمر بھی اشک بار نظر آتا ہے۔

مخدوم محی الدین کے یہاں ابتدا میں بنی نوعِ انسان سے گہرے تعلق کا پتا نہیں چلتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے یہاں انسانی ہمدردی اور عالمی محبت کے نقوش ابھرنے لگے ہیں اس طرح ان کا موضوع پھیلتا ہے اور ساری کائنات پر بکھر جاتا ہے اور جب سمٹتا ہے تو انسان کی ذات پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ ان کی وطنی اور عالمی شاعری میں بڑی دلکشی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دلکشی کا باعث ان کا نرم اسلوب ہے۔ بعض ترقی پسند شعرا کے اسلوب میں کھردرا پن ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری دل پر گہرے نقوش نہیں ثبت کرتی ہے۔ موضوع ہزار اہم سہی مگر جب تک طرزِ بیان دلکش نہیں ہوتا ہے کوئی بات دل میں گھر نہیں کرتی ہے۔ مخدوم محی الدین کی شاعری کا لب و لہجہ نرم و نازک اور لطیف ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ جنگ کی بات کرتے ہیں تب بھی ان کی زبان سے انگارے کے بجائے پھول برستے ہیں۔ ان کی نظم "جنگ" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

امن و اماں کی نبض چھپی جا رہی ہے کیوں
بالینِ زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں

اب دلہنوں سے چھین لیا جائیگا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

برلبط نوازِ بزمِ الوہی ادھر تو آ
دعوت دہِ پیامِ عبودی ادھر تو آ

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیدادیاں تو دیکھ

ان اشعار میں درشتی اور سختی نہیں ہے بلکہ سنبھلے ہوئے انداز میں جنگ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور انسان کے خون کی ارزانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی قسم کا نرم لب و لہجہ ان کی نظم "جنگِ آزادی" میں بھی موجود ہے۔

مخدوم محی الدین کی عشقیہ شاعری میں جس طرح خلوص اور صداقت ہے اسی طرح ان کی سیاسی شاعری میں بھی حقیقت کی جھلک جلوہ گر ہے۔ دورِ حاضر کے بہت سے شعرا اپنی شاعری میں زنداں، قید، سلاسل، اور فصیل وغیرہ کا ذکر فرضی طور پر کرتے ہیں ان کی نقالی بالکل بے کیف اور بے اثر ہوتی ہے جس نے کبھی قید و بند کی زندگی نہیں گزاری ہے وہ اس کی سختیوں کا تجربہ کس طرح کر سکتا ہے۔ مخدوم محی الدین نے بذاتِ خود کمیونسٹ تحریک کے سلسلے میں قید کاٹی ہے اسی لیے ان کو قید و بند کا ذاتی تجربہ ہے۔ انھوں نے اپنے ان تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی نظم "قید" ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں، داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے

دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے

چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو
جاگ اٹھتی ہے مری شمع شبستان خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے

عام طور سے آزاد نظموں میں تاثر کی کمی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مبہم انداز بیان بھی سوز و اثر میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ مگر مخدوم محی الدین کی اس نظم میں تاثیر اور تڑپ موجود ہے۔ انھوں نے قید کے ماحول اور اس کے اثرات کی صحیح اور واضح طور پر عکاسی کی ہے۔

مخدوم محی الدین نے ایک کمیونسٹ شاعر کے رشتے سے سرمایہ داری پر بھرپور وار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سطح ارض پر ساری مصیبت سرمایہ داروں کے ہاتھوں لائی ہوئی ہے۔ اس لیے انھوں نے سرمایہ داری کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ان کی نظم "زلف چلیپا" سرمایہ داروں پر ایک بھرپور وار ہے۔

آ رہی ہے تجھ پہ لے سرمایہ داری کا نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا ساتا اہتمام

آندھیاں شعلے بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج

موت محو شادمانی غرق ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمد کی زمیں وہ ابن مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے

ان اشعار میں انسان کی بے بسی اور بیکسی کی سچی تصویر دکھائی گئی ہے۔ ماؤں کی سہانی گودیوں کی ویرانی اور فرق گیتی پر کانٹوں کے تاج کا باعث سرمایہ داری ہے اس کی نحوست سے ساری خلقت مٹ رہی ہے اور کائنات جل رہی ہے۔ یہ سارے اشعار سوز و تاثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان اشعار کا اسلوب بھی شگفتہ اور دلکش ہے۔ مگر چھٹے شعر میں کرشن بروزن گلشن کچھ غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ان اشعار کی تاثیر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ان اشعار میں سرمایہ داری کو مستاصل کرنے کا جذبہ بھرپور موجود ہے۔

مخدوم محی الدین کو اس بات کا یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی سرمایہ داری کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور دنیا میں صلح و آشتی اور مساوات کا پرچم لہرانے لگا۔ کیوں کہ انسانی شعور بیدار ہو چکا ہے۔ اور اب وہ غلامی کے پنجوں میں کھیلنے کے لیے

تیار نہیں ہے۔ ان کی نظم "مستقبل" اس نئے زمانے کی بشارت دیتی ہے

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

دھڑکتے دلوں کی صدا آ رہی ہے
اندھیرے میں آواز پا آ رہی ہے
بلاتا ہے کوئی ندا آ رہی ہے

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

نہ سلطانی و قیصری ہے نہ زاری
نہ تخت سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

سفینہ مساوات کا کھے رہا ہے
جوانوں سے قربانیاں لے رہا ہے
غلاموں کو آزادیاں دے رہا ہے

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

مخدوم محی الدین کی شاعری مجموعی طور پر دلکش، حسین اور کامیاب ہے ان کی شاعری بڑی حد تک فنی اور لسانی عیوب سے بھی پاک ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ ورنہ بہت سے ترقی پسند شعرا ان لغزشوں کے مرتکب ہوئے ہیں جن کا نہ ان کو احساس ہوتا ہے اور نہ اعتراف کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ مخدوم محی الدین کے موضوعات اہم ہیں۔ ان کا اسلوب بھی نازک اور لطیف ہے۔ ان کے موضوع اور ان کے اسلوب کی آمیزش سے جو مے دو آتشہ تیار ہوتی ہے اس میں بلا کا نشہ اور خمار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ نشہ اور خمار دیرپا معلوم ہوتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک میکدۂ شاعری کا در کھلا رہے گا ان کی شراب کا نشہ اور خمار باقی رہے گا۔

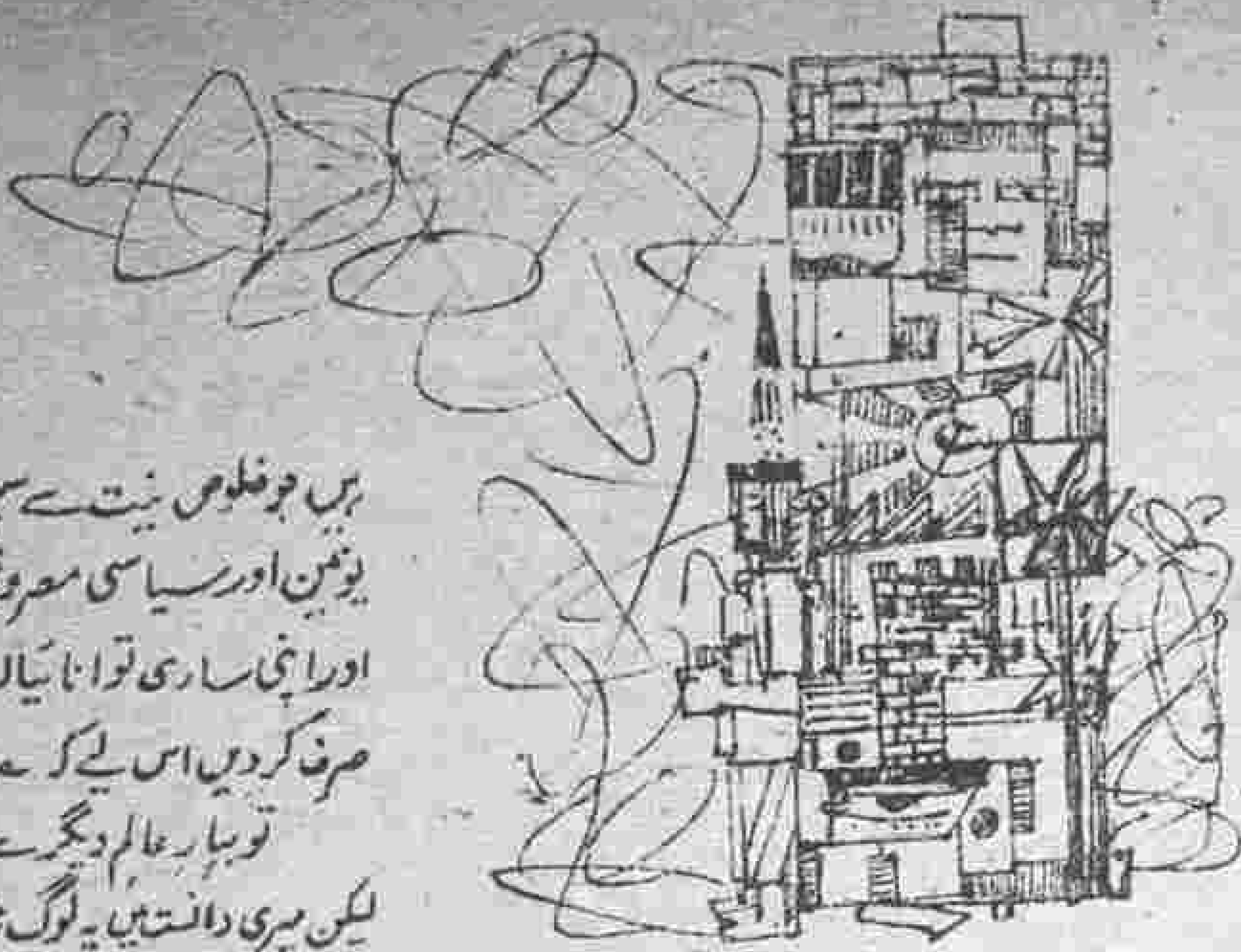

مخدوم کی زندگی
مخدوم کی شاعری

راج بہادر گوڑ

● ایسے بہت لوگ ہیں اور بلاشبہ ان میں بہت نیک دل بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مخدوم بہت بڑے شاعر ہیں لیکن کمیونسٹ اور مزدور تحریک نے ان کی شاعری پر پہرے بٹھا دیے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو خلوص نیت سے بھی یہ کہتے ہیں کہ مخدوم ٹریڈ یونین اور سیاسی مصروفیتوں سے سبکدوش ہو جائیں اور اپنی ساری توانائیاں شعر و ادب کی خدمت میں صرف کر دیں اس لیے کہ ؎

تو برائے عالم دیگرے زکجا بہ ایں چمن آمدی

لیکن میری دانست میں یہ لوگ مخدوم کی شاعری اور شخصیت کو صرف ایک پہلو سے دیکھتے ہیں۔ مخدوم نے جس سیاسی اور سماجی مقصد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے وہی ان کی شاعری کا خمیر بھی ہے۔ پھر اس مقصد سے مخدوم کو محض افلاطونی لگاؤ نہیں ہے بلکہ اس کے حصول کے لیے وہ مسلسل جد و جہد کرتے رہے ہیں۔ اسی جد و جہد سے وہ اپنے شعر کا مواد، بیان کا خلوص، ادبی اعتماد اور فنی پختگی حاصل کرتے ہیں۔

مخدوم تلنگانہ کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے اور وہیں کھیتوں میں "پانی کے کنارے" انھوں نے پہلے پہل "دل دھڑکنے کی صدا" سنی۔ گاؤں کی "نا آشنائے سیم و زر دختر پاکیزہ گی" سے آنکھیں چار ہوئیں۔

جب شعور نے انگڑائی لی تو مخدوم نے دیکھا کہ ان کا محبوب "مشرق" مغربی چیلوں کا لقمہ ہے۔ ایک مسلسل رات، ایک بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ ایک مرگ بے قیامت ہے۔

پھر انھوں نے دیکھا کہ ہمالہ کے پرے افق پر

انقلاب کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ اور ایک "جہانِ نو" کی بشارت دے رہا ہے۔

ایسا جہاں جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہاں جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہاں جس کی نئی صبح و شام ہو

لیکن مخدوم یہاں رکتے نہیں، وہ اپنے ہم وطنوں کو آواز دیتے ہیں:

ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

معصوم ہندوستانی قوم کی محرومیوں نے مخدوم کو درد و کرب دیا۔ ایک نئی دنیا کے جنون پرور تصور نے ان کو آشفتہ سری دی۔ پھر وہ اس ممکن الحصول۔ تابناک مستقبل کی طرف حیات لے کے، کائنات لے کے، سارے زمانے کو ساتھ لے کے چل پڑے۔

اور یہی عوامل مخدوم کی شاعری کی محرکات ہیں۔

مخدوم کے پاس آرزو ہے لیکن غم آرزو نہیں۔ حال کی ناآسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے کیوں کہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ اپنی باعمل زندگی اور جہدِ مسلسل ہی سے وہ اعتماد حاصل کرتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ۔

رات کے ماتھے پر آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور

مہر بہ صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا

یہ کچھ ہے کہ محکومی سے تنگ آکر کچھ جوانمرد آزادی کی منزل کی طرف دہشت پسندی کے SHORT CUT پر چل نکلیں اور آس کریں کہ امید جلد بر آئے گی۔ چنانچہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں کچھ آشفتہ سروں نے دہشت پسندی کا راستہ اختیار بھی کیا تھا۔

ادب پر بھی اس تحریک کی چھاپ پڑی۔ یہاں تک کہ اقبال بھی ادبی دہشت پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور جب انھوں نے کسانوں کی کس مپرسی دیکھی تو بے ساختہ چیخ اٹھے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

مخدوم پر بھی یہ موڈ طاری ہوا تھا۔ ان کا باغی اعلان کرتا ہے۔

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا

ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرت آبادِ امارت کا مکاں توڑوں گا
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگا دینے دے مجھے

اور پھر :
زلزلو آؤ، دہکتے ہوئے لاوٗ آؤ
بجلیو آؤ، گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ، جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

اس موڑ پر مخدوم نے دیکھا کہ انقلاب کا کوئی SHORT CUT نہیں ہے۔ محنت کش عوام کی منظم تحریک ہی... انقلابات کی خالق ہوتی ہے۔ وہ باعمل تو تھے ہی ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ کسانوں کی جدوجہد میں حصہ لینے لگے۔

مخدوم اپنے دور کے چوٹی کے شاعر ہی نہیں، چوٹی کے مزدور اور کمیونسٹ رہنما بھی ہیں۔

مخدوم سنگرینی کالریز میں INCOGNITO پہنچ گئے ہیں۔ مزدوروں کے اجتماع میں ہیں۔ ان کی یونین بنا رہے ہیں

مخدوم شاد آباد میں ہیں۔ سمنٹ کے مزدوروں کی ہڑتال کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

مخدوم کو داڑ کے قریب اپنے جتھے کے ساتھ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں اور پولیس کے آفیسر کی پیشانی کو 12 O'CLOCK شاٹ کا نشانہ بنانے کا اہتمام ہو رہا ہے۔

مخدوم، بی رنڈی مرحوم کے ساتھ ہیں، اور ادھر دیسکھ کی گڑھی سے رضاکاروں کا جتھا ایک بدہیت سالار کی سرکردگی میں نکلا۔ گولی چلنے لگی

آصف جاہی "حویلی" میں شگاف پڑا۔
پھر مخدوم کی تلوار، قلم میں تبدیل ہو گئی اور شاعر نے کہا۔
لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظامِ ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربت کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

بدل رہی ہے یہ رنج و عذاب کی دنیا
ابھر رہی ہے نئے آفتاب کی دنیا
نئے عوام نئی آب و تاب کی دنیا
وہ رنگ و نور کی محفل شباب کی دنیا

یہی تو مخدوم کا ہنر ہے وہ تلوار کو قلم میں اور قلم کو تلوار میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وہ عوام کے معروف قدموں سے قدم ملا کر چلتے ہیں، ان کی لڑائیوں میں حصہ لیتے ہیں اور پھر ان ہی لڑائیوں کے تجربوں کو عوام کے ارمانوں کو ان کی کامرانیوں کو شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔ خود مخدوم نے "گل تر" کے مقدمہ میں کہا ہے کہ باہمہ اور بے ہمہ کا یہ سلسلہ جاری کار رہتا ہے۔ مخدوم نے اس ہنر میں جہاوت حاصل کر لی ہے۔

مخدوم کی رومانی شاعری بھی ان کی زندگی کے بلند نصب العین کے تابع ہے۔ وہ روایتی رومانی شاعری سے الگ بھی ہے اور ارفع بھی۔ وہ داغ کی طرح یہ نہیں کہتے۔

مٹی کی بھی لے تو روا ہے شباب میں

وہ کہتے ہیں۔

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

اور مخدوم کا پیار شب کی تاریکی میں کیا جانے والا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے کہ:

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدوم کا میکدہ کوئی دیر یا حرم نہیں ہے۔ وہاں جانا ہو تو،

نظر عفیف دلِ پاک پارسا خود رہے

مخدوم کے پاس رقیب کی شکایت، ہجر کا رونا، شیخ کی غیبت، یہ سب کچھ نہیں جو روایتی رومانی شاعری کی خاص علامتیں ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ مخدوم جلبتوں کے غلام نہیں رہے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مخدوم جس تہذیبِ نو کے نقیب ہیں وہ انسان کو شرافت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ اور مخدوم انٹلکچول اعتبار سے ان بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں۔

لیکن مخدوم عشق کی محرومیوں سے واقف ہیں۔ اور "چارہ گر" پر کس کر طنز کرتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

الغرض مخدوم نے دیکھا کہ محنت اور محبت دونوں ہی مجبور ہیں اس لیے وہ پروردگار سے دعا کرتے ہیں۔

صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

یہی مخدوم کی آرزو ہے۔ یہی ان کی زندگی، ان کی جدوجہد اور ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مخدوم شاعر ہی نہیں اپنے دور کا شعری مزاج ہیں بلکہ خود شاعری کا ایک دور ہیں۔

عمل اور کامیابی کے دس سال

آندھرا پردیش کے قیام کو ایک دہا یعنی دس سال کی مدت مکمل ہونے پر خوشیاں منانے میں ہم سب شریک اور متحد ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو آندھراؤں کی تاریخ میں ایک عظیم یادگار دن تھا۔ اور ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۶ء تک کے دہے میں ریاست میں عزم و ایقان اور عمل کی محرک قوتوں کی بدولت سرگرمی اور ریل پیل جاری رہی۔ ہمارے منصوبوں نے عوامی جوش اور جذبے کو بیدار کرتے ہوئے اور عوام کا تعاون حاصل کرتے ہوئے ہماری فکر و خیال کو نئی وسعتیں بخشی ہیں۔

ہمارے منصوبوں میں اگر ایک طرف زرعی پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا ہے تو دوسری طرف صنعتی ترقی کے لیے بھی ضروری اسباب و وسائل مہیا کیے گئے ہیں۔ زراعت پر مسلسل زور دینا نہ صرف ریاستی نقطۂ نظر سے ضروری ہے بلکہ اولین قومی ضرورتوں کا بھی یہی تقاضا ہے۔

اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ منصوبوں کے مجموعی رقمی خرچ کے پروگراموں کے لحاظ سے پہلے منصوبے کے تحت ریاست کی کامیابی (۱۰۱) فی صد، دوسرے منصوبے کے تحت (۱۰۵) فی صد رہی۔ حقیقت میں یہ ریکارڈ فخر و مباہات کے قابل ہے۔

پچھلے دہے میں جس میں دوسرے اور تیسرے پانچ سالہ منصوبوں کی مدتیں شامل ہیں برقی قوت کی ترقی پر جو زرعی اور صنعتی دونوں طرح کی ترقی کے لیے اولین شرط ہے (۱۲۶۰٫۱) کروڑ روپے خرچ کیے گئے۔ اسی عرصہ میں زراعت اور آب پاشی پر مجموعی طور پر (۲۶۶٫۴۴) کروڑ روپے خرچ کیے گئے ہیں۔

ریاست کے چوتھے پانچ سالہ منصوبے کے تحت (عارضی) مجموعی رقمی خرچ (۶۳۵) کروڑ روپے تجویز کیا گیا ہے جس میں زراعت، آبپاشی اور برقی قوت کے پروگراموں پر حسب معمول مسلسل زور دیا جائے گا۔ اب ہم اعتماد اور بھروسے کے ساتھ روشن تر مستقبل کی توقع کر سکتے ہیں جس کی بنیادیں یقین اور اخلاص کے ساتھ رکھی جا چکی ہیں۔

ہم نے جوش، ولولے اور طاقت کے ساتھ ریاست کے قیام کے دوسرے دہے میں داخل ہو رہے ہیں اور اپنے آپ کو مادر وطن کی بڑی سے بڑی خدمت کے لیے وقف کر لیتے ہیں۔

پہلا کامیاب دہا ایک روشن مستقبل کی ضمانت دے رہا ہے

ٹی رام چندر راؤ۔ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ۔ آندھرا پردیش

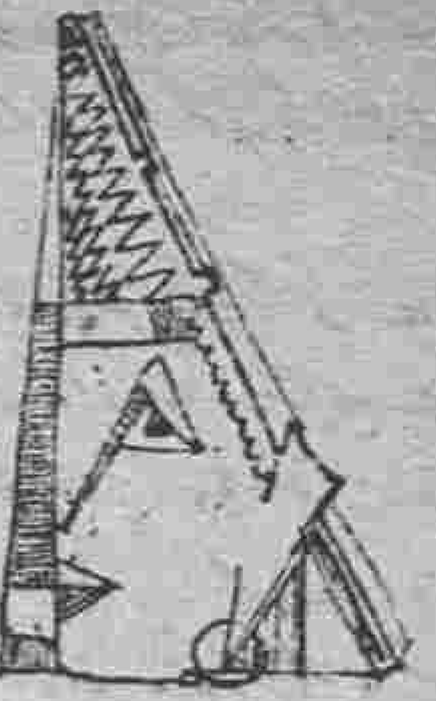

مخدوم

ایک مکمل فنکار

مصطفیٰ علی اکبر گرامی

● مخدوم کی شخصیت اور اس کے فکر و فن سے متعلق اپنے شخصی تاثرات کے اظہار کے لیے ایک طویل عرصہ سے سوچ رہا تھا۔ لیکن اس میں آج تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اب کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو تاثرات کا بے پایاں سمندر سامنے ہے مجبور ہوں۔ اس لیے کہ وقت کم ہے۔ صرف مختصر تذکرے پر اکتفا کروں گا۔

مخدوم کی شخصیت جتنے حسین خانوں میں بٹی ہوئی ہے اس کی شاعری کے بھی اتنے ہی حسین روپ ہیں۔ وہ ایک مکمل آرٹسٹ ہے اور ایک آرٹسٹ ہی کی طرح زندہ رہتا ہے۔ اس کی روزمرہ زندگی میں اس کے فن کا حسن انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے۔ وہ جس انداز میں سوچتا ہے اسی انداز میں سانس بھی لیتا ہے وہ تصنع اور دکھاوے سے پاک اور ریاکاری سے کوسوں دور ہے اور اس کی یہی خصوصیت ایک مکمل آرٹسٹ ہونے کی سب سے بڑی پہچان ہے وہ ماحول اور روایات کے بنے تلے اصولوں کی گرفت سے بہت پرے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے فنکاروں کی طرح اس کا اپنا کوئی معین راستہ نہیں۔ اس کی شخصیت کوئی ایسی ندی نہیں جو اپنے بہاؤ کے لیے ایک مقررہ راستے کی مرہون رہے۔ اور جس کا جوش و سیلاب اپنے کناروں کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ ایک ایسی خوبصورت تتلی ہے جو اپنے جذبات اور تصورات میں سرشار جیتی جاگتی اٹھلاتی رنگ برنگ کے پھولوں کی مسکان اور ان کی خوشبو کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہے اور پھر بہار سے لیے روپ رنگ کا پیام لے کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ کسی ایک پھول یا ایک مقام کا ہو کر رہ جانا اس کے لیے ممکن نہیں۔

مخدوم کے مکمل فنکار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف کبھی کسی چیز کو نہ اپنی شاعری میں داخل ہونے دیا نہ اپنی زندگی میں۔ وہ پیدائشی GENIUS ہے۔ مخدوم کے فکر وفن سے متعلق اس نکتہ کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا بت تراش ہے جس کے فن کا حسن خوبصورت گل بوٹوں کے تازہ رنگ مرقعوں کی شکل میں جا بجا مسکراتا اور گیت گاتا نظر آتا ہے۔

فی الوقت میں اپنے اس محبوب شاعر کی ایک اہم مخصوص اور نمایاں خصوصیت کو جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ مختصراً بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ مخدوم نہ صرف بہت زیادہ حساس ہے بلکہ اس میں جذبات کی شدت بھی حد کمال تک پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الوکھے موضوع اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے تلاش کر لیتا ہے۔ . . . . . اگر کہیں اس نے کسی فرسودہ اور پرانے موضوع پر طبع آزمائی بھی کی ہے تو اس موضوع اور مضمون کو نئی حیات بھی بخشی ہے۔ روایات کی غیر ضروری پابندی سے اس کی شاعری اُس کی فطرت کی طرح یکسر پاک اور بے نیاز ہے۔

جنگ کے عنوان سے قدیم اور جدید کئی شعرا نے نظمیں کہی ہیں لیکن مخدوم کی نظم جنگ انداز اظہار کا بے ساختہ پن اپنی ندرت کے ساتھ کہیں نہیں ملتا۔ ملاحظہ ہو:

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

اس مختصر سے ٹکڑے میں جانے والے سپاہی کا عزم اور پھر "پوچھو وہ کہاں جا رہا ہے" میں جنگ کی تباہ کاری ہولناکی سے لے کر اس کے سارے مضرات سے باخبری اس کے خلاف تنبیہ اور اس سے واقفیت کے باوجود سپاہی کے مصمم قصد کے اظہار کا کیا خوبصورت اشارتی انداز ہے۔ نظم کیا ہے ایک ایک لفظ اپنی جگہ حکایت ہے۔ اس خصوصیت کی حامل ایک اور مختصر نظم نمونتاً پیش کرتا ہوں۔ پنڈت نہرو کی وفات پر ہندوستان کے لاتعداد شعرا نے مختلف زبانوں میں اپنی عقیدت اور رنج کا اظہار کیا لیکن مخدوم کی نظم سب سے مختلف ہے۔

ہزار رنگ لیے اک کبھو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار مشت بہار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

اس نظم کے ایک ایک لفظ کے حسن وجمال کی تشریح کے لیے ایک دفتر درکار ہے لیکن میرا مقصد صرف مخدوم کی

چند خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے میں محض اسقدر عرض کروں گا کہ ان چند اشعار میں پنڈت جی کی شخصیت کو جس خوبصورت پیرائے میں ظاہر کیا گیا اور ان کی وفات کے واقعہ کی اہمیت کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ سب شدت احساس کی دین ہے اور ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔

ادب میں طنز کو بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ جس فن کار کے مزاج میں احساس اور جذبات کی شدت کے ساتھ WIT بھی بڑے پیمانے پر ودیعت کی گئی ہو۔ طنز کے خدوخال اسی قدر تیکھے اور کٹیلے ہوں گے اور یہ حسن بڑے نامعلوم انداز میں جلوہ گر ہوگا۔ جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی ان خصوصیات سے متصف ہونا ضروری ہے۔ ایک طنز تو وہ ہوتا ہے جس کا انداز بالکل کھلا اور صاف ہو۔ جیسے حضرت اکبرالہ آبادی کا طنز۔ دوسرا طنز وہ ہے جو پس پردہ نشتر زنی کرتا ہے۔ مثلاً

(۱) غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

(۲) ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

مخدوم کا طنز دوسرے زمرے سے تعلق رکھتا ہے، جیسے "چارہ گر" اور "بھاگ متی" وغیرہ میں منجملہ دیگر خصوصیات کے اپنی معراج پر ہے۔

(۱) یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

(۲) آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھولدو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

(۳) کوئی ملتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

ادب میں NOSTALGIC FEELINGS جس کا قریبی ترجمہ "یادیں" کیا جا سکتا ہے کے اظہار کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مخدوم کے پاس ان یادوں کے حسین مرقعے ملاحظہ ہوں۔

(۱) نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

(۲) فصل گل ہوتی تھی کیا جشن جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

(۳) چمن کی آنکھ بھر آئی کلی کا دل دھڑکا
لبوں پہ آئی ہے جب بھی کسی قرار کی بات

(۴) یہ زرد زرد اُجالے یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بیقرار کی بات

(۵) کوئی جھلملاتا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے

جنگ اور جنگ کے بعد اور پھر ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کے دور میں شاعری نے جھنجلاہٹ اور جھلاہٹ کے عجیب و غریب روپ دھارے تھے اور جوش نے اپنے غم و غصہ کا اظہار یوں کیا تھا:

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ

لیکن مخدوم کی جھلاہٹ میں اپنے وطن کا پیار اور انسان کی محبت موجزن ہے۔ مثلاً

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

آخر میں اس قدر عرض کر دوں کہ مخدوم کی صحبت میں چند لمحات کا گزارنا کسی آرٹ گیلری کی سیر یا بہ اعتبار رسوزیت شراب کے دور کے مماثل ہے۔

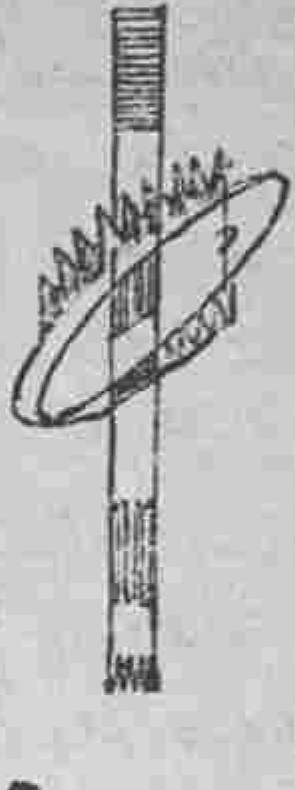

مخدوم کی شاعری میری نظر میں

یٰسین علی خاں

● تقریباً ۳۳ برس سے مخدوم محی الدین صاحب مجھے جانتے ہیں اور اس جان پہچان کا جو شرف مجھے حاصل ہے اس لحاظ سے جو کچھ میں لکھوں گا اس کا کوئی حصہ ماخوذ نہ ہوگا بلکہ اس پر مستند ہے میرا فرمایا ہوا کی مہر لگی ہوگی. میرا مخدوم سے اولین تعلق ان کا شعر ہے اس تعلق سے دوسرے تعلقات کڑی بہ کڑی ملتے چلے گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے. اس موقع پر مجھے برہان الدین صاحب کا وہ جلسہ یاد آرہا ہے جب کہ آج سے ۳۳ برس پہلے ایک ادبی محفل میں اردو شاعری کے ارتقا پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ دکن میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا شاعر یک بیک پیدا ہوگیا ہے اور وہ مخدوم ہے. پرانی یادیں اس بات کی متقاضی ضرور ہیں کہ مخدوم سا محبوب شاعر زندگی کے جس نشیب و فراز سے گزرا ہے کچھ اس کا ذکر ہو، اور کچھ ایسے واقعات اور حادثات بھی بیان کیے جائیں جن کے نازک اور لطیف نقوش آج بھی ذہن کے کینوس پر حیوں کے توں محفوظ ہیں. لیکن مجھے یقین ہے کہ جشن مخدوم کے موقع پر لکھنے والوں میں سے اکثر نے یہ کام بحسن و خوبی انجام دے دیا ہوگا اس لیے یہاں میں مخدوم کی شاعری میں فن، اور اظہار شخصیت کے جو انمول خزانے مجھے مل سکے ہیں ان ہی کا مختصراً ذکر کروں گا. اس کے آرٹ کی ساحرانہ خوبیاں یہ ہیں کہ مخدوم اپنے شعروں میں ایک ایسی نئی اور اچھوتی دنیا آباد کر لیتا ہے کہ اس کے اشعار میں تصور تصویر سے ہمکنار نظر آتا ہے اور وہ اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آمیزش اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو کچھ اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ اس کے اس عمل سے تضاد تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کا مرکب بن جاتا ہے. جمالیاتی تاثر اس کی شاعری کی جان ہے مگر اس کی رومانیت... روحانی کیفیات کی ترجمانی کے

عالم میں اور آگ میدان کو چھوتے ہوئے بھی سماج سے رشتہ نہیں توڑتی۔ وہ اپنی شاعری میں ان ہی راہوں سے گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جہاں لاکھوں دل تڑپتے اور دھڑکتے ہوئے ملتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے احساسات مبہم تاثرات کی چادر نہیں اوڑھ لیتے اور اس کا اسلوب اظہار جلال و جمال دونوں اعتبار سے بہت واضح، دلیرانہ اور قطعی ہوا کرتا ہے۔ اس کی شاعری انقلاب کی نقیب، ارتقا کی پرستار، ظلم و استحصال کی دشمن ہوتے ہوئے بھی اوچھے اور وقتی حربے استعمال نہیں کرتی بلکہ اس میں آفاقی مسائل اور زندگی کے امکانات کی وہ قدریں ملتی ہیں جو دائمی اور وجدانی ہیں۔ دوسری طرف اس کی شاعری حدیث دلبران زہرہ جبینوں کے لطف خرام، آرائش کاکل اور اڑتے ہوئے آنچلوں کے ذکر سے بھی خالی نہیں ہے لیکن اس کے الفاظ و معانی اور رنگ و آہنگ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حسن و عشق کی دیویاں اس کی نازک اور دوشیزہ روح میں الہامی جنون پیدا کر کے پرکیف نغمے لکھوا رہی ہوں۔

مخدوم کا فن شاعری بھی اس کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کا پابند ہے۔ اس کی زبان معیاری ہے اور اس معیار پر آنے کے بعد انفرادیت کو کامل آزادی حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ زبان کو جس طرف چاہے موڑ لے۔ چنانچہ مخدوم الفاظ کے استعمال میں محتاط ہے لیکن ان کے محل استعمال میں بعض دفعہ ایسا اجتہاد کرتا ہے کہ لوگ منہ تکتے رہ جاتے ہیں، مگر انکار و اعتراض کی گنجائش نہیں پاتے۔ مخدوم وزن، قافیہ اور ردیف کی حد تک بھی اردو شاعری کے مزاج کو خوب سمجھتا ہے اس کی آزاد نظموں میں بھی وزن ہوتا ہے اور وہ دقیق اور مرتعش بحروں کے اوزان کو بھی اپنی آزاد نظموں کے شکستہ ٹکڑوں میں اس لطف اور برجستگی سے سموتا ہے کہ عروض جاننے والوں کا منہ بھی کڑوا نہیں ہونے پاتا۔
مخدوم کے پاس تشبیہ اور استعارے اپنی اصلی حالت یعنی معنویت سے ہٹ کر بھی ملتے ہیں۔ پرانی تشبیہات کے استعمال پر قدرت حاصل کر لینا مشکل ضرور ہے لیکن مختلف چیزوں میں صحیح اور دلکش مشابہت کو محسوس کر لینا خداداد ذہانت کی نشانی ہے، اور یہ بات ہم کو مخدوم کے کلام میں جگہ جگہ پر ملتی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی ان نادر، دلکش اور نئی تشبیہوں کی شرح بھی لکھی جائے۔ الغرض فنی اعتبار سے بھی مخدوم کا کلام نہ صرف معیاری ہے بلکہ نئی راہیں دکھاتا ہے۔ عملی تجربات نے مخدوم کی شاعرانہ ذہنیت کو ایک ایسی امتیازی بالیدگی عطا کی ہے کہ دعوت دینے اور نوازشات حسن کے ساتھ دعوت فکر و عمل اس کے کلام کا خاصہ بن گئی ہے اور یہ نقوش اتنے گہرے ہیں کہ ان کی حیثیت ادبی ارتقا کی ایک مضبوط کڑی کی سی ہے اور وہ اپنے زمانے کی شاعری پر ایسے نقوش چھوڑ رہا ہے جو مستقبل کی گزرگاہوں کو بھی روشن کریں گے۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کے فکری عناصر کا تجزیہ

معین الدین

● شعر کے جمالیاتی حسن کے ادراک کے لیے اگر ایک طرف شعر کے صورت و معنی کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے تو دوسری طرف شعر کے محرکات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ شعر فہمی کے لیے شاعر کا ذہن سمجھنا ضروری ہے۔ ذہن اگر بیدار ہے تو تخلیقی عمل بھی جاندار اور صحت مند ہوگا۔ ذہن اگر سویا ہوا ہے تو فن پارہ بھی خوابیدہ اور بے جان ہوگا۔

اس لیے مخدوم محی الدین کے کلام کو سمجھنے کے لیے مخدوم کے ذہن کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ تخلیقی محرکات کی واضح طور سے نشان دہی کی جا سکے۔ "گلِ تر" میں مخدوم نے پڑھنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے "شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور

من کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے۔ یہی تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔"

من کے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا کے اس تضاد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرے کے اندر جھانک کر دیکھا جائے جس میں شاعر نے آنکھ کھولی، شعور حاصل کیا اور اسے جِلا دی۔

مخدوم حیدر آباد کے متوسط گھرانے میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد میں تعلیم پائی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ملازمت اختیار کر لی ملازمت سرکاری تھی اس لیے راس نہ آئی۔ سرکاری ملازمت کا ماحول مخدوم کے ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا تھا چنانچہ مخدوم نے ملازمت کو خیرباد کہا اور عوامی تحریکوں سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔ یہ وابستگی آج بھی قائم ہے صرف نظری اعتبار سے ہی نہیں بلکہ عملی حیثیت سے بھی۔

یہ ہے مخدوم کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ۔ اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے مواد اس طبقے سے لینا ہوگا جس سے مخدوم منسلک تھے اس کے بغیر مخدوم کے ذہنی ارتقا کو سمجھنا مشکل ہے۔ میری مراد اس متوسط طبقے سے ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے بظاہر ٹھوس گراؤنڈ سے کھوکھلا ہے اور پرانی قدروں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ دوسری طرف محنت کش طبقے کی زندگی اور توانائی سے بھرپور جدوجہد ہے جس کے تحت نئی قدریں ابھر رہی ہیں۔ نئی اور پرانی قدروں کی ایک زبردست کشمکش ہے۔ کچھ ادیب اس کشمکش سے آنکھیں چار نہ کر سکے اور اپنی "ذات" میں اس طرح محصور ہو کر رہ گئے کہ پھر باہر نہ نکل سکے۔ یہ ادیب ایک زبردست انفرادیت کا شکار ہو کر رہ گئے لیکن بہت سے دانشور اس انفرادیت کی حدود سے شعوری طور پر نکل آئے اور خود کو ایک عظیم اجتماعیت سے منسلک کر لیا۔ ان دانشوروں میں مخدوم محی الدین کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

مخدوم نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہے اور اس کی بندشیں بہت سخت ہیں ایک چھوٹی سی اقلیت نے معاشی اور تہذیبی ذرائع، وسائل پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر استحصالی قوتیں زور پکڑتی جا رہی ہیں اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر ایک انانیت پھیل گئی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی انانیت کو نفس کشی کے ذریعے نہیں روکا جا سکتا اس کا انسداد صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جدوجہد کے ذریعے ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جائے جو طبقات کی تقسیم سے آزاد ہو جس کی رہنمائی محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں ہو۔ یہ محنت کش طبقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بار آور بھی ہے اور طاقتور بھی۔ یہ طبقہ ایک مشترکہ تخلیقی عمل کا سرچشمہ ہے جس کے تجربے کے بغیر اس مسلکِ حیات کا ادراک ممکن نہیں جو مخدوم اور مخدوم کی نسل کے دوسرے شاعروں میں نظر آتا ہے۔ اس تجربے کے بغیر ان حقیقتوں کا شعور بھی ممکن نہیں جو ایک تحریک کی شکل میں نمودار ہوئیں اور ادبی سطح پر جن کا مظہر ترقی پسند ادب ہے۔ مخدوم نے ان حقیقتوں کا تجربہ نظری طور پر بھی کیا اور عملی طور پر بھی۔ ان دونوں قسم کے باہمی تجربوں کے باہمی امتزاج نے مخدوم کو وہ شعور بخشا جس نے "دل کے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا" کے تضاد کو شعری وجدان سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا کہ مخدوم کی تخلیقات میں بیک وقت رومان، انقلاب اور حب الوطنی تینوں عناصر کی آگہی جھلکتی ہے۔

بعض رجعت پرست اور روایتی انداز کے ادیبوں کے خیال میں داخلی واردات کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ ایسے ادیبوں اور نقادوں کے نزدیک سیاست اور انقلاب شاعری کا موضوع ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کے نزدیک یہ مقصدی شاعری ہے جو ایک پروپگنڈے کے طور پر تو استعمال کی جا سکتی ہے لیکن ایسی شاعری کو عظیم شاعری کا درجہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے تیس برس کی اردو شاعری میں اس قسم کا پروپگنڈا بھی ملتا ہے لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس میں عظیم شاعری کے خدوخال بھی نمایاں طور پر

نظر آتے ہیں۔ بہرکیف شاعری کا موضوع سیاست ہو یا انقلاب غمِ دوراں ہو یا غمِ جاناں "حدیثِ دل" ہو یا "صحیفۂ روزگار" داخلی تجربات اور محسوسات کو بھی اگر خارجی زندگی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو تجربے میں وسعت اور معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔ سوال اس کا نہیں ہے کہ اول الذکر کے علاوہ شاعری کا کوئی موضوع ہی نہیں یا آخر الذکر کے بغیر شاعری ممکن نہیں بلکہ سوال یہ زیادہ اہم ہے کہ وہ شاعر نے اپنے تجربات کو وجدان سے کس طرح ہم آہنگ کیا ہے۔

"سرخ سویرا" اور "گلِ تر" دونوں میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ مندرجہ بالا سطور میں مخدوم کی شاعری کے محرکات کا جو کچھ بھی جائزہ لیا گیا ہے اس کی روشنی میں مخدوم کی نظموں کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے کہ مقصدیت کے باوجود مخدوم کے لہجے کی انفرادیت نے شعر کے جمالیاتی حسن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ مقصدیت کا الزام عام طور پر نظموں پر ہی لگایا جا سکتا ہے اس لیے یہاں صرف نظموں سے بحث کی گئی ہے۔

اردو میں یوں تو نظموں کا رواج بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ آزاد اور حالی سے لے کر اقبال اور چکبست تک نظموں کے مختلف نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن نئی نسل کے شاعروں میں خاص طور سے ان شاعروں نے جو کسی نہ کسی اعتبار سے ترقی پسند تحریک سے منسلک رہے ہیں نظموں کو خاص طور سے اظہارِ بیان کا ذریعہ بنایا۔ سردار جعفری، اختر الایمان، مجاز، فیض، ساحر اور کیفی اس سلسلے میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظم کو اظہارِ بیان کا ذریعہ بنانے میں یوں تو بہت سے نظریات کارفرما رہے ہیں لیکن چند باتیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً بیان کے لیے اور زیادہ وسعت درکار تھی جو غزل میں ممکن نہ تھی اور جس کی تنگنائی کا ذکر غالب نے بھی کیا ہے۔ پھر یہ کہ خیالات کے تسلسل کو غزل میں باقی رکھنا ممکن نہ تھا اس لیے نظم کا پیرایہ اختیار کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اردو میں طویل نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ طویل . . . . طویل نظموں میں خیالات کا تسلسل تو باقی رہتا ہے بیان کے لیے وسعت بھی میسر آ جاتی ہے اور خیالات کی نشو و نما بھی ہوتی رہتی ہے لیکن دشواری یہ محسوس ہوتی ہے کہ ایک جذباتی کیفیت کو بہت دیر تک باقی رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے نظم میں ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ غالباً یہ بڑی وجہ ہے کہ اردو میں مختصر نظموں کا رواج شروع ہوا۔

یوں تو بہت سے اردو کے شاعروں نے مختصر نظمیں کہنی شروع کیں لیکن جو معنویت اور جامعیت مخدوم کی نظموں میں نظر آتی ہے وہ شاذ و نادر ہی اردو کے شعرا میں ملتی ہے۔ اندھیرا، جنگِ آزادی، انقلاب، حویلی، قید، اور چاند تاروں کا بن، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان نظموں کو غور سے پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی موضوعات کے باوجود ان میں مخدوم کے لہجے کی انفرادیت برقرار ہے۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

یہاں ایک اعتماد جھلکتا ہے اعتماد یہ ہے کہ نیا سورج طلوع ہونے والا ہے اور یہ نیا سورج ایک نئے عہد کا ترجمان ہوگا پرانے نظام میں تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مخدوم کی نظم "جنگ آزادی" نے مزدوروں اور محنت کش طبقے میں ایک انقلابی ترانے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ یہ انقلاب صرف ہندوستان کے محنت کش طبقے کی امیدوں کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے محنت کشوں اور مزدوروں کی آرزوؤں اور خوابوں کا گہوارہ ہے۔ اس نظم میں مخدوم کسی خاص نسل و قوم کے جذبات کے ترجمان نہیں ہیں بلکہ ایک عالمگیر انسانیت کے علمبردار ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک بند:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی — آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند میں رہنے والوں کی — محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی — دہقانوں کی مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ایک نئے نظام کا قیام مخدوم کا خواب ہے۔ انقلاب اس کی ایک علامت ہے۔ تعمیر اور تبدیلی اس کی ایک خصوصیت ہے۔ انقلاب پرانے نظام کو ختم کرنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے اور نئے نظام کے قیام کا ضامن ہے لیکن یہ انقلاب ہوا میں معلق نہیں ہے اس کی جڑیں عوامی تحریکوں میں پیوست ہیں۔ شاعر انقلاب کے جذبے سے سرشار ہے اور ہمہ تن منتظر ہے۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نظم "حویلی" ایک فرسودہ سماج کی علامت ہے۔ کسانوں کا خون چوس کر اس کی رنگ آمیزی کی گئی ہے نیا سماج ابھرنے والا ہے۔ "حویلی" کے بوسیدہ در و دیوار پر آزادی کا پرچم لہرانے والا ہے لیکن آزادی کا پرچم لہرانے سے پہلے قید و بند کی سختیوں سے بھی گزرنا ہے۔ "قید" جبر و استبداد کا ایک مخصوص ادارہ ہے جس کے در و دیوار سے بربریت ٹپکتی ہے۔ مخدوم نے متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں لیکن انھیں اس کا شدید

احساس ہے کہ ان کا گنج گراں مایہ عمر نذر زنداں ہو گیا! "نذر آزادی زنداں وطن" نہیں ہوا۔ اس احساس کی شدت کو کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے:-

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنج گراں مایہ عمر
نذر زنداں ہوا
نذر آزادی زنداں وطن کیوں نہ ہوا

تلنگانہ، استالین، اور چاند تاروں کا بن، اور ایسی ہی کئی نظمیں ہیں جو اپنے موضوعات کے اعتبار سے اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سب نظموں میں انداز بیان اس قدر اچھوتا ہے کہ ہیئت کی تبدیلی کے باوجود ان کا مطالعہ لطف اندوزی کا باعث ہے۔

لیکن ان تمام نظموں میں "چاند تاروں کا بن" مخدوم کی فنکارانہ صناعی کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔ اس نظم میں مخدوم فن کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ ایک وسیع موضوع کو شاعر نے اس خوبصورتی کے ساتھ اپنے فن میں سمویا ہے کہ پڑھنے والے چونک اٹھتے ہیں۔ اس وسیع کینوس پر ماضی، حال اور مستقبل اپنی اپنی خصوصیتوں کے ساتھ ابھرتے ہیں اور اس خاکے میں رنگ بھرتے جاتے ہیں۔ ان رنگوں کے باہمی امتزاج سے ماضی، حال اور مستقبل کی ایک خوبصورت تصویر ابھرتی ہے جس میں حقیقت کا ادراک بھی ہے اور فنی حسن بھی۔ ملاحظہ ہو:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے

"پیاسی آنکھوں" میں ایک پورے دور کی تاریخ سمو دی گئی ہے۔ ایک دور جو مایوسی اور تشنگی کا دور ہے ظلم و تاریکی کا دور ہے لیکن تاریکی ختم ہونے والی ہے اور اجالا ہونے والا ہے۔

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے

صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

تاریکی اور روشنی کی مسلسل کشمکش ہے۔ اس کشمکش میں صرف قومی جذبات کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی جد و جہد کی جھلک نظر آتی ہے لیکن آگے کی منزل "پیار کی" بھی ہے اور "دار" کی بھی۔ منزل سامنے ہے لیکن سمت کا تعین نہیں ہے اس لیے بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ "دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو" میں اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ صلیب ایک علامت ہے اپنے مشن کو پھیلانے کی اور جدوجہد کو جاری رکھنے کی۔

غرض مخدوم کی بیشتر ایسی نظمیں جن کا موضوع سیاست اور انقلاب ہے اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے اس قدر خوبصورت ہیں کہ مقصدیت بالکل گراں نہیں گزرتی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے 'غم ذات' میں بھی خارجی حقائق کی بھرپور آگہی جھلکتی ہے۔ مخدوم کا اظہار و بیان براہ راست نہ ہونے کے باوجود انتشار کا شکار نہیں ہوتا اس لیے کہ شعوری طور پر مخدوم ایک عوامی تحریک سے وابستہ ہیں اور وہ نہ صرف عوامی محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں بلکہ دل سے عوام کا احترام کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ عوام کو ہی تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ مخدوم کے فکر و فن کی آبیاری اسی سرچشمے سے ہوتی ہے۔

کھڑے ہیں کاسہ بکف ظلمتوں کی چوکھٹ پر
مہ و ستارہ و خورشید روشنی کے لیے

ہمارے دور کی تاریکیوں اور روشنیوں کی
زبان سے لکھا ہوا جدید شعری ادب کا ایک پارہ

پتھروں کا مغنّی

وحید اختر کی ۱۶ برسوں کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب
قیمت :- ۶ روپے

(پبلشر)
اردو کتاب گھر - علی گڑھ

"آگہی و بیباکی"

باقر مہدی کے تیکھے تنقیدی مضامین کا مجموعہ
جس میں آج کے ادبی مسائل اور ادبی شخصیتوں پر بڑی بےباکی لیکن ایمانداری سے اظہار خیال کیا گیا ہے
قیمت پانچ روپے پچاس پیسے
ناشر:- خلیل احمد

گوشۂ ادب ۲۱- آرکیڈیا بلڈنگ بمبئی ۲

گلِ تر کی رعنائیاں

نجمہ سمیع

● جدید اردو شاعری غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف طویل سفر ہے۔ غمِ دوراں کا احساس سارا جگ بیتی ہوتے ہوئے بھی بڑا تلخ اور سنگین ہے۔ یہاں حسن و رومان اور آسودگی کے فانوس بجھ جاتے ہیں اور زندگی کی محرومیاں اور تشنگی کچھ اور بھی کسک پیدا کر دیتی ہے۔ مگر غمِ دوراں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں ایک نیا احساس اور زندگی کا نیا ادراک پیدا کیا۔ اس احساس نے تلخی اور بغاوت کے جذبے جگائے اور اس طرح اردو شاعری میں خارجی دنیا اپنی پوری بے رحم سچائی اور سنگین حقیقت کے ساتھ در آئی۔ آج شاعر کی آواز اپنی داخلی گہرائیوں ہی سے نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں سے آ رہی ہے وہ محض جذبے کے سہارے نہیں بلکہ علم و شعور کی روشنی میں شاعری کی نئی نئی بلندیوں سے آشنا کر رہا ہے۔ زندگی کے ہمت شکن ماحول میں امید کے نئے چراغ جلا رہا ہے انسانیت کی روندی ہوئی کلیوں میں بھی ایسے "گلِ تر" کی تلاش کر رہا ہے جو انسان کے مشامِ جاں کو مہکا دے۔ اس کی کچلی ہوئی روح میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کر دے۔ وہ مایوسیوں سے گھرا اندھیروں میں بھی ایک نئی سحر کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ رات طویل سہی، اُجالا کبھی تو پھوٹے گا ۔۔۔؟ اور انتظار کے بعد آئی ہوئی صبح کتنی حسین تابناک اور دل آویز ہوگی:۔

مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اُجالوں کا پیام آئے گا

ایک نئی صبح شاعر کے خواب کی تعبیر ہے۔ وہ خواب جس کا صرف تصور کل تک ہماری شاعری میں ہلچل پیدا کر رہا تھا آج وہ تصور ایک انقلابی زندگی کے قالب میں سما کر سامنے آ چکا ہے۔ اس طرح اردو شاعری جو بیسویں صدی کے آغاز تک بھی اپنی وجدانی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کے ساتھ محض تفریحی اور فراری تھی، انقلابی افکار کی ایک نئی شاہراہ

پر نکل آئی اور شاعری میں ایک ایسے دور کی ابتدا ہوئی جس میں عوام کی نبض حیات کی دھڑکنیں نمایاں تھیں۔

اردو شاعری اس انقلاب کے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے جن نئی نئی منزلوں کی طرف بڑھی ہے جن ترقی پسند رجحانات کی وسعتوں اور گہرائیوں سے روشناس ہوئی ہے ان میں مخدوم محی الدین کا نام اور کلام نمایاں ہے۔ مخدوم کی شاعری ایک ایسا نشان راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں جمع ہو رہی ہیں۔ ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار ہے۔ یہاں مجھے مخدوم کے کلام پر تنقید کرنا نہیں ہے۔ میں ان تاثرات کو ظاہر کرنا چاہتی ہوں جو "گل تر" کے پڑھنے کے بعد مجھے ہوئے۔

"گل تر" "سرخ سویرا" کے مقابلے میں مخدوم کے ذہنی اور شعوری ارتقاء کی زیادہ نشاندہی کرتا ہے۔ مخدوم نے آج کے مسائل کو بڑے حسن، بڑی دلآویزی اور بڑے فنکارانہ انداز سے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ "چاند تاروں کا بن" میں ان کانٹوں کی نوک نظر آ رہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔ نظم کے آخری حصہ کا لہجہ بڑا غمگین ہے۔ جس آزادی کے لیے شہیدوں نے موم کی طرح اپنے تن گھلائے تھے وہ آزادی آئی تھی تو آرزوؤں کے خون میں ڈوبی ہوئی مگر شاعر اپنے ہمدموں سے مایوس نہیں اور نہ شاعر کو مایوس ہونا چاہیے کیونکہ شاعری ہمارے دل سے گفتگو کرتی ہے۔ اس کا اثر ہماری روح، دل و دماغ، وجدان غرض ہماری مکمل شخصیت پر ہوتا ہے۔ اگر شاعر ہمیں یاس کی بھیانک ظلمتوں میں ڈھکیل دے تو امیدوں کے نازک آبگینے چور چور ہو جائیں گے۔ غرض — وہ اپنے ہمدموں سے مایوس نہیں —

رات کی تلچھٹ ہیں، اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو —
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی، منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

میرے خیال میں شاعر کو غمگین تو ہونا چاہیے مگر مایوس نہیں۔ مخدوم کے کلام میں ہمیں کہیں بھی یاس اور بیزاری نظر نہیں آتی اگر کہیں یاس ہے بھی تو اس کے پہلو میں امید اور آرزو اور ارادے کے نقش بڑے گہرے نظر آتے ہیں جس سے کلام میں اثر کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے اور عمل کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً "پیار کی چاندنی" کا یہ بند ظلم و زیادتی کے محبس میں بھی زندگی کی سرگرمیوں میں شامل رہنے کی تحریک دلاتا ہے۔

ابن آدم کو سولی چڑھاتے رہو

زندگانی سرِ دار گاتی رہے
یادِ یاراں میں اک جام غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل ٹمٹماتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

اسی طرح "جانِ غزل" اور دوسری نظموں میں مخدوم نے دل کے اس ساز کو بہت آہستہ چھوا ہے جس سے محبت کا ایک غمگین نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت مدھم اور نازک ...... مگر محبت کے ان پرکیف لمحات میں وہ چاہتے ہوئے بھی دنیا کے غم بھول نہیں سکتے:

مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹ گئیں بدلیاں کھل گئے پیچ و خم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل!

نظمیں "جانِ غزل" اور "ہم دونوں" رومانیت اور جذبات کی مے سے چھلکتے ہوئے جام ہیں۔ ان میں زندگی کی امنگوں اور بے تابیوں کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ محبت اور پیار کی پرخلوص خواہش جدائی کے اذیت ناک لمحوں میں بھی مایوس ہونے نہیں دیتی۔

میں جہاں بھی رہوں تم جہاں بھی رہو
اپنی آنکھیں تو افق زاروں پہ ملتی ہی رہیں گی کہیں دور
اور دل چپکے سے مل جائیں گے دل ہی دل میں

مخدوم کے یہاں دھیمے دھیمے سے حزن و ملال کی جو کار فرمائی نظر آتی ہے۔ وہ کسی "رنگین حادثے" کی بدولت ہے اور اسی لیے ان کے کلام میں جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ بھی کچھ انہی حالات کی رہین منت ہے ورنہ وہ ایسی اثر آفریں غزلیں نہ کہہ پاتے:

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے — جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے
چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں — نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ان کی بعض غزلیں بڑی مرصع ہیں۔ ان میں مشاقی کی شان پوری آن بان کے ساتھ جھلکتی ہے۔ میں نے ان غزلوں کو کئی کئی بار پڑھا ہے اور ہر بار ایک نیا لطف محسوس کیا ہے۔

روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں

ساز آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ　　جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

ایک جگہ انھوں نے خود ہی کہا ہے ؎　　کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

فیض کے اثرات کے ہلکے ہلکے نقوش غزلوں کے بعض مقامات پر بہت پرکیف ہیں ؎

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ　　انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں
سرگوشیوں کی رات ہے رخسار و لب کی رات　　اب ہو رہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں

مخدوم موجودہ شاعروں میں صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کے فنی شعور میں خلوص و صداقت حقیقت و واقعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ان اقدار کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں اس کے بغیر ان کے نزدیک فن کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ مگر کاش وہ جزوی خامیوں کو نظر انداز نہ کریں۔ معمولی لفظوں کا ذرا سا الٹ پھیر ساری نظم کی خوبصورتی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم "ہم دونوں" کا یہ حصہ ؎

اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں، تڑپ جاتے ہیں، چلاتے ہیں

پہلے تو غم کے بندھنوں کو گوندھنا پھر اسے استعارے کے پھیر میں لا کر جاندار تصور کر کے انھیں تڑپانا اور پھر ان کا چلا اٹھنا ... امسرت و غم کو ذی روح صفات سے متصف کیا جا سکتا ہے مگر غم کے بندھن نہ تڑپ سکتے ہیں اور نہ چلا سکتے ہیں اس سے زبان سے لاپروائی کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر اسی نظم میں آگے چل کر انھوں نے بڑی سیدھی سی خوبصورت تشبیہ دی ہے ؎

سیل بے تحمیل میں تری یاد اے دوست
اس طرح تیرے گی
صبح دم تیرتا پھرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس

ان کی نظم احساس کی رات بڑی حسین نظم ہے اگرچہ اس میں بھی الفاظ کا غلط استعمال اور استعارے کھٹکتے ہیں۔ مثلاً ؎　　شفقِ زلیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ

زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر زیست کی شفق ــــ اور نہ صرف یہ بلکہ شفق پر پھر ایک رنگین

تشنہ بھی لگا دیا۔ اسی طرح بعض نظموں اور غزلوں میں کچھ الفاظ کا استعمال محل نظر ہے ؎

یہ کوہ کیا ہے یہ دشتِ الم فزا کیا ہے

"الم فزا" کبھی فصیح اردو نہیں بلکہ یہ لفظ کی غلط ترکیب ہے۔ فزا کا لفظ اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں خوشی اور مسرت کا اظہار کرنا ہو۔ ایک اور جگہ ایسی ہی فاش غلطی ان سے سرزد ہوئی ہے ؎

ان کے پہلو سے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے

جھونکے مہک سکتے ہیں مگر شاداں کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ کاش ہمارے شعراء ان ذرا ذرا سی غلطیوں پر نظر رکھیں تا کہ پڑھنے والے کا تاثر ختم نہ ہو۔

بہر حال ـــــ چند فنی اور لسانی لغزشوں سے قطع نظر، مخدوم کے کلام میں ایک بات نمایاں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب نہیں، ان کے پاس جذبات کے ساتھ ارادے کی قوت بھی کارفرما ہے۔ ان کے المیہ میں زندگی دوڑتی پھرتی ہے جو کرب و الم کے عالم میں بھی جینے کے لیے کوشاں ہے۔ ان کے تفکر میں سنجیدگی، خلوص اور انسانیت کا ایک حسین امتزاج ہے اور ان کے پر خلوص لہجے کی نرمی میں ایک ترنم ہے۔ ان کے تصورات کی گرم آنچ اور جذبات کی بھٹی میں ایک ایسی روح تڑپ رہی ہے جسے سماجی اور معاشی بدحالی سے نفرت ہے۔ مجبور انسانیت کی غلامی سے نفرت ہے سماج کی خود غرضیوں سے نفرت ہے:-

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

ان کی اکثر نظموں اور غزلوں میں تشنہ کام محبت کے تصورات و جذبات کی لو بھڑکتی نظر آتی ہے بقول ؎

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

مگر کرب و اضطراب کے اس عالم میں بھی وہ تسکین و طمانیت کے سامان ڈھونڈ لیتے ہیں:-

دراز ہے شبِ غم، سوز و ساز ساتھ رہے
مسافرو! مئے مینا گداز ساتھ رہے

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے، دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

"دمِ شعلہ ساز" اگر ساتھ ہے تو زندگی کی راہوں پر پھول بکھر جاتے ہیں۔ کیونکہ:-

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے

زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

دار سے دلدار کی منزلوں تک پہنچنے کے لیے کتنے کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔

مخدوم کی نئی نظموں میں جو ایک نیا رجحان ابھرا ہے وہ گزرتے ہوئے لمحے سے مسرت کا رس نچوڑنے اور ماضی یا مستقبل کے مقابلے میں حال کو اہمیت دینے کا رجحان ہے جو صحت مند بھی ہے، اور زندگی سے پیار کا ثبوت بھی۔

یہ رقص رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

حقیقت یہ ہے کہ شعر پڑھ کر رہ جانے والی کیفیت ایک ایسے ہی شاعر کا حصہ ہے جس کی شاعری میں ساحری ہو — اور مخدوم کی شاعری میں محبت کی خوشبو کے ساتھ سوزِ وطن کی سوندھی مہک بھی شامل ہے۔

ماءُ اللحم خاص

غذائیت سے بھرپور ایک اعلیٰ درجہ کا مرکب ہے۔
اس کے استعمال سے جسم میں نیا خون پیدا ہوتا ہے اور بھوک خوب لگتی ہے۔ آپ کے سارے نظامِ عضوی کو دوبارہ پھرتیلا بناتا ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

”گلِ تر“ اور اس کے بعد

داؤد اشرف

(داؤد اشرف نے پچھلے سال عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا ہے۔ یہ مضمون اس مقالے کا ایک باب ہے جو انھوں نے اپنے ایم۔اے فائنل کے لیے مخدوم کی شخصیت اور شاعری پر لکھا تھا۔ ادیب)

● مخدوم کی ”سرخ سویرا“ اور اس کے بعد کی شاعری کے لہجہ، مزاج، آہنگ اور موضوعات میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ خود مخدوم کے الفاظ میں ”ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے اسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے۔“ تاریخی اور سماجی تبدیلیوں کے اثرات ادب اور شاعری پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے زمانے اور سماج کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد کے زمانے اور سماج میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ اسی دوران میں ملک بیرونی تسلط سے آزاد ہوا۔ پنجاب، بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات سے ساری انسانیت لرز اٹھی آزادی کی جد وجہد کی کامیابی کے ساتھ ہی ساتھ تاریخ کے اس ہولناک المیہ اور پھر بہت سے خوابوں اور تصورات کے چکنا چور ہو جانے کے واقعات اور حادثات ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے ذہنوں میں اضطراب، ہل چل اور تشکیک کو جنم دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ گریز، مایوسی، فرار اور ندامت کے احساسات بھی اردو ادب میں پیدا ہونے لگے۔ نعرہ بازی کا طوفان تھمنے لگا تو ماتم کا شور بلند ہوا۔ ادبی رجحانات، مسلمات اور نقطۂ نظر میں تغیر اور تبدیلیوں کو تاریخ کے تسلسل اور سماجی شعور کے ارتقا کو پیش نظر رکھ کر ہی جانچا جا سکتا

عملی سیاسیات سے مخدوم کی سرگرم وابستگی کی وجہ سے اگر ان کی شاعری کے لب ولہجہ اور موضوعات کی تبدیلی کو سیاسی زندگی میں ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ ایک شاعر کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی مخدوم نے زندگی کا مطالعہ ہمیشہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے ایک سیاسی کی حیثیت سے نہیں۔

سنہ ۴۴ء سے ۵۱ء تک انھوں نے سوائے "تلنگانہ" کے کوئی اور نظم نہیں لکھی مخدوم اس سات سال کے عرصہ میں بدلتے ہوئے حالات اور تبدیلیوں سے قریب ہی نہیں رہے۔ انھوں نے سیاسی تحریکات میں راست عملی حصہ لیا۔ یہی نہیں بلکہ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کے رہنماؤں میں بھی وہ شامل رہے۔ ان کے ہم عصر شعراء میں کوئی اور اس دور کی کشمکش اور ہنگاموں سے اتنا قریب نہیں رہا۔ اس کے باوجود ان کی کوئی نظم اپنی "خارجی" شکل میں ان کے ذہن کے دیچوں سے باہر نہیں آسکی۔ سات سال کی اس خاموشی کو محض خاموشی تصور کرنا۔ ایک غیر شاعرانہ JUDGEMENT ہوگا شاعری کی "داخلی تخلیق" اور اس کی خارجی شکل کے درمیان بعض اوقات برسوں کی دوری اور فاصلہ ہو جاتا ہے ۵۱ء کے بعد مخدوم کا متواتر اور مسلسل شعر کہنے کا موڈ، روانی اور موزونی طبع — کیا ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ غیر شعوری طور پر ہی لیکن تجزیہ اور محاسبہ کے بعد ہی ان کی شاعری الفاظ، بحور اور قافیہ اور ردیف کے خارجی لباس میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ اگر شاعر کسی ہنگامی یا وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر فوری اپنے جذبے کے اشتعال اور فکر کے ہیجان کو نظم کرکے شائع کردے تو اس کی شاعری میں سطحیت، ہیجان اور نعرہ بازی داخل ہو جاتی ہے۔ اپنی سیاسی اور عملی زندگی میں روزانہ "نعروں" اور ہنگاموں سے راست تعلق کے باوجود مخدوم کا نعرہ بازی اور سطحی موضوعاتی شاعری سے گریز ایک شاعرانہ گریز اور ایک صحت مند علامت ہے۔ ہم کسی شاعر سے یہ مطالبہ بھی تو نہیں کر سکتے کہ وہ خاص موقعوں اور خاص لمحوں میں "یہ" لکھے اور "وہ" لکھے۔

مخدوم نے اپنے دوسرے مجموعۂ "گل تر" کے پیش لفظ میں "پڑھنے والوں سے" کے زیر عنوان جو چند سطور لکھی ہیں انھیں سب سے زیادہ بھروسہ کے قابل شہادت تصور کرنا چاہئے۔ مخدوم کا اپنے بارے میں یہ بیان خاص طور سے اہمیت کا حامل ہے۔ "شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فرد معاشرہ کی حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہمکلام ہو۔"

"سرخ سویرا" سے "گل تر" تک کے سفر میں مخدوم کا سماجی اور جمالیاتی شعور بھی پختہ ہوتا گیا ہے ان کے مزاج کا ٹھہراؤ ربط، اعتدال پسندی، عقلیت کی کسوٹی پر ہر جذبے اور ہر تاثیر کو پرکھنا اور انتشار کشی کا کچھ اندازہ سرخ سویرا کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں بھی ہوتا ہے "گل تر" اور اس کے بعد کی بعض نظموں اور بیشتر غزلوں میں یہ خصوصیات زیادہ واضح اور

مکمل روپ میں ملتی ہیں۔

مخدوم کے پہلے اور دوسرے دور کی شاعری میں "استالین" کو ایک کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے سچے خلوص اور جذبے کی پوری شدت کے ساتھ "کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں"، "کیا مجاہد نہ بنوں" جیسی باتیں کہی تھیں کیونکہ وہ تاریخ کے اس مرحلے پر اپنے آپ کو اس رزم کا خاموش تماشائی "دیکھنا نہیں چاہتے تھے "جنت کو جہنم کے حوالے" کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے تلوار اٹھالی اور تلنگانہ کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اشتراکی انقلاب ان کی منزل اور عوام ان کے محبوب تھے۔ اس دور میں وہ انقلاب کے گیت گا سکتے تھے۔ مزدوروں اور کسانوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے والے ترانے لکھ سکتے تھے۔ لیکن سیاسی اور سماجی زندگی کے تجربے کو انھوں نے شعری تجربہ نہیں بنایا۔ سیاسی اور انقلابی رہنما کی خارجی دنیا کو انھوں نے شاعر کی داخلی دنیا سے الگ ہی رکھا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۰ء تک کی مدت میں انھوں نے جو ایک نظم "تلنگانہ" لکھی ہے وہ بھی شاید اس خیال سے کہ اگر تلنگانہ کا سلسلہ پر کچھ نہ لکھنا بڑی عجیب بات سمجھا جائے گا۔ اس دور میں تو ان کے بعض ہم عصر شعرا اور ادیب تلنگانہ اور اس کے ہنگاموں سے دور رہنے کے باوجود بھی تلنگانہ کو موضوع بنا رہے تھے مارچ ۱۹۵۱ء میں مخدوم گرفتار ہوئے۔ جیل میں گزارے ہوئے دن بالعموم ارباب فکر و دانش کو گزرے ہوئے ایام کی ہر بات زندگی کے ہر حادثے، تجربے اور تاثیر کا گہرا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جیل کی تنہائی میں یادوں کا ہجوم شعری تاثرات کی بازتعمیر کا باعث بھی بن جاتا ہے چنانچہ مخدوم نے اپنے سات سالہ سکوت کو جیل کی چار دیواری میں "قید" لکھ کر توڑا۔ "شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ انھیں یاد آئی"۔ ان کے معروف قدموں کی آواز انھوں نے سنی۔ اپنے محبوب کی طرح انھوں نے عوام کو یاد کیا لیکن زنداں کی گھٹن اور مایوسی کے احساس سے وہ دور رہے انھیں غم تھا تو صرف یہ تھا کہ ان کا گنجِ گراں مایۂ عمر ـــ "نذر زنداں ہوا ـــ نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا"۔ اس لہجہ اور اس رویہ نے اس مختصر نظم میں بڑا تاثر اور انفرادی شان پیدا کر دی ہے۔ جیل کی زندگی مختصر ہونے کی وجہ سے وہ "قید" کے علاوہ اور کوئی نظم نہیں لکھ سکے۔ اس کے بعد پھر وہ سیاسی زندگی اور الیکشن کے ہنگاموں میں شب و روز مصروف ہو گئے۔ دماغ کے دریچے جو جیل میں کھل گئے تھے پھر عرصہ کے لئے بند ہو گئے۔ جیل سے رہائی کے بعد "چارہ گر" لکھنے تک پانچ سال کی مدت میں انھوں نے دو شعر زیرعنوان "نیا چین" (۱۹۵۱ء) اور "ماسکو" "قریب قریب اتنی ہی مختصر نظم ۱۹۵۲ء میں لکھی۔ "کل تر" میں یہ دونوں غیر اہم نظمیں محض اس وجہ سے شامل ہیں کہ وہ ایک مشہور اور ہردلعزیز شاعر کے تبرک کے طور پر شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ان کی نظم "چارہ گر" سے ہوتا ہے۔ تقریباً چھ سال تک تاثرات اور تجربات کے روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپنے کے بعد ان کی شاعری داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آئی تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہمکلام ہو۔ لیکن عالم خارج میں آنے کے بعد ان کی "داخلیت" کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

"چارہ گر" انھوں نے اپنے سماجی شعور کی پختگی کی اس منزل پر پہنچ کر لکھی ہے۔ جہاں وہ اپنے ذہنی ارتقاء سے مطمئن ہو کر زندگی اور کائنات کے متعلق اپنے شعور کی گہرائیوں سے خیالات کے موتی چن چن کر باہر لا سکتے ہیں۔ اس نظم کا موضوع نیا نہیں۔ وہی ازلی و ابدی واقعہ محبت ہے جو ہر دور میں ہر نظام میں ہر معاشرہ میں موجود رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا اور کسی "چارہ گر" کی زنبیل میں کوئی "نسخۂ کیمیا" ایسا نہیں جو اس درد کا مداوا کر سکے غالب نے بھی یہی بات

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کہی تھی۔ مخدوم نئی اور قدیم اقدار ان کی کش مکش، نئے بدلتے ہوئے سماج، نئی دنیا اور نئے معاشرہ غرض سب کچھ دیکھنے اور دیر و حرم کی سیر مکمل کرنے کے بعد یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ دو بدن پیار کی آگ میں جلنے ہیں۔ اس گتھی کو سلجھایا نہیں جا سکتا خواہ جاگیرشاہی ہو یا مذہبی نظام ہو یا آج کا غیر مذہبی سیکولر نظام حیات۔ مندروں کے کواڑ، مسجدوں کے مینار اور میکدے کے دراڑ ان ہی مختلف نظام ہائے حیات کے SYMBOLS ہیں۔

"چارہ گر" اور اس کے بعد کی شاعری میں ان کا یہ احساس اور تاثر بار بار ہمارے سامنے آتا رہا ہے کہ فرد اور غم ذات کے مسائل کسی میکانکی اصول ضابطہ یا قانون کے ذریعہ ختم نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ انسانی ذہن اور نفسیات سے متعلق یہ نازک مسائل جن میں محبت یقیناً سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ گتھی ہے کش مکش حیات کے لئے ازل سے ابد تک ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ ہاں انھیں یہ احساس ضرور ہے کہ ایسے معاشرہ میں جہاں سماجی اور معاشی مساوات کا دور دورہ ہو۔ انسانوں کے لئے بہتر اور پر مسرت زندگی کے زیادہ مواقع فراہم ہو گئے ہیں کیونکہ طبقاتی کش مکش اور استحصال کے ختم ہو جانے کی وجہ سے فرد پہلے کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہے۔ اس کے باوجود نئے جبر ہو سکتے ہیں کش مکش کی نوعیت اور شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ یورپ اور مغرب کی نئی صنعتی سوسائٹی میں نئی کشمکش اور تضادات کی اس بدلی ہوئی نوعیت نے شاعری اور فنون لطیفہ پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور اس کے زیر اثر ہی شاعری اور فنون لطیفہ میں مختلف نئے رجحانات اور مسائل شامل ہوئے ہیں۔ قدیم اقدار اور اصطلاحوں کے معنی اور مفہوم میں بھی بہت فرق آچکا ہے۔

"آج کی رات نہ جا" میں زندگی کی جانب مخدوم کا رویہ صحت مند اور مثبت نوعیت کا ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی لطف بھی ہے اور آلام بھی ساز و آہنگ بھی اور زنجیر کی جھنکار بھی ——— تکمیل تمنا بھی اور حسرت بھی زہر بھی اور آب حیات لب و رخسار بھی ——— بہر حال زندگی زندہ رہنے اور مسکرانے کے لئے ہے اور وہ "ایک رات" بھی کتنی یادگار اور کس درجہ حسین رات ہوگی جو بہت راتوں کے بعد آئے اور جس میں کوئی محبت کی نظر شاعر کے لئے ہی "وقف" ہو۔ اس نظم، مختلف غزلوں کے کئی اشعار اور بعض دوسری نظموں میں بھی مخدوم نے یہ رومانی فضا پیش کی ہے۔ دراصل انہوں نے اپنی زندگی کے بعض حقیقی تجربوں کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ غزل اور جان غزل کی جانب ان کا یہ رجحان "سرخ سویرا" اور "گل تر" کی شاعری کے ایک نمایاں فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

"چاند تاروں کا بن" ہندوستان کی پچھلی تیس سالہ تاریخ "جدوجہد آزادی اور حصول آزادی کے بعد کے ہنگاموں اور المیہ کو پیش کرتی ہے۔ یہ نظم مخدوم کی سیاسی اور عوامی زندگی کے تاثرات اور تجربوں کا نچوڑ بھی ہے لیکن یہ تاثرات ایک سیاست داں کے نہیں ہیں ایک شاعر کے ہیں۔ انھوں نے ہر واقعہ ہر موڑ اور ہر بات کا ایک خاص شاعر کی حیثیت سے مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں بڑی روانی اور بڑا تاثر اور موسیقیت ملتی ہے موضوع کی وسعت کے باوجود انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ شاعر نے چن چن کر استعمال کیا ہے اور اپنے مجموعی تاثر کو عمیق مطالعہ اور گہری سوچ کے بعد ہی نظم کی شکل میں پیش کیا ہے "چاند تاروں کا بن" لکھنے تک مخدوم یہ دیکھ چکے تھے کہ آزادی کے متوالے کس طرح موم کی طرح جلتے پگھلتے رہے تاکہ نیا سویرا طلوع ہو اندھیرا چھٹے اور روشنی آئے۔ آزادی کے دیوانوں نے بہ حقیقت جھیلی سختیاں برداشت کیں بے غرضی کے ساتھ ایثار کئے حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی قربان کر دیں ۔۔۔ انھیں تشنگی ضرور تھی مگر وہ اس تشنگی میں بھی سرشار تھے" ۔۔۔ لیکن صبح دم ۔۔۔ وہ ایک "دیوار غم" بن گئے کیونکہ رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو ۔۔۔ "جوئے خون بن گیا" ۔۔۔ مخدوم کا اشارہ ان قیامت خیز فسادات کی طرف ہے جو حصول آزادی کے مرحلہ پر اور حصول آزادی کے بعد دیکھے گئے "رات" لے جاتے جاتے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اس نظم میں موم کی طرح جلتے ہوئے شہیدوں ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان "امامان حد گرہ فن" کی طرف بھی اشارہ ہے جو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ ہر جدوجہد آزادی کی تاریخ میں نظر آتے ہیں جو خون نو سحر پی جاتے ہیں اور سادہ لوح بے غرض انسانوں کو رہزن کے بھیس میں رہنما بن کر ڈس لیتے ہیں مخدوم کا یہ کہنا کہ

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

یہ ظاہر کرتا ہے کہ اجالا ضرور ہوا ہے لیکن "کچھ کچھ اجالا" ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ وہ اندھیرے کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ اندھیرا ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ رات کی ان تلچھٹوں اور اندھیرے کو مخدوم نے نہ صرف برِ اعظم ہندوستان میں آزادی کے بعد دیکھا ہے اور روس میں طلوع اشتراکیت کے بعد بھی یہ اندھیرا نظر آتا ہے۔ یہ اندھیرا ایشیا، آفریقہ اور لاطینی امریکہ کے بیسیوں ممالک میں جدوجہد آزادی کی منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد بھی دیکھا گیا اور دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے کہ

ہاتھ میں ہاتھ دو ۔۔۔ سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی ۔۔۔ منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں ۔۔۔ دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

اب منزل مقصود صرف ایک منزل نہیں بلکہ پیار کی اور کوئے دلدار کی منزلیں ہیں۔ شاعر کا شعوری ارتقا اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اب اسے یہ جستجو میں معلوم ہوتی ہے کہ راہوں کے بعد منزل آتی ہے اور منزل کے بعد پھر راہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ منزل مقصود تو صرف ایک خیال اور تصور ہے۔ زندگی کو زیادہ حسین زیادہ خوبصورت اور اس دھرتی کو انسانوں کے لئے زیادہ اچھی رہنے کی جگہ بنانے کے لئے جدوجہد ہمیشہ جاری رہے گی کیونکہ کشمکش حیات کے ہنگامے ختم نہیں ہو سکتے۔ کوئی سویرا مکمل سویرا نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ سویرے کے باوجود کہیں اندھیرا کم نظر آتا ہے اور کہیں سویرا ہو جانے کے بعد بھی گھٹا ٹوپ اندھیرے کے

چھا جانے کا احساس رہتا ہے۔

مخدوم کی یہ نظم بڑی جامع اور ان کے دوسرے دور کی شاعری کی بہترین نظم ہے اس موضوع پر اردو میں جتنی نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں یقیناً اس نظم کو ایک خاص مقام حاصل رہے گا۔ اس نظم میں بڑی آفاقیت ہے۔ شاعرانہ اظہار کی صداقت اور بھرپور تاثر کی یہ نظم بڑی عمدہ مثال ہے۔

"سناٹا" مخدوم کی مختصر لیکن بڑی پراثر نظم ہے۔ اس خوبصورت نظم کی شعریت اور روانی دل میں اتر جاتی ہے۔ شاعر اپنے گردوپیش کے ماحول میں کوئی ہلچل کوئی "دھڑکن" محسوس نہیں کرتا۔ لوگ اسے بڑے کار دیار میں نظر آتے ہیں۔ شاعر زندگی میں اضطراب تڑپ اور سچا جذبہ اور نصب العین چاہتا ہے۔ شاعر اپنے ماحول سے اداس ضرور ہے لیکن نظم اس خواہش پر ختم ہوتی ہے کہ

کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

رخسار کی بجلی زندگی کے خوبصورت تصور اور آدرش کی تمنا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شاعر اس سنسان رہ گزر کو جل کر بھسم ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے یہ نظم مخدوم کے بدلے ہوئے مزاج کے مطابق ہے جس میں وہ اپنے تاثرات اور اپنے دل کا راست اظہار کر دیتے ہیں لیکن مریضانہ یاسیت سے پھر بھی وہ اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

"احساس کی رات" میں جو سناٹا سے پہلے لکھی گئی ہے شاعر کا یہی تاثر پایا جاتا ہے۔ جب ماحول کے سناٹے کو انہوں نے اپنی نظم "سناٹا" میں بیان کیا ہے وہ اس ماحول کو احساس کی رات سمجھتے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ یہ رات بھی سرد نہ ہو جائے کیونکہ سارا ماحول طوفان حوادث کے نرغے میں ہے۔ ہوس کی یلغار ہے۔ انھیں یہ اندیشہ ہے کہ پیمانِ وفا اور نقشِ تمنا کہیں مٹ نہ جائے

یہ نظم بھی اس خواہش اور تمنا پر ختم ہوتی ہے کہ

میرے دل اور دھڑک   شاخ گل ۔ اور مہک اور مہک

"گل تر" کی بعض نظموں "نیا چین" "ماسکو" اور "گنگا رن" سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ نظمیں رسمی طور پر بہ دل روی میں کہی ہیں۔ ان نظموں میں نہ تو کوئی خاص بات ہے اور نہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ شاعر اپنے بھرپور تاثر کو پیش کرنے میں ناکام نظر آتا ہے حالانکہ شاعر کے نزدیک ان واقعات کی غیر معمولی اہمیت مسلمہ ہے اس کے برخلاف پنڈت نہرو کی موت پر لکھی جانے والی بے شمار نظموں میں مخدوم کی مختصر سی نظم بہت پراثر ہے۔ سب سے مختلف، غیر روایتی بھی۔ خوبصورت بھی اور زندہ رہنے والی بھی

۱۔ ہزار رنگ ملے اک سبو کی گردش میں
۲۔ ہزار پیرہن آئے گے زمانہ میں
۳۔ گر وہ صندل و گل کا غبار مشت بہار
۴۔ ہوائے وادی جنت نشاں میں آوارہ
۵۔ قضا کے ساتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
۶۔ وہ شست جہت کا اسیر
۷۔ نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

کچھ مخدوم کے فن اور شخصیت کے بارے میں

رؤف خلش

(اس مضمون پر رؤف خلش کو جشن مخدوم کمیٹی کی جانب سے پہلا انعام دیا گیا۔ ادیب)

● مخدوم کا نام ایک انقلابی شاعر اور ایک سیاسی رہنما دونوں حیثیتوں سے مقبول و ممتاز ہے ان کی شاعری کا لب و لہجہ اتنا منفرد اور ان کی شخصیت اتنی رچی ہوئی ہے کہ کوئی بھی عاجلانہ رائے کسی ایک روپ کے حق میں سطحی تصور ہوگی۔

مخدوم کی شعرگوئی کا آغاز ۱۹۳۳ء سے ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں غیرملکی حکمرانوں کے خلاف عوام کا غم و غصہ تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا۔ مارکسی تعلیمات کے زیر اثر نوجوان طبقہ اپنی سماجی و معاشرتی سرگرمیوں میں مصروف عمل تھا آزادی کی جد و جہد بڑے پیمانے پر جاری تھی۔ یہ تمام کوششیں ادب میں بھی نئے رجحانات لے کر داخل ہوئیں۔ مخدوم ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ذہین طالب علم تھے اور حالات کے بدلتے ہوئے تیوروں سے غافل نہیں تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ترقی پسند تحریک نے اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ معاشرے کے ہر شعبہ میں قدم رکھا تو حیدرآباد میں اس کی تشکیل و تشہیر کا سہرا مخدوم کے سر رہا۔ ان کے اندر شروع ہی سے ایک مکمل فنکار بننے کے پورے آثار موجود تھے۔ زمانہ طالب علمی میں انہوں نے شعر و شاعری کے علاوہ ڈراموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کالج میگزین میں ڈرامے کے تعلق سے متعدد مضامین لکھے۔

اسی زمانے میں ان کی بزلہ سنجی حاضر جوابی اور ظرافت . . . . . . ان کی شخصیت کے اہم جزو بن گئے تھے۔ اور یونیورسٹی میں ان کی لطیفہ گوئی کا چرچا

رہتا تھا۔ یہ وصف آج بھی برقرار ہے۔

ترقی پسند تنظیم سے مخدوم کی وابستگی اس حقیقت کی مظہر ہے کہ ان کے جذبات، خیالات اور قوت ارادی نے اس تنظیم کے مسلک کو قبول کر لیا تھا جو اس زمانے کے تمام سیاسی و سماجی انتشار کی بیخ کنی کرنا چاہتی تھی۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، مخدوم نے اسے اکتسابی فن کے طور پر ہرگز نہیں اپنایا کیوں کہ وہ محض موزوں طبع نہیں تھے بلکہ ان کے فہم و ادراک میں آزادیٔ افکار اور بالغ نظری ہی قوم کی نجات دہندہ تھی چنانچہ یہی گہرا VISION اور زندگی کا بھرپور الفان ایک شاعر کے پیکر میں ڈھل گیا، جس کی ترجمانی ان کی ایک خوبصورت نظم "شاعر" میں ملتی ہے ؂

بکھری ہوی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
فردوس خیالی میں بیٹھا، اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو، پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

اُن کی ابتدائی شاعری میں ہم کو رومان کی جھلکیاں زیادہ ملتی ہیں جیسے ان کی نظمیں "طور" "آتشکدہ" "انتظار" "سجدہ"، "جوانی" اور "ساگر کے کنارے" وغیرہ۔ لیکن بعد میں ان کی دوربینی اور سماجی شعور نے حسن و عشق کے محدود کوچے سے نکل کر دوسرے خارجی موضوعات کی وسعتوں کو بھی ناپنا شروع کر دیا۔

مخدوم کا پہلا مجموعۂ کلام "سرخ سویرا" ۱۹۴۴ء میں چھپا تھا۔

اس میں جتنی نظمیں ہیں سب میں ردیف و قافیہ کا اہتمام (کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر) موجود ہے۔ سوائے دو نظموں "اندھیرا" اور "اسٹالین" کے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید نظم فی الواقعی ہیئت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ موضوع کی ندرت سے تشکیل پاتی ہے۔ ورنہ "سرخ سویرا" میں بیشتر نظمیں ہیئت کے اعتبار سے قدیم قرار پاتیں جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بہ لحاظ موضوع یہ سب نظمیں مثلاً "مشرق"، "حویلی"، "زلف چلیپا"، "انقلاب"، "جنگ" اور "دھواں"، وغیرہ تمام عصری مسائل کی صورت گری کرتی ہیں۔ خصوصاً "اندھیرا" کا یہ بند ؂

شب کے سناٹے میں رونے کی صدا
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی
چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

مخدوم کبھی زندگی کی کشمکش اور طویل سفر میں تنہا چلنے کے قائل نہیں رہے بلکہ اپنے ہمراہ ساری جمعیت

سارے قافلے کی الجھنوں کا بار اٹھایا' انھوں نے پسند کیا۔ ان کا ایک مشہور شعر ہے ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یہ موضوع ان کی بیشتر نظموں میں براہ راست یا بالواسطہ ابھر کر آیا ہے۔ غم ذات کو غم دوراں میں مدغم کرنے کا یہ جذبہ بہت کم فن کاروں کو نصیب ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مخدوم کی شخصیت، مایوسی، محرومی یا ناکامی کا لبادہ اوڑھنا نہیں چاہتی۔ ورنہ ممکن تھا کہ وہ تلخی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر مزاج کی وادیوں میں آرام لے لیتی۔ یہاں مخدوم کی حوصلہ مندی اور پُر امیدی کا سایہ ان کے شعری مزاج پر پڑتا ہے۔ اگرچہ وہ خوب جانتے تھے ؎

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک

اس کے باوجود ان کا حساس دل، فراریت کی پناہ گاہ نہیں ڈھونڈتا بلکہ سماج کی بوسیدہ حویلی کے کھنڈروں پر جو کہ تاریک اور ہولناک ہیں آزادی کا پرچم کھول دینے کا عزم رکھتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ مخدوم نے زندگی بھر کبھی رجعت پسند طاقتوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ اردو شاعری میں مخدوم نے کیا اضافے کیے؟ خصوصاً جدید نظم کی ساخت و پرداخت میں ان کا کیا رول رہا؟ بیشتر تنقید نگار فیض و مخدوم کی شاعری کا تقابلی موازنہ بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل وہ فنی و ذہنی یگانگت ہے جس کا رنگ دونوں کے پاس جا بجا ملتا ہے۔ خارجی و داخلی موضوعات تہذیب نفس، کلاسیکیت میں جدیدیت کا رنگ یہ سب باتیں دونوں کی شاعری میں مشترک رہی ہیں۔ مخدوم نے جہاں شروع میں صرف نظمیں کہیں، وہاں فیض غزلیں بھی کہتے رہے۔ اردو نظم پہلے مسلسل تو مسلسل غزل کے فارم میں کہی جاتی رہی ہے۔ لفاظی اور ترکیبوں کی آڑ میں نفس مضمون ایک ہی ہوتا تھا۔ لیکن جدید نظم کا سانچہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں موضوع اور تسلسل کا التزام ۱۹۳۶ء کے بعد پیدا ہوا۔ مخدوم و فیض کے علاوہ اس کے نقیب ن م راشد، میراجی اور اختر الایمان ہیں۔ نظم کو اکائی کا تصور دینے اور علامت و اشارے سے مالا مال کرنے میں ان سبھوں نے اجتہاد کیا ہے۔

مخدوم ہمیشہ ہر ترقی پذیر نظریہ، نئے پن اور زندگی کے ہر مثبت پہلو کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں انٹلکچول اور خصوصاً نوجوانوں کے حلقے میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ درمیانہ طبقہ ہو، غریب طبقہ ہو۔ مزدوروں یا کسانوں کی تحریک ہو، طلبا کا اجتماع ہو مخدوم

فضا اور ماحول میں گھل مل جاتے ہیں۔ سیاست داں ہونے کے ناطے انھیں اکثر مشتعل ہجوم اور غیر سماجی عناصر سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے لیکن وہاں بھی وہ اپنی سوجھ بوجھ اور ذہانت سے بڑے سے بڑے مجمع کو قابو میں رکھنا جانتے ہیں۔

مجلسی آداب کا پاس رکھنا ملنساری اور رکھ رکھاؤ میں یقیناً ان کا جواب نہیں۔ البتہ ایک شے ان کے مزاج میں ایسی ہے جسے آپ ان کی "خود شناسی" کہہ لیجئے، وہ کسی کی زبان سے اپنے بارے میں تنقید یا زیادہ صحیح الفاظ میں اپنی تنقیص برداشت نہیں کر سکتے۔ میں سمجھتا ہوں یہ عادت بھی ان کی خوبیوں ہی میں گنی جائے گی۔ اس لیے کہ سماجی حیثیت سے ایک اعلیٰ مقام رکھنے والا ہر گھڑی غیر ضروری یا نامناسب الزام تراشی کیوں کر گوارا کر سکے گا؟ اس کے علاوہ بعض اوقات۔ ایسی باتوں کو درگزر کر دینے سے کم ظرف لوگوں کو شہ بھی مل جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے مخدوم بھی اسی نظریے کے تحت اپنی تنقیص برداشت نہ کر پاتے ہوں۔ اس سے ہٹ کر مخدوم کو آپ انتہائی مخلص ہنس مکھ، پرکشش اور سنجیدہ پائیں گے۔ اپنے عقائد کی بنا پر وہ شروع ہی سے ایک اشتراکی رہے ہیں۔ تلنگانہ تحریک جو ایک طرح سے جاگیرداروں اور کسانوں کا تصادم تھی اور جس کے پیرو مخدوم رہے، اس میں بھی ان کا مزاج مصلحتوں کی تمام آلائشوں سے قطعاً پاک رہا۔

جس طرح مخدوم دیکھنے، سننے میں حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ نظر آتے ہیں ان کی شاعری بھی اس وصف سے خالی نہیں۔ غالباً جدید شاعروں میں مخدوم واحد شاعر ہیں جنھوں نے دکنی الفاظ (جنھیں کوئی بھی شعر میں لانے کو اپنا احساس کمتری سمجھتا) نہایت بے باکی اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی نظموں میں استعمال کیے ہیں۔ جب لکھنؤ یا دلّی والے اپنی زبان پر فخر کر سکتے ہیں اس کا روزمرہ یا محاورہ ادب میں لانے سے نہیں جھجکتے تو دکن والے کیوں اس سے پیچھے رہیں؟ یہ بات اپنے شعروں کے ذریعہ حضرت مخدوم نے ہی جتلائی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں کے یہ مصرعے ملاحظہ ہوں:

دور "مجبس" کی فصیلوں سے بہت دور کہیں	(قید)
کوئی "سنچل" نہ کوئی چاپ نہ کوئی دھڑکن	(سناٹا)
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا "تماں"	(مشرق)

۱۹۶۱ء میں مخدوم کا دوسرا مجموعہ کلام "گل تر" شائع ہوا۔

یہ مجموعہ ان کی شاعری کے دوسرے دور کی نمائندگی کرتا ہے اس میں ان کا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۱ء تک کا کلام شامل ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد ان کے اندر کا فنکار اپنی تعمیری خطوط پر سوچتا رہا جس انداز سے ہر انسان دوست آدمی سوچ سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات ـــــ حیدرآباد کا پولیس ایکشن ایک شاہی حکومت کا خاتمہ ـــــ انڈین یونین میں حیدرآباد کا انضمام ـــــ جاگیر دارانہ نظام کا دم توڑنا ـــــ

یہ سب ایسے معمولی حادثات تو نہ تھے کہ مخدوم ان سے چشم پوشی کرتے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں نے ایک نیا موڑ اختیار کرلیا جس کے نتیجے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک مخدوم نے بمشکل چار پانچ نظمیں کہی ہوں گی۔ جن میں "قید"، "آج کی رات نہ جا" اور "چارہ گر" قابلِ ذکر ہیں ان نظموں کو پڑھ جائیے ہمارا ذوقِ شعری ایک پُرسوز کرب اور قلبی کشمکش میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوگا۔ خاص کر "آج کی رات نہ جا" کے یہ مصرعے ؎

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے

جو شاعر زندگی کو ان تمام صورتوں میں بھی اپنانے کا حوصلہ رکھے اس کا شعورِ آگہی کتنا ارفع، کتنا بلند ہو سکتا ہے۔

اپنے تہذیبی ورثے کو جو سالہاسال کی ذہنی و روحانی کاوشوں کا حاصل تھا، مخدوم نے اپنے جمالیاتی ذوق اور شعری پاکیزگی سے خوب خوب نکھارا، سنوارا اور نسبتاً شگفتہ انداز میں شعری قالب میں سمو دیا "گلِ تر" کے مخدوم، "سرخ سویرا" کے مخدوم سے ان معنوں میں بدلے ہوئے ہیں کہ ان کی نئی شاعری دھیمی آنچ کی زم روی موضوعات کے تنوع، گھلاوٹ اور نغمگی کی آئینہ دار ہے۔ یہ باتیں شروع ہی سے مخدوم میں موجود ہیں لیکن ان میں تیزی و تندی اب آئی ہے۔ "پیار کی چاندنی" "رقص" "جانِ غزل" "چپ نہ رہو" "احساس کی رات" اور "فاصلے" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ آزادی کے موضوع پر "چاند تاروں کا بن" ان کی شاہکار نظم ہے جس کی ہم پلہ نظمیں جدید شاعری میں ایک دو ہی نکلیں گی۔

مخدوم ہمیشہ جس سیاسی پارٹی سے وابستہ رہے (اور اب بھی ہیں) اس کے اصولوں پر کاربند رہنے کو اپنا ایمان سمجھتے رہے۔ اپنے اس عوامی کردار میں انھوں نے وضعداری کی شان بھی برقرار رکھی اور وفاداری بشرطِ استواری" کا جیتا جاگتا نمونہ بھی بنے رہے۔ یہ خصوصیات محض ان کی اپنی شخصی خوبیوں کی مرہونِ منت ہیں مزدوروں اور کسانوں کے لیے اپنی اعلیٰ صلاحیتیں وقف کر دینا ان کے مطالبات منوانے کے لیے ہر مخالف وار کا بے باکی سے مقابلہ کرنا۔ ثابت کرتا ہے کہ ان میں "جراتِ رندانہ" کوٹ کوٹ بھری ہے۔

حق و باطل، خیر و شر کی لڑائی تو ازل سے جاری ہے۔ لیکن مخدوم کے مزاج میں جو بدی کی طاقتوں کے خلاف کھلا چیلنج کرنے کا انداز موجود ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا یہ قطعہ اسی کا ترجمان ہے ؎

اُسی ادا سے اُسی بانکپن کے ساتھ آؤ — پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ
ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں — تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

۱۹۵۹ء سے مخدوم کی شاعری کا ایک اور رنگ سامنے آتا ہے اور وہ ہے ان کی غزل گوئی — جب انہوں نے اپنے مخصوص ترنم میں یہ شعر پڑھ دیا ؎

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل — تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

تو کسے معلوم تھا کہ وہ اپنے اسلوب کی تازگی، حسنِ بیان اور غنائیت کے بھرپور امتزاج سے اپنے اندر کے ایک "غزل گو" کو بھی بے نقاب کر دیں گے۔ ان کی غزلوں کے یہ اشعار کتنے حسین اور دلآویز ہیں ؎

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے — جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے
آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے — گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
دل میں اتر کے سیرِ دلِ رہرواں کریں — آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں
بجا رہا تھا بہت دور کوئی شہنائی — اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

"گلِ تر" کی اشاعت کے بعد بھی انہوں نے چند اور نظمیں کہی ہیں جن میں "وصال"، "لحنِ جگر"، "نصف کا خواب"، "وقت بے دردِ مسیحا"، "فریاد" اور "زنجیر" بے حد معنی خیز اور موضوعات کے لحاظ سے متنوع ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ رمز و ایما کے نشتر سے اپنی اور اپنے عہد کی ناآسودگیوں کو دھیرے دھیرے کچوکے لگا رہے ہیں۔ ان کے فن کی یہ دردمندی سوائے احساس کی نزاکت، سوز و گداز اور فنی بصیرت کے اور کیا ہو سکتی ہے۔ شہرت پسندی اور خود نمائی سے نفرت مخدوم کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ورنہ کئی بار ایسے مواقع پیدا ہوئے جب مالی منفعت یا اعلیٰ منصب و مقام انہیں سرفراز کر سکتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں بحیثیت گیت نگار فلمی دنیا کی بہت بڑی مالی پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا جس کا باعث وہی ناپسندیدہ عناصر تھے جو ان کی مخصوص طرزِ فکر سے میل نہ کھا سکے۔

کوئی محفلِ مشاعرہ ہو، یا کوئی جلسہ ہو یا سیاسی تقریب ہو، مخدوم اپنی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اور اپنی خوش خلقی، دلچسپ چٹکلوں اور اپنی خدا داد ذہانت سے فضا کو زعفران زار بنا دیں گے۔ کینہ توزی اور ریاکاری سے وہ ہمیشہ کوسوں دور رہے۔ منافقانہ رویہ ان کے نزدیک سنگین جرم سے کم نہیں۔ شاید اسی بنا پر مخالفین میں بھی وہ قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مخدوم کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر کم ہیں اور لیڈر زیادہ۔ یہ خیال قطعاً درست نہیں۔ ان کی شخصیت تمام ہمہ گیر پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جن کی بنا پر مخدوم نے اپنی سماجی و سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مخدوم نہ صرف ایک اہم شاعر ہیں بلکہ ایک بلند حوصلہ انسان بھی ہیں۔ ان کے کردار و مزاج میں پابندیٔ روایات اور ذہنی غلامی کے خلاف وہ بے پناہ جذبہ ہے کہ اس سے ان کی فطرت اور فن میں طبع زادگی، بے ساختگی اور برجستگی آگئی ہے۔ پتہ نہیں وہ شاعر اور لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ اگر ایک تمثیل نگار، فلم رائٹر بھی ہوتے تو ان کی شخصیت کے اور کتنے ہی گوشے نمایاں ہوتے۔

مخدوم کی شخصیت — شعر کے آئینے میں

حسن فرخ

(اس مضمون پر حسن فرخ کو جشن مخدوم کمیٹی کی جانب سے دوسرا انعام دیا گیا۔ ادیب)

● مخدوم محی الدین اس دور کی ایک بہت ہی مشہور اور مقبول شخصیت ہیں۔ مخدوم کی شاعری پر کوئی بات شروع کرنے سے پہلے اس دور کا تعین کرنا اور ان اسباب و عوامل پر غور کرنا بے حد اہم اور ضروری ہے جن کے خمیر سے مخدوم کی شاعری اٹھی ہے

مخدوم کی شاعری کی ابتدا اور عروج ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کا دور ہے اور یہی وہ وقت تھا جب اردو کے چار شاعر اردو نظم کو شعوری طور پر جدیدیت کے نئے پیرہن عطا کر رہے تھے اور اپنے خیالات جذبات تفکرات اور تاثرات کو نئے انداز سے پیش کر رہے تھے اور یہ شاعر تھے میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین۔

جدید شاعری کے بارے میں اس بات کا تعین کر لینا یہاں بے حد ضروری سا ہے کہ آخر یہ لعجہ بہ شاعری ہے کیا؟ کچھ لوگ آزاد بحر والی نظموں کو جدید شاعری کا نام دیتے ہیں۔ کچھ غیر مقفیٰ نظموں کو۔ کچھ لوگ عورت مزدور، طوائف وغیرہ کے علاوہ انگریزی یا دوسری زبانوں کے الفاظ کو اور ان سے متعلق موضوعات کو نظم میں برتنے کو جدیدیت سمجھتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی تخلیق آزاد بحر میں ہونے اور غیر مانوس لفظوں کے مستعمل ہونے کے باوجود قدیم اور روایتی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ابتدائی پابند شاعری بھی جدید ہو سکتی ہے۔

جدید شاعری دراصل اس مزاج اور اسلوب کا نام ہے جس میں کسی بھی موضوع کو خواہ کسی بھی ...

۱۹۵۸ء میں بھی بالکل نئے اندازو آہنگ سے برتا گیا ہو۔ جس میں بات واضح بھی ہو لیکن علائم اور اشاریت کا پردہ بھی ہو اور روایتی سانچوں سے الگ رہ کر خیال، جذبے اور اسلوب کی انفرادیت بھی باقی رکھی گئی ہو۔

اُردو شاعری میں جدیدیت کے آثار ہمیں بالکل ابتدا ہی سے ملتے رہتے ہیں۔ لیکن نظیر اور غالب کے پاس نمایاں طور پر جدیدیت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد "مخزن" گروپ کے ان تمام شعراء نے جدید مزاج کے بنانے میں نمایاں حصہ لیا جنھوں نے قابلِ لحاظ تعداد میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے۔ اگرچہ محمد حسین آزاد حالی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، یلدرم، ظفر علی خان، نادر کاکوروی، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خاں، عبدالرحمٰن بجنوری، تلوک چند محروم، اور حامد اللہ افسر کے زیر سایہ جدید شاعری پروان چڑھی لیکن صحیح معنوں میں اقبال ہی اُردو کا پہلا سب سے بڑا جدید شاعر ہے جس نے شعوری طور پر اس مزاج کو نہ صرف سمجھا بلکہ عملی طور پر اپنی شاعری کے ذریعہ اس کا پرچار بھی کیا۔

اقبال کی پابند جدیدیت اور بعد کی آزاد جدیدیت کا بہترین امتزاج پہلی بار اُردو شاعری میں شعوری طور پر میراجی، راشد، اختر الایمان، فیض اور مخدوم ہی کے پاس ملتا ہے۔

فیض اور مخدوم کی ایک مشترکہ خوبی ہے۔ نغمگی، ترنم، اور لے، ان دونوں کا انداز بھی بہت حد تک ملتا ہوا ہے جس کا سبب دونوں کی فکر و شعور کی یکسانیت اور زندگی کے بارے میں مشترکہ نقطۂ نظر ہو سکتا ہے، لیکن اس یکسانیت کے باوجود دونوں کا رنگ بے انتہا منفرد ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے دو مصرعے درج ہیں۔

جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال (مخدوم)

یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال (فیض)

ان دونوں مصرعوں میں خیال اور طرزِ ادا کی حد درجہ یکسانیت کے باوجود دونوں کی انفرادیت بھی موجود ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فیض پر کلاسیکیت کا بہت زیادہ غلبہ ہے جب کہ مخدوم کے پاس جدیدیت نے خود اپنی جگہ کلاسیکیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

مخدوم کی نغمگی نے تغزل سے زیادہ ترنم اور لے کا سہارا لیا ہے اور یہ کیفیت خارجی شعور کی نہیں داخلی ہے۔ جو نغمگی کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ یہ مزاج ان کی بعض ڈائرکٹ اور سیاسی نظموں میں تک موجود ہے۔ جیسے نظم "جنگ آزادی" "سپاہی"، اور "تلنگانہ" جس کے چار مصرعے درج ہیں۔

امامِ تشنہ لباں، خضرِ راہ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مری نجات، مری کائنات، میری حیات
سلام مہرِ بغاوت، سلام ماہِ نجات

مخدوم نے آہستہ آہستہ ڈھنگ بدلی اور ڈائرکٹ مصرعوں کی تعداد کم ہو گئی۔ علائم اور اشاریت نے ان کی جگہ لے لی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران ہی مخدوم نے "ایستالین" اور "اندھیرا" جیسی جدید شاعری کی نمائندہ نظمیں کہی تھیں جو آج بھی بہترین آزاد نظموں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان دونوں نظموں کے کچھ مصرعے درج ہیں۔

سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے، سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے
نکل آتے ہیں بلوں سے باہر
اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کرو (ایستالین)

وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم (اندھیرا)

مخدوم کی شاعری کی ایک اور بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کسی بھی تخلیق پر جو عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہو وقتی ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی وجہ نہ صرف یہ کہ ان کا پختہ فنی شعور ہے بلکہ ان کی نگاہ کا وہ عمق بھی ہے جو پروپگنڈہ اور آرٹ میں ایک حدِ فاصل کھینچتا ہے۔ "تہرو" یا لومبا کے قتل پر کہی گئی نظم "چپ نہ رہو" اس کی بہترین مثال ہے۔

ابھی لوگوں کا ذہن غزل کے آہنگ اور ردیف و قافیے کی صوتی خوش آہنگی کو بھول نہیں سکا ہے اور ابھی بہت دن تک اس بات کا امکان بھی نظر نہیں آتا۔ اسی لیے آزاد و غیر مقفیٰ نظمیں بہت کم لوگ قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کلیہ مخدوم کی شاعری پر پورا نہیں اترتا۔ ان کی تمام آزاد و غیر مقفیٰ نظمیں نہ صرف ذہنوں نے قبول کی ہیں بلکہ بہت سوں کو یہ نظمیں یاد بھی ہیں۔ ایسی نظمیں خصوصاً "چارہ گر"، "چاند تاروں کا بن"، "سپاہی" اور "رقص" شامل ہیں۔ ان کا مزاج کا ٹھہراؤ گداز اور دھیما پن ہی دراصل ان نظموں کی زبردست شہرت کا سبب ہیں۔

مخدوم اس سے بھی زیادہ ہر دلعزیز، مشہور اور محبوب ہیں جتنی کہ مذکورہ نظمیں ہیں۔ ہند و پاک کے گوشے گوشے میں لوگ ان کے متعلق ہر بات یاد رکھتے اور دوسروں کو سناتے ہیں۔ حیدرآباد میں کسی بھی شخص سے اگر ان کے متعلق پوچھا جائے تو ایک نہ ایک قصہ ضرور سنائے گا۔ کسی سے معلوم ہوگا کہ انہوں نے اپنی آبائی زمین غریبوں میں تقسیم کر دی تھی۔ کوئی یہ بتائے گا کہ وہ اس کے بے حد بُرے وقت کام آئے تھے۔ کوئی کسی ٹریڈ یونین کی میٹنگ کا ذکر کرے گا کوئی کسی مشاعرے کا،

اور کوئی اسمبلی کے ہنگاموں کا، لیکن اس کے بعد سننے والا جب بھی مخدوم سے ملے گا تو اسے تعجب ہوگا کہ وہ تو ایک اور ہی مخدوم سے مل رہا ہے۔

مخدوم کی شخصیت اتنی مکمل، سادہ اور کشش انگیز ہے کہ اگر مخدوم شاعر، سیاست داں اور لیڈر نہ بھی ہوتے تب بھی اتنے ہی مقبول ہوتے جتنے کہ آج ہیں۔

مخدوم کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت ان کی خوش اخلاقی، سادگی اور اپنائیت ہے۔ ان کے لہجہ میں بڑی مٹھاس ہے۔ اور یہ مٹھاس ان کی شاعری میں بھی در آتی ہے۔

مخدوم کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ اُسے کسی ایک عنوان کی لکیروں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جہاں ایک سنجیدہ شخصیت کے مالک ہیں وہیں ان کی ذہانت، ظرافت کے شگوفے بھی بکھیرا کرتی ہے۔ ان کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ مخدوم سنجیدہ محفلوں میں بھی اپنے برجستہ اور بے ساختہ فقروں سے جان ڈال دیتے ہیں۔ ہر ادبی، سیاسی اور سماجی تقریب جس میں مخدوم موجود ہوں شگفتگی سے خالی نہیں رہا کرتی۔

ایک بار مشہور افسانہ نگار جوگیندر پال کے گھر ایک ادبی نشست تھی جس میں حیدرآباد آئے ہوئے بہت سے ادیب وشاعر موجود تھے۔ جلسے کی کارروائی چل رہی تھی کہ بشر نواز اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد کسی بھاری بوجھ کے گرنے کی سی ایک زوردار آواز آئی۔ سبھی پریشان ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ بشر نواز سیڑھیوں سے گر گئے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کہ آخر وہ باہر گئے ہی کیوں تھے؟ مخدوم نے بے ساختہ کہا "بشر تو گرنے کے لیئے ہی باہر جاتا ہے"

مخدوم کے لطیفوں اور فقروں کی طرح ان کی شاعری کی مہک بھی بہت تیزی سے پھیل جاتی ہے اور ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔

"گل تر" کی نظمیں "سہاگ متی" "احساس کی رات" اور "جانِ غزل" اپنے رُومانی پہلو، شدتِ جذبات ...... مصرعوں کی تازگی، علامتوں ...... کی شگفتگی اور مزاج کے دھیمے پن کی وجہ سے نہ صرف پڑھتے اور سنتے وقت بلکہ تنہائیوں کے لمحوں میں بھی اپنا جادو جگاتی رہتی ہیں۔

"سہاگ متی" جہاں رومانی پہلو لیئے ہوئے ہے وہیں اس میں آفاقیت بھی ہے۔

شہر باقی ہے محبت کا نشان باقی ہے ، دلبری باقی ہے دلداریٔ جاں باقی ہے
سرفروشی نگاراں جہاں باقی ہے ، تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

مخدوم نے بصرت سہاگ متی کو محبت کی ایک اہم علامت بنا دیا ہے بلکہ فرسودہ تشبیہوں اور استعاروں اور سطحی مصرعوں سے بچتے ہوئے انتہائی دلکش اسلوب اور علامتوں کے استعمال سے محبت کے ازلی جذبے کو بھی بہت بلند مقام عطا کر دیا ہے۔

"احساس کی رات" میں مخدوم نے زندگی کا ایک بالکل علیحدہ اور مثبت پہلو پیش کیا ہے۔ یہ انداز بالکل نیا اور

اچھوتا ہے اور اپنے اندر ایک تعمیری پہلو بھی رکھتا ہے۔

"جانِ غزل" کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے اور اس نظریے کو جو کارزارِ حیات میں عورت کی ہم راہی کا منکر ہے۔ یکسر غلط ٹھہراتا ہے۔

مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم

مخدوم نے محبت سے گریز کے منفی رویے کو درست قرار دیا ہے نہ فرار کے نقطۂ نظر کو۔ مخدوم تو یہ کہتے ہیں کہ محبوب کے ساتھ کہیں کچھ دیر راہ میں "خوابِ فردا" کی "دیوار کی چھاؤں میں" بیٹھ کر "عشرتِ حال کی مے" پی لیں اور پھر رواں دواں منزل کو جا لیں۔

مخدوم کے اس روانی سفر کے معراج نظم "چارہ گر" ہے اس نظم میں انہوں نے سماجی پابندیوں کے علاوہ مذہبی پابندیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو مجسم آنکھ بنی محبت کے جذبوں کی نگرانی کرتی رہتی ہیں۔ ان تمام گرہوں اور زنجیروں کو کھولتے اور کاٹتے ہوئے بھی انہوں نے نظم اس سوال پر ختم کی ہے

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے

اس سوال کا جواب بھی انہوں نے دیدیا ہے نظم "وصال" میں۔ ان دونوں نظموں کا مرکزی خیال ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہے۔ جہاں ایک "احساسِ نشاط" کی ترجمان ہے وہیں دوسری نظم اس احساس کی تکمیل کرتی ہے بلکہ "نشاطِ احساس" کی منزل تک اس موضوع کو پہنچا دیتی ہے۔

"چاندتاروں کا بن" "شب کا خواب" "تنہائی" اور "وقت" ۔ بے درد مسیحا" یہ وہ نظمیں ہیں جو مخدوم کو شہرت کی سطح پر لے آئی ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات بہت بڑے، عظیم اور گہرے ہیں "چاندتاروں کا بن" انسان کی ازلی کشمکش کی کہانی ہے۔ اس کشمکش کی جس میں انسان کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد ہوتا ہے وہ اپنی جدوجہد اور عمل میں لگا رہتا ہے لیکن جب منزل کے قریب پہنچتا ہے تو یہ لمحہ اس کا مسرت و فرحت [illegible] تھک بھی جاتے ہیں۔ لیکن مخدوم کا نغمہ اس وقت بھی رجائیت کا ساتھ نہیں چھوڑتا ہے

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

"وقت — بے درد مسیحا" مخدوم کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں نہ صرف مسائل حیات اور انسانی نفسیات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے بلکہ ان کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ کتنی حقیقتیں کس قدر بھرپور انداز کے ساتھ شاعرانہ پیراہن میں لپٹی ہوئی ہیں ؎

زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام، پھپھولوں کو سکوں ملتا ہے
وقت بے درد مسیحا ہے
بہ یک حکم جگا دیتا ہے، جلا دیتا ہے۔

شاعری میں علامت اور اشاریت کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک تو کم الفاظ کی کم مائیگی اور اظہار کی بے چارگی کو چھپانے کے لیئے دوسرے کسی مصلحت کے تحت بات کھل کر نہ کہنے یا اسے خوبصورت اور گمبھیر بنا دینے کے لیئے اس نظم میں بھی انہوں نے یہی بات پیدا کی ہے۔

مخدوم نے اپنی نغمگی، ترنم اور لے کو پچیس سال تک غزل کے سانچوں میں ڈھلنے سے بچائے رکھا لیکن آخرکار وہ بھی اردو کی اس کافر صنف سے نہ بچ سکے انھیں کے الفاظ میں ؎

کوئی محفل ہو کہ مقتل ہو کہ میخانہ ہو ؎ دل وہ کافر ہے جو ہر دم تری صورت مانگے

غزل کی طرف راغب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے فن میں یا اپنے مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہوں کیوں کہ مخدوم کسی بھی چیز کی بہتات کو غالباً برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وہ ایک مشاعرے سے محض اس لیے بھاگ کھڑے ہوئے تھے کہ وہاں شاعروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس واقعہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مخدوم خود ہی اس مشاعرے کے صدر بھی تھے . . . .

. . . . مخدوم کو اکثر مشاعروں میں شعراء کی فہرست پر اعتراض کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک قصہ بھی مشہور ہے کہ ایک مشاعرے میں صرف چھ شاعروں کی فہرست انھیں پیش کی گئی لیکن انہوں نے حسب عادت کہا، بھئی شاعر تو بہت ہو گئے ہیں۔ کیا ان میں کمی نہیں کی جا سکتی؟"

مخدوم کے اسی رجحان نے انہیں غزل کی طرف راغب کیا ہوگا۔ پچھلے آٹھ سال کے عرصے میں انہوں نے کوئی چندرہ بیس غزلیں کہی ہوں گی۔

غزل مخدوم کے ہاں جس قدر نازک، خوبصورت اور ایمائی ہوگئی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مخدوم غزل سے منحرف نہیں ہوگئے تھے تو یہ نئی غزل کے لئے فال نیک ہوگا۔

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں ٭ خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ
دھڑک گئے ہیں کبھی دل، کبھی جھکی ہے نظر ٭ کہاں چھپا ہے کسی سے کسی کی چاہ کا رنگ
ابھی نہ رات کے گیسو کھلے، نہ دل مہکا ٭ کہو نسیم سحر سے ٹھہر ٹھہر کے چلے
نہ کسی آہ کی آواز، نہ زنجیر کا شور! ٭ آج کیا ہوگیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے
سنا رہی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا ٭ اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں

....

دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا ٭ اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات
تمام عمر چلا ہے تمام عمر چلے ٭ ابھی ختم نہ ہو یار غمگسار کی بات

کوآپریٹیو اساس پر شائع ہونے والی کتابیں

نیا کارواں

مرتب:۔ وقار اعظمی

جس میں حیدرآباد کے دس نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل کی گئی ہیں

آبگینے

مرتب:۔ حسن فرخ

جس میں ہندوستان بھر کے (۲۰) ابھرتے ہوئے شاعروں کا انتخاب۔ کلام شامل ہے

ہر کتاب کی قیمت: ایک روپیہ

ناشر:۔ "ادارۂ مصنفین نو" ۳۶۔ بی/ اعظم پورہ۔ حیدرآباد ۲۴

ماہنامہ "شاعر" بمبئی فخر و مسرت کے ساتھ

فروری ۱۹۶۷ء میں

اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار

کرشن چندر

پر نہایت ضخیم شاندار اور مثالی نمبر پیش کر رہا ہے

کرشن چندر کی منفرد شخصیت اور اس کے ہمہ گیر فن پر صرف ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادیبوں بلکہ ہندی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی زبانوں کے مشہور قلمکاروں نیز دنیا کی مختلف زبانوں کے ایک سو سے زیادہ مصنفین و مفکرین کے مضامین و تاثرات

کرشن چندر نمبر

چھ سو صفحات سے زیادہ کی ایک عظیم منفرد اور حسین خصوصی اشاعت

فوٹو آفسٹ کی ۴۸ صفحات پر یادگار تصاویر

قیمت : دس روپے

کرشن چندر نمبر میں

خود

کرشن چندر

کے

اپنے قلم سے

ایک تازہ غیر مطبوعہ اور شاہکار

نئے

ناول

کے علاوہ

تین تازہ کہانیاں، ایک ڈرامہ، ایک مزاحیہ، تین مضامین "میرے ادبی نظریات"، "میرے تنقید نگار"، "میری ادبی زندگی کا آغاز و انجام"، کرشن چندر کے شب و روز (تصاویر کے ذریعہ) اور عکس تحریر کرشن چندر کے اہم

خطوط

ایجنٹوں کے آرڈر پہلے سے آنے چاہئیں، بعد میں تعمیل نہ ہو سکے گی

منیجر "شاعر"

مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۵۲۶۹ بمبئی ۳

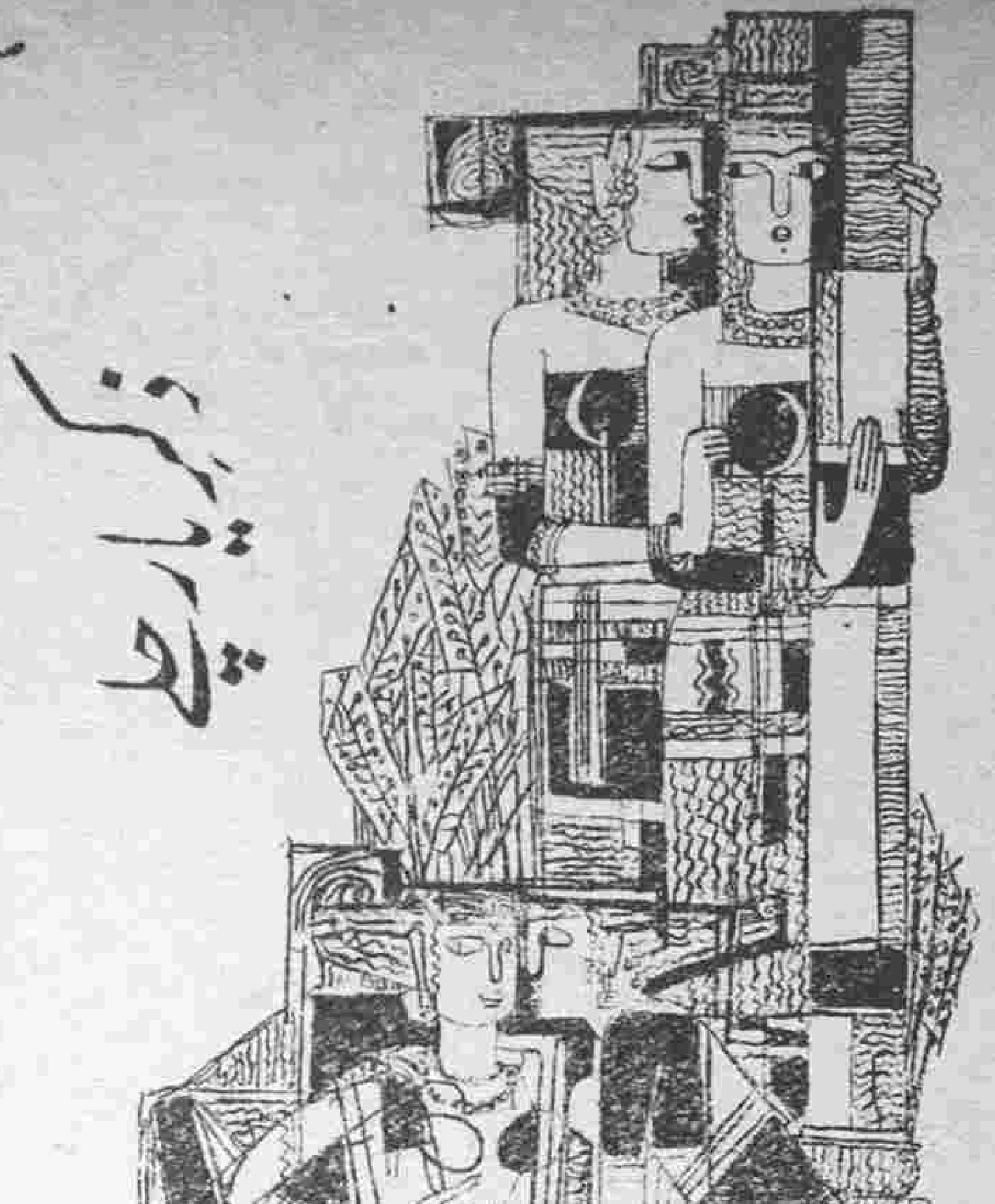
ذکرِ یار چلے

ذکرِ یار چلے

شخصیت

لکھنے والے

مرزا ظفر الحسن

یحییٰ صدیقی

اکبر وفا قانی

بدر شکیب

مرزا شکور بیگ

شہر یار کاؤس جی

محی الدین غازی

زینت ساجدہ

یوسف ناظم

مبارز الدین رفعت

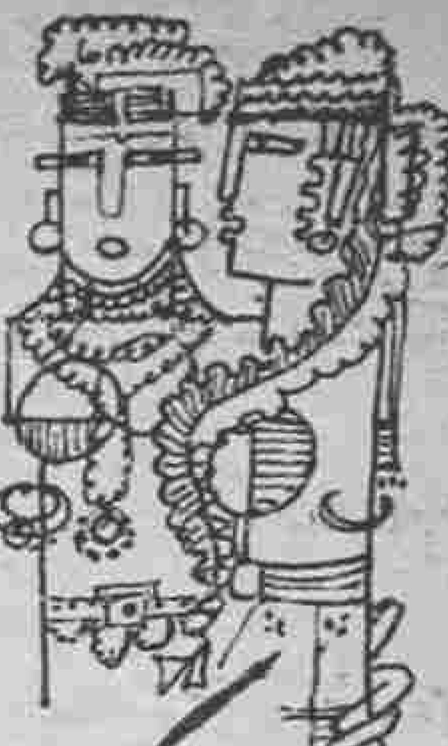

ذکرِ یار چلے

مرزا ظفر الحسن

مخدوم کے بچپن کے ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست مرزا ظفر الحسن نے یہ مضمون پاکستان سے بھجوایا ہے جس دلکش انداز میں مرزا صاحب نے یہ مضمون لکھا ہے اس کی تعریف تو کی جاسکتی ہے لیکن جس بے پناہ پیار سے یہ مضمون لکھا گیا ہے اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی، صرف رشک کیا جاسکتا ہے مخدوم پر۔ (ادیب)

● چالیس پینتالیس سال پہلے کی بات آج بھی اسی طرح یاد ہے جیسے کل کا قصہ۔ حیدرآباد دکن میں ضلع میدک کا مستقر سنگاریڈی تھا جہاں میں پیدا ہوا، بڑا ہوا، مڈل تک تعلیم پائی اور مخدوم سے پہلی بار ملا۔

گاؤں کے وسطی حصہ میں ایک بڑی چاوڑی اور چاوڑی کے اطراف چار لمبی سڑکیں ان میں سے ایک سڑک پر میرے والد کا مکان تھا۔ شام کے وقت گاؤں کے کمسن بچے سڑکوں پر لوہے کا پہیہ گھماتے پھرتے اور ذرا بڑی عمر کے لڑکے تالاب پر سیر کرنے جاتے۔ یہی اس زمانے کی تفریح تھی۔

سفید باریک ململ کا کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے بال بنائے ایک شام میں بھی چاوڑی کے اطراف پہیہ گھما رہا تھا اور دو لڑکے ایک جگہ کھڑے ہوئے اپنے دوسرے ساتھیوں کا انتظار کرنے والوں میں ایک صاحب مخدوم محی الدین تھے۔

کھمبے بوڑھے ہونے لگے

مخدوم نے میرا راستہ روکا اور پوچھا۔ ہمارے ساتھ تالاب پر چلو گے؟ عین اسی وقت گاؤں کا جانا پہچانا حجام نمودار ہوا۔ کاندھے پر چھوٹی سی سیڑھی لگی ہے، سر پر ایک ٹوکرہ اور اس میں چمنیاں، تیل کی بوتل، صفائی کے لیے دو ایک میلے کپڑے وغیرہ رکھے ہیں۔ وہ باری باری سڑک کے ہر کھمبے کے پاس رکتا کھمبے سے سیڑھی لگاتا اس پر چڑھتا اور لیمپ کا جائزہ

لیتا۔ کبھی لیمپ بدلتا، کبھی تیل ڈالتا کسی کی چمنی تبدیل کرتا اور کبھی بتی چھوٹی بڑی کرتا۔ آخر میں کام ختم ہونے کے بعد اپنا سامان سمیٹ کر دوسرے کھمبے کی طرف چلا جاتا اور پھر سے کام شروع کر دیتا۔ سڑک پر کھیلنے والے بچے اکثر حجام کے ساتھ ساتھ چلتے اور کھمبے کے پاس رکتے، اسے کام کرتا دیکھتے اور بڑے انہماک سے انتظار کرتے کہ حجام دیا سلائی جلائے اور لیمپ روشن ہو۔ جب اندھیرا ہو جاتا تو حجام بچوں سے کہتا "شام ہو گئی ہے اب گھر جا کر پڑھو"

وہ کہے یا نہ کہے، بچے اسے دیکھ کر سمجھ جاتے کہ کھیل کود کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اور ان کو گھر جانا چاہیے۔ ہر شام حجام اور بچوں کا یہی معمول تھا۔ وہ اپنے گھر سے آتا اور یہ اپنے گھر چلے جاتے۔

مخدوم نے اپنا سوال دہرایا "تالاب کی سیر کے لئے چلو گے" اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حجام لالٹینوں کے ٹوکرے میں ڈال کر مجھے میرے گھر پہنچا دیا۔ مخدوم سے شام کی یہ ملاقات ہمارے پیار اور محبت کی پہلی صبح تھی۔

زمانہ بیت گیا۔ حجام بوڑھا ہو گیا ہم پر جوانی آگئی۔ جن بچوں کو شام ہونے پر گھر بھیجا کرتا تھا اب ہیر کٹنگ سیلون میں بیٹھ کر وہی حجام ان کے گیسو بنانے لگا۔ سڑکوں کے کھمبے اس کی اور ہماری عمروں کے درمیان کھڑے تھے۔ مگر تب تک کھڑے رہتے تھے؟ وہ بھی بوڑھے ہونے لگے۔ لیمپ بجھ گئے۔ بلب روشن ہو گئے۔

جمال الدین کا خالق

جامعہ عثمانیہ کے طالب العلم لیاقت منزل اور آس پاس کی دوسری عمارتوں میں پڑھتے تھے۔ طلباء کی انجمن کا نام انجمن اتحاد، اور اس کا دفتر، خوش طبع مگر پڑھائی سے بھاگنے والے طالب علموں کا اڈہ تھا۔ یہی وہ مرکز تھا۔ جہاں مخدوم نے ایک لطیفہ سنایا۔ اور کہا کہ یہ جمال الدین کا لطیفہ ہے۔ گزشتہ پچیس تیس سال میں جمال الدین کے ہزاروں لطیفے بنے اور سینکڑوں محفلوں میں سنے اور سنائے گئے۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے یا یاد رہا کہ جمال الدین کے لطیفوں کا خالق مخدوم تھے۔ اور اس سلسلہ کا پہلا لطیفہ ہے کچھوے کے دو پر۔

میں اس لطیفہ گوئی کو مخدوم کی جامعاتی زندگی کا ایک اہم موڑ سمجھتا ہوں۔ یہی ان کی مقبولیت کا سنگ بنیاد ہے۔ بچہ اپنی زبان سے پہلے پہل ادا ہونے والے لفظ کو بار بار دہراتا ہے۔ اگر ماں کہنا تو باپ کو بھی ماں، میز کو بھی ماں، بھائی کو بھی ماں، گھڑی کو بھی ماں، غرض ہر چیز کو ماں کہے گا اور اسے بڑی خوشی ہوگی کہ اس نے لفظ ماں سیکھ لیا ہے۔ اسے اپنے سیکھے ہوئے لفظ ماں ہی کی رٹ لگی رہتی ہے۔ مخدوم کو بھی غالباً بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے سنائے ہوئے لطیفہ پر دوستوں اور ساتھیوں نے اظہار تحسین کیا۔ جس طرح بچہ نئے نئے الفاظ تلاش کرتا ہے اسی طرح مخدوم بھی نئے نئے لطیفے گھڑنے لگے۔ انہوں نے اپنے ذہن و زبان کو لطیفوں کے لئے وقف کر دیا۔ جہاں بیٹھے جمال الدین کا لطیفہ سنایا۔ جس نے بلایا جمال الدین کے لطیفوں کی فرمائش کی۔ مخدوم کو ساتھیوں و سامعین کی ضرورت تھی۔ انہیں وہ کھڑک کے پاس ملنے لگے۔ لڑکے کٹھنے جاتے تھے۔ مخدوم نے شیخ پورہ ... اشعار لگا دیے مخدوم اور حاضرین کا ایسا کاروبار چمکا کہ سبحان اللہ ماشاء اللہ۔

عام قاعدہ ہے کہ پہلے محفل سجتی ہے پھر شمعِ محفل پیدا ہوتی ہے۔ جامعہ میں اس کے برعکس ہوا۔ پہلے مخدوم چراغ بنا اور اس کی کرنوں سے محفل بعد میں سجی۔ چھوٹے بڑے گروپ بننے لگے اور ان میں مخدوم کا ذکر ہونے لگا۔ مخدوم سے پہلے جامعہ میں سماجی جمود تھا۔ سکوت تھا۔ سکوت مخدوم نے توڑا۔ جمود مخدوم کی وجہ سے دور ہوا۔

گاؤں کی چھتری

کسی گاؤں سے آئے ہوئے ایک لڑکے نے جامعہ میں داخلہ لیا۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ چھتری (چھاتہ) رہتی تھی۔ مخدوم، میر حسن، نورالہدیٰ، اور دوسرے لڑکوں نے اسے سمجھایا کہ "بھیا چھتری نہ لایا کرو۔ چھتری گاؤں میں عزت و قبول کی نشانی ہو تو ہو مگر ہم شہر والے اسے باعثِ توہین سمجھتے ہیں۔ دھوپ میں جلیں گے، واٹر پروف خریدنے کی سکت ہو تو بارش میں بھیگیں گے، مگر ہم شہر والے چھتری کبھی نہیں استعمال کریں گے۔ تم بھی ہماری تقلید کرو اور شہری بن جاؤ۔" گاؤں کا لڑکا نہ مانا تو اس کا نام چھتری رکھ دیا۔ اب وہ جہاں جاتا سب لڑکے اس کی چھتری کا مذاق اڑاتے۔ اس پر آوازیں کستے۔ اسے دق کرتے۔ وہ بچارہ بڑا ضدی یا صاحبِ کردار تھا۔ ساری صعوبتیں برداشت کیں مگر چھتری نہ چھوڑی۔ اس کے بعد شاید مخدوم کو یہ خیال آیا کہ گاؤں اور شہر میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ اور شہر کی ناموس و عزت کا تحفظ کرنا ہی پڑے گا۔

لیاقت منزل کے بڑے میدان میں املی کا ایک اونچا اور گھنا درخت تھا۔ مخدوم نے دشمن کی چھتری چرالی۔ املی کے اس درخت کی پھننگ تک چڑھ کر اسے مضبوط رسی سے باندھ دیا اور تماشے کا انتظار کرنے لگا۔ درخت پر کھلی ہوئی چھتری دیکھ کر طالب علم اپنی اپنی جماعتوں سے نکل آئے اور جامعہ درسگاہ کی بجائے قہقہہ زار بن گئی۔ جو بھی درخت اور چھتری کی طرف دیکھتا اور قہقہہ لگاتا۔ "چھتری" آپے سے باہر اور بری طرح بے بس ہو گیا۔

سیدھا پرنسپل کے پاس گیا۔ اور ان سے مخدوم کی شکایت کر دی۔ عبدالرحمٰن خان صاحب پرنسپل تھے۔ فوراً چپراسی کو بھیج کر ملزموں کو پکڑ لائے۔

مخدوم کٹہرے میں

خان صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ ملزمین، مخدوم محی الدین، میر حسن، اور نورالہدیٰ وغیرہ قطار بنائے خاموش کھڑے ہیں۔ میز کی دوسری طرف ہاتھ باندھے مؤدب کھڑے ہیں۔ دونوں فریقین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کیوں جمع ہیں۔ کس بات پر پیشی ہوئی ہے اور کیا پوچھا جائے گا۔ مگر خان صاحب کے مسلسل سکوت اور سگار کے مستقل شغل کو دیکھ کر مخدوم کی شریر رگ پھڑکی۔ عام طور سے ایسے موقعوں پر رگیں پھڑک جاتی ہیں مگر اس مخدوم کے جسم میں ایک خاص رگ ہے جو بعض اوقات بے اندازہ پھڑکتی ہے۔ مخدوم نے پرنسپل صاحب سے پوچھا "ہمیں کس تقریب میں بلایا گیا ہے؟"

"تقریب" کا لفظ سنتے ہی خان صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مخدوم کو بری طرح گھورا۔ شیر کی طرح گرجے اور بولے "تقریب۔ کس تقریب میں بلایا گیا ہے؟ شرم نہیں آتی تم سے۔ یہ پیشی ہو رہی ہے" عبدالرحمٰن خان صاحب بظاہر سخت مگر دیسے ہی سادہ مزاج پرنسپل تھے۔ اپنے بچوں اور جامعہ کے طالب علموں میں کوئی فرق نہ کرتے۔ زبان اور بعض الفاظ کے انتخاب میں گھر اور دفتر ان کے نزدیک ایک سے تھے پہلے تو مخدوم اور ان کے ساتھیوں کو شرم دلائی کہ ساتھیوں کی

اٹھوا بدلنے والے تم کون ہوتے ہو" اور آخر میں کہا "تم نے ان کے ٹخنہ شرارت کی۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی۔ بس یہی ہے تمہارے طلب کئے جانے کی تقریب۔ سمجھے" "گو کے گڑھے میں نہ تم ڈھیلا پھینکتے نہ تم پر چھینٹے اڑتے۔ جاؤ صبر کرو۔ آئندہ شرارت اور شکایت نہ کرنا۔ خان صاحب نے جو جی میں آیا بے تکان اور بلا تکلف کہہ دیا اور مخدوم کو شرارت کے لئے ایک اور شوشہ مل گیا۔ اس لڑکے کا نام چتیری کی بجائے "گو کا گڑھا" ہوگیا۔

شوخی نے شہرت دی۔ شہرت شرارت کی تشہیر کرنے لگی۔ مخدوم کو ممتاز طالب علموں میں امتیازی مقام ملنے کے امکانات نظر آنے لگے۔ پروفیسر حسین علی خان جیسے با اصول اور کم گو اساتذہ بھی پوچھنے لگے کون ہے مخدوم؟

پیلا دوشالہ

زحمت منزل جامعہ عثمانیہ کی سب سے مشہور اقامت گاہ تھی۔ مخدوم بھی اسی میں رہتے تھے۔ سال کے شروع میں جب نئے لڑکے آتے تو پرانے لڑکے انہیں تنگ کرتے۔ ان پر "ریڈ لیمین" کے نام سے جرمانہ عائد کر کے روپیہ وصول کرتے اور اس کی مٹھائی منگوا کر کھاتے۔ جو نہ دیتا اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ اسی زمانے میں گاؤں سے ایک لڑکا آیا۔ اس غریب کو کیا معلوم کہ شہر میں بڑے بڑے شیطان بسے ہوئے ہیں۔ پرانے لڑکوں نے اس سے مٹھائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے مٹھائی کھلانے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک روز اسے تنگ کیا۔ اس پر رنگ پھیکا پانی ڈال دیا اور اس کے بعد موقعہ پاکر اس کی شال غائب کردی۔ نہ صرف غائب کی بلکہ دو تین روز بعد زحمت منزل میں ایک تعزیتی جلسہ کر کے قرارداد ہمدردی بھی منظور کروالی۔ جلسے میں مخدوم نے ایک نظم سنائی جو آن کی آن میں مشہور ہوگئی۔ اور حیدرآباد میں مسلسل کئی سال تک مقبول رہی۔ مخدوم کی طالب علمی کی پہلی نظم "پیلا دوشالہ" آج بھی سینکڑوں نجی محفلوں اور سماجی تقریبوں کی یاد تازہ کرتی ہے جن میں یہ شوق سے گائی جاتی تھی۔ اسی نظم نے مخدوم کو جامعہ کا مقبول ترین طالب علم بنا دیا۔ انتہا یہ ہوئی کہ ثقہ ذوق رکھنے والے اساتذہ اور بزرگ بھی اس اردو نظم کا فارسی شعر مزے لے لے کر پڑھنے لگے۔

"او گرم کن پہلوئے من باز بیائی ..... گرم ز جدائی
آں روز بیا آر کہ من زیر تو بالا ...... وہ پیلا دوشالہ"

مخدوم ہنسنے ہنسانے میں بری طرح مصروف تھے۔ انہیں نہ تو جمال الدین کے لطیفوں سے زحمت ملتی تھی اور نہ پیلا دوشالہ ان کا پیچھا چھوڑتا تھا۔ ناں خود مخدوم کو خیال نہیں آیا تھا کہ یہ مشاغل ترک یا کم کر کے کسی اور طرف توجہ کریں۔ مخدوم کی پہلی شخصیت شاعر خوداں کے معیار کے مطابق نامکمل تھی اور ان کی رائے میں ابھی بہت سے لوگوں کو ہنسانا باقی تھا۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ... سنجیدہ مخدوم کا شعور بیدار تو تھا مگر متحرک نہیں ہوا تھا اس لئے وہ ہنسنے ہنسانے ہی میں لگے ہوئے تھے۔

مخدوم کی دوسری شخصیت

میر حسن انجمن اتحاد کے صدر اور مخدوم کے دوست تھے، آئین تو تھا، جانیں تو تھے۔ دونوں کے دوست بھی مشترک تھے اور مخالف بھی مشترک۔ اسی دوستی کا پہلا نمونہ ایک ڈرامہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ... میر حسن اور مخدوم نے مل کر جارج برنارڈ شا کے ڈرامے "وڈوورز ہاؤسز" کو "ہوش کے ناخن" کا روپ دیا۔ یوم جامعہ عثمانیہ کے موقعہ پر یہ اسٹیج ہوا اور بہت کامیاب رہا۔ اسی ڈرامہ کے بعد مخدوم کی

دوسری شخصیت اُبھرنے لگی۔ اب مخدوم لطف و طرب کی محفل چھوڑ کر علم و ادب کی محفل میں بھی جانے لگے۔

دوسری شخصیت سے میری مراد مخدوم کے فکر و نظر میں ایک اہم تبدیلی ہے۔ حیدرآباد میں انگریزی اور خاص طور پر شیکسپیر کے ڈراموں کا دور آخری ہچکی لے چکا تھا۔ جامعہ عثمانیہ میں عزیز احمد کا ڈرامہ "کالج کے دن" اور دستو سال گو رشٹے کے ناول کا اُردو ترجمہ جو عابد حسین نے کیا تھا اسٹیج کیا جا چکا تھا۔ برنارڈ شا ابھی خاصہ کی چیز تھا۔ یا تو انگریزی ادب کے اساتذہ کرتے تھے یا ایم اے انگریزی کے خاص طالب علم۔

ادبی تمثیلی اور سماجی ذوق

شا کے وڈوورز ہاؤس کا انتخاب مخدوم اور میر حسن کے ادبی تمثیلی اور سماجی ذوق و شعور کا اہم سنگ میل تھا۔ ان کا مطمح نظر محض داد حاصل کرنا ہوتا تو شریڈن یا مولیر جیسے مصنفوں کے کئی ڈرامے موجود تھے۔ مگر ان کے دلوں میں کوئی کھٹک تھی کوئی کسک تھی۔ سوسائٹی کے منہ پر طمانچہ مارنے کیلئے ان کے ہاتھ مچل رہے تھے اور یہی باعث بنا ہو شا کے ناخن کی تحسین کا۔ انھوں نے ایک عظیم مصنف کے مسائل کھیل میں طنز و مزاح کی آمیزش کی، اسے اپنے سماج کے رنگ میں رنگا اور انٹر سے ایم اے تک کے طالب علموں پر نہایت جرأت آمیز تجربہ کیا۔ یہ بڑی ہمت کا کام تھا۔ دونوں نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا۔ مجھے اس ڈرامہ میں اداکاری کی عزت نصیب ہوئی ہے۔ ریہرسل اور شو کے وقت جو اعتماد میں نے مخدوم اور میر حسن میں دیکھا وہ بہت کم دوسرے ڈرامہ نویسوں میں پایا۔ اکثر تو اپنے ڈراموں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ ڈرامہ نگار مخدوم کے بھروسہ کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے ایک اہم کردار کا رول بھی ادا کرنے کی ہمت کی۔ اِن کا یہ ڈرامہ ناکام ہو جاتا تو میرا خیال ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا اسٹیج مستقبل کے ڈرامہ نگاروں کے لیے تختہ دار بن جاتا۔ مگر انھوں نے اُسے پھولوں کی سیج بنا ڈالا۔ حیدرآبادی ڈرامہ نگاروں کا پہلا پرچم مخدوم اور میر حسن نے بلند کیا اور اس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

"چھوٹا" اور "بڑا"

نورالہدیٰ جوہر بھی تھا اور جوہری بھی۔ وہ اپنی ابتدائی طالب علمی سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک ایک چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا رہا۔ دنیا کا کونسا موضوع تھا جس پر نورالہدیٰ کا مطالعہ سیر حاصل نہ تھا۔ کونسا عنوان تھا جس پر اس شخص نے گھنٹوں استاد کے ساتھ گفتگو نہیں کی۔ بات چاہے کیمرے کی ہوتی یا امریکی ونسٹن چرچل کی جس نے انگریز ونسٹن چرچل سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنا نام تبدیل کر دے۔ میرامن کی زبان کا ذکر چلتا یا اجنتائی آرٹ کا۔ نورالہدیٰ اپنی گفتگو میں سب پر حاوی رہتا اور حریف کو نیچا دکھاتا۔

نورالہدیٰ اور نورالعقل دو بھائی تھے۔ والد پنجاب سے آ کر سلطان بازار کی ایک مسجد کے پیش امام ہو گئے تھے۔ مکان مسجد سے ملا ہوا تھا۔ مگر ان دونوں بھائیوں کو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق نہ ہوئی۔ ایک دوسرے کا نام لینے یا بھائی کہنے کی بجائے "بڑے" اور "چھوٹے" کہتے تھے۔ چھوٹے کے پاس نہایت فرسودہ موٹر سیکل تھی۔ جو کم از کم آدھ گھنٹے تک کک مارنے کے بعد بھی مشکل سے اسٹارٹ ہوتی۔ ایک دن چھوٹا موٹر سیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور بڑا بازو کھڑا دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بڑے نے کوئی مشورہ دیا کہ یوں کرو تو اسٹارٹ ہو جائیگی۔ چھوٹا کہنے لگا تم نے کبھی موٹر سیکل چلائی کہ؟

کچھ جانتا بھی ہے جو اس کے متعلق مشورہ دے رہا ہے؟ بڑا خاموش ہوگیا۔

نورالہدیٰ کو خاص احباب میفسٹو کہتے تھے۔ میفسٹو کے چار چھ گھنٹے ہر روز میرے گھر پر لازمی طور پر گذرتے تھے۔ ایک مرتبہ میفسٹو نے آنا بند کردیا۔ دس پندرہ دن تک نہیں آیا اور جب آیا تو بی ایس اے، ٹرمیف، بارلی، ڈیوڈسن، انڈین، ایریل، ڈی کے ڈبلیو، جاوا، اے جے ایس، میچلس، اور دوسری کئی موٹر سیکلوں کی معلومات کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لایا۔ پندرہ بیس روز تک موٹر سیکلوں، ان کے پرزوں، رنگ روغن، رفتار، سیٹ، ٹائر ٹیوب، پیٹرول، آئیل غرض ہر عنوان پر وہ وہ تقریریں جھاڑیں کہ خدا کی پناہ۔ ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ اس وقت کے ڈیلر سہراب برادرس، بمبئی موٹر مارٹ، ودھا موٹر مارٹ وغیرہ کے ماہروں کو بھی معلوم نہ تھیں۔

بات صرف اتنی تھی کہ چھوٹے نے بڑے کے تبحر علمی پر حملہ کیا تھا اور بڑے نے دنیا جہاں کے موٹر سیکل مینوفیکچرز کو خطوط لکھ کر ان سے لٹریچر منگوا لیا۔ دس پندرہ دن تک ان کا بغور مطالعہ کیا اور دو تین ہفتوں تک احباب کا بھیجہ پلپلا کردیا کہ اس موٹر سیکل میں یہ خوبی ہے اور اس موٹر سیکل میں وہ خرابی۔

مخدوم، میر حسن اور میفسٹو

میفسٹو کو مخدوم میں ایک چمک نظر آئی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ چمک ایک دن جامعہ عثمانیہ کی آنکھیں خیرہ کردے گی۔ میفسٹو کو ذرا ہوش کے ناخن اور اس کے مصنفین مخدوم اور میر حسن پسند آگئے اور ان میں اتحاد ثلاثہ ہوگیا۔ اتحاد بھی ایسا کہ بعد کے زمانہ میں نظریاتی اختلاف کے باوجود تینوں ایک کل کے اجزاء بنے رہے۔ یہی وہ دوستی تھی جس کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو صیقل کیا۔ کس کا کتنا اثر تھا یہ مفصل بحث چاہتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک نے دوسرے کے دماغ سے بھی سوچنا سیکھا اور دوسرے کو اپنی زبان میں بات کرنا بھی سکھایا۔ یہ ان کی ذہنی ہم آہنگی کی نشانی تھی۔ مخدوم، میر حسن اور میفسٹو میں معرکہ کی بحثیں بھی ہوئیں۔ مباحث میں ایک نے دوسرے کی علمی انداز میں مخالفت بھی کی۔ مگر اتحاد ثلاثہ اور اختلاف ثلاثہ کی کچھ شان ہی نرالی تھی۔ یہ ایک عمارت کے تین ستون تھے۔ خدا مغفرت کرے ایک ستون گر گیا اللہ باقی دو کو سلامت رکھے۔۔۔

لالہ گوڑہ کی لڑکیاں

اڈکمیٹ میں جامعہ عثمانیہ اور اس کے اقامت خانوں کی عارضی عمارتیں بن گئیں تو جامعہ کا دفتر اور اس کے ساتھ بورڈنگ میں قیام کرنے والے طالب علم کا ایک بڑا قافلہ اڈکمیٹ منتقل ہوگیا۔ قریب ہی ایک ریلوے کالونی لالہ گوڑہ ہے۔ آج کا مجھے علم نہیں۔ اس زمانے میں یہاں اینگلو انڈین بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ اور ریلوے کے ملازم۔ جوان جوان لڑکیاں شام کے وقت بن ٹھن کر باہر نکلتیں اور خوب خوب رومان لڑاتی تھیں۔

اس زمانے میں ہندو اور مسلمان طالب علم بلاتکلف شیروانی پہنتے تھے۔ سوٹ پہننا فخر کی بات نہ تھی۔ بلکہ اہم تقریبوں تہواروں اور عیدوں کے موقع پر کوئی سوٹ پہن لیتا تو اس پر پھبتی کہی جاتی۔ پانچ دس اونچے گھرانوں کی لڑکیوں کو چھوڑ کر تمام مسلمان لڑکیاں پردہ کرتیں، اور بے شمار ہندو خاندان کی لڑکیاں بھی بے باکی سے باہر نہ نکلتیں۔ ان پر بھی پردہ کا

بلاواسطہ اثر تھا۔ خواجہ غلام السیدین کی صاحبزادی زاہدہ ضرور آتیں۔ حسینہ مرزا کو صرف یہی ایک بے پردہ لڑکی تھی۔ جو فراک پہنتی اور بے تکلف عابد روڈ پر گھومتی اور اکیلی خرید و فروخت کرتی۔

مچایا خاندان

میری دوستی چند پارسی اور عیسائی خاندانوں سے تھی۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ اور لڑکے بھی۔ مچایا خاندان میں میرا آنا جانا سب سے زیادہ تھا۔ مسز مچایا کو میں ممی اور ان کی بہن مسز چارلس کو آنٹی این پکارتا۔ ان کی لڑکیاں میری والدہ کو ممی اور والد کو ڈیڈی کہتیں۔ اور میرے گھر بھی آتیں۔ میری اور اس خاندان کے نوعمروں کی دوستی کا ایک خاص حلقہ تھا۔ مس مے مچایا، مس ایلین تھیا فولس استاسی مچایا، جیونت راؤ اور میں ایک دوسرے کے حلقہ بگوش تھے۔ مے نے بعد میں جیونت راؤ سے اور ایلین نے استاسی سے شادی کر لی۔ ہمارا یارانہ بھی اس آخر وقت تک قائم رہا۔

یہ لڑکیاں اور لڑکے اکثر جیونت راؤ کی یلی ڈاج کار میں شہر کے اڈیکمیٹ مجھ سے ملنے آتے۔ کبھی شام کے وقت اور کبھی چاندنی راتوں میں۔ مخدوم، میر حسن، اور دوسرے ساتھیوں کو میری، دوستی اور ملاقاتوں کا پوری طرح علم تھا۔ بدگمانی اور رشک کی نہ کوئی وجہ تھی۔ اور نہ امکان۔ وہ کھلے بندوں آتے اور میں ان سے ملا کرتا۔ کار آتی تو میرے ساتھی کوئی نوٹس نہ لیتے، البتہ مخالف گروپ کے طلبا اپنے کمروں سے نکل آتے اور کھسر پھسر کرتے رہتے۔ لڑکیوں کی آمد و رفت اور ان سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ بند نہ ہوا تو ایک دن کسی دل جلے نے چوری سے میرے آٹو گراف البم میں یہ شعر لکھ دیا۔

پردہ اٹھ جانے کا آخر یہ نتیجہ نکلا
جس کو جینا یہ سمجھتے تھے بھتیجہ نکلا

عشق بازی کا شوق

جامعہ کی لٹ آور سرزمین پر بار بار ان لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد بعض طالب علموں کو عشق بازی کا شوق چرایا۔ وہ لالہ گوڑہ کا طواف کرنے لگے مگر اینگلو انڈین لڑکیاں شیروانیوں کو کہاں خاطر میں لاتیں۔ یہ لڑکے اینگلو انڈین لڑکیوں کی زیارت کو آتے سو بچاس گز کے فاصلے سے مگر ایڈونگ اوٹ کو نظمی بگھارتے کہ شوہرکہ سے زیادہ قریب ہو گئے ہیں۔ بلکہ دو ایک کو اپنے قابو میں بھی کر لیا ہے۔ ایک دن مخدوم کے مزاج میں بڑی چہل تھی۔ کہنے لگے چلو لالہ گوڑہ چلیں۔ میں نے انکار کر دیا کیونکہ مخدوم کے پاس صرف شیروانیاں تھیں۔ سوٹ نہ تھا۔ بڑی حجت اور بحث کے بعد طے ہوا کہ مخدوم میرا سوٹ پہن کر چلیں گے۔ استری کرتے ہوئے میں نے پتلون کے فلیپ الٹے اور پتلون کی لمبائی میں اضافہ کیا تاکہ لمبائی پوری نہ ہو تو کم از کم برا بھی نہ معلوم ہو۔ مخدوم نے سوٹ پہنا، ٹائی باندھی، دونوں نے چہرے پر افغان اسنو کا لیپ کیا۔ پاؤڈر ملا، سینٹ لگایا، کوٹ کے کالر پر پھول لگائے۔ راستے بھر چار مینار سگریٹ پیتے ہوئے گئے۔ مگر ہاتھ میں ایک ایک گولڈ فلیک کی پیکٹ تھامے رہے۔ باتیں کرتے ہوئے لالہ گوڑہ پہونچے۔

پہلا سوٹ

مخدوم کو پہلی مرتبہ سوٹ میں دیکھا تو ہنسی بے تحاشہ آئی۔ مگر ضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ کیونکہ مخدوم کے غصے کا ڈر تھا اور جذبۂ عشق کا احترام مقصود تھا۔ البتہ لطف لینے کے لیے دو ایک قدم پیچھے ہو جاتا اور دیکھتا مخدوم محی الدین صاحب کبھی پتلون کے پائنچے نیچے کی طرف کر کے پتلون کے طول میں اضافے کی کوشش فرماتے ہیں اور

کبھی کوٹ سے دھینگا مشتی کرکے اپنا پچھلا بستر چھپاتے ہیں۔ راستہ بھر یہی تماشہ دیکھتا رہا۔ اور لطف اندوز ہوتا رہا۔

چرچل کی دہائی

مخدوم کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے قریب سے گذرتے ہوئے ہماری زبان سے بکنگھم پیلیس برٹش میوزیم ہائیڈ پارک جیسے الفاظ ادا ہوں تو وہ لڑکیاں لندن پلٹ سمجھکر شرک پر کہا ہم سے شادی کر لینگی۔ ہم دونوں نے پورے لال گوڑہ کا ایک سے زیادہ مرتبہ طواف کیا۔ کئی لڑکیوں کا انتخاب کیا، انگریزی میں بڑا زور مارا کبھی چرچل کی دہائی دی۔ کبھی روز ویلٹ کا وظیفہ جپا۔ چارلی چپلین کا نام لیا، ملکہ وکٹوریہ کا تذکرہ کیا، بگ ٹاٹن ٹاٹن فش۔ انگریزی میں گالیاں بھی بکیں۔ مگر کسی کالی کلوٹی نے بھی ہماری طرف توجہ نہ کی۔ مخدوم نے غصہ میں کہا۔ ڈیم بلڈی جلو والیس۔ گولڈ فلیک ضائع ہوئے۔ پونچھو اپنے منہ سے افغانی اسنو۔

یہ ریل یہاں سے سیدھی مدینہ کو جائیگی

جامعہ کے طلباء تقریباً ہر سال انجمن اتحاد کے خرچ پر سیاحت کے باہر سفر پر جایا کرتے تھے۔ کبھی بنگلور کی سیر کی، کبھی دلی چلے گئے اور کبھی آگرہ دیکھ لیا۔ سفر کا پروگرام باقاعدہ طور پر جلسہ عام میں بحث و تمحیص کے بعد طے ہوتا۔ اس میں اخراجات کا میزانیہ منظور ہوتا۔ میر قافلہ کا انتخاب ہوتا اور دوسرے انتظامی امور طے پاتے۔

ایک سال یہی بحث ہو رہی تھی کہ کہاں جائیں۔ اچھی خاصی سمجھداری کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ملا قسم کے لڑکے نے بے سمجھے بوجھے تجویز پیش کر دی کہ اس سال حج کے لئے جائیں گے۔ بحث کی گرمی میں لڑکے یہ بھول گئے کہ ان کے سفر کے زمانے میں حج نہیں ہوگا۔ موافقین مذہبی جذبات کی رو میں بہے جا رہے تھے اور مخالفین لڑتے تھے کہ معقول وجوہ کے باوصف اس سفر کی مخالفت کی جائے تو ان پر کفر کا فتویٰ نہ صادر ہو جائے۔

مخدوم کو شرارت سوجھی۔ تجویز پیش کی کہ سفر سمندری جہاز کی بجائے بذریعہ ریل کیا جائے گا۔ اب اسی پر بحث ہونے لگی۔ بڑی رد و قدح کے بعد سب نے منظور کر لیا کہ ہاں ریل میں جائیں گے اور حج کریں گے۔ مخدوم تو یہ مصرعہ گنگناتے ہوئے ہال سے چل دئے "یہ ریل یہاں سے سیدھی مدینہ کو جائیگی" اور جلسہ برخاست ہونے کے بعد لڑکوں کو پتہ چلا کہ کوئی ریل مدینے کو جاتی ہی نہیں۔

گولڈ فلیکس

اڈکمیٹ میں ایک پارسی نے ہوٹل کھولا۔ چائے، کیک، پیسٹری، لڈو، بالوشاہی، حلوہ سوہن، قسم قسم کے سگریٹ اور ان کا ستم یہ کہ ہر طالب علم سے بہ اصرار کہے کہ بابو جی دوکان آپ کی ہے۔ پیسے کی فکر نہ کریں۔ گولڈ فلیکس بھیجوں؟

بورڈنگ کے پورے لڑکے گولڈ فلیک سگریٹ پیتے اور ہوٹل کے مالک کو "گولڈ فلیکس" کہتے تھے۔ سال بھر ہر ایک کا کھاتہ چلتا رہا۔ اور پیٹ بھر کر کھاتے رہے۔ گرمیوں کی چھٹیاں آئیں اور ہمارے کھاتوں میں ادا شدنی رقم کی جھلک پڑی تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کہ یا اللہ اتنی بڑی رقم ہم کون ادا کر سکے گا۔ وہ ایک لڑکے کے قرضہ سے ڈر کر چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے ہی جامعہ چھوڑ کر گھر چلے گئے اور اطمینان سے بیٹھ گئے کہ کہاں قرض خواہ اور کہاں قرضدار۔ جب دوسرے دوستوں کو پتہ چلا کہ ہم حساب چکائے بغیر جامعہ سے فرار ہو گئے ہیں تو ہماری مصرعہ طرح پر انہوں نے بھی غزلیں کہہ ڈالیں سب کے سب بھاگ آئے اور

اور گولڈ فلیس سر پیٹ کر رہ گیا۔

انفرنو کی منحوس شام

شہر میں میرا مکان بے روزگاروں کا اڈہ بن چکا تھا۔ مخدوم نے اس کا نام "انفرنو" رکھا تھا۔ جہاں روز احباب جمع ہوتے اپنی ناکامیاں بیان کرتے اور اگلے منصوبوں کا اعلان کرتے۔ ایک منحوس شام عجب اتفاق ہوا دیر تک دوستوں کا انتظار رہا مگر اس دن کوئی نہ آیا۔ ہر آہٹ پر نظر گیٹ کی طرف جاتی مگر مایوس لوٹ آتی۔ مراقبہ یا کسی غنودگی کے بعد میری آنکھ کھلی تو دیکھا حضرت گولڈ فلیس سامنے کھڑے ہیں۔ وہ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹھیاں دکھا دکھا کر مجھ سے روپیہ کا مطالبہ کریں اور میں کہوں کہ میرا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں، یہ میری تحریر ہی نہیں۔ میں نے ہوٹل میں کبھی کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ گولڈ فلیس بار بار رام اور بھگوان کی قسم کھا کر یاد دلائے کہ ہم کس مزے سے گولڈ فلیس سگریٹ پیا کرتے تھے اور ہم اسے سراسر جھوٹ اور بہتان قرار دیں۔ آخر میں ڈانٹ کر اسے گھر سے باہر کر دیا کہ خبردار آئندہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔

دوسری شام اس سے زیادہ منحوس ثابت ہوئی۔ آج بھی کوئی نہ آیا۔ مگر ہم اطمینان سے بیٹھے تھے کہ گولڈ فلیس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ اتنے میں ایک جاوش صاحب تشریف لائے۔

آتے ہی فرمانے لگے "پیسہ لاؤ پیسہ" میں نے پوچھا کس کا پیسہ؟ کاہے کا پیسہ؟ کہنے لگا۔ "دیکھو تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا اشٹیٹ۔ نکالو پیسہ" تھوڑی بہت بحث کے بعد جاوش نے اپنی تلوار پر ہاتھ رکھا تو مجھے اپنا ہاتھ اپنی گردن پر رکھنا پڑا کہ کہیں غائب نہ ہو جائے۔ اب نجات کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ جاوش سے چند دن کی مہلت مانگوں۔ چنانچہ مہلت مانگی، اس نے بڑی مشکل سے ایک دن دیا اور میں نے اس سے زیادہ مشکل سے قرض لے کر گولڈ فلیس کا حساب بے باق کیا۔ اور دل ہی دل میں دوستوں کو گالیاں دیں کہ وہ ان غیر حاضر نہ رہتے تو میرا بیڑہ غرق نہ ہوتا۔

مخدوم کا الٹا سفر

عابد روڈ پر سابق پوسٹ آفس کی دیوار کے پاس چارکمان سے آ کر سکندرآباد جانے والی بس اور اس کے بالکل سامنے یعنی راجہ ہیر کٹنگ سیلون کے سامنے سکندرآباد سے آ کر چارکمان جانے والی بس ٹھہرا کرتی تھی۔ مخدوم اور محی الدین غازی نے سینما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہیں سکندرآباد جانا تھا اس لئے سابق پوسٹ آفس کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر بس کا انتظار کر رہے تھے۔ چند منٹ بعد جب وقت دونوں طرف سے دو بسیں آئیں ایک دوسرے کے متوازی کھڑی ہو گئیں اور اپنے اسٹاپوں پر مسافر بھرنے لگیں۔ مخدوم اور غازی کو سکندرآباد جانے والی بس میں سوار ہونا تھا کہ اچانک مخدوم نے ارادہ بدل دیا۔ غازی کو زور سے کھینچا اور گھسیٹتا ہوا سامنے والی بس کی طرف ...

... بھاگنے لگا جو مخالف سمت یعنی سکندرآباد نہیں بلکہ چارکمان جانے والی تھی۔ مخدوم کی اس حرکت پر غازی چلایا۔ "یہ غلط بس ہے چارکمان جائے گی ہمیں سکندرآباد جانا ہے" مگر مخدوم نے ایک نہ سنی غازی کو بس میں اندر ڈھکیلا اور خود بھی سوار ہو گیا اور بس سکندرآباد کی بجائے چارکمان کی طرف چل دی۔ غازی نے پوچھا یہ کیا حماقت تھی تو مخدوم نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھتا نہیں وہ دیکھ گولڈ فلیس اور جاوش کھڑے ہیں" گولڈ فلیس ہکا بکا کھڑا تھا

"مخدوم صاحب ہی جیسے انہیں انگشت جرابات تو کہیئے" مگر اس وقت تک مخدوم محی الدین صاحب کی حس ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی اور وہ سکندر آباد کی بجائے چار کمان جا رہے تھے۔

ہرے دوپٹے والی

میرے گھر کی دعوتوں میں مخدوم، میر حسن، اشفاق اور شہاب کی شرکت اتنی ہی یقینی تھی جتنی کہ خود میری۔ ان حضرات کا ہفتہ کی دو چار راتیں ہمارے گھر پر گذارنا معمولی بات تھی عرصۂ دراز کی آمد و رفت اور ان سے میری بے تکلفی کے باوجود میری بڑی بہن جن کو میرے احباب بھی آپا جان کہتے تھے ان سے پردہ کرتی تھیں اور وہ بار بار دھمکی دیا کرتے تھے کہ پردہ توڑ دیں گے۔ گھر میں گھس آئیں گے۔

میری خواب گاہ سے متصل میرا ڈرائنگ روم تھا۔ یہ دونوں کمرے چوبیس گھنٹے دوستوں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ میں گھر پر رہوں یا نہ رہوں یہ آتے اور براجمان ہو جاتے۔

بمبئی سے رفیق غزنوی آئے تو میں نے انہیں کھانے پر بلایا اور گانے کی محفل سجائی۔ ابا جان نے خاندان کے علاوہ اپنی سسرال کی خواتین اور لڑکیوں کو بھی گانا سننے کے لیے مدعو کر لیا۔ گانا ور انترے میں ہو رہا تھا۔ اور خواتین اس کے عقبی ہال میں چلمن سے لگی بیٹھی تھیں۔ محفل جب رنگ پر آئی تو مخدوم اور شہاب غائب تھے اپنے ڈرائنگ روم میں گیا تو دیکھا دونوں حضرات باری باری دروازہ کی ایک دراز سے ہال کی خواتین اور لڑکیوں کو جھانک رہے ہیں اور ان پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ انہیں یہ پتہ نہ چلا کہ میں ان کے پیچھے کھڑا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ ایک دفعہ مخدوم نے جھانکا اور کہا "ارے ارے دیکھو ہرے دوپٹے والی کو" شہاب نے ہرے دوپٹے کو دیکھا اور کہا "ہاں واللہ خوب ہے"، مخدوم نے شہاب کو ہٹا کر دوبارہ دیکھا۔ اور اللہ اکبر کہہ کر سجدہ میں گر گیا۔ اس کے بعد شہاب نے دوبارہ دیکھا اور وہ بھی سجدہ ریز ہو گیا۔ دونوں باری باری ہرے دوپٹے والی کو دیکھتے اور سجدے میں گر پڑتے۔

مجھے ان دونوں پر بڑا پیار آیا اور ساتھ ہی اس ہرے دوپٹے والی کو دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ میں نے ان سے کہا کیوں جناب یہ کیا بدمعاشی ہے۔ مخدوم کہنے لگا "ارے بدنصیب آ تو بھی دیکھ" چنانچہ میں نے بھی دیکھا۔ اور اس کے بعد دونوں کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ جانتے ہو ہرے دوپٹے والی کون ہے؟ سور وہ حمیدہ ہے "حمیدہ"۔ حمیدہ کا نام سنکر مخدوم اور شہاب پھر ایک مرتبہ سجدے میں گر پڑے۔

میری شادی ہو جانے کے بعد میں نے یہ قصہ حمیدہ کو سنایا اور تاکید کی کہ مخدوم اور شہاب ملنے آئیں تو ان کی خوب خبر لینا اور ادھر ان دونوں کو خبردار کر دیا کہ وہ جواب دہی کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ مخدوم اور شہاب جب دنوں تک میرے گھر نہیں آئے مگر جب آئے اور بات چھڑی تو اُلٹا مجھے جھوٹا ثابت کر دیا۔

چائے کی نہیں، چائے خانہ کی عادت

نشر گاہ حیدرآباد کا دفتر پہلے یاور منزل خیریت آباد میں تھا جو دوستوں کی خیریت پوچھنے جگہ زیادہ تر ملاقی کی چائے پینے کے لیے دو چار احباب بلا تکلف نازل ہو جاتے۔ ہر دوست کو ملاقی لے جا کر چائے پلانا ہم ریڈیو والوں کا فرض منصبی تھا الغرض کہ تھے یہ لازم بھی کہ

سارے دوست چائے پیتے ہیں گے جن میں میر حسن، اشتفاق، مکیش مرحوم، عقیل احمد وغیرہ۔ بعض دن صبح سے شام تک بلاقی کے کم و بیش بیس پچیس پھیرے ہو جاتے۔ فضل الرحمن صاحب ناظم نشریات اور محبوب علی طاہر صاحب مہتمم نشرگاہ ہمیں طلب کرتے اور انہیں معلوم ہوتا کہ ہم لوگ بلاقی گئے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں چپ ہو جاتے کہ انہیں میر حسن کا یہ قصہ معلوم تھا میر حسن کی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اپنے گھر سے جامعہ آتے جاتے میر حسن کو اکثر چائے خانہ میں داخل ہوتے یا نکلتے دیکھتے تھے۔ ایک دن پوچھا "کیوں بھئی تمہیں چائے کی اتنی عادت کیوں ہے؟" میر حسن نے جواب دیا "چائے کی نہیں چائے خانہ کی عادت ہے۔"

چمارن کا دودھ

ایک دن مخدوم محی الدین صاحب نشرگاہ تشریف لائے اور ہم دیرینہ عادت کے تحت یا اپنا فرض سمجھتے ہوئے اٹھے اور چلے انہیں لے کر بلاقی کی طرف۔ بڑھے چپراسی تلجیا کو سختی سے مستقل حکم دے رکھا تھا کہ جب کوئی بلاقی کی طرف جائے تو وہ دوسروں کے کمروں میں جاکر اس کی اطلاع کر دے چپراسی اطلاع کیا کرتا، بس "بلاقی" کہتا ہوا گزر جاتا اور قوم سمجھ جاتی کہ کوئی مہمان نازل ہوا ہے۔ بلاقی جانا ہے۔

مخدوم محی الدین صاحب کی اس تشریف آوری کو میں دو واقعات کی وجہ سے ایک تاریخی دن قرار دینا چاہتا ہوں۔ ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہم نشرگاہ سے بلاقی جا رہے تھے۔ اور دوسرا واقعہ بلاقی سے نشرگاہ لوٹتے وقت ہوا۔

میں، مخدوم، میر حسن، اشتفاق اور مکیش بلاقی جا رہے تھے اور راستے میں مخدوم نے اچانک میری خاندانی اور ذاتی شرافت کا ذکر کر دیا۔ راستہ ہی میں میرا ماتھا ٹھنکا۔ چائے پیتے ہوئے جب میری سسرال کی تعریف شروع کی تو میں نے گفتگو کو مختصر کرنے کے لیے بڑی لجاجت سے اس توصیف کی وجہ تسمیہ دریافت کی۔ میرے سوال کا راست جواب دینے کی بجائے کہنے لگے "عابد روڈ پر باٹا کمپنی کے جو منیجر ہیں۔ تمہارے ماموں سسر جنہیں تم حاجی ماموں کہتے ہو ...... وہ بھی بڑے شریف آدمی ہیں" معاملہ میری سمجھ میں آگیا "اور میں نے کہا" اب آپ تعریف کرنے کی بجائے صاف صاف اپنا مدعا فرمائیے" کہنے لگے "آپ کے سر میں بھیجہ نہیں لکڑی کا برادہ بھرا ہوا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ باٹا کا جوتا خریدنا ہے اپنے حاجی ماموں کے نام چٹھی لکھ دو۔" میں نے ایک پرچی لکھ دی کہ میرے دوست مخدوم کو میرے حساب میں ایک جوتا خریدنے دے دیجیے۔

مخدوم نے چٹھی پڑھی اور کہا "باوجود اس تمام شرافت کے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے تم نے ایک آدھ مرتبہ کسی چمارن کا دودھ ضرور پیا ہے جب ہی تو چٹھی میں لکھا ہے کہ ایک جوتا خریدیں گے اگر ایک نہ لکھتے تو کیا میں پوری باٹا کمپنی اٹھا لاتا؟"

جوتے کا برش

میں نے اسی وقت دوسری چٹھی لکھ دی کہ مخدوم جو سامان خریدیں وہ میرے حساب میں دے دیا جائے۔ مجھے اپنا حشر معلوم تھا۔ موصوف نے میری اور میرے سسرال کی جی بھر کے تعریف کی تھی اس کے معاوضے کے طور پر جوتے، سلیپر، موزے، پالش کی ڈبیہ، جوتے صاف کرنے کا برش اور نہ جانے کیا کیا خرید کر دی

سابقہ پشتوں پر احسان عظیم فرمایا۔ اس غریبی کا ایک ہی حزنیہ پہلو تھا۔ وہ یہ کہ مخدوم نے نہ کبھی جوتوں پر پالش کیا ہوگا اور نہ جوتوں پر برش پھیرنے کی فرصت ملی ہوگی۔

اپنی نظروں میں آپ ذلیل

ملاقی سے نشرگاہ واپس ہوتے وقت جو دوسرا واقعہ پیش آیا پہلے اس کا پس منظر سن لیجئے۔

ایک روز سید اشفاق حسین میرے گھر آئے۔ میں شیو کر رہا تھا نوکر سے کہا اشفاق کو بیچ کے کمرے میں بٹھائے جہاں کمرے میں تخت پڑے تھے اور ہر دیوار سے لگی ہوئی قدآدم آئینہ کی دو دو تین تین الماریاں تھیں۔

اشفاق تخت پر بیٹھ گئے۔ الماری کے آئینہ میں اپنی صورت نظر آئی تو دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ مگر ادھر جو دیکھا تو اس آئینہ میں اپنی ہی شکل دکھائی دی۔ پھر گھوم گئے۔ مگر شمال جنوب، مشرق مغرب جدھر رخ کیا اپنا ہی عکس دیکھا۔ بہت غصہ آیا اور مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔ دوسرے روز ملاقات ہوئی اور میں نے چلے جانے کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے "تم کم ظرف ہو ہماری نظروں میں ہمیں ذلیل کرنے کے لیئے قدآدم آئینے رکھے۔ اور ہمیں مجبور کیا کہ یہاں بیٹھ کر دیکھو اپنی صورت"۔

یہ واقعہ میں نے مخدوم کو سنایا تو کہنے لگے "ہاں اشفاق بہت بدصورت ہے۔ افریقی النسل معلوم ہوتا ہے۔ میری طرح عرب نژاد نہیں ہے"۔ اشفاق نے جب عربوں سے مخدوم کے رشتے کا حال سنا تو کہا عرب تو خیر کیا باپ دادا گھوڑوں کے کسی عرب تاجر کے پاس سائیس ہوں گے۔ مخدوم کو بتایا کہ اشفاق نے انہیں سائیس کہا ہے تو کہنے لگے اشفاق کے دادا اصطبل میں جنبد تھے۔ اشفاق کو اپنے بدصورت ہونے کا اتنا ملال نہیں تھا جتنی اس بات کی خوشی تھی کہ مخدوم بھی خوبصورت نہیں ہے۔ احباب تاک میں رہتے کہ دونوں کی مڈبھیڑ کرا کے لطف حاصل کریں۔

ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ مخدوم محی الدین صاحب سیکریٹری ماموں سسر کے نام میرا خط حاصل کر کے ہمارے تھا بلاقی سے نشرگاہ واپس آرہے تھے کہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔ سامنے سے ایک کار آئی۔ بڑی، قیمتی اور نئے ماڈل کی۔ اس کار میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ حسین، جوان، بنی سنوری۔ اشفاق نے لڑکی کو دیکھا ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ دل پکڑ کر سڑک پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے۔ لڑکی نہ مخدوم کی محبوبہ تھی اور نہ اشفاق کی معشوقہ۔ اگر حق تھا تو دونوں کا حق تھا۔ دو نو ایک کا بھی نہ تھا۔

محبت کی چھاؤں

سنہ ۱۹۳۹ء میں میرے رومانی افسانوں کا مجموعہ "محبت کی چھاؤں" شائع ہوا۔ میں نے اس کے دیباچہ میں اعتراف کیا کہ مجموعہ کا نام اپنے ہمدم دیرینہ مخدوم کی نظم "محبت کی چھاؤں" سے متاثر ہو کر رکھا ہے۔ میں اس زمانے میں ایک عجیب سیلاب میں بہہ رہا تھا اور مخدوم کی اس نظم نے واقعی مجھ پر ایک کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ مخدوم کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا اور افسانہ نگار کے ایسے اعتراف پر اظہار مسرت نہ کرنا چاہتا تو صرف خاموشی اختیار کر لیتا۔ کتاب یا موضوع کی مذمت نہ کرتا۔ لیکن مخدوم کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف نہیں۔ عزیز کینی میں

میری ہی چائے پیتے ہوئے میرے افسانوں کے چیتھڑے بکھیر دیئے۔ میں نے قاضی عبدالغفار صاحب اور نیاز فتحپوری کے تبصروں کا رعب ڈالنا چاہا۔ اور سمجھایا کہ انہوں نے بھی تعریفیں کی ہیں مگر مخدوم مجھے بے نقط سناتا رہا کہ دنیا میں بس ان کا ایک موضوع رہ گیا تھا جس پر افسانے لکھے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مخدوم کی ایک آدھ رگ بے مروت اور بدلحاظ بھی ہے۔ وہ کسی سے بے جا سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ یہ اس کے کردار کی خوبی اور مضبوطی کی دلیل ہے۔

مخدوم نے رسی بانٹی

میں کبھی قید نہیں ہوا مگر ایک مرتبہ قید خانے جا چکا ہوں۔ میرا مکان چنچلگوڑہ میں سنٹرل جیل کے بالکل قریب تھا۔ تقسیم سے پہلے مخدوم جیل میں بند تھے اور میں نے ان سے ملنے کی طرح ڈالی۔ جیلر سے میرے چونکہ کم و بیش دوستانہ تھے۔ ان کے توسط سے میری اور جیلر کی اور جیلر کی مہربانی سے میری اور مخدوم کی ملاقات طے ہوئی۔ دفتر میں خان بہادر امانت اللہ خان صاحب بیٹھے تھے۔ میں پہنچا ادب سے سلام کیا اور اشارہ ملنے پر بیٹھ گیا۔ خواہش یہ تھی کہ مخدوم سے تخلیہ میں ملاقات ہو تا کہ جناب کی جائے حزم و ریاست جس میں جیل سے فراری کے انتظامات شامل تھے معلوم کر سکوں۔ ماحول کو سازگار بنانے کے لیے میں نے ریڈیو والوں کا شہرہ آفاق حربہ استعمال کیا۔ اور کہا "خان بہادر صاحب آپ نشرگاہ سے تقریر نشر کریں۔ بہ حیثیت مہتمم جیل آپ کی بڑی شہرت ہے۔ سامعین کی اس سے بڑھ کر خوش بختی کیا ہوگی کہ آپ کی آواز اور گراں قدر خیالات سن سکیں" میری تقریر جاری تھی اور خان بہادر صاحب خاموش بیٹھے تھے کبھی کبھار گردن ہلا کر یا ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے اور بس اتنے میں ایک چپراسی آیا۔ خان بہادر صاحب نے اسے اشارہ کیا وہ چلا گیا اور وہ ایک منٹ میں مخدوم کو لے آیا۔ ابھی مخدوم سے سلام علیک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جیلر صاحب کی زبان سے ایک جملہ کئی قسطوں میں ادا ہوا۔ وہ ہر دو منٹ سے تیسرے لفظ پر ہکلاتے رہے۔ میں مخدوم کو بھول گیا اور یہ سوچنے لگا کہ اگر خان بہادر صاحب میری دعوت نشر قبول کر لیتے تو میں اپنے افسروں کو کیا جواب دیتا کہ مائکروفون کے لیے کس مقرر کو پکڑ لایا ہوں۔

جب ذرا جان میں جان آئی تو مخدوم سے بات شروع کی۔ انہیں کچھ کاغذات پنسل قلم بلیڈ وغیرہ کی ضرورت تھی سوائے بلیڈ کے تمام سامان بھیجنے کی اجازت مل گئی۔ بلیڈ میں بھی کوئی حرج نہ تھا کیونکہ قتل اور خودکشی مخدوم کے بس کا روگ نہیں۔ میری شامت آئی تو قیدی سے پوچھ ڈالا فرصت کا وقت کس طرح گزرتا ہے؟ جیلر صاحب کی موجودگی میں فرمانے لگے "ہمیں پالک غرض وغیرہ کے نام سے جو ساگ دیا جاتا ہے وہ انسانوں کے تو کیا جانوروں کے کھانے کے لائق نہیں ہوتا اس لیے دن بھر اس کی رسی بانٹا رہتا ہوں۔ خان بہادر صاحب کا منہ لال ہو گیا۔ قبل اس کے کہ قید خانے کے لیے کوئی تحریر ہوتی یا مخدوم مزید زبان درازی کرتا میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ مخدوم کی جبلت جیل میں بھی اس کے ساتھ رہی۔

تین نظمیں تیس سال

میں کامل اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مخدوم برصغیر کا واحد شاعر ہے جس کا کلام بڑے بڑے جلسوں جلوسوں تقریبوں اور محفلوں میں پچھلے تیس سال کے تین مختلف ادوار دوسری جنگ عظیم سے پہلے جنگ کے زمانے میں آزادی کے بعد سے آج تک۔ انفرادی طور پر، کورس اور قوالی کی صورت میں سیکڑوں ہزاروں بار گایا گیا۔ حیدرآباد اور اس کے اضلاع کی بے شمار تقریبات میں مخدوم کی طالب علمی کی نظم پیلا دوشالہ ذوق و شوق سے سنی جاتی

پہلے دو شالہ کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی ایک مثال کافی ہے کہ گزشتہ کے زلزلہ زدگان کی امداد میں طلبائے جامعہ عثمانیہ نے پیرا اور مخدوم کا ایک ایک ڈرامہ اسٹیج کیا جسے دیکھنے کے لیے نظام دکن، اعظم جاہ، معظم جاہ، مہاراجہ کشن پرشاد اور سر اکبر حیدری بھی آئے۔ اسی محفل میں نظم پیلا دوشالہ قوالی کے روپ میں پیش کی گئی۔ واضح رہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب مجال نہ تھی کہ نظام کی موجودگی میں کسی اور شاعر کا کلام سنانے کی اجازت دی جاتی۔ قوالی ہوئی۔ بڑے ٹھاٹھ سے ہوئی اور خود نظام نے نظم کے فارسی شعر کی نہ صرف بے ساختہ داد دی بلکہ پاس بیٹھے ہوئے انگریز ریذیڈنٹ کو اس کا ترجمہ کر کے سنایا۔ نہ پیلا دوشالہ کوئی ادب پارہ ہے نہ نظام کا اظہار تحسین شعری تنقید کا کوئی خاص پیمانہ۔ اس کے باوجود جو ہوا اس سے شاعر کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں مخدوم نے "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" لکھی جس کی مقبولیت کی تفصیل سبط حسن نے خطوں میں درج کی ہے۔ جو سرخ سویرا کے تعارف کے طور پر شائع ہو چکا ہے۔ اس دور میں انگریز نے بڑے بڑے شاعروں کو ریڈیو اور فوج میں ملازم رکھا تھا۔ کیا کسی کا کلام ہمر نگیر سے راس کماری تک پبلک جلسوں اور جلوسوں میں گایا گیا؟ ہزاروں نے جنگ آزادی سن کر سر دھنا مگر کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔

کئی سال قبل مخدوم کا ایک ترانہ مقبول ہوا اور اتنا مقبول ہوا کہ مخدوم سے زیادہ معروف اور ہم اس کے ہم عصر مجاز نے خفیف سی تبدیلی کر کے اسے اپنا ترانہ کہہ دیا۔ میں اس معصوم چوری کو جو مجاز نے اپنی بیماری کے زمانے میں کی مخدوم کی بارگاہ میں مجاز کا نذرانہ عقیدت قرار دیتا ہوں۔

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے

گھر میں میرے بچے شاہین اور جاوید نے بارہا مخدوم کا ذکر سنا تھا۔ ایک دن دونوں ریڈیو سیلون سن رہے تھے۔ بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور مجھے بھی ریڈیو کے کمرے میں لے گئے اور کہا سنئے اپنے دوست مخدوم کے لکھے ہوئے گانے، "ایک چنبیلی کے منڈوے تلے" کا ریکارڈ۔ میں یہ ریکارڈ اب تک سینکڑوں مرتبہ ریڈیو پر سن چکا ہوں۔ اور مجھے دوستوں نے بتایا ہے کہ چنبیلی کے منڈوے تلے پانچ پانچ سات سات ہزار کے مجمع میں حاضرین کی فرمائش پر بار بار گوایا گیا ہے۔ اور بھی بہت سے فلمی گانے ہیں اور یہ با اعتبار نظم اس سے بہتر مگر جو عوامی مقبولیت اس نظم کو نصیب ہوئی کسی دوسری نظم کے حصے میں غالباً نہیں آئی۔

میں نے پیلا دوشالہ، جنگ آزادی اور چنبیلی کے منڈوے تلے کی ادبی قدر و قیمت کا نہیں بلکہ ان کی عرصۂ مسلسل تک مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی بدولت "راوی کے اس پار بھجوا" اور "میرا سلام لیجا" بے حد مشہور ہوئے مگر ان کی مقبولیت کی عمر چار پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ قبولیت عام اور عرصۂ مسلسل کے باب میں مجھے نہ مخدوم سے پہلے کسی شاعر کا نام ملا اور نہ مخدوم کے بعد۔ میرے اس دعوے کو جذبۂ دوستی نہ سمجھا جائے۔ اگر یہ غلط ثابت ہو گیا تو میں اپنے الفاظ واپس لے لوں گا۔

فلمی دنیا میں ایک سے ایک بڑا شاعر ہے اور بڑے بڑوں نے بھی فلمی گانے لکھے ہیں مگر ان میں ایسا نہیں جو کسی فلمی گانے کو ادب یا دیگر صاحبان علم کی محفل میں سنانے کی جرأت کر سکے مگر چنبیلی کے منڈوے تلے کا خالق یہ کر چکا ہے۔ اسی طرح

کسی چھوٹے یا بڑے شاعر کی ایک بھی نظم ایسی نہیں ہے جو پہلے ادب کی محفل میں پڑھی اور پسند کی گئی ہو اور بعدہ فلمی دنیا کی ٹوک بھی ہو۔ یہ امتیاز صرف مخدوم کی نظموں کو حاصل ہے۔

شامِ فراق

اتنا کچھ لکھ دینے کے بعد بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مخدوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں شاعر یا شعر کا نقاد ہوتا تب بھی اس مضمون میں جس کا مقصد اپنی اور مخدوم کی ملاقاتوں کے تاثرات بیان کرنا ہے۔ مخدوم کے کلام پر تبصرہ نہ کر پاتا۔ میں ڈرامہ نگار ہوں مگر مخدوم کے پھول بن اور ہوش کے ناخن پر کوئی بحث نہ کر سکا۔ اداکار ہوں مگر مخدوم کی اداکاری کا تذکرہ نہ کر سکا۔ مقرر ہوں مگر مخدوم کی تقریری صلاحیتوں کا ذکر نہ کر سکا۔ مخدوم کی شخصیت ہمہ پہلو ہے اور میں اس کے کسی ایک پہلو کو بھی اجاگر نہ کر سکا۔

سوچتا ہوں پھر یہ جو لکھا ہے کیا ہے؟

شائد تالیف نسخہ ہائے وفا کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے دوستو

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

شاعروں
سخن وروں
ادیبوں
دانش وروں
اور سب کا پسندیدہ
گولکنڈہ سگریٹ

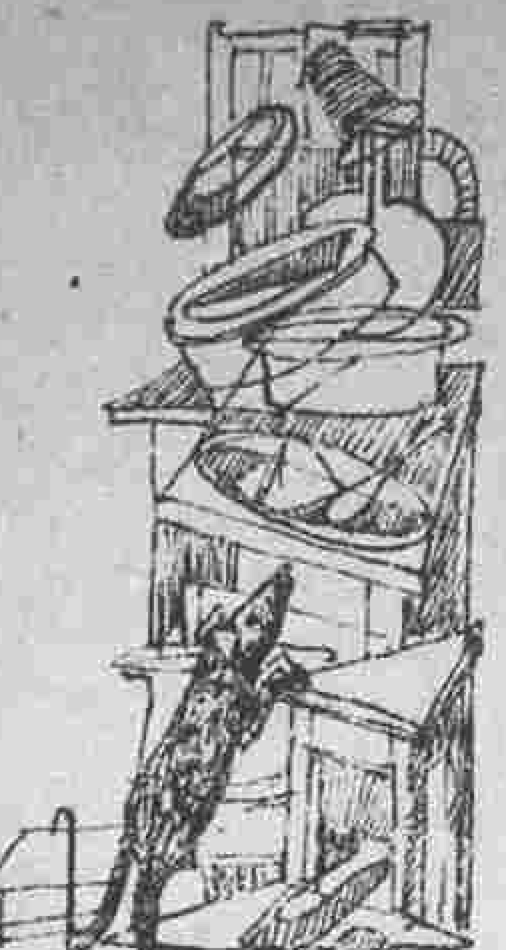

مخدوم

اقامت خانے میں

یحییٰ صدیقی

● سنہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے میں ایف اے کے آخری سال میں زیر تعلیم تھا۔ اور میرا قیام فرحت منزل میں تھا۔ اقامت خانہ کی انجمن نے اس سال اورنگ آباد جانے کا پروگرام بنایا تھا اور نہ صرف روانگی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی بلکہ سفر کے سارے انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے۔

روانگی سے دو دن پہلے دو ایسے حضرات جن کا قیام اقامت خانہ میں نہیں تھا انجمن کے صدر غلام محافظ خاں سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ اورنگ آباد کے سفر میں ان کو بھی شریک کر لیا جائے۔ غلام محافظ خاں کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن بعض اراکین کی مخالفت کی وجہ سے ان کو انکار کرنا پڑا۔

ان دونوں میں سے ایک کی شخصیت بڑی پرکشش تھی۔ اکہرے بدن، میانہ قد، سانولے سلونے رنگ، تیکھے خطوط، روشن آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں والا یہ اجنبی مجھے بہت پسند آیا۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ اس کا نام مخدوم ہے۔

مخدوم کی شخصیت کی طرح اس کی باتوں میں بھی بڑی کشش تھی۔ میں نے سوچا کہ مخدوم اگر اس سفر میں ساتھ رہا تو تفریح کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ اس لیے میں نے مخالف اراکین کو راضی کرنے کی کوشش کی مگر ان کو بھی جیسے ضد ہو گئی تھی۔

مخدوم اور اکبر اراکین کے اس طرز عمل سے ذرا بھی کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور کہا کہ چونکہ وہ بھی اورنگ آباد جانے کا فیصلہ کر چکے تھے اس لیے وہ پارٹی کے ساتھ ہی چلیں گے مگر اپنا انتظام علیحدہ رکھیں گے۔

اسٹیشن پر غلام محافظ خاں نے ان کے لیے رعایتی ٹکٹ خریدنے کی پیش کش کی مگر دونوں نے یہ کہہ کر کہ وہ اپنے ٹکٹ خرید چکے ہیں، شکریہ کے ساتھ ان کی پیش کش کو رد کر دیا۔

سفر کے دوران رات کے وقت ٹی، ٹی، ای نے

ٹکٹ چیک کرنا شروع کیا۔ جب مخدوم سے اس کا ٹکٹ مانگا تو مخدوم نے کہا کہ ٹکٹ تو صدر صاحب کے پاس ہے۔ ٹی ٹی ای نے جواب دیا کہ وہ صدر صاحب کے ٹکٹ چیک کر چکا ہے اور طالب علموں کی گنتی بھی کر چکا ہے، ایک طالب علم بغیر ٹکٹ کے ہے۔ مخدوم نے کہا یہ کیسے ممکن تھا کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی اور ٹی ٹی ای کو لے کر صدر صاحب کی تلاش میں نکلا دونوں ہر ڈبہ میں جاتے، سوئے ہوئے طالب علموں کو جگاتے اور ان سے دریافت کرتے کہ صدر صاحب کونسے ڈبہ میں ہیں۔ خود غلام حافظ خاں کو ہوشیار کر کے ان سے بھی یہی سوال کیا گیا۔

دونوں نے پوری ٹرین کے کئی چکر لگا ڈالے مگر صدر صاحب نہیں ملے۔

ٹی۔ ٹی۔ ای سمجھ گیا کہ مخدوم بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے مگر آدمی خوش مذاق تھا بجائے مخدوم پر بگڑنے کے وہ لطف لیتا رہا اور اپنی مدود کے اختتام پر جب گاڑی سے اترا تو اس نے مخدوم پر یہ بات واضح کر دی کہ وہ اس کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور وہ محض اس لیے اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کر رہا ہے تھا کہ بڑے خوبصورت انداز میں چلانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اورنگ آباد پہنچنے تک مخدوم کو اس کی دلچسپ گفتگو پسندیدہ شخصیت اور حسن اخلاق کی وجہ سے ہر ایک پسند کرنے لگا تھا اور جن اراکین نے اس کو اپنے ساتھ رکھنے پر اعتراض کیا تھا وہ اپنے طرز عمل پر شرمندہ تھے۔

اورنگ آباد اسٹیشن پر گاڑی رکنے سے پہلے ہی مخدوم پلیٹ فارم پر کود گیا ہانپتا کانپتا گیٹ پر پہنچا اور بڑے گھبرائے ہوئے لہجہ میں گیٹ کیپر سے کہا کہ جامعہ عثمانیہ کے کچھ طالب علم آئے ہیں مگر اس نے ان کے لیے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ گیٹ کیپر نے اس کو باہر جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ سواری کا انتظام کر سکے۔

مخدوم تیزی سے باہر نکل گیا تھوڑی دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا پھر بڑے وقار سے پلیٹ فارم پر آ کر ہم لوگوں کا استقبال کرنے لگا۔

جو طالب علم اس استقبال کے پس منظر سے واقف نہیں تھے وہ حیران تھے اور جو واقف تھے وہ لطف لے رہے تھے۔

اس سفر میں ہمارے ساتھ ایک صاحب ایسے بھی تھے جو چوری کا کرنے کے عادی تھے مخدوم بھی ان کا شکار ہوتے ہوتے بچا۔

اورنگ آباد میں قیام کی دوسری رات کو جب ہم سب لوگ سو رہے تھے ان صاحب نے مخدوم کے تکیے کے نیچے سے اس کا پیسہ نکال لیا اور پیشاب کے بہانے سے بستر سے اٹھ کر چلے گئے۔ مخدوم کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے اکبر کو بیدار کر کے اس حادثہ کی اطلاع دی اکبر نے مشورہ دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو پرس اسی وقت حاصل کر لو ورنہ بعد کو ملنا ناممکن ہو جائے گا۔ مخدوم کے ذہین دماغ نے فوراً ایک ترکیب سوچ لی اور جیسے ہی وہ صاحب واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹے مخدوم نے کہا "ٹھاٹو یار سمجھ گیا؟"

وہ صاحب سمجھ گئے کہ راز فاش ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا، "اچھا آپ جاگ رہے تھے" میں تو مذاق کر رہا تھا"۔ کہتے ہوئے پیسہ واپس کر دیا۔

اورنگ آباد کے قیام کے زمانے میں کبھی کبھی ہم لوگ ایک ہوٹل میں چائے پینے چلے جاتے تھے۔ ہوٹل سڑک کی سطح سے کوئی تین فٹ نیچے تھا۔ مرکزی کمرے میں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی تہ خانے میں آ گئے ہیں۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا، نمی کے اثرات لیے ہوئے عجیب قسم کی بو ہر طرف پھیلی ہوئی۔ اس کی وجہ سے ہوٹل کا ماحول بڑا پُر اسرار ہو گیا تھا اور شاید اسی وجہ سے مخدوم نے اس کا نام بغداد شریف رکھ دیا۔

تفریحی سفر سے واپسی کے بعد مخدوم سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اس لیے کہ ہم دونوں کو اسکاؤٹنگ سے دلچسپی تھی اور دونوں ایک ہی ٹروپ کے رکن تھے۔

علی مہدی رضا صاحب ڈپٹی کمشنر بوائے اسکاؤٹس کو اسکاؤٹنگ سے عشق تھا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو، اسی لیے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود انھوں نے اپنا بھی ایک روورس ٹروپ قائم کر رکھا تھا۔ زیادہ تر کالج کے طالب علم اس ٹروپ میں شامل تھے۔ ہفتہ میں دو بار بوائے اسکاؤٹس ہیڈکوارٹرس میں اس ٹروپ کا اجتماع ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ہم لوگ ہائکنگ (HIKING) کو بھی چلے جاتے تھے۔

جب نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو مخدوم نے بی اے میں داخلہ لے لیا لیکن چونکہ ہمارے مضامین الگ الگ تھے اس لیے صرف انگریزی کی کلاس میں ملاقات ہوتی تھی۔

بی اے کے آخری سال میں وہ فرحت منزل میں رہنے لگا۔ اقامت خانہ میں اس کی حیثیت جونیر کی تھی لیکن چند ہی دنوں میں وہ سینیر گروپ کا سرگرم رکن بن گیا۔ چنانچہ نئے آنے والوں کو برادری میں شامل کرنے کی تقریب کے سلسلہ میں جب ایک نووارد کا بورا بستر چھپا دیا گیا تو اس نے بڑے دکھی لہجہ میں کہا کہ اسے بستر کا کوئی غم نہیں تھا البتہ اس میں ایک دوشالہ تھا وہ اگر اس کو مل جاتا تو باقی بستر سے دستبردار ہونے کو تیار تھا۔ یار لوگوں کو شغل ہاتھ آ گیا اور اس دوشالہ کی یاد میں مجلسیں برپا کی گئیں، تعزیتی قراردادیں پاس کی ہوئیں اور مخدوم نے مرثیہ کہا جس کو بیلا دوشالہ کے نام سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مرثیہ کے بعد ہی مخدوم اور ان کے احباب پر مخدوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کا انکشاف ہوا کچھ ہی دنوں بعد مخدوم نے اپنی پہلی غزل احباب کو سنا کر بے پناہ داد حاصل کی۔

یہی کا زمانہ تھا جب تعلیمی اداروں میں اردو تعمیر کا چرچا بھی کچھ زیادہ ہی ہونے لگا۔ مقیمین فرحت منزل نے بھی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا لکھا ہوا مزاحیہ ڈرامہ ہنرا ڈیبیشن کیا۔ اس ڈرامہ میں میں نے نواب کا، مرزا ظفر الحسن نے نواب بیگم کا، مخدوم نے ملازم کا اور نقی علی نے عامل کا کردار پیش کیا تھا۔

یہ ڈرامہ مخدوم کی بے ساختہ اداکاری کی وجہ سے ہماری توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ مخدوم کا اسٹیج پر آنے کا یہ پہلا موقع تھا لیکن جس فنکارانہ طریقہ پر اس نے اپنے مزاحیہ کردار کو پیش کیا اسی کی وجہ سے وہ پہلی پیش کش کے بعد ہی صف اول کے شوقین اداکاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

اس ڈرامے کی پیش کش کے ساتھ ہی انفرنو کی بھی داغ بیل پڑی جس کے ابتدائی دور کے اراکین مخدوم، میر حسن، نور الہدیٰ، ظفر، رفیق، شہاب، جمیل، علی احمد اور میں تھے۔ بعد میں اراکین کی تعداد آہستہ آہستہ بڑھتی رہی اور دو سال بعد ۱۹۳۳ء میں یہ جامعہ کی سب سے ممتاز جماعت بن گئی۔

ہم لوگ چائے خانوں میں بیٹھ کر ادبی، سماجی، ثقافتی اور فلمی موضوعات پر گھنٹوں گفتگو کرتے، سینما دیکھتے، مختلف قسم کی بے ضرر شرارتیں کرتے، زیادہ کھیلتے اور کم پڑھتے جس کی وجہ سے اکثر اپنے ہم عصروں کے ہدف ملامت بنے رہتے۔

ایک مرتبہ پروفیسر محی الدین قادری زور صاحب نے میر حسن سے کہا تھا "سنا ہے آپ لوگ چائے کے بہت شوقین ہیں، صبح سے شام تک چائے پیتے رہتے ہیں"۔ اور میر حسن نے جواب دیا تھا "ہم لوگ چائے کے شوقین نہیں بلکہ چائے خانہ کے شوقین ہیں"۔ اور یہ بات بڑی حد تک صحیح تھی۔

اس سال علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم حیدر آباد آئی۔ زاہد سعید لودھی اس کے کپتان تھے، میجر وزیر علی اور لالہ امرناتھ بھی ٹیم میں شامل تھے۔ ان کو فرحت منزل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ تعارفی تقریب میں مخدوم نے پیلا دوشالہ سنایا، میجر وزیر علی نے اس کی دھن ماؤتھ آرگن پر سنائی۔ پھر تو روز شام کو جمگھٹا ہونے لگا۔ میجر وزیر علی آپ بیتیاں سناتے۔ مخدوم خود ساختہ لطیفوں سے سب کی تواضع کرتا۔ مخدوم گیت سناتا، میجر وزیر علی ماؤتھ آرگن بجاتے۔ جب وہ لوگ رخصت ہونے لگے تو انھوں نے مخدوم کا بطور خاص شکریہ ادا کیا۔

امتحانات کے قریب ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کی وجہ سے ہم سب کو بڑا صدمہ پہنچا۔ ہوا یوں کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کو جو لازمی دینیات کا درس دیا کرتے تھے کوئی دوسرا مضمون دے دیا گیا اور ان کی جگہ ایک اور مولانا دینیات لازمی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ بعض طالب علم جن میں مخدوم بھی شامل تھا ان سے الٹے سیدھے سوالات کرتے۔ مولانا جواب دینے کی بجائے جھنجلانے لگتے۔ طالب علم ان کی اس بے بسی سے لطف اٹھاتے۔ آخر کار مولانا نے نہ صرف ان طالب علموں سے انتقام لے لیا بلکہ دو تین بے گناہوں کو بھی لپیٹ لیا۔ انھوں نے اپنے خیال کے مطابق شریر طالب علموں کو منتخب کر کے ان کی حاضری ساٹھ فیصد سے کم کر دی، چوں کہ امتحان میں شرکت کے لیے ساٹھ فیصد حاضری ضروری تھی اس لیے بشمول مخدوم آٹھ طالب علموں کو امتحان میں شریک ہونے سے روک دیا گیا۔ مجھے اس وجہ سے زیادہ دکھ تھا کہ مولانا نے مذہبی پیشوا ہونے کے باوجود اول تو انتقام لیا تھا دوسرے اس کے لیے بہت ہی ذلیل طریقہ اختیار کیا تھا۔ آٹھوں طالب علموں نے اجتماعی اور انفرادی طور پر ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر ان کو امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں ملی اور ان کا ایک سال استاد کی کینہ پروری کی نذر ہو گیا۔

اس غیر متوقع حادثہ پر مخدوم نے حیرت انگیز صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ کسی کسی وقت اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی تھی جس سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کبھی وہ سارے دن کی تگ و دو کے بعد بڑا پُر امید لوٹتا، غسل کرتا اور تازہ دم ہو کر سب کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتا کسی دن مایوس لوٹتا تو کتابیں پٹخ دیتا، بلگرامی صاحب کی شان میں ایک قصیدہ عرض کرتا اور گنگناتا ہوا اقامت خانہ سے چلا جاتا، اس پریشانی کی حالت میں بھی اس کو یہ خیال رہتا تھا کہ دوسروں کی پڑھائی میں حرج نہ ہو۔

۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ کی کچھ عارضی اور کچھ مستقل عمارتیں تیار ہو گئی تھیں نئے تعلیمی آغاز کے کچھ دنوں بعد جامعہ اور اقامت خانہ جات کو عمارتوں میں منتقل کر دیا گیا۔

شہر میں جامعہ کے چار اقامت خانے نظامت منزل، فرحت منزل، مسرت منزل، اور ہندو ہاسٹل تھے، عارضی اقامت خانہ میں بھی چاروں بلاک برقرار رکھے گئے اور ایک نئے بلاک کا اضافہ کیا گیا جو نظامت منزل کا توسیع شدہ بلاک تھا۔

مخدوم نے ایم اے میں داخلہ لیا تھا، میر حسن اور میں ایم اے کے آخری سال میں تھے۔ ہم تینوں کو نظامت منزل کا کمرہ نمبر (۱۱) رہائش کے لیے ملا ہوا تھا۔ ہم تینوں کے علاوہ پارٹی کے بعض اور افراد بھی اقامت خانہ میں مقیم تھے۔ علی احمد شہریار، سکاؤٹس جی اور ظفر نظامت منزل بلاک میں تھے، شہاب اور رفیق فرحت منزل بلاک میں رہتے تھے۔ پارٹی کے جو اراکین اقامت خانہ میں نہیں رہتے تھے وہ بھی کلاس ختم ہونے کے بعد آجاتے۔ بالخصوص جمیل، نور الہدیٰ اور نذر محمد خاں زیادہ وقت اقامت خانہ میں گزارتے۔ اجتماع عام طور پر ہمارے کمرہ میں ہوتا اور وہ دھما چوکڑی مچتی کہ خدا کی پناہ۔

ہم لوگ بڑی بے اصولی زندگی گزارتے تھے، نہ پڑھنے کا کوئی وقت معین تھا نہ کھیلنے کا نہ ہاسٹل کے کھانے کا کچھ ٹھیک تھا نہ سونے کا، نہ تو ہم اقامت خانہ کے اصول و قواعد کے سختی سے پابند تھے نہ بالکل ہی بے لگام تھے ہمارے بے اصولی پن میں بھی ایک اصول تھا۔ مخدوم اور میر حسن بالالتزام سگریٹ کی راکھ ہر طرف پھیلاتے اور اس کے ٹکڑے سارے کمرہ میں پھینکتے اور دونوں کی میز پر رکھے ہوئے ایش ٹرے حسرت سے ان کا منہ تکا کرتے دونوں اپنی کتابیں پلنگ، کرسی اور فرش پر بکھیر کر رکھتے ان کی میزیں ویران پڑی رہتیں میر حسن کے پلنگ کے سرہانے میلے پاجاموں کا ڈھیر لگا رہتا، اس کا کہنا تھا کہ کرتا تو شیروانی کے نیچے رہتا ہے روز روز بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ احباب کمرہ میں جمع ہوتے سگریٹ پیتے زور زور سے بحث کرتے اور میں چونکہ سیول سرویس کے مقابلہ کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے اس سارے ہنگامے سے بے نیاز پلنگ پر لیٹا کتاب کے مطالعہ میں معروف رہتا۔ اچانک کمرہ میں جیسے زلزلہ آجاتا میں سمجھ جاتا کہ اب چائے پینے کا پروگرام ہے۔

اطمینان کا سانس لیتا کہ کچھ دیر سکون سے پڑھنا نصیب ہوگا لیکن کمرہ کی حالت دیکھ کر طبیعت الجھنے لگتی،

اٹھتا، مخدوم اور میر حسن کے بستر ٹھیک کرتا سگریٹ کے ٹکڑے سمیٹ کر باہر پھینکتا. کتابیں ترتیب سے میزوں پر جما؟ اور چائے خانہ کی کشش سے مجبور ہو کر ماسٹر کے چائے خانہ پہنچ جاتا جہاں بقول ماسٹر دی کاسٹا (دی کاکشن) میں ذرا سی کسر ہوتی، ہم لوگ لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے، ڈٹ کر قرض کی چائے پیتے اور گولڈ فلیس (گولڈ فلیک) کے کش اڑاتے جب ادھ ہو کے تھک جاتے تو تازہ دم ہونے کے لیے کچھ پڑھ بھی لیتے. میں ادبیات، سیاسیات اور معاشیات کا مطالعہ کرتا. میر حسن اپنے مقالہ "مغربی تصانیف کے اردو تراجم" کے لیے مواد جمع کرتا اور مخدوم درسی کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا. ہم سب کا حال یہ تھا جیسے جامعہ پر، استادوں پر اور کتابوں پر احسان کر رہے ہوں.

میں نے ابھی تک آپ کو شاید یہ نہیں بتایا کہ کبھی کبھی مخدوم ہم سب سے کٹ کر مزدوروں کے کیمپوں کی طرف چلا جاتا اور ان کے مسائل کے بارے میں ان سے بات چیت کرتا. اس میں اس کی صلاحیت تھی کہ وہ محنت کش طبقے کو اپنے سے مانوس کر لے اور بڑے بے تکلف انداز میں ان سے ان کے گھریلو مسائل پر گفتگو کرے. پہلی مرتبہ اس کا تجربہ مجھے میسور میں ہوا تھا.

مخدوم اور میں اپنے ٹروپ کے ساتھ کل ریاستی اسکاؤٹس جمبوری میں شرکت کے لیے ریاست میسور گئے. پروگرام اس طرح بنایا گیا تھا کہ جمبوری میں شرکت بھی ہو جائے اور ریاست کے قابل دید مقامات بھی دیکھ لیے جائیں.

ہم لوگ شہر میسور میں ٹھہرے ہوئے تھے، مخدوم قیام گاہ سے تھوڑے فاصلے پر لگے ہوئے نل پر نہانے چلا گیا. تھوڑی دیر بعد میں اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نل پر کئی مرد اور عورتیں جمع ہیں. مخدوم نل کے نیچے بیٹھا ہوا ہے، دو ہم عورتیں اس کی پیٹھ مل رہی ہیں اور وہ بڑی بے تکلفی سے سب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے.

اس سفر میں ہم نے بنگلور، سرنگاپٹم اور کولار کا دورہ کیا اور سب سے آخر میں ہاسن گئے جہاں جمبوری کا اجتماع ہونے والا تھا. ہاسن کافی کی کاشت کے لیے مشہور ہے. وہاں بارش کا کوئی خاص موسم نہیں ہے بلکہ بارہ مہینے بارش ہوتی رہتی ہے. جمبوری کے دنوں میں بھی بارش کا سلسلہ جاری رہا.

ہم لوگ کیمپ میں ٹھہرے ہوئے تھے. ہم کو دو خیمے دیے گئے تھے. ایک نسبتاً بڑا دوہرے پرت والا رہائش کے لیے تھا اور دوسرا چھوٹا اکہرے پرت والا سامان رکھنے کے لیے. سامان کی حفاظت کے لیے ہر رات دو اسکاؤٹوں کی ڈیوٹی لگتی تھی. ایک رات مخدوم اور میں ڈیوٹی پر تھے. اچانک بارش ہوگئی اور تھوڑی سی دیر میں خیمے کے اندر بھی اتنا ہی پانی تھا جتنا باہر. ہم دونوں نے خیمے کے اندر سامان اس ترتیب سے رکھا کہ بارش کا کم سے کم اثر اس پر پڑے، اور خود ایک بلانکٹ اوڑھ کر ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹ دی. صبح کو برستے پانی میں منہ ہاتھ دھویا، اپنے ساتھیوں کے لیے بالٹیوں میں پانی بھرا. اس کے بعد دن بھر کے پروگرام میں سب کے ساتھ شریک رہے. اس دن پہلی مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ مخدوم کے کمزور جسم میں کتنی طاقت ہے اور وہ برداشت کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے.

ہمارے ٹروپ نے ابتدائی طبی امداد کے مقابلہ میں بھی حصہ لیا. مخدوم اور میں ٹیم میں شامل تھے. ہم کو اپنی صلاحیتوں

بڑا ناز تھا۔ حیدرآباد کی کوئی ٹیم ہمارے مقابلہ میں نہیں ٹھہرتی تھی اس لیے ہم کو اعتماد تھا کہ ہم مقابلہ جیت کر طلائی کپ حاصل کرلیں گے لیکن ہم چوتھی پوزیشن حاصل کرسکے مقابلہ کے بعد منصفین سے جب غیر رسمی بات چیت ہوئی تو انھوں نے ہماری تعریف کی اور کہا کہ آپ لوگوں میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ آپ نے کسی سوال کا جواب کتاب کی ترتیب کے مطابق نہیں دیا، ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو کتاب لفظ بہ لفظ یاد نہیں تھی۔ اس مقابلہ کے بعد ہم کو پتہ چلا کہ کبھی کبھی سمجھ کر پڑھنا قابل اعتراض اور رٹنا پسندیدہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے عادات و اطوار اور اس کی افتادِ طبع کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو اس کے ساتھ سفر کرو۔ مخدوم کے ساتھ یہ تجربہ بھی ہوگیا میں نے اس کو سفر کے دوران بھی مخلص دوست، ہمدرد ساتھی اور اچھا رفیق پایا۔ وہ ہر جگہ، ہر حال میں خود بھی خوش رہتا اور دوسروں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔

۱۹۳۶ء میں مخدوم ایم اے کر کے سٹی کالج میں استاد ہوگیا لیکن کچھ دنوں بعد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے کر اشتراکی تحریک سے وابستہ ہوگیا۔ ایک مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران اس نے کہا "میرا ارادہ نوکری کرنے کا کبھی بھی نہیں تھا میں نے محض اس لیے نوکری کی تھی کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مخدوم اچھی نوکری نہ ملنے کی وجہ سے اشتراکی ہوگیا۔ میں اس تحریک سے اس لیے وابستہ ہوا ہوں کہ میرے خیال میں انسانیت کی نجات اسی میں ہے"۔

عملی زندگی میں ہمارا راستے الگ الگ ہوگئے، ہم دو مخالف سمتوں میں چلنے لگے۔ مخدوم اشتراکیت کا علمبردار تھا اور میں بحیثیت پولیس افسر اس تحریک کو کچلنے میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ عقائد کے اس اختلاف کے باوجود میں مخدوم کے خلوص مقصد، تحریک سے اس کی لگن محنت کش طبقے کی فلاح کے لیے اس کی انتھک کوششوں کا معترف رہا۔ سنہ ۱۹۲۳ء کی ملاقات جو ماہ و سال کی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک پائیدار اور مستحکم دوستی میں بدل چکی تھی۔ ایسی دوستی جس میں سوائے خلوص کے کچھ نہیں تھا ناسازگار حالات میں بھی باقی رہی۔

جب کبھی مخدوم کو گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی اور میرا بھی شہر کا چکر ہوتا تو اس سے ملاقات ضرور ہوتی ایسی ہی ایک ملاقات میں میں نے اس کی ایک تقریر کا ذکر کیا جس میں اس نے پولیس والوں کو لتاڑا تھا۔

کہنے لگا میں نے اس تقریر میں ایک بات بھی جھوٹ نہیں کہی یہ الگ بات ہے کہ تم پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا اس لیے کہ تم پولیس والے کہاں ہو، اگر سب پولیس والے تمھاری طرح ہو جائیں تو ریاست میں اشتراکی تحریک کی ضرورت باقی نہ رہے۔

معلوم نہیں یہ اس کی مخلصانہ رائے تھی یا اس نے ایک پرانے ساتھی اور دوست کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ دی تھی۔

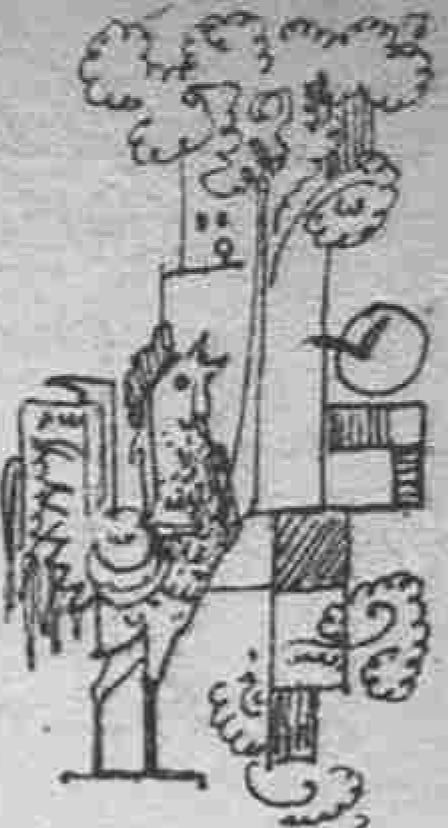

مخدوم — ایک آواز

اکبر وفاقانی

آپ کا عنایت نامہ بہت تاخیر سے مجھے ایک ہفتہ قبل ملا۔ اس کے کچھ دنوں پہلے شاذ الحسن نے مجھے آپ کی فرمائش کا حال تلایا تھا اور میں نے اکبر سے بھی کہہ دیا تھا۔ اکبر کو تو ابھی تک آپ کا خط بھی نہیں ملا۔ میں چاہتا تھا کہ اکبر کو مخدوم کے متعلق لکھنا چاہیے کیوں کہ وہ ان سے بہت قریب رہے ہیں۔ لیکن اکبر کی بینائی متاثر ہے اور سکونِ قلب بھی میسر نہیں۔ ایک روز جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے انھیں اپنا مضمون سنایا اور ان سے کہہ دیا کہ جب تک وہ نہیں لکھیں گے میں اپنا مضمون نہیں بھیجوں گا۔ چنانچہ کل رات وہ اپنا مضمون لے کر پہنچے اور کہنے لگے کہ انھیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جسے وہ مضمون DICTATE کرا سکیں اس لیے مجبوراً انھوں نے خود لکھا۔ میں نے سرسری طور پر اس کو دیکھ کر اس میں کچھ کانٹ چھانٹ کی ہے۔ صاف کرنے یا مکرر لکھنے کا موقع نہیں تھا اکبر نے آپ کو اجازت دی ہے کہ آپ اس میں جس طرح چاہیں ترمیم فرما سکتے ہیں۔ بہرکیف یہ دونوں مضامین آپ کی خدمت میں مرسل ہیں۔ (بدر شکیب)

● دکن کی پُر فضا پہاڑیوں اور وادیوں سے ایک دلدوز آواز اس صدی کے ابتدائی پچیس سال میں اٹھی۔ یہ آواز جس میں صدیوں کا درد پنہاں تھا۔ انسانیت اور اس کی مسرتوں کی تلاش میں غموں اور مصائب کا شکار ہو گئی۔ آج اس آواز کے پرستار اس کی یادگار اس کے جیتے جی منا رہے ہیں۔

مخدوم قریشی مرحوم کی نظر میں ہمیشہ ایک کھٹکی ہوئی سی رہا اور اس کی پہلو دار زندگی ہماری دلچسپی اور ساز کا باعث رہی۔ کالج میں مخدوم ایک بذلہ سنج ہنسنے ہنسانے والا

شوخ طالب علم تھا۔ لیکن کالج کے باہر آنے کے بعد اس کی زندگی میں انقلاب آگیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مخدوم سٹی کالج کی مدرسی کو خیرباد کہہ کر کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے لگا تو معلوم ہوا کہ مخدوم محض ایک کھلنڈرا نہیں بلکہ ایک ایسا سنجیدہ اور مستعد نوجوان ہے جو اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو اپنی مقررہ منزل کے حصول کے لیے وقف کر سکتا ہے۔

مخدوم بہ حیثیت شاعر عثمانیہ کے شعرا میں بہت نمایاں ہے۔ اس کا کلام بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق ہے اس کی ہر نظم میں اس کے انداز فکر طرز ادا کی ندرت اور انوکھے پن کے ساتھ ایک پہاڑی منظر کی دلکشی اور نظر افروزی موجود ہے۔

مخدوم کی شاعری کا سے اگر اس کے کردار اور عقیدے کو سمجھنا ہو تو اس کی نظم "پرسہ" دیکھیے۔

نہ تو جاودانی نہ میں جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

مخدوم شعر کہتا نہیں اس کا جذبہ اس سے شعر کہلواتا ہے۔ اس لیے فرمائش پر اس سے کسی نظم کی توقع بیکار ہے

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا — ترے آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی بے خودی خود پردہ دار راز الفت ہے — جو کہتے ہو سنبھل جاؤ سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

آج جب میں ان دو شعروں کی سحر کاری پر غور کرتا ہوں تو لگتا ہے میں نے ان میں مخدوم کے کردار کو تینوں (DIMENSIONS) میں دیکھا تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ یہ اشعار مجھے اس قدر پسند تھے۔ وطن چھوڑ کر چودہ سال گزر جانے کے بعد ایک مرتبہ میں کراچی کے کسی اسکول کی ایک محفل موسیقی میں آغا سرور کو مخدوم کی ایک نظم گاتے سنا۔ دکن کی چاندنی رات میں پھولوں سے لدا ہوا . . . چنبیلی کا منڈوا جس نے دیکھا وہی اس نظم کا حقیقی لطف اٹھا سکتا ہے لیکن مخدوم نے چنبیلی کے اس حسین آسمان نما منڈوے کے نیچے انسانیت کی جلتی ہوئی چتا دیکھی خود بھی رویا اور سننے والوں کو بھی رلایا۔

مخدوم ایک مقرر، ایک اداکار، اور ظریف بزلہ سنج پہلے بھی تھا اور شاید اب بھی ہو۔ کیوں کہ میں مخدوم کی اس خصوصیت میں تبدیلی ناممکن سمجھتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ مخدوم اپنی ایک نظم آزاد انصاری مرحوم کو سنانے کے لیے گیا۔ مولانا بہت سنجیدہ بزرگ تھے اور نوجوانوں کی بڑی دلجوئی فرمایا کرتے تھے۔ جب مخدوم وہاں سے واپس آیا تو فوراً میر حسن کے پاس پہنچا۔ میر حسن کو عروض میں کافی دخل تھا۔ اس نے پوچھا کہ میر حسن یہ ایطا کیا چیز ہے شعر کی خوبی ہے یا عیب۔ میر حسن نے ایک لیکچر دینا شروع کیا۔ ایطا دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جلی دوسرا خفی۔ مخدوم نے کہا مگر یہ تو بتا کہ یہ شعر کا عیب ہے یا حسن۔ میر حسن نے کہا ایطائے جلی عیب ہے۔ اس پر مخدوم ہنستے ہوئے کہنے لگا بے گدھے تو نے پہلے ہی یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔ میں نے حکیم آزاد انصاری کو ابھی ابھی اپنی تازہ نظم سنائی

انھوں نے میرے ہر شعر پر سر ہلا کر داد دی اور آخر میں کہا میاں . . . . "تمھارے تیسرے شعر میں ایطا ہے۔ میں یہ سمجھ کر کہ مولانا شعر کی کسی خوبی کا ذکر کر رہے ہیں۔ بہت کڑک کر بولا کہ جی ہاں وہ تو ہوتا ہے۔" نہیں معلوم میرے اس جواب کو انھوں نے شوخی پر محمول کیا ہوگا یا جہالت پر۔

دیکھنے کو تو یہ ایک لطیفہ ہے لیکن اس سے مخدوم کے کردار کے ایک خاص پہلو کا پتہ چلتا ہے۔

مخدوم کا ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ میں بی اے کرنے کے کئی سال بعد جب قانون پڑھنے کے لیے کالج میں دوبارہ شریک ہوا تو مخدوم ایم اے میں تھا۔ اس وقت ظفر انجمن اتحاد کا صدر تھا۔ سوال یہ درپیش تھا کہ اس سال کالج کا تفریحی سفر کشمیر کا ہو یا برما کا۔ طلبا کشمیر کو دو سال پہلے مرتضیٰ کی صدارت کے زمانے میں جا چکے تھے لیکن برما نہیں گئے تھے اس لیے ایک بڑی تعداد برما جانے کی تائید میں تھی۔ تاہم برسر اقتدار جماعت کشمیر کی طرف مائل تھی۔ برما والے مجھے اور میرے ایک ساتھی علی بن کاظم کو اپنی تائید کے لیے ہال میں لے کر پہنچے۔ ہم چونکہ زیادہ اثر رکھتے تھے اس لیے آسانی سے کثرت آرا ہمارے ساتھ ہو گئی۔ مخدوم کشمیر کے دلدادوں میں تھا۔ اس نے جب اپنی تحریک ناکام ہوتے ہوئے دیکھی تو ایک نئی تحریک پیش کی کہنے لگا: "ہم کشمیر جائیں گے اور بجائے برما کے ہم حج بیت اللہ جائیں گے۔ ظفر اور مخدوم کی پارٹی نے خوب ہوحق مچائی اور یہ تحریک فوراً قبول ہو گئی۔ ہم بھی حیران تھے کہ اب کیا ہوگا۔ ہمارے ساتھی ہماری صورت دیکھ رہے تھے۔ علی بن کاظم نے میرے کان میں کہا: "اکبر یہ حج بیت اللہ کہاں واقع ہے۔" یہ سننا تھا کہ میں نے اٹھ کر یہی سوال کر دیا۔ اب مخدوم کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ لیکن اس نے بڑی معصوم شکل بنا کر جواب دیا کہ وہ جغرافیہ میں بہت کمزور ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ حج بیت اللہ کہاں واقع ہے۔

مخدوم کے متعلق لکھتے ہوئے مجھے اس کا احساس ہے کہ مجھ میں اور اس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ وہ ہے ہنسوڑ اور میں ہوں منقبض۔ لیکن مادر جامعہ اور مادر وطن کے رشتے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ میں مخدوم کا مرید تو نہیں ہوں لیکن اس کا وکیل ضرور رہا ہوں اور اس مضمون میں بھی میں نے مخدوم کی وکالت دل کی زبان سے کی ہے۔

مخدوم ایک وارفتہ و بے باک شاعر ہے کیمونسٹ تحریک کا دلدادہ اور ترقی پسندی کا علمبردار عرصے سے وہ اور ان کی شاعری دونوں روپوش ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "سرخ سویرا" جدید اردو شاعری کا شہ کار اور متعدد نوجوان شعرا کے لیے نمونہ کا کام انجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

"داستان ادب اردو" ۱۹۵۱ء

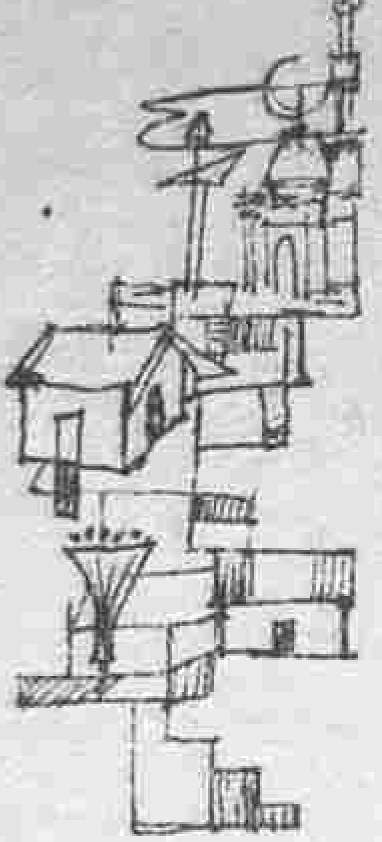

مخدوم — چند یادیں

بدر شکیب

● ایک دبلا پتلا سا نوجوان، سانولا رنگ، تیکھے چتون درمیانہ سے نکلتا ہوا قد، چہرے میں دھنسی ہوئی چمکیلی آنکھیں، جسم پر ہلکے رنگ کی سوتی شیروانی پہنے ہوئے اپنے کسی ساتھی کے ساتھ ایک روز مجلہ عثمانیہ کے دفتر میں داخل ہوا۔ میں مضامین کے مسودوں کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ میں نے دونوں کو اپنے برابر کی خالی کرسیوں پر بٹھا کر ملاقات کی غرض دریافت کی۔ اس نوجوان کے ساتھی نے کہا کہ یہ مخدوم محی الدین ہیں اور مجلہ کے لیے اپنی کوئی نظم سنانا چاہتے ہیں۔ میں ان کا نام سن چکا تھا۔ کچھ دنوں سے ان کی نظم "پیلے دوشالہ" کا کالج کے ادبی حلقوں میں بڑا چرچا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ مخدوم کی پہلی نظم تھی اور محض تفنن طبع کے لیے انھوں نے اسے موزوں کیا تھا۔ لیکن یہ اتنی مشہور ہوئی کہ اس نے مخدوم کی خفتہ شعری صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ مجھے یاد نہیں اس روز انھوں نے مجھے کونسی نظم سنائی چونکہ مجلہ کے ایک شمارے کے لیے مضامین اور نظموں کا انتخاب ہو کر ان کی کتابت بھی ہو چکی تھی اس لیے میں نے انھیں آئندہ پرچہ کی تیاری کے وقت کچھ اور نظموں کے ساتھ ملنے کہا۔ یہ غالباً ۱۹۳۳-۳۲ء کا زمانہ تھا۔ مخدوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

جامعہ عثمانیہ کے توپ کے سانچہ کے زمانے میں اکبر وفا قانی، حبیب اللہ رشدی، عبدالقیوم خاں باقی، جلال الدین اشک، محمد امیر، ابوالکلام، بدر شکیب وغیرہم کا کلام بالالتزام مجلہ اور دیگر اردو جرائد میں شائع ہونے لگا تھا۔ یہی جامعہ کے اولین دور کے شعرا ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے اڈیکمیٹ منتقل ہونے کے بعد جامعہ نے جو شعرا پیدا کیے ان میں مخدوم، وجد

مکش، اور سانہ نے نہ صرف بڑی شہرت حاصل کی بلکہ اول الذکر دونے تو اردو زبان میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا۔

مخدوم کی شعری صلاحیتوں یا اردو ادب میں اس کا مقام متعین کرنا زیر نظر مضمون کا مقصود نہیں ہے بلکہ میں اس ماحول اور فضا کو پیش کرنا چاہتا ہوں جس نے مخدوم کی شاعری کو جنم دیا اور اس کے فقادِ سیاسی میں ایسی انقلاب انگیز تبدیلی کی کہ وہ سماج کا باغی بن گیا۔

حیدرآباد کا نظام جاگیرداری حیدرآباد کی نسلوں کے لیے پیام موت ثابت ہوا۔ سوسائٹی میں اس نظام کی جڑیں کچھ اتنی مضبوط نہیں کہ سقوط حیدرآباد تک عامۃ الناس میں سے کسی کو محض ..... اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر بہت کم ابھرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ کی تاسیس اور تعلیم کی توسیع و اشاعت سے ملک میں شعور عامہ بیدار ہوا، غریب اور ادنیٰ متوسط طبقات کو اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا لیکن معاشرہ میں اس طبقہ کو کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔ ایک غریب متوسط خاندان کے طالب علم کے لیے اعلیٰ تعلیم کے اکتساب کے بعد بھی نہ اچھی ملازمت مل سکتی تھی اور نہ اس کو ایسے مواقع حاصل تھے۔ آخر وقت تک خاندانی وجاہت، اثر و رسوخ، سفارش اور اقربا پروری کا زور رہتا۔ نا اہل اور کم تعلیم یافتہ لوگ اپنے اثرات کے بل بوتے اعلیٰ تعلیم یافتوں کو زندگی کی دوڑ میں پیچھے دھکیل دیتے تھے۔ اس صورت حال سے ملک کے نوجوان طبقہ سخت مایوس تھا۔ ان میں احساس شدت سے زور پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ سماج کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنے انتقام کی پیاس کو بجھائیں۔ کچھ لوگوں نے اپنے لیے آزاد پیشوں جیسے وکالت، تجارت، ٹھیکہ داری وغیرہ کو منتخب کیا تاکہ ان کی ذاتی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں۔ اس میں بیشتر نے کامیابی بھی حاصل کی لیکن سب ہی لوگ تو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے لیے ہر پیشہ کی کچھ روایات ہوتی ہیں جن پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے اور جن کے بغیر کامیابی حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے طلبا نے معمولی معمولی ملازمتیں محض اس لیے قبول کرلیں کہ انھیں خاندان کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا یا اگر سرکاری ملازمت میں داخل نہیں ہوتے تو ان کی عمریں اتنی متجاوز ہو جائیں کہ وہ سرکاری ملازمت کے قابل ہی نہیں رہتے۔ لیکن ان میں بعض ایسے باہمت لوگ بھی تھے جنھوں نے ان حالات سے بغاوت کی اور ہر قسم کی صعوبتیں جھیلنا گوارا کیا۔ ان میں سر فہرست مخدوم محی الدین کا نام ہے۔

سٹی کالج کی ملازمت کے دوران مخدوم جس ذہنی کشمکش کا شکار رہتے تھے اس نے بالآخر انھیں ترک ملازمت پر آمادہ کیا۔ ان کی اس زمانے کی شاعری ان کے ان ہی باغیانہ خیالات کی آئینہ دار ہے۔ حیدرآباد میں اور وہ بھی سرکاری ملازمت کا چھوڑنا ایک بڑے عزم کا طالب تھا۔ ملازمت چھوڑ کر مخدوم نے ایک غیر معمولی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اور یہ آتش نمرود حیدرآباد کا نظام جاگیرداری تھا جس کے ماتحت عوامی طبقات کو ابھرنے کے قطعاً کوئی مواقع

حاصل نہ تھے۔ اس کے بعد ادب میں ترقی پسندی اور سیاسی عقائد میں کمیونزم کو انھوں نے اپنے قبول کیا اور بڑی دیانت داری
سے اپنے اصولوں پر عمل پیرا رہے۔ مجھے ان کے سیاسی عقائد سے کوئی بحث نہیں لیکن انھوں نے سوسائٹی کے عام
ڈگرے سے بغاوت کر کے جو مثال قائم کی وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔

سنہ ۱۹۶۶ء
کی
بہترین شاعری
اردو کے ممتاز شعرا کی نادر تخلیقات کا انتخاب
نئی آوازوں کے ساتھ
مرتب:۔ سبطِ نبی صیغم
چند قلمکار:۔ جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری
عابد علی عابد، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ن م راشد، اختر الامان
مجید امجد، عدم، عبدالعزیز فطرت، باقی صدیقی، قتیل شفائی،
جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، ظہیر کاشمیری، عارف بخاری،
منظور عارف، کرشن موہن، جمیل ملک، وزیر آغا، سلیمان اریب
احمد فراز، گوپال متل، محسن احسان، اعجاز احمد فاروقی
حمایت علی شاعر، عرش صدیقی، سحر انصاری، ساقی فاروقی
محمد سلیم الرحمٰن، کمار پاشی، کوثر عادل منصوری، رفعت سروش
ضیا جالندھری، شہزاد احمد، منیر نیازی، اور دوسرے۔
(وسط اپریل ۶۷ء تک شائع ہوگا)
مطبوعات بادبان۔ ۲۰۳ لشکر بازار راولپنڈی

سہ ماہی
سیپ
ایک رسالہ — ایک تحریک
ہر بار پرانے اور نئے
ناموں کے ساتھ
معیاری اور اچھی تحریریں
پیش کرتا ہے
تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے
قیمت:۔ ۳ روپے
سہ ماہی سیپ ۳۹ گارڈن آفیسز
مراد خاں روڈ، کراچی ۳

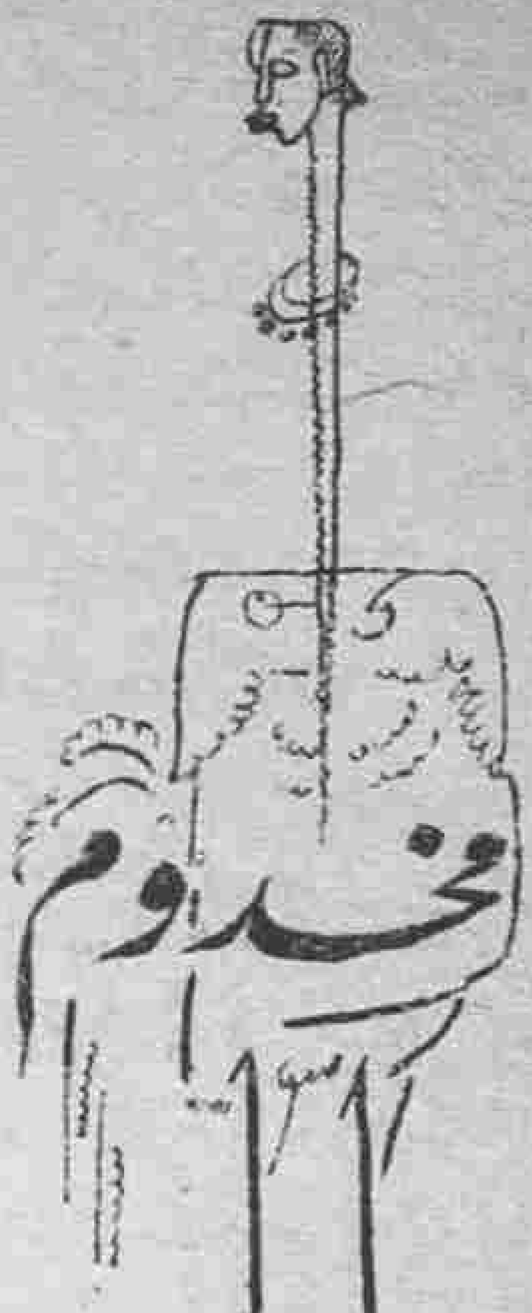

پرانی یادیں

مرزا شکور بیگ

• یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب عثمانیہ یونیورسٹی مختلف کرایہ کی عمارتوں میں آباد تھی۔ عمارتیں کرایہ کی تھیں مگر پڑھنے پڑھانے والوں کے دماغ ذاتی تھے۔ مخدوم کو سب سے پہلے میں نے لیاقت منزل میں دیکھا۔ اب جہاں حیدرآباد اسٹیٹ بنک ہے اسی کی عقبی عمارت کا نام لیاقت منزل تھا۔ وہاں سوشل گیادرنگ تھی۔ رات کا وقت تھا میں نے دیکھا کہ ایک سانولا سلونا جوان اسٹیج پر ایسی حرکتیں کر رہا ہے کہ دیکھنے والوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے۔ جواب ملا۔ مخدوم محی الدین۔ اسی سال کالج میں داخلہ لیا ہے۔ مجھے اس سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور کیسے نہ ہوتا۔ وہ [illegible] مجھ سے زیادہ مسخرہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً چالیس سال بیت گئے سوچتا ہوں تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

یونیورسٹی میں داخلہ سے پہلے مخدوم نے کہاں تعلیم پائی مجھے نہیں معلوم۔ کہیں تعلیم پائی بھی یا نہیں اس کی گواہی بھی نہیں دے سکتا۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ کالج میں وہ مجھ سے دو یا تین سال جونیئر تھا۔ مخدوم کے چہرے سے ذہانت اور آنکھوں سے شرارت جھلکتی تھی۔ مذاق کرنے اور مذاق سمجھنے کی صلاحیت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں جس سے متاثر ہوا وہ اس کا خلوص تھا جب کبھی ملتا یوں محسوس ہوتا کہ دل سے مل رہا ہے۔ چند مختصر سی ملاقاتوں میں ہم ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔

اس زمانے میں یونیورسٹی کے طالب علم مخصوص قسم کی شرارتیں کرتے تھے۔ ہڑتالیں کرنا، جلوس نکالنا، توڑ پھوڑ کرنا ابھی کورس میں داخل نہیں ہوا تھا۔ بہت بڑی شرارت جس کا ان دنوں چرچا تھا وہ ایک گدھے کو [illegible] کر کے [illegible] کے گھر پہنچا دینا تھا جہاں صوبے [illegible] [illegible]

دال لازمی ملا کرتی تھی۔ بعض طالب علم اس روز کی دال سے تنگ آ گئے۔ ایک وقت دال اور دوسرے وقت چانول کی کڑھی کا مطالبہ کیا۔ ہم نے مخالفت کی۔ دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کڑھی کے فدائیوں کی دوسری دال کے شیدائیوں کی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت برطانوی ہند میں بھی دو پارٹیاں تھیں ایک وفاقی مرتبہ کی حامی تھی دوسری مکمل آزادی چاہتی تھی غرض وہاں جب ایسے اہم مسائل پر بحث جاری تھی تو ہمارے اسٹیٹ میں دال اور کڑھی کے مسائل طے ہو رہے تھے۔ بورڈنگ کے مقیمین کو ہمنوا بنانے کے لیئے میں نے ایک مسدس کہہ دیا۔ اس کا ایک بند آپ بھی سن لیجیئے۔

کالج میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں — یا جاتے ہوے ہوں کسی تفریحی سفر میں
بریانی اڑاتے ہوں یا ہا ما ڈنر میں — ہے دال کا ہونٹوں پہ مزہ شکل نظر میں
ہم اور کسی شئے کا اجارہ نہیں کرتے
پر دال کی فرقت کو گوارہ نہیں کرتے

مخدوم نے جب کالج میں داخلہ لیا تو دال والی نظم کا چرچا تھا۔ نہ معلوم مخدوم پہلے ہی شعر کہا کرتا تھا یا کالج ہی میں اس نے شاعری کی ابتدا کی۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ مخدوم کی شاعری کی ابتداء یونیورسٹی کے داخلہ کے بعد ہوئی۔ ایک طالب علم شہر حیدر آباد سے سالانہ امتحان دینے آئے یہاں ایک بورڈنگ (اقامت خانہ) میں ٹھیرے۔ ان کے پاس ایک پیلا دوشالہ تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ یار لوگوں نے موقع پاکر وہ دوشالہ پار کر دیا۔ بیچارے غم کے مارے ہر ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ کیا آپ نے پیلا دوشالہ کہیں دیکھا ہے۔ ان کی اسی تڑپ نے مخدوم کے جذبۂ شاعری کو ابھارا اور مخدوم نے "پیلا دوشالہ" کے عنوان سے اپنی شاعری کے جوہر دکھائے۔ مجھے جو یاد ہے آپ بھی سن لیجئے اور لطف اٹھائے۔

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا — .... وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا ہجر کا بھالا — .... وہ پیلا دوشالہ
وہ کون ملا ڈر تھا جو چیٹ کر گیا تجھ کو — پٹ کر گئی مجھ کو
تو کون سے موئے کا بنا تازہ نوالہ — وہ پیلا دوشالہ
اے دیدۂ بے سلسلہ خشم اس پہ جو ابھا
او گرم کن پہلوئے من بار بیا آئی — گرمئ زجدائی
آں روز بیا و آر کہ من زیر تو بالا — وہ پیلا دوشالہ

یونیورسٹی کی ایک تقریب میں حیدر آباد کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کی موجودگی میں بطرز قوالی جب "پیلے دوشالہ" کو پیش کیا گیا تو حاضرین کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اس نظم سے مخدوم کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ اس طرح مخدوم کی ذہانت، ذلکہ سنجی اور خصوصیت میں شاعری بھی شامل ہو گئی۔ اب مخدوم کو اپنی اداکاری کا لوہا منوانا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں "انجمن ترقی ڈرامہ" قائم ہوئی۔ اس انجمن کی ابتداء سے انتہا تک میں اس کا معتمد رہا۔ فضل الرحمن صاحب نے جواب

علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں کئی ڈرامے لکھے۔ ان کے ایک ڈرامہ کا نام "حشرات الارض" تھا۔ یہ ڈرامہ [illegible]
میں اسٹیج کیا گیا جسے اب اگر ناگیز کہتے ہیں۔ حضرت برق نائب مدیر "الاعلان" کا پارٹ مجھے ملا تھا۔ مولوی خیر الامور مالک
مطبع مخدوم بنا تھا۔ خیر الامور کے سر پر سفید نقشی کام کی گول ٹوپی۔ جسم پر مہین ململ کی شیروانی، ٹھوڑی پر سفید ڈاڑھی، لبیں کتری
ہوئی۔ آنکھوں میں سرمہ، ناک پر عینک اس ہیئت کذائی میں مخدوم کیسا دکھائی دیا ہوگا۔ اس کا تصور آپ کر لیجئے —
خیر الامور مطبع کے مالک ہیں۔ جہاں "الاعلان" چھپتا ہے۔ "علامہ وعدہ اس کے مدیر ہیں اور حضرت برق اس کے نائب مدیر،
خیر الامور کے آتے ہی حضرت برق نے کہا "الاعلان" میں طباعت کے لئے ایک پرزور مضمون وصول ہوا ہے۔ پرزور کا لفظ
سنتے ہی خیر الامور نے فرمایا "میں ان پرزور مضامین سے دور بھاگتا ہوں۔ پرزور مضامین لکھنے والے کو بھی مصیبت میں گرفتار
کرتے ہیں اور چھاپنے والے کو بھی۔ جب ان سے کہا گیا کہ یہ مضمون اس نوعیت کا ہے تو خیر الامور نے پوچھا کہیں کوئی سبھا کا
امور تو نہیں ہیں۔ پھر خیر الامور نے مشورہ دیا "جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ میں نہیں کہتا کہ نکتہ چینی بری چیز ہے۔ نکتہ چینی
کرو۔ مگر ان لوگوں پر نہیں جو با اثر ہیں یا جن کے پاس روپیہ ہے۔ یا جو صاحب اقتدار ہیں" نائب مدیر نے جل کر کہا پھر کس پر
نکتہ چینی کریں، فقرا و مساکین پر خیر الامور نے جواب دیا۔ شفاخانے کا عملہ ہے شوق سے اس پر نکتہ چینی کرو۔ کوئی منشی بھی
رشوت کا عادی ہے اس کو برطرف کروادو۔ کوئی نرس راتوں کو تفریح کو نکل جاتی ہے اس کی رپورٹ کرو مگر اعزاز احمد
اور کمیٹی کے ارکان کے بارے میں سکوت اختیار کرنا ہی احسن ہے۔ ہر چیز اعتدال سے ہونی چاہئے۔ تنقید اعتدال سے۔
تقریر و تحریر اعتدال سے۔ بزرگوں کا قول ہے میانہ روی سے بہتر کوئی چال نہیں۔ "خیر الامور اوسطہا" ایسے مشورے
کے بعد مخدوم جب اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فاتحانہ انداز میں کہتا ہے کہ صاحبزادے یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں"
تو تھیٹر قہقہوں سے گونج جاتا۔ میں یہ بتانا بھول گیا کہ اس ڈرامہ سے پہلے فضل الرحمن کا ایک اور ڈرامہ "ظاہر باطن" کامیاب
طریقے پر اسٹیج کیا جا چکا تھا۔ اس میں "شاعر غم" انگلہ کا پارٹ مجھے ملا تھا اور اسی ڈرامے میں مخدوم لالہ گوہری رام مہاجن
بنا تھا۔ کرتہ دھوتی پہنے گلے میں ریشمی رومال ڈالے جس کے دونوں سرے سینے پر لٹکتے تھے۔ سر پر مارواڑی وضع کی پگڑی
تھی۔ اس لباس میں مخدوم نے اسٹیج پر داخل ہوا سلام دلام کے بعد نواب صاحب سے یوں مخاطب ہوا۔

نواب ساب کیا کہیں۔ سسر رفیک کھرچ مانگتے ہیں۔ جمانت مانگی تو بولے نواب صاحب سے پوچھ لو۔ مرے
چاچا مرجا شگفتہ (مرزا شگفتہ) اب تک کیم میں مہنت مہاجن ہیں اور میں ان کی آدھی پونجی کا وارث ہوں۔ بس مری جمانت
ے تو میں آپ سے پوچھنے حاضر ہوا۔ کھرچ تو کئی ہجار مانگتے ہیں کنتو ہمارے پاس روپیہ کہاں

لالہ گوہری رام سود بیاج کا دھندا کرتے تھے مگر جب پوچھا تو بولے

نہیں نہیں نواب ساب ہم سود نہیں لیتے۔ کنتو سکت روپے کا بھاڑا مانگتے ہیں۔ یعنی اس روپے کا گھر جاکر بھاڑا
پر ملاتا تو جو رکم منی دی ہی مجھے دیدو

بہرحال اس پارٹ کو مخدوم نے اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ اندیشہ ہو چلا کہ عملی زندگی میں وہ یہی دھندا نہ شروع کردے

مگر ایسا سمجھنے والے غلطی پر تھے۔ مخدوم نے خیرالامور اور سیٹھ گوہری رام کے پارٹ کو کامیابی سے ادا کئے تھے مگر اس طرح کے دھندے بازوں سے وہ گہرا تنفر لے کر عملی میدان میں اترا۔ ہر ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد ظفر الحسن کے گھر میں بیٹھک ہوتی تھی۔ جو تھیٹر کے قریب ریڈی ہاسٹل سے متصل تھا۔ رات کا بقیہ حصہ عموماً گپ شپ اور ہنسی مذاق میں گزر جاتا تھا۔ ایسی محفلوں میں مخدوم کی موجودگی چار چاند لگا دیتی تھی۔ گفتنی و ناگفتنی دونوں قسم کے مذاق چلتے تھے۔

مخدوم ابھی کسی تعلیم کی تکمیل کر رہا تھا کہ میری تعلیم ختم ہوگئی۔ ال ال بی کے بعد میں نے وکالت کو اپنا پیشہ بنایا۔ اور دوست احباب کی کثرت اور اسی قسم کی دوسری مصروفیات سے تنگ آکر میں نے شہر حیدرآباد کی سکونت ترک کردی اور ورنگل چلا گیا۔

مخدوم نے کالج کے ماحول میں شاعری کی ابتداء کی تھی۔ اسے سب جھوم جھوم کر سنتے تھے۔ مگر جب عصری تقاضوں نے مخدوم سے شعر کہلوانا شروع کیا تو اس کی شاعری حکومت کی نظر میں خطرناک شکل اختیار کرنے لگی۔ مخدوم نے ایم اے کرنے کے بعد مدرسی کا پیشہ اختیار کیا مگر اس وقت تک وہ اشتراکی تحریک کو اپنا چکا تھا۔ اب سماجی تقاضے اس پر چھا گئے تھے۔ غریبی اور غریبوں کا غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ زیادہ دنوں اپنے آپ کو ملازمت کی جکڑ بندیوں میں نہ رکھ سکا۔ اس نے ملازمت کو خیرباد کیا اور پھر لیڈر ہوگیا

اختر حسین جو بعد میں مدیر "پیام" بھی ہوگئے تھے ورنگل کالج میں اردو کے لکچرر ہو کر آئے۔ اور کچھ دنوں بعد انھوں نے ورنگل میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کر ڈالا۔ حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور فیضی کے علاوہ حیدرآباد سے مخدوم اور نظر کا آنا بھی مجھے یاد ہے۔ مخدوم اور نظر کے ساتھ غنی سعید اور صلاح الدین بھی تھے۔ ان چاروں کا قیام میرے گھر پر تھا۔ غنی سعید اور صلاح الدین شاعر نہیں تھے۔ مگر مخدوم کی خاطر آگئے تھے۔ میں نے کہا اچھا کیا جو تعریف کرنے والوں کو بھی تم لوگ لیتے آئے۔ مخدوم نے کہا ہاں کبھی سخن فہم کوئی تو ہو۔ ان چاروں کا قیام دو تین دن میرے گھر پر رہا۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کب صبح ہوتی اور کب شام۔ مشاعرہ میں مخدوم نے جو رنگ جمایا اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ وہ جب شعر سناتا ہے تو یہ حسین تعبیر آتی ہے۔ اور اپنی دلکش آواز میں وہ دلوں کی دھڑکنوں کو محفل پر یوں بکھیر دیتا ہے کہ سب مسحور ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت وہاں بھی تھی۔ اسی رات کا ایک خاص واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔

مشاعرہ سے پہلے ڈنر کا انتظام تھا۔ ڈنر کے لیے جب بلایا گیا تو مخدوم یہ کہہ کر کہ میں ابھی آیا باہر چلا گیا۔ سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ٹیبل کے دوسرے کنارے والوں نے تو کھانا شروع بھی کر دیا مگر ہم مخدوم کا انتظار کر رہے تھے۔ جب دیر ہونے لگی تو خیال ہوا کہ کہیں فرار تو نہیں ہو گیا۔ بہرحال کافی دیر بعد مخدوم اپنے روحانی تبسم کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ تاخیر کی وجہ پوچھی تو گول ہو گیا۔ ڈنر ہو گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ میر یعقوب مرحوم میر مشاعرہ تھے۔ مائک کے پاس ایک کرسی رکھ دی گئی تھی۔ شاعر وہیں اپنا کلام سنا رہے تھے۔ مخدوم کی باری آئی تو اس نے کہا میں کھڑے ہو کر سناؤں گا۔ اور اصرار بھی کیا۔ غرض وہ مائک کے آگے اپنے دونوں ہاتھ ناف کے پاس باندھے کلام سنانے لگا۔ کلام کیا

سُنا رہا تھا گویا بچھو ڈنک مار رہا تھا۔ مگر اس کا یہ "سپوز" سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مشاعرہ کے بعد جب صبح صبح کے قریب ہم گھر واپس ہوئے تو مخدوم سے ڈنر میں دیر حاضری اور اس طرح کلام سُنانے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ جب میں اپنا پاجامہ باندھ رہا تھا تو کمر بند ٹوٹ گیا۔ اب میں کیا کرتا۔ ایک سرے کو اندر سے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اِدھر دیر ہونے لگی تو میں نے کمر بند کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جیب میں رکھ لیے اور پاجامہ کو تہمد کی طرح بل دے کر باندھ لیا۔ مشاعرہ میں یہ اندیشہ ہوا کہ کرسی سے اٹھتے وقت کہیں وہ پیچ ڈھیلا ہو کر کھل نہ جائے۔ اس لیے کھڑے ہو کر ہاتھوں سے اس پیچ کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ یہ کہہ کر اس نے کمر بند کے وہ ٹکڑے بتائے۔ میں نے وہ ٹکڑے اس کے ہاتھ سے لے لیے۔ دوسرے دن اس پارٹی کو رخصت کرنے اسٹیشن گیا۔ جب ٹرین چلنے لگی تو میں نے ایک لفافہ دے کر کہا۔ یہ میری طرف سے ہے۔ مخدوم نے خوشی خوشی اُسے کھولا تو اس میں وہی کمر بند کے ٹکڑے تھے۔ اس نے فرمائشی قہقہہ لگایا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔

دن گزرتے گئے۔ اب مخدوم کا شمار ان لیڈروں میں تھا جنہیں حکومت تلاش کر رہی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد حکومت نے تلنگانہ میں کمیونسٹ تحریک کو کچلنے کا بیڑا اٹھایا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ پہلے یہ سننے میں آیا کہ راج بہادر گوڑ گرفتار ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد مخدوم کی گرفتاری کی بھی خبر آئی۔ مخدوم کی مقبولیت اور خلوص کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی گرفتاری پر خوش ہونے والے ہی اس کی جان کی خیر منا رہے تھے۔ پہلے الیکشن کے قبل حکومت نے گرفتار شدہ لیڈروں کو رہا کر دیا۔ مخدوم بھی رہا ہوا۔ شہر میں اس کا جلوس نکالا گیا۔ ایسا جلوس کہ شہر والوں کو اب تک یاد ہے۔ پہلے عام انتخاب میں مخدوم کو ناکامی ہوئی پھر ایک ذیلی انتخاب میں کامیاب ہو کر مخدوم نے لیجسلیٹو اسمبلی میں جگہ حاصل کی۔ وہ اپوزیشن پارٹی کا ڈپٹی لیڈر ہو گیا۔ اسمبلی میں اسکی ہر تقریر بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی۔ میں بھی اسی اسمبلی کا ایک رکن تھا۔ ایک واقعہ سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھول چند گاندھی تعلیمات کے وزیر تھے۔ انہوں نے ایک بل پیش کیا تھا جس کی اپوزیشن کی جانب سے پُر زور مخالفت ہو رہی تھی۔ مخدوم نے بھی ایک دلچسپ تقریر کر ڈالی اور کہا پھول چند جی نے جو بل پیش کیا ہے اس میں پھول چند اور کانٹے زیادہ ہیں۔ دوسرے عام انتخاب میں بھی مخدوم کو کامیابی نہ ہوئی۔ آندھرا پردیش بن جانے کے بعد لجسلیٹو کونسل میں تو مخدوم اپنی پارٹی کی طرف سے کونسل کا رکن بن گیا۔ اور اب بھی اپوزیشن پارٹی کا لیڈر رہے۔ میں مخدوم کے ساتھ اور مخدوم کے بعد بھی اسمبلی کا رکن رہا۔ کونسل کا ممبر بننے کے بعد مخدوم جب مجھ سے ملا تو اپنے شرارتی تبسم کے ساتھ مجھ سے کہا بھائی جان ابھی تک آپ لوور ہاؤز (LOWER HOUSE) میں ہیں۔ تشریح سے اس مذاق کی لطافت مجروح ہو گی۔ بس جو سمجھ سکتے ہیں وہ نہ سمجھنے والوں کو سمجھا دیں۔

شمیم پیرہن یار کیا نثار کریں!
تجھی کو دل سے لگا لیں تجھی سے پیار کریں

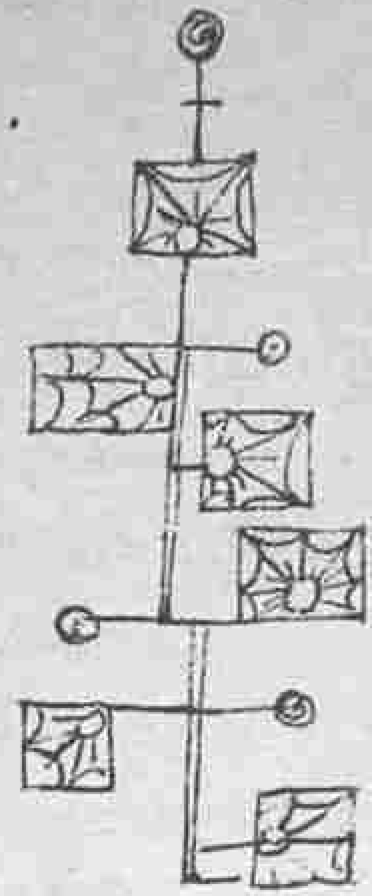

مخدوم

شریکِ جرم

شہریار کاؤس جی

● سرنامہ برجشنِ مخدوم۔ پتہ دفتر روزنامہ سیاست صدر استقبالیہ عابد علی خاں، معتمد میر حسن مورخہ ۲۹ رنومبر ۱۹۶۶ء۔ خط موصول ہوا ۵ ردسمبر ۱۹۶۶ء کو۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ نومبر کے تیسرے ہفتہ میں جشنِ مخدوم حیدرآباد میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے یہ بھی تحریر تھا کہ مخدوم کے فکر و فن اور شخصیت سے متعلق مشاہیر کے مضامین اور تاثرات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے

آخر میں مجھ سے خواہش کی گئی تھی کہ اس جشن کے موقع پر "مخدوم ۔ چند یادیں" کے عنوان پر ایک مختصر تقریر کروں اور اس تقریر کا مسودہ وسط نومبر تک معتمد صاحب جشن کی خدمت میں پیش کردوں۔

اب سامعین کرام سے استدعا ہے کہ وہ فیصلہ فرمائیں کہ نومبر کی آخری تاریخ میں لکھا ہوا خط جس میں نومبر کے تیسرے ہفتہ میں منعقد ہونے والے جشن کا ذکر اور اس جشن میں مجھ سے جس تقریر کی فرمائش ہے اس کا مسودہ وسط نومبر تک معتمد صاحب کے حوالے کردیا جائے کس طرح ممکن ہے جب کہ یہ خط مجھے ۵ ردسمبر ۶۶ء کو شام میں دست ہوتا ہے اور "فوری جواب مطلوب" کی سرخی بھی اس پر موجود ہے۔

جواب کی نسبت سوچ ہی رہا تھا کہ ۷، ۸ اور ۹ ردسمبر کے اخبارات میں جشن کا پروگرام چھپا اور میرا نام مقررین کی فہرست میں موجود تھا۔ ۹ ردسمبر کی شب ایک دوست لے گئے مخدوم کے اعزاز میں ایک جلسہ تھا وہاں معتمد صاحب مجھے دیکھتے ہی سر پر سوار ہوگئے اور تقریر کا مسودہ طلب کرنے لگے۔ میرا کوئی بھی عذر قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا اور مجبور ہو کر ایسی پر آدھی رات گئے یہ مضمون لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مخدوم کے شعر سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہا لیکن اس پر سفارہ فرسائی کی جراءت نہیں کرسکتا البتہ

دعوت نامہ میں لفظِ شخصیت نے ضرور متاثر کیا اور یہ چند یادیں اسی انوکھی شخصیت سے متعلق ہیں۔

میرے دوست سید غلام علی صاحب (علی صائب) کا قول ہے کہ "بیل بڈھا ہوتا ہے آدمی بڈھا نہیں ہوتا۔" اگر یہ بات سچ ہے تو اس کا انطباق مخدوم پر پوری طرح ہوتا ہے۔ عمر میں شائد یہ مجھ سے بھی دو سال بڑے ہی ہیں مگر ان کے بالوں کی سیاہی محتاجِ خضاب نہیں منہ میں دانت ابھی ماں کے دودھ کے رہینِ منت ہیں۔ ان کے عزم کی پختگی ان کی معروفیت ہے اور طبیعت کی جولانی اور کلام کی نزاکت مخدوم کا شباب ہے۔

یوں تو مخدوم سے واقفیت بہت پرانی ہے لیکن ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء کا دور بہت ہی قربت کا دور ہے ہم مکتب ہم خیال اور شریک حرم و سزا رہے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں چند نوجوانوں کی ایک زندہ دل پارٹی خود بخود تشکیل پا گئی تھی جنہوں نے اپنی پوری توانائیاں اور قابلیت تحصیل علم اور جامعہ کے وقار قائم کرنے کے لئے صرف کردیں اور دنیا میں کچھ بھی نہیں پایا۔ آج اس ٹولی کے افراد کہیں بس چکے ہیں۔ کوئی انگلستان یا امریکہ میں بس گیا کوئی دور پاکستان میں پڑا ہے۔ چند اللہ کو پیارے ہوئے لیکن غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں کی نسبت صدر کلیہ محسن طلباء مولوی عبدالرحمن خاں صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ "یہ لوگ انقلاب لائینگے"۔ چنانچہ زندگی کے جس شعبہ میں یہ لوگ داخل ہوئے وہاں کچھ نہ کچھ کر دکھایا۔ اور مخدوم سب سے اونچا کھڑا نظر آتا ہے۔

مخدوم کی شخصیت بہت ہی وسیع اور بسیط ہے جس کو انگریزی میں MULTI PURPOSE PERSONALITY کہہ سکتے ہیں جس محفل میں بھی بیٹھے اس کا مقام وہاں ضرور ہے۔ مخدوم کی زندگی کی ابتداء دیہات میں ہوئی اور آج بھی مخدوم نے دیہاتیت کو اپنے سے دور نہیں کیا ہے۔ اس کو ہر حالت میں خوش رہنا آتا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس طویل مدت میں میں نے اسے کبھی بھی مغموم یا افسردہ نہیں پایا۔ جب وقت جامعہ عثمانیہ اپنی نئی عمارتوں میں منتقل ہوا اور ہم شہر کی چہل پہل سے دور فطرت کی سادہ اور معصوم فضا میں رہنے لگے تو یہاں بھی مخدوم احباب کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور ہر بیٹھک میں اسی کی باتیں سب سے زیادہ دلچسپ ہوتی تھیں۔

مخدوم کی شخصیت میں انوکھاپن ایک خاص مقام رکھتا ہے جو بھی حرکت اس سے سرزد ہوتی ہے یا جو بھی لفظ اس کی زبان سے نکلتا ہے اس میں ایک اپج کا ہونا ضروری ہے۔ کالج کا زمانہ تھا میں راستے سے پیدل جا رہا تھا اور مخالف سمت سے مخدوم سیکل پر آ رہا تھا۔ سلام علیک۔ کچھ اس تپاک سے ہوئی کہ اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھوٹ گئی۔ فوراً سیکل رکی مخدوم اتر پڑا۔ اور سگریٹ اٹھالی۔ قبل اس کے کہ میں پوچھوں کہ ایسا کیوں کیا خود بڑی سادگی سے فرمانے لگے "گولڈ فلیک ہے"۔ اور سائیکل پر سوار ہو کر چلتا بنا۔

دوسری جامعات کی طرح جامعہ عثمانیہ کے امتحانات میں بھی ایسے امیدوار شریک رہتے تھے جو مدرسی ہوتے تھے امتحانات کے زمانے میں ایسے امیدواروں کو جامعہ کے اقامت خانوں میں جگہ ملتی تھی۔ اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر [illegible] طلباء سے ضروری اشارات میں مدد لیتے تھے۔ فرحت منزل ہی کا ذکر ہے کہ ایک مولوی صاحب کسی ضلع سے تشریف لائے

وہ بی اے کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے۔ ان کا مضمون دینیات تھا جب انہوں نے سوالات کی نوعیت کی نسبت دریافت کی تو مخدوم نے انتہائی معصومیت سے کہا۔ مولوی صاحب۔ نظری امتحان کی کوئی فکر نہیں آپ جیسی بزرگ ہستی کے لئے اس میں کوئی دشواری نہیں ہے عملی یا (PRACTICAL) دینیات بہت مشکل ہے یہاں احکام شرعی کو عملی طور سے کر کے دکھلانا پڑتا ہے۔ مولوی صاحب بہت پریشان ہوئے اور غالباً دو دن تک مشق میں مصروف بھی رہے۔ بعد کو جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ بات ایک مذاق تھی تو بہت ہی خفا ہوئے اور ہاسٹل چھوڑ کر کسی ہوٹل کی راہ لی۔

مخدوم کی شاعری پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ میں اپنے میں اتنی قابلیت نہیں پاتا کہ اس پر کوئی تبصرہ کروں۔ لیکن جانتا ہوں کہ اس کی شاعری کا آغاز "پہلا دوشالہ" سے ہوا ہے۔ اس کا بھی تعلق ہاسٹل کی شرارت (ACTIVITY) سے ہے۔ ہوا یوں کہ ایک نو وارد طالب علم کے ساتھ مذاق کیا گیا اور ان کا ایک دوشالہ جو زرد رنگ کا تھا غائب کر دیا گیا۔ صاحب دوشالہ بہت پریشان ہوئے اور طرح طرح سے استدعا کی کہ ان کی یہ قیمتی شئے ان کو واپس کر دی جائے۔ جب کو ان کے حال پر رحم آ گیا اور تصفیہ ہوا کہ ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہو اور اس کے بعد یہ دوشالہ واپس کیا جائے۔ جلسہ باضابطہ منعقد ہوا اور مودب افاوت خانہ نے اس کی صدارت فرمائی۔ چند تقریروں کے بعد مخدوم نے ایک منظوم تعزیت پیش کی جس کے اشعار بہت ہی مقبول ہوئے کیونکہ وہ ٹھیٹ دکنی بلکہ دیہاتی رنگ لئے ہوئے تھے۔ بہرحال صاحب دوشالہ کو دوشالہ واپس مل گیا مگر یہ نظم کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ کئی سال تک جامعہ کے سالانہ جلسوں میں اس کو پیش کیا جاتا رہا۔ اور اس کے قدر دانوں میں آنجہانی مہاراجہ کشن پرشاد بہادر (وزیر اعظم) اور خود اعلیٰ حضرت حضور نظام تھے۔ اس نظم کا پہلا اور آخری شعر پیش کرتا ہوں۔

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا۔ وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا۔ وہ پیلا دوشالہ

او گرم کن پہلوئے من باز بیائی۔ گریم زجدائی
آں روز بیا وار کہ من زیر تو بالا۔ وہ پیلا دوشالہ

جس وقت یہ نظم بطرز "قوالی" کے پیش ہوئی تھی تو ہمارے دوست علی صاحب (سید غلام علی) پر حال طاری ہو گیا جب قوال آخری شعر پر پہنچا۔ جو آپ سن چکے ہیں۔ تو صاحب حال نے روتے ہوئے فرمایا "ارے اردو میں بول سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اردو میں بول"۔

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

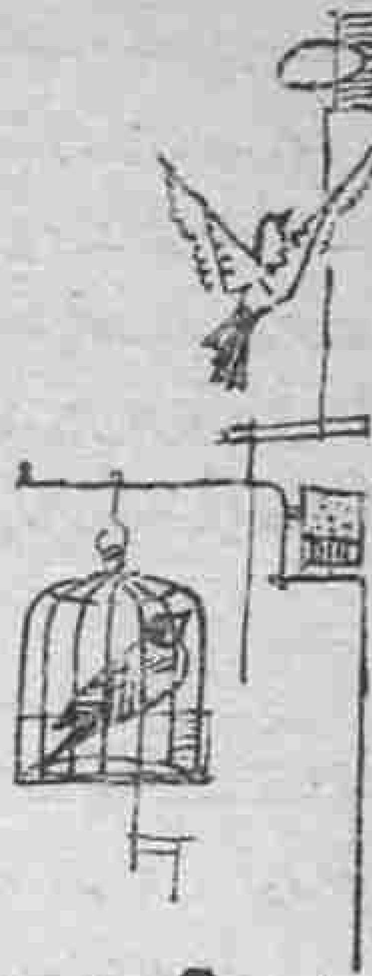

ما و مجنوں

محی الدین غازی

• کل خواجہ معین الدین کے ہاں دعوت میں ظفر الحسن سے ملاقات ہوی۔ میر حسن کے خط اور یوم مخدوم کی اطلاع ملی۔ یکدم ذہن اور حافظہ تیس پینتیس سال پیچھے لوٹ گیا۔ میں نے مخدوم کو بچپن میں سب سے پہلے میدک میں دیکھا تھا وہ بھی مسجد میں اور میلاد النبی کے جلسہ میں نعت پڑھتے ہوے۔ اس کے بعد مخدوم سے دوسری بار مدراس کی "صدیق سرائے" میں ملاقات ہوی۔ یہ ملاقات کیا بلکہ یہ کہیے کہ دوبارہ انھیں دیکھنے اور میدک میں دیکھی ہوی یاد تازہ کرنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد دکن سے جامعہ عثمانیہ کے طالب علم تعلیمی تفریح کے لیے مدراس گئے ہوے تھے۔ ہم چادر گھاٹ اسکول کے طالب علم بھی تعلیمی تفریح پر نکل کر ان سے مدراس میں جا ملے تھے میں نے مخدوم کو اس زمانہ میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہی دبلا پتلا اور سبک جسم روشن آنکھیں مجموعی طور پر ایک دلکش شخصیت۔ چنانچہ واپسی میں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اگرچہ میں اسکول کا طالب علم تھا اور اس وقت شاید مخدوم انٹرمیڈیٹ میں ہوں۔ ریل کے ڈبے میں کالج کے ہم سفر لڑکوں کے سامنے ہم دونوں میں کچھ گفتگو ضرور ہوی تھی جس کو میں مباحثہ ہی کہہ سکتا ہوں۔ مجھے بچپن ہی سے ڈبیٹ (DEBATE) اور تقریر کا شوق تھا۔ یہ یاد نہیں رہا کہ کس موضوع پر گفتگو ہوی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ مخدوم نے میری ہمت افزائی کی تھی۔ مدراس سے واپسی کے بعد مخدوم کو میں نے میجسٹی کے انتخاب کے جلسہ میں جو عزت منزل (جامعہ کی بورڈنگ) میں ہو رہا تھا ایک نظم سناتے ہوے دیکھا اور سنا۔ جو نظم انھوں نے سنائی تھی اس کا ایک مصرع تھا۔

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے ابھی

مجھے ان کھیتوں اور پانی کے کناروں کو بھی دیکھنے کی نعمت حاصل رہی ہے۔ جہاں مخدوم کی یہ نظم موزوں ہوی تھی۔ مخدوم پیدائشی "تلنگے" تھے۔ غالباً وہ اندول میں پیدا ہوے جو میدک ضلع کا مقام) پیدائش یعنی گھیکال سے بالکل

قریب تھا۔ میں نے اپنے سنگاریڈی کے قیام کے زمانے میں مخدوم کو نہیں دیکھا لیکن مخدوم سنگاریڈی میں کافی عرصہ رہ چکے ہیں۔ میں نے سنگاریڈی کے اس تالاب کے پانی کے کنارے اور دھان کے کھیت دیکھے ہیں جہاں مخدوم نے کسی کو دراصل دیکھ کر کہا تھا "ہمیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی"۔ اسی سنگاریڈی کے تالاب کے کنارے محبت کے دیوتا نے اس کے حساس دل پر سب سے پہلے تیر چلایا تھا اور اس تیر سے مجروح ہونے کے بعد تلنگانہ کے مخدوم کے تلنگانہ کے حسن کو "خراجِ عشق" پیش کیا تھا۔ مخدوم نے "ہاں تلنگن گائے جائے بانکی تلنگن گائے جا" کے نغمے سے دکن کے ادبی ذوق میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ شاعر مخدوم کی شخصیت ابھر آئی۔ مخدوم کی شخصیت کی تیاری میں اس کی عاشقی اور شاعری نے بڑا کام کیا ہے۔ مخدوم کی عاشقی اور شاعری نے ہمیں یعنی اس دور کے مخدوم کے ساتھیوں کو اس کی اور ایک نظم کے ایک مصرع کا گرویدہ بنالیا تھا اور وہ مصرع یہ تھا۔ ع

لو بجی گھنٹی کہ رخصت کارواں ہونے کو ہے

مخدوم کو ذکی الحسی کی جو دولت ملی تھی اس کا اس نے بڑا جائز اور صحیح استعمال کیا۔ مخدوم کی ذات کے ساتھ سحر اپن، اداکاری، شاعری، مدرسی، سیاست کاری، خطابت بہرحال کئی مشغولیتوں اور مصروفیتوں کا ساتھ رہا ہے لیکن مخدوم کی زندگی اور اس کی تعمیر اور ترقی میں ادب اور علم کا پہلو غالب ہے۔ مخدوم دکن میں پیدا ہو کر اپنے ہم ملک اور ہم مشرب یعنی سیاسی عقائد رکھنے والے ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ہم عقیدہ ساتھیوں کے مقابلے میں بڑے خوش قسمت رہے ہیں۔ ان کی یہ خوش قسمتی دکن کی حالیہ تاریخ بھی رہی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں دکن کی سرزمین پر کئی عقیدے اور نظریے مختار بنے تھے۔ ان بیشمار عقیدوں اور نظریوں کے ٹکراؤ نے دکن میں مخدوم کی مخصوص شخصیت اور ذہن کی تعمیر و تیاری کے اسباب فراہم کر دیئے۔ دکن نے ہندوؤں کو سروجنی نائیڈو، مسلمانوں کو بہادر یار جنگ اور کمیونسٹوں کو مخدوم محی الدین دیا۔ دکن میں مخدوم کا مسلمان خاندان میں پیدا ہو کر کمیونسٹ ہونا میرے لئے تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ شاہی محل سے گوتم بدھ کا نکل کر غریبوں کی نجات کے لئے جنگلوں میں کام کرنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مخدوم کی شخصیت کو پگھلانے اور صیقل کرنے میں کیسے کیسے دردناک حالات نے حصہ لیا ہے۔ اس زمانے کی وہ ساری بدنصیبیاں بلکہ ان کی مسلسل یورش نے مخدوم کی خوش نصیبی کے راستہ کو صاف اور استوار کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کو چھوڑے ہوئے بیس پچیس سال ہو چکے۔ لیکن مخدوم کا خیال آتے ہی قاضی محمد حسین کا سنایا ہوا وہ شعر یاد آجاتا ہے جو مرحوم نے فارغین جامعہ عثمانیہ کے ایک وداعی ڈنر میں سنایا تھا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

مخدوم کو اس کے جنون نے اس کے اپنے صحرا میں پہونچا دیا اور ہم جیسے لوگ جو اس کے ہم سبق تھے زندگی کی بیشمار الجھنوں میں الجھ کر شخصی مفاد اور کاروبار کی گلیوں اور کوچوں میں مسلسل رسوا ہوتے رہے ہیں۔

مخدوم دکن ہے۔ مخدوم تلنگانہ ہے۔ مخدوم جامعہ عثمانیہ ہے۔ مخدوم شاعر ہے۔ مخدوم ادیب ہے اور مخدوم لیڈر بھی ہے

مخدوم کی شخصیت کے اطراف کئی محاسن اور خوبیوں کا ایک ہالہ ہے رنگین اور درخشاں ہالہ یہ ہالہ کم نہ ہوگا اور اسے مدہم نہ ہونا چاہئے اور خدا کرے کہ یہ مدہم نہ ہو۔ ادب اردو میں مخدوم اور ان کے قبیل کے شاعروں کا جو حصہ ہے، اسے کون محو کر سکتا ہے۔ مخدوم کی شخصیت کا ایک یہ دوامی عنصر ایسا ہے کہ مخدوم اپنی شاعری کے تعلق سے پاکستان میں بھی مقبول رہے گا۔ میں نے اپنی بے تکلفی اور خلوص کی بناء پر مخدوم کی مخاطبت میں آپ تم اور انہیں کے ضمائر استعمال ... کئے ہیں۔ مخدوم کے عقیدت مندان کو ممکن ہے کہ تیری اور یہ تیرے ناخوشگوار بلکہ تلخ محسوس ہو لیکن میں اپنی بے تکلفی اور اپنے خلوص اور سادگی کے حق سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ میں اس مخدوم سے جس کی صورت میرے دل کا آئینہ گذشتہ پچیس برس سے منعکس کرتا رہا ہے مخاطب ہوں اگر مخدوم بدل گیا ہے یا بدل گئے ہیں یا تبدیلی قبول فرمالی ہے تو ایسا شخص میرا ممدوح اور مخدوم کب ہو سکتا ہے وہ تو کوئی اور ہوگا جس کی یا نمایانی کی میں غلط کوشش کرتا ہوا اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرتا ہونگا۔ میں جب اپنے مخدوم کو یاد کرتا ہوں تو ایک فخر محسوس کرتا ہوں زمانہ طالب علمی میں اس کے ہم عصر بلکہ جونیئر ہونے کی مجھے بھی سعادت حاصل ہے جس جامعہ عثمانیہ نے اسے تیار کیا ہے اسی جامعہ نے مجھے بھی بنایا ہے اور اسی تعلق سے میں مخدوم کو کسی بھی زبان اور کسی بھی انداز سے یاد کر سکتا ہوں نلگنڈہ کے جنگلوں میں روپوشی کے بعد میں نے مخدوم کو اب تک نہیں دیکھا اور نہ اس کی تصویر دیکھی ہے۔ مخدوم میری نظر میں اب تک جامعہ کی نیلی شیروانی اور مصری ٹوپی والا دبلا پتلا مخدوم ہے۔

اساوری کا باپ مخدوم، نورالہدیٰ اور میر حسن کا دوست، مخدوم ظفرالحسن کے "انفرنو" کا ساتھی مخدوم کراما کاتبین جیسے مندرجات میں حصہ لینے والا مخدوم جس کو دیکھنے کی تمنا بھی پوری ہوگی یا نہیں کون جانتا ہے؟

ان کے مزاج اور کلام میں ایک قسم کی وارفتگی اور بے باکی ہے۔ آتش کے منہ میں ہوشیار جاتے اور دیوانہ وار واپس آتے ہیں۔ شعر میں خیال اور جذبے کی دلچسپ آمیزش ہوتی ہے۔ نئے مضامین کے ساتھ نئے الفاظ کی تلاش کرتے لیکن اپنے شعر کو قید و بند سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی آواز کو کہکشاں میں ڈوبتی دیکھ کر یہ آرزو رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ حریم عرش کو چھوکر آگے نکل جائے "قلندر" کی طرح ان کی نگاہوں کی زد آسمانوں پر رہتی ہے۔ جب کبھی زمین کی طرف دیکھتے ہیں محبت یاد آتی ہے یا وہ کثافتیں نظر آتی ہیں جو ابن آدم نے اپنے ہاتھوں پیدا کی ہیں۔ "مشرق"، "قلندر" اور "ٹوٹے ہوئے تاروں" میں ان کا مشرب صاف نظر آرہا ہے۔

تذکرہ شعرائے عثمانیہ (چوتھی جلد) ۱۹۳۹ء

مرتبہ:۔ سید معین الدین قریشی و عبدالقیوم خاں باقی

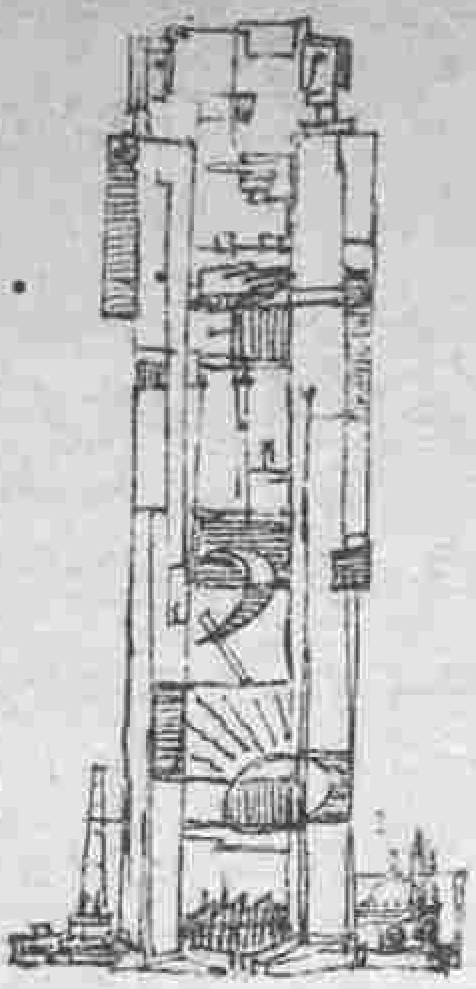

من ترا حاجی بگویم

زینت ساجدہ

یہ مضمون زینت ساجدہ نے جشنِ مخدوم کے ادبی اجلاس میں سنایا اور بے حد داد حاصل کی۔ (ادیب)

• حاضرینِ جلسہ! واقعہ ایک دن کا یہ ہے کہ منیر حسین نامی ایک شخص اردو ہال کے اسٹیج پر صدر بنا بیٹھا تھا۔ کسی شاعر مرحوم کا یوم منایا جا رہا تھا۔ اور تقریروں میں مرحوم کے اوصافِ پسندیدہ کے گن گائے جا رہے تھے۔ ایسی عمدہ عمدہ بے شمار باتیں لوگوں نے کہیں کہ اگر بے چارہ مرحوم زندگی میں سن پاتا تو پھولے نہ سماتا۔ زمانہ کی کج ادائی کا شکوہ نہ کرتا بلکہ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ سن لیتا کہ لوگ اسے اس قدر اچھا سمجھتے ہیں تو سچ مچ اچھا بن جاتا۔ بس خیال ہوا منیر حسن کو کہ اگر زندگی میں ایسی قصیدہ خوانی کی جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مارے خوشی کے عمرِ عزیز کے پانچ سات سال اور بڑھ جائیں۔ پھر اس کا بھی کیا بھروسہ کہ ہم جس طرح گزرے ہوؤں کو یاد کرتے ہیں لوگ ہمیں بھی یاد کریں۔ پرانے بادشاہ اسی بے اعتباری کے سبب اپنا مقبرہ جیتے جی ہی تیار کروا لیتے تھے۔ چنانچہ شخص مذکور نے حلقۂ احباب میں یہ بات چھیڑی کہ اس طرح ایک دوسرے کی تعریف و تحسین کی جائے۔ باقاعدہ ایک پروگرام بنے اور آپس میں سب ایک دوسرے کو بھلا کہیں اور سنیں۔ قرعۂ فال مخدوم کے نام نکلا کیونکہ اس کمبخت کے چاہنے والے اس شہر میں بے حساب بے شمار ہیں۔ داڑھی والوں سے لے کر چوٹی والوں تک ہر طبقے اور ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کا نام رکھنا چاہا۔ "من ترا حاجی بگویم"۔

حضرات! چوں کہ مخدوم کے چاہنے والے بیرونِ شہر و دیگر اقطاعِ ہند بھی پائے جاتے ہیں اس لیے خیال ہوا کہ سب کو شرکت کا موقع دیا جائے

کیوں کہ سب کی آرزو یہی تھی۔ اس لیے سلسلہ زلف کی طرح دراز ہوا۔ اور خدا معلوم کب وہ روز نیک آتا کہ اچانک رمضان شریف آپہونچے۔ اور اس کے بعد مخدوم اپنے ساٹھ سال پورے کر لیتا۔ اس لئے جشن کا اعلان ہوا۔ مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے نہ لوگ سمجھنا چاہتے ہیں تو اسلئے بعین اس کی جوانی میں اس کا جشن منانا طے پایا۔ کچھ لوگ ایسے بھولے بھالے ہیں جو بڑی خوشی سے ذکر کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں کہ لیجئے مبارک ہو۔ مخدوم ساٹھ سال کا ہوگیا۔ سنا آپ نے ہاں حیرت ہے۔ مگر سچ مانئے یہ سن سن کر مخدوم کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ خدا جانے کب سے اس نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ اس کی عمر کا پہیہ الٹا گھوم رہا ہے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی خاتون محترم اپنی جوان جہان بچی کو اس سے ملاتے وقت کہتی ہیں بیٹا تو۔ یہ ہمارے ابا کے کلاس میٹ تھے۔ یا کوئی مرد بزرگ جن کے بالوں میں چاندی جھلملا رہی ہے بڑے خضوع و خشوع سے ہاتھ ملا کر کہتے ہیں آپ نے پہچانا نہیں میں بھی کالج میں آپ کا طالب علم رہ چکا ہوں۔ تو بیچارے مخدوم کی عجیب حالت ہوتی ہے کیونکہ جب بھی لڑکیاں گروہ در گروہ سامنے سے گزریں تو مخدوم بشرٹ کا لمہ ٹھیک کر لیتا ہے کیونکہ اس معصوم کو ابھی تک یہی خیال ہے کہ وہ سب اسے ہی دیکھ رہی ہیں۔ بات اُسے دیکھ کر اتنی عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ خدا معلوم اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مصری ممیوں کا کون نسخہ استعمال کیا تھا کہ برسوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور جوں کا توں سدا بہار۔ میرا خیال ہے کہ ریفریجریٹر اور تھرماس بنانے والی کمپنیاں مخدوم کو بطور اشتہار استعمال کر سکتی ہے۔ چونکہ بزنس میں نے سجھائی ہے رائلٹی میں بھی (۱۵) فیصد رائلٹی کی حقدار ہوں۔

ہر ایک شخص جشن مخدوم میں اس کی قصیدہ خوانی پر تلا ہوا ہے۔ سن سن کر جی جلا اور جل بھن کر کباب ہو گیا کیوں نہ جلے ویسے بھی مخدوم سے جی جلتا ہے۔ مغلپورہ کے نوابوں سے لیکر چکر گوڑہ کے مزدوروں تک جس کو دیکھئے فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدوم کی محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل یا نظم کیوں نہ کہے سارا شہر اسے منھ زبانی یکایک یاد کر لیتا ہے۔ حیدرآبادیوں کی تو خیر مخدوم کمزوری بن گیا ہے۔ افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں مگر نو وارد آئے ہوئے لوگ بھی لہرا لہرا کر منڈیلی کے چبوترے تلے گنگناتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو سیکھ گئے ہیں ظاہر ہے کہ ان باتوں نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے ایک تو شاعر ہے ویسے ہی اتراتا ہے پھر ان تعریفوں نے تو اس ہی مار دیا اس کا کریلا اور نیم چڑھا بن گیا۔ اسی لئے میرا جی چاہتا ہے سب تعریف کریں تو میں ہجو گوئی پر اتر آؤں تاکہ اینٹی ڈوٹ کا کام کرے۔ گھر میں بھی اس کی مخالفت مشکل ہے چاہنے والے ہر گھر میں موجود ہیں۔ اس لئے یہاں زیادہ محفوظ ہوں کیونکہ اسٹیج پر ایک نہیں کئی صدور تشریف فرما ہیں۔ جان و مال کی حفاظت کی ضمانت ہے۔

مخدوم اصل میں سخت کمینہ ہے۔ دیکھئے کئی سال ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ ایک غزل لکھ دے تاکہ میں مشاعرہ میں پڑھ کر داد وصول کر سکوں آپ کو تو معلوم ہی ہے شاعروں پر واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ تو پھر جی للچا ہی اٹھتا ہے۔ مخدوم نے فوراً حامی بھر لی کہ تازہ کلام مجھے دیدے گا۔ لیکن حال یہ ہے کہ شعر کا لفظ لفظ جس طرح وارد ہوتا ہے لوگوں کو نے لگتا ہے۔ یا تو مصرع، آدھا مصرع، پورا شعر اور پورا شعر ہر منزل پر سنایا جاتا ہے۔ اطراف لوگ نظر نہ آئیں تو فون پر سنائے گا۔ فون پر کوئی سننے والا نہ ملے تو لوگوں کے گھر جائے گا۔ وہ بیچارہ سن رکھا کر کہتا

کا کہ ایہ چونی وصول کرے گا پھر روپیہ بھی ہضم کر جائے گا اور شعر سنائے گا۔ اگر کوئی ڈھنگ کا سننے والا نہ ملے تو راستہ چلتے آدمی
کو روک کر سنائے گا۔ بلکہ اسے دیکھ کر آدمی خود سننے رک جائے گا۔ کوئی نہیں تو رکشا والے کو سنائے گا ہوٹل کے بیرے کو سنائے گا
ننھے منے بچوں کو سنائیگا۔ غرض وہ اسی طرح غزل یا نظم کے تمام ہونے سے پہلے ہر لفظ کئی بار سیکڑوں لوگوں کو سنا چکتا ہے
اور اس کا کلام مرض متعدی ہے۔ سننے والے دوسروں کو سنائیں گے۔ اس طرح حیدرآباد کی ساری پبلک طوطے کی طرح اس کا
کلام رٹ لیتی ہے۔ اس طرح تازہ غزل مجھ تک پہونچنے سے پہلے سب کو زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کمینہ نہ کہوں
تو اسے کیا کہوں۔ میر کے کلام سے سرقہ کرنا آسان ہے ممکن ہے کسی کو پتہ نہ چلے۔ لیکن مخدوم کا آدھا شعر بھی چوری کر لیجئے اور
کسی کو سنائیے تو سننے والا بقیہ آدھا شعر ذکر کرتا ہے۔ مخدوم نے کیا خوب کہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو والے خواہ مخواہ اس کا کلام نشر
کرنے سے بچتے ہیں۔ اس کا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ خود ہی بدنام ہوتے ہیں۔ وہ بذات خود ریڈیو اسٹیشن ہے اور بار بار اپنے پروگرام
اس طرح نشر کرتا ہے کہ دور نزدیک سب نہ صرف سن لیں بلکہ سن سن کر یاد رکھنے پر مجبور ہو جائیں اور جب کسی محفل میں سنانے کی
فرمائش ہو تو وہ بچہ بننے کی کوشش کرے گا۔ جیسے یاد نہیں۔ پبلک کے بے حد اصرار پر سناتے سناتے اٹک جائے گا اور پبلک ایک
آواز ہو کر جب اسے یاد دلائے گی تو اصیل مرغ کی طرح اکڑ کر ادھر ادھر فخریہ دیکھے گا۔ دیکھا آپ نے شاعری اس کو کہتے ہیں
اور دوسرے شاعر بیچارے غمزدہ ہو کر اپنی ناقدری کا غم بھلانے کے لئے رونے لگیں گے کسی شاعر کو بھی اس کے اپنے شہر کے
لوگ اس طرح سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتے۔ ایسی مزا بداری نہیں کرتے۔ میں نے کہا نا سب نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے
گھر کی مرغی دال برابر سمجھا ہی نہیں۔ صدیوں کی ناقدر دانی نباہنے وطن کی روایت توڑ دی۔ جب سے بھی واقعی حد ہے وہ روز سنائے
اور سال بھر تک وہی ایک چیز سناتا رہے تو بھی سب ہمہ تن گوش بن جاتے ہیں۔ خدا جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیتے ہیں
اکتانے کا نام نہیں لیتے باسی پرانی بوسیدہ غزلیں تک شوق سے سنتے ہیں اور دوسرے شاعروں کی سائیکلوجی خراب ہوتی ہے

اصل میں اس کی آواز میں جادو ہے۔ گہری طرحدار کھرا اور چڑھی ہوئی آواز جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتے ہیں
اور اداس کی رات میں گویا دیپک سا جل اٹھتا ہے۔ مگر جہاں آپ نے شوق کا اظہار کیا کہ لگے نخرے دکھانے۔ اصرار کیجئے کہ غزل
ترنم سے سناؤ تو تحت اللفظ پڑھنے لگے گا۔ بے سروں کو تو گانے کا شوق ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ ذرا آواز کی تعریف کی اور
تحت اللفظ پر اتر آئے۔ میرا خیال ہے کہ جشن مخدوم میں ایک ریزولیشن پاس کر دیا جائے کہ مخدوم جب سنائے ترنم سے سنائے
مجھ سے عرب ملکوں کی سیاحت کر کے آنے والے ایک سیاح نے کہا آہ ام کلثوم کیا آواز اس کی ہے۔ ساٹھ برس کی ہو چکی مگر آواز
کا جادو نہیں ٹوٹا۔ میں نے کہا آپ نے مخدوم کو نہیں سنا۔ ساٹھ برس سے تو ہم ہی سن رہے ہیں مگر آواز کا طلسم نہیں ٹوٹا۔ بلکہ ابرق
سی چمکنے لگی ہے۔

ریزولیشن کی بات آئی ہے تو ایک ریزولیشن اور پاس کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ جب بھی ادبی محفلوں میں مخدوم آئے تو اپنی لمبی لمبی
تقریروں سے پرہیز کرے نظم سنایا کرے۔ بہت سے لوگ اس کی تقریروں کو جھیل لیتے ہیں تو سمجھتا ہے کہ اس کی تقریر سننے کے
لئے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ سب اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اس لمبی تقریر کے بعد شعر سنائے گا۔ تقریر سننی ہو تو رنج سے سن لیں گے

چاہے فقط مخدوم شاعر ہے اور اس کا شعر سننے کے لئے ہی ہم آتے ہیں۔ تقریریں وہ ادب کی سرحد سے باہر جلسوں اور جلوسوں میں کر سکتا ہے۔

مخدوم شاعر بھی ہے شخصیت بھی، جادو بھی ہے اور جادوگر بھی۔ مگر بڑے بوڑھے، اس کا اعتبار مشکل ہے۔ وہ جب نہایت سنجیدگی سے باتیں کرتا نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی کو بنا رہا ہے اور بننے والے کو خبر بھی نہ ہوگی۔ آندھرا پردیش نیا نیا بنا تھا۔ ایک خاتون اردو سے بالکل ناواقف اپنی دانست میں بے حد با اثر ایک محفل میں مخدوم کو شعر پڑھتے سن کر بے حد متاثر ہوئیں۔ آواز یقیناً کانوں میں رس گھول گئی ہوگی۔ تمکنت سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں۔ مخدوم نے سوکھا منہ لٹکا کر مظلومیت سے دکھڑا دیا کہ بے کار ہوں۔ بے چاری ریڈیو اسٹیشن میں کام دلانے کا پکا وعدہ کر بیٹھیں اور مخدوم نے ان کی سرپرستی کے انداز کو اور شہ دی۔ انگلش میں ان سے بات کرتا اردو میں کا خطری دیتا جاتا۔ پاس بیٹھنے والوں کا برا حال تھا۔ ایکٹنگ تو اس کے لئے فطری تھی۔ بعد میں جب خاتون محترم کو معلوم ہوا کہ یہ تو لال مخدوم ہے، تو پھر نام سے ہی بدکنے لگیں۔

وہ تو خیر۔ مگر یہ سردار جعفری۔ خاصا چالو آدمی ہے۔ وہ بھی جھانسے میں آگیا۔ جب مخدوم نے اپنی آواز کا سلسلہ نسب حضرت بلال حبشی سے ملایا تو اس نے اپنے مضمون لکھ ڈالا اور شاید آج تک خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ یہ چار سو بیس جب چاہتا ہے سقراط بقراط بن جاتا ہے۔ جب چاہتا ہے قلوپطرہ اور قرۃ العین کا عاشق۔ یہ تو دلی کی راجدہانی جیسا ہے جس نے کبھی کسی سے سچ بولا نہ وفا کی۔ مگر وہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ سنجیدہ باتیں لطیفوں کی طرح بیان کرتا ہے اور گپ مارتے وقت افلاطون کی طرح سنجیدہ اور ذی شعور نظر آتا ہے۔ وہ بھی جو ہمیشہ سے اسے جانتے ہیں بارہا الو بنے ہیں کیونکہ وہ تو گرگٹ ہے۔ جب دیکھئے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے۔ اعتبار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس بہروپیے کا سچا روپ کون سا ہے۔

مخدوم اپنی مقبولیت پر آپ ہی نازاں ہے کہ مجھے سب جانتے ہیں۔ چاہیں نہیں تو جائیں کہاں، جو آپ کے سر پر سوار ہو جائے اسے سر پر بٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کوئی ٹھور ایسا نہیں جہاں وہ نہ جا سکتا ہو۔ ہوٹلوں میں، عورت مردوں میں، امرا ریاست والوں میں، اپوزیشن لیڈر، اور بچوں میں سرکس کا مسخرہ۔ میں نے بارہا اسے نہایت ہی گھریلو قسم کی عورتوں سے بگھارے بینگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور انباڑے کے آچار کی ترکیب پوچھتے سنا ہے۔

مخدوم کو اپنے بیو بلینک حسن پر بڑا ناز ہے۔ اب جو بنے بھائی نے اسے اجنتا کی مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے۔ پہلے ہی سے وہ اپنے آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے ترشا ہوا صنم سمجھتا ہے۔

مگر مخدوم محنت کا فر ہے۔ برا بھلا کہہ کر بھی عزیز رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک بار شام بہاراں میں پینے کا ذکر کیا تھا تو دوسرے ہی دن کئی مولویوں نے خطوط بھیجے اور برا بھلا کہا۔ لکھا تھا غزل کا کافر ہے۔ سچ مچ کافر نہیں ایمان پختہ ہے کہ ایک نہ ایک دن راہِ راست پر آ جائیگا۔ عوام بھی کہتے ہیں کہ دہریہ ہے تو کیا ہوا۔ دیکھ لیجئے بڑے پیر کے نام کی نسبت سے کیا نام نکلا ہے۔

یہ سب کہا مگر وہ رہتا ہے ہر ستا لفظوں کی زبان میں نہایت ... اور وہ مخدوم ... آئے ... بھی

دیکھئے۔ کل سے مرکس رہا ہے۔

مجھے آج سروجنی نائیڈو کی بیٹی لیلامنی یاد آرہی ہیں کالج میں کوئی تقریب ہو وہ سب سے آخر میں اشتعل انتھم کی فرمائش کرتیں، "وہ خم گردن وہ دست ناز" وہ ان کا سلام، مگر لعنت ہے مخدوم پر جس کے ایسے قدر داں ہے جو نہ وہ اپنی قدر گنوا تا ہے کوئی کہئے تو ناراض ہوتا ہے۔ لڑنے مرنے، مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کس قدر خواہش تھی کہ وہ منقطع کہئے کتنے اصرار پر لکھا، مگر یہ ذوقی کی حد ہے۔ جسے چاہتا ہے شعلہ شخ شعلہ بدن بنا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ساٹھ سالہ عمر کا اثر چہرے مہرے پر نہ سہی آنکھوں اور کانوں پر ضرور ہوا ہے آنکھوں کے اتنے اچھے اچھے ڈاکٹر شہر حیدرآباد میں موجود ہیں وہ یقیناً مخدوم کو بھی جانتے ہوں گے انھیں کیسے گوارا ہے کہ ان کی دور دور تک بدنامی ہو۔ اب بھی وقت ہے کہ ایک عینک اور ایک سماعت کا آلہ اس کی نذر کیا جائے۔

اس کا مجموعہ بساطِ رقص اجرا ہو گیا کچھ نظمیں تو بالکل راک ان رول کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ ٹوسٹ اور شیک اس لئے جب بجدینگ اسمارٹ لڑکیاں مخدوم کو سننے اور (ADMIRE) کرنے آتی ہیں اور ڈاون ہونے لگتی ہیں کہ اللہ کتنے سوویٹ ہیں مخدوم صاحب تو میں خطرے کی گھنٹی بجا دیتی ہوں' وہ جو سفید سر والے بزرگ راج بہادر بیٹھے ہیں نا ان سے فل ٹن ایرس بڑے ہیں۔ اور کئی نواسے نواسیوں کے نانا حضرت' وہ بڑی بے اعتبار سے روگا ڈ کہہ کر سنبھل جاتی ہیں۔ اور وقت کے سر پر سے خطرہ ٹل جاتا ہے' خدا معلوم مخدوم کیوں نہیں سوچتا کہ اور شاعر چاہے جو کریں مگر مخدوم کو لوگ چاہتے ہیں تو اس سے کچھ معیاروں کے طلبگار بھی ہیں۔

تو معلوم نہیں ہنسنے بولنے کھلکھلانے والا مخدوم شعر سناتا ہے تو مجھے وہ بالکل تنہا نظر آتا ہے۔ تنہا مسافر شب گزیدہ جو اپنے دل کا چراغ جلائے سب کے لئے راہ تلاش کر رہا ہو۔ آپ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوں گے۔ مگر شعر سن کر دل جیسے پگھلنے لگتا ہے۔ اسی لئے کافر ہے کمینہ ہے سب کچھ ہے مگر

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

"سرخ سویرا" حیدرآباد کے نوجوان ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کا مجموعہ کلام ہے جو قولاً اور فعلاً ہر لحاظ سے ایک ترقی پسند سیاسی نوجوان ہیں۔ مجموعہ کا ابتدائی حصہ رومانی نظموں پر مشتمل ہے جو کسی امتیازی خصوصیت کی حامل نہیں۔ دوسرے حصے میں "سپاہی"، "اندھیرا" اور "اسٹالین" کی آواز بہترین ادبی تخلیقات ہیں اور ہمارے دور کے ادبِ عالیہ کا جزو بن سکتی ہیں۔ مخدوم سے ہمارے ادب کے مستقبل کو بہت سی امیدیں ہیں۔

"سرخ سویرا" پر تبصرہ از ساحر لدھیانوی۔ ماہنامہ ادبِ لطیف ۱۹۴۵ء

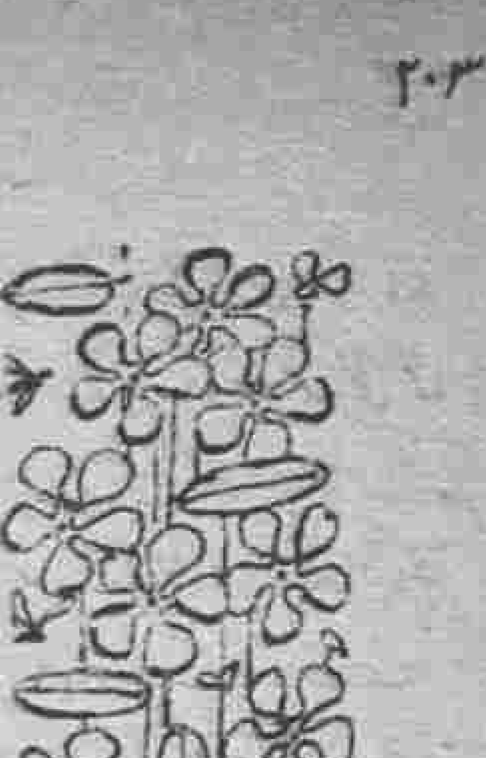

سدا بہار مخدوم

یوسف ناظم

● نباتیات یا شاید حیوانیات کی کسی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ جیسے جیسے آدمی کی عمر بڑھتی جاتی ہے وہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ مخدوم محی الدین نے بڑے ہی مہذب انداز میں اور نہایت خاموشی کے ساتھ یعنی چپ چپاتے اس قاعدہ کو غلط ثابت کر دیا۔ کلیوں (کلیہ کی جمع) کو غلط ثابت کرنا مخدوم محی الدین کا بڑا مرغوب فعل ہے۔ مخدوم اب بھی ہمہ تن جوان ہیں۔ لوگ جب سے انھیں دیکھ رہے ہیں ایسا ہی دیکھ رہے ہیں۔ کیا تعجب اندر ہی اندر وہ کسی شاہی طبیب سے مشورہ کرتے رہے ہوں۔ یوں مخدوم محی الدین بہت پرانے ہیں کیوں کہ وہ قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان کچھ اس طرح نظم کرتے ہیں گویا انھوں نے ہی قاضی کے فرائض انجام دیے تھے ـــ اس دور میں انھیں قاضی بننے کا موقع نہیں ملا کیوں کہ اس زمانے میں یہ ہوا کہ وہ دن بیاہ کی آگ میں جل گئے۔ قلی قطب اور بھاگ متی کی طرح ان کا عقد نہ ہو سکا۔ مخدوم مزاجاً "پسندیدہ" محبت ہیں۔ محبت کی ناکامی پر ان کے اندر بیٹھا ہوا کوئی شخص "چارہ گر" سے پوچھ بیٹھتا ہے۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

مخدوم محی الدین بڑے امداد باہمی قسم کے آدمی ہیں انھوں نے اور راج بہادر گوڑ نے مل کر بڑی مثالی امداد باہمیاں انجام دی ہیں۔ غالباً ۱۹۴۴ء میں ان دونوں کے درمیان ایک ہی سوٹ تھا جس دن مخدوم محی الدین کوٹ پہنتے تو راج بہادر گوڑ پتلون پہنتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس دن مخدوم کوٹ پہنتے پتلون بالکل نہ پہنتے ـــ پہنتے لیکن کوئی دوسری۔ برسوں یہ گرم سوٹ ان دونوں کے پاس رہا لیکن کسی ایک دن بھی ان میں سے کسی ایک کو پورا سوٹ پہننے کی اجازت نہیں ملی ـــ سیکل بھی غالباً ان دونوں یا جوج ماجوج کے پاس ایک ہی تھی۔ باری باری

یہ دونوں ہر جگہ "بلا اجازت" جاتے اور لوگوں کی نیکیوں اور بدیوں کا حساب لکھتے رہتے۔ مخدوم محی الدین اس زمانے میں لیبر آفس کے مستقل کا بکوں میں سے تھے۔ اپنی سیکل پر بیٹھ کر وہ گنڈی پاٹ سے بلاورشیٹ تک آتے اور راستے میں کبھی سیکل کی ہوا نکل جاتی تو مخدوم سیکل ہاتھ میں لے کر پیدل ہی آتے کیوں کہ ان کی پتلون اور کوٹ میں جیبیں تو ضرور تھیں لیکن آسیب زدہ مکان کی طرح خالی۔ لیبر آفس پہنچتے تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ چائے پینے سے انکار کر دیتے اور کہتے پہلے کھانا کھا چکے ہیں۔ مسکرا مسکرا کر زہر آلود باتیں کرتے۔ فرماتے ہندوستان میں مہا بھارت کے زمانے سے جو افلاس چلا آ رہا ہے اب تک قائم ہے ــــ مخدوم شاید مہا بھارت کے وقت بھی موقعہ واردات پر موجود تھے۔

مخدوم نے کپڑے پہننے میں نہیں، کتابیں لکھنے میں بھی "امداد باہمیت" کو برقرار رکھا۔ مخدوم نے میر حسن کے ساتھ سازش کر کے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ غالباً یہ کتاب اردو ڈراما کے بارے میں تھی "ایک کتاب دو مصنفین" اور "ایک سوٹ دو پہننے والے" مخدوم محی الدین کی "شرکت پسند" طبیعت کی نشانیاں ہیں۔ ان کا بس چلتا تو شاید وہ ادر محبت سے نجی و خانگی کام بھی امداد باہمی کے اصول پر انجام دیتے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کی بھی ایک نسل ہوتی ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل قسم کی نسلیں اس "قوم" میں کب پیدا ہوتی ہیں ٹھیک سے نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مخدوم کا تعلق کس نسل سے ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ مخدوم جامعہ عثمانیہ کی فصل کے ہیں۔ ان کی فصل میں سکیش، وجد، میر حسن، اشتفاق حسین، صمد رضوی، سکندر علی وجد، اکبر وفاقانی، بدر شکیب، اور نور الہدیٰ وغیرہ جیسے "جید" لوگ تھے۔ جامعہ عثمانیہ کی اس فصل میں وٹامن ہی وٹامن تھے۔ مخدوم اس وقت واقعی جوان تھے۔ اس وقت کی نئی شاعری کی پہلی پہلی آوازوں میں مخدوم کی آواز رسیلی آواز سب سے زیادہ سامعہ نواز تھی۔ مشہور یہ ہے کہ مخدوم جب سٹی کالج کے لڑکوں کو پڑھانے پر مامور تھے تو مخدوم پڑھاتے کم اور "سکھاتے" زیادہ تھے۔ ان کے سکھے ہوئے شاعروں میں ایک مرحوم لطیف ساجد بھی تھا۔ مخدوم اس زمانے میں شاعری کے انٹرونیس انجکشن دیا کرتے تھے۔ اس وقت شاید ان کی شاعری پر "پابندی" بھی لگ گئی تھی۔ اسی لیے مخدوم نے غیر پابند شاعری (آزاد نظم) شروع کر دی تھی۔

مخدوم بڑی ملٹی پرپز قسم کی اشیا میں سے ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور لیڈر بھی، عاشق بھی ہیں اور محبوب بھی ہیں اور محبوب بھی۔ خادم بھی ہیں اور مخدوم تو خیر اول ہی سے ہیں۔ وہ اس ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی طرح ہیں جس میں ہر شخص کو اپنے مطلب کا سامان مل جاتا ہے ــــ شاعر کی حیثیت میں مخدوم قدیم اور جدید کے درمیان کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ غزل تو وہ ایسی کہتے ہیں جیسے پنکھا جھیل رہے ہوں اور بادِ صبا کے جھونکے میں یقیناً کوئی رشتہ داری ہے ــ

ہجوم بادہ و گل میں ہجوم یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے. خواہ مخواہ کسی کو پریشان کرنے میں مخدوم کے اندر بیٹھے ہوئے شریر نوجوان لڑکے کو بڑا مزا آتا ہے. ایک آدھ سلام کر کے اگر مخدوم الگ ہو جائے تو ان کی عاشقی پر پانی پھر جاتا. لیکن وہ تو مجمع کی پرواہ کیے بغیر صبا السلام بن گئے اور انھوں نے ایک دو نہیں کئی سلام کر ڈالے. اور کسی کی نگاہ کئی بار جھک گئی.

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن

ہر صبح مے تلخی ایام بھی پی ہے

بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا

گو جام وہی ہے وہی پیمانہ وہی ہے

پہلے شعر میں واردات قلبی ہے تو دوسرے شعر میں قتل کی واردات. آنسوؤں سے لبریز آنکھوں اور متبسم چہرے کی زندہ مثال مخدوم کی شاعری ہے. یہ اگر شاعری نہ کرتے تو شاید آہ بن کر گھٹ جاتے ورنہ خواجہ میر درد تو ضرور بن جاتے اور ان پر ذک رات میں بام کی مالش کرنی پڑتی.

ان کی غزلیں اور رومانی نظمیں گنے کے رس . . . . کی طرح سبک اور شیریں ہیں لیکن ان کی انقلابی اور موضوعاتی نظمیں اتنی گرم ہیں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھ کر سہنی پڑتی ہیں. ان کی نظم کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے جیسے ٹرومن کی بولنگ. ان کی نظم پڑھیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ مخدوم نہایت تیز بھاگ رہے ہوں اور آپ کو انھوں نے ساتھ باندھ رکھا ہو. ان کی نظم "چاند تاروں کا بن" نہایت وحشت ناک ہے. نظم کاہے کو ہے اچھی خاصی تاریخ ہے.

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے

صبح کا کچھ اجالا اجالا بھی ہے

ہمدمو

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی (آپ سمجھیں گے دار پر پہنچ کر منزلیں ختم ہو گئیں لیکن نہیں)

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدوم لیڈر ہونے کے حساب سے چونکہ مقرر ہیں اس لیے وہ چپ رہنے کے قائل ہیں. لیکن وہ ان مقرروں میں سے ہیں جو دوسروں کو بولنے کی دعوت دیتے ہیں. ورنہ آپ نے کتنے ہی لوگوں کو دیکھا ہوگا جو صرف اپنی

ہی آواز سُننا پسند فرماتے ہیں۔ مخدوم کہتے ہیں چپ نہ رہو۔

آدمی کو کیوں چپ نہ رہنا چاہیے اس کی وجہ مخدوم یہ بتاتے ہیں کہ:۔

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے

اور ہو جشنِ شہیدانِ وفا، چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو، چپ نہ رہو۔

مخدوم عجیب و غریب آدمی ہیں۔ دوسروں پر وہ قطعی ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔ قطعی خاموش نہیں بیٹھ سکتے لیکن خود ہنس ہنس کر زہر پیتے رہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو عشق ہے ہی بری بلا۔

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانہ کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

یہاں ان کی ساری دلیری دھری رہ جاتی ہے اور منہ پر تالے لگ جاتے ہیں۔

مخدوم میں ایک چیز بڑی خاص ہے "اپنا پن"۔ ان کے "آندھرا کٹ" کے چہرے پر کچھ اس غضب کا بھولا پن ہے کہ آدمی انھیں غیر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ امریکہ، جرمنی یا روس میں پیدا ہوئے ہوتے تو یقیناً سراغ رسانی کے محکمے میں بھر لیے جاتے۔ ایسے چہروں پر تو وہاں خزانے لٹا دیئے جاتے ہیں۔

مخدوم رہائش کے معاملے میں بڑے مستقل مزاج ہیں۔ ایک زمانے میں وہ پرانے انڈیا کافی ہاؤس میں رہتے تھے۔ وہ اس میں اتنا رہے کہ خود کافی ہاؤس کو بند ہو جانا پڑا۔ پھر وہ شاید ویکاجی میں بھی رہنے لگے۔ ویکاجی کو بھی اٹھ جانا پڑا۔ اب غالباً وہ اورینٹ ہوٹل میں رہتے ہیں ــــ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

دل میں اتر کے سیرِ دلِ رہرواں کریں
آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں
ماضی کی یادگار سہی یادِ دل تو ہے
طرزِ نشاطِ نوحہ گراں دیکھتے چلیں

جامعہ عثمانیہ کا ایک مایۂ ناز فرزند — مخدوم

مبارز الدین رفعت

● دنیا کی اولین اور اب اس وقت آخرین اردو جامعہ عثمانیہ مرحوم، ہائے زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا جسے شباب کے بدلے موت آئی، جس کی قسمت میں جینے کے دنوں میں مرنا لکھا گیا، جوانا مرگی جس کا مقدر ہوا، مشکل سے اپنی تیس سالہ کم عمری میں اردو دنیا کو کیا کچھ نہ دے گئی۔ علوم و فنون اور سائنس و حکمت کے تمام شعبوں میں درس و تدریس کی آخری اور انتہائی منزلوں تک اردو زبان کے ذریعہ تعلیم کا کامیاب تجربہ، بے شمار علمی اور فنی اصطلاحات علمی اور فنی طرزِ بیان اور طریقۂ اظہار، باوقار علمی اور فنی لہجہ، تحقیق اور تدقیق کے اعلیٰ معیاری نمونے!

اسی بے نصیب جامعہ کے فیضِ تحقیق سے اردو ادب کی تاریخ کی مختصر عمر دراز ہوئی۔ کہاں دو سو سال پہلے کے ولی اورنگ آبادی اردو کے باوا آدم سمجھے جاتے تھے اور اب کہاں ولی سے بھی چار سو سال پہلے کے عظیم مصنف اور شاعر حضرت مخدوم سیدنا سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ اردو کے اولین نثر نگار اور شاعر تسلیم کر لیے گئے۔ اردو کا اولین اور نہایت تابناک، چار سو سالہ ادبی دور اسی کی سعیِ پیہم سے منظرِ عام پر آیا۔ محمد قلی، ابن نشاطی، وجہی، غواصی، وجدی نصرتی، ہاشمی، شاہی اور ایسے ہی کتنوں کے ادبی شہ پارے جو صدیوں سے ہماری بے حسی اور کم نگاہی کے مرثیہ خواں طاقِ نسیاں میں پڑے ہوئے تھے، منظر عام پر آئے۔ ان ادبی شہ پاروں نے اردو زبان و ادب کی عمر ہی دراز نہیں کی، اردو ادب کی وقعت اور وقار میں بے اندازہ اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ شمالی ہند کے بعض علاقوں کے اس جبلی مرکب اور ناز بے جا کو بھی ختم کر دیا کہ وہی "اہلِ زبان" ہیں، تنہا وہی زبان دانی کے

اجارہ دار ہیں۔ اردو کے اولین ادبی دور میں گولکنڈے کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی درباروں نے اُردو کی جو بیش بہا سرپرستی کی اور دورِ حاضر میں جامعۂ عثمانیہ مرحوم نے جو بیش قرار خدمت انجام دی، اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو کو بولی ٹھولی کی معمولی کی زبان کے درجے سے اٹھا کر ادبی اور علمی زبان بنانے میں ارضِ دکن نے کتنا شاندار حصہ ادا کیا ہے۔

اس جوان مرگ مرحوم اُردو جامعہ نے اپنی نہایت قلیل مدتِ حیات میں اُردو دنیا کو کیسے کیسے بیش بہا جواہر دیئے ہیں۔ سائنس کے میدان میں ڈاکٹر رضی الدین، فلسفہ کے میدان میں ڈاکٹر ولی الدین، ڈاکٹر وحید الدین، تاریخ کے میدان میں پروفیسر عبدالمجید صدیقی، ڈاکٹر ابونصر محمد خالدی، عربی کے میدان میں ڈاکٹر عبدالمعید خان، اسلامی دینیات میں ڈاکٹر غوث، ڈاکٹر یوسف الدین، قانون کے میدان میں ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر سیادت علی، اُردو زبان اور اُردو ادب کی تاریخ نگاری کے میدان میں ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، تنقید کے میدان میں شیخ چاند، عزیز احمد، افسانہ اور ناول نگاری کے میدان میں عزیز احمد، مزاح نگاری کے میدان میں یوسف ناظم، شعر کے میدان میں مکش، سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین، یہ تو بس ایک چلتی ہوئی فہرست ہے۔ تفصیل میں جائیے تو اور کتنے ہی نام اس فہرست میں بڑھائے جا سکتے ہیں یہ سب کے سب اسی مرحوم درسگاہ کے فیض یافتہ، اس درسگاہ کے لیے ہی کیا کسی بھی جامعہ کے لیے باعثِ فخر و نازش!

جامعۂ عثمانیہ مرحوم کے فیض یافتہ شاعر لوگ تو بہت ہیں، پروفیسر باقی مرحوم نے تو "شعرائے عثمانیہ" کے نام سے ان شاعروں کا ایک تذکرہ ہی مرتب کر دیا ہے۔ لیکن ان شاعروں میں دو شاعر ایسے ہوئے ہیں کہ ان کے کلام نے ہندوستان گیر شہرت پائی، ان کے نام کا آوازہ پوری اُردو دنیا میں گونجنے لگا۔ ایک سکندر علی وجد دوسرے مخدوم محی الدین۔

آج سے تقریباً تیس سال ادھر کی بات ہے، میں اسکول کی شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک عزیز عثمانیہ یونیورسٹی کے کالج میں پڑھتے تھے۔ اور اس کے ہاسٹل میں رہتے تھے۔ چھٹیوں میں وہ گھر آتے تو بڑے فخر کے ساتھ اپنے سے عمر میں چھوٹے عزیزوں کو ہاسٹل کے قصے سناتے۔ ہم سب بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ یہ قصے سنتے، اور سوچتے کہ وہ وقت کب آئے گا کہ ہم بھی کالج میں پڑھیں گے اور اس کے ہاسٹل میں رہیں گے۔ ایک بار انھوں نے ایک قصہ سنایا کہ کسی دیہاتی طالب علم کا پیلے رنگ کا دوشالہ جو چوری گیا یا رفیقوں نے اڑا لیا۔ اس پر اس طالب علم نے اپنے دوشالے کے غم میں ایسی ایسی حرکتیں کیں کہ پورے ہاسٹل کو مزہ آ گیا۔ ہاسٹل کے ایک سینیر طالب علم، مخدوم محی الدین نے جو ان دنوں شاید بی۔ اے۔ یا ایم۔ اے کے درجے میں پڑھتے تھے ایک پُرلطف نظم، اس دوشالے کے مرثیہ کے طور پر لکھ ڈالی۔ یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ ہاسٹل میں کورس میں گائی گئی، ہاسٹل سے نکل کر پورے کالج میں پھیلی اور کالج کی چار دیواری سے نکل کر شہر میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ اب تو وہ نظم میرے ذہن سے اتر گئی ہے، لیکن جب میں خود کالج میں پڑھنے آیا تو میرے اکثر ساتھیوں کو یہ نظم یاد تھی۔ عنوان تھا "پیلا دوشالہ"۔ بڑی پُرلطف مزاحیہ نظم تھی۔ اسی نظم کے ذریعہ مستقبل کے ایک عظیم فنکار سے میرا پہلا تعارف ہوا۔

پھر میں نے "پیلا دوشالہ" سے کہیں زیادہ سنجیدہ موضوعات پر مخدوم کی نظمیں پڑھیں، مشاعروں میں ان کی

زبانی اِن کا کلام سُنا۔ اللہ اللہ، کیا لحن داؤدی اس شاعر نے پایا ہے۔ پیشہ ور گویوں کے انداز میں تال سُر سے درست شعر خوانی نہیں۔ شہزادوں کے انداز میں بے پناہ ترنم کے ساتھ شعر خوانی جگر مراد آبادی، نظر حیدر آبادی اور مخدوم محی الدین پر ختم ہوگئی۔ جن لوگوں نے مخدوم کی زبانی اِن کا کلام سُنا ہے، وہ گواہی دیں گے کہ لحن کی دل آویزی اور کلام کی رعنائی دونوں... خوبیاں جب ایک جگہ جمع ہوجاتی ہیں تو کیا شراب دو آتشہ کا مزہ آتا ہے، اس کے نشہ میں سب ہی مست و بے خود ہوجاتے ہیں ایک سحرِ حلال ہوتا ہے کہ ہر سُننے والے کو اِتنا مبہوت و متحیر کردیتا ہے کہ کلام کی داد دینا تک وہ بھول جاتا ہے۔

مخدوم نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کی سند حاصل کرلی تو فکرِ معاش کا سوال سامنے آیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کا زمانہ پوری دنیا کے لئے بڑی کساد بازاری کا زمانہ تھا۔ اِس عالمی کساد بازاری . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

کے... زمانے میں مخدوم سرکاری ملازمت کی تلاش میں نکلے تو بڑی تگ و دو کے بعد محض سید محمد اعظم صاحب (بعد میں نواب اعظم جنگ بہادر) کی وجہ سے جو حیدر آبادی تحریک کے بڑے زبردست حامی اور حیدر آباد کے بہت بڑے محسن ہیں مخدوم کو سٹی کالج میں صرف چالیس روپیوں کی مدرسی ملی۔ اور ایک مدت تک مخدوم کو اسی پر قانع رہنا پڑا۔ بعد میں مخدوم نے اِس کارِ مدرسی پر بھی لعنت بھیجی، ملازمت کا جوا اُتار پھینکا اور دل و جان سے اپنے آپ کو اشتراکی تحریک سے وابستہ کرلیا۔ یہ تو تحلیلِ نفسی کا کوئی ماہر ہی بتا سکے گا کہ اس سماجی بے انصافی نے مخدوم کو ایک سچے اور پکے کمیونسٹ بنانے میں کتنا حصہ ادا کیا ہے۔ بہر حال، اچھا ہی ہوا کہ مخدوم کے ساتھ انصاف نہ ہوا۔ انصاف ہوتا تو مخدوم بھی ہزاروں سرکاری ملازموں کی طرح اپنی انفرادیت کھو دیتے، اپنی خودی بیچ دیتے، دنیا کو نئے سرے سے بنانے اور سنوارنے کے خواب تک نہ دیکھ سکتے۔

تلنگانہ کی عظیم یادگار عوامی تحریک ایک عظیم رہنما سے محروم ہو جاتی۔ ایک آتش نوا شاعر کے ولولہ انگیز انقلابی نعروں سے اُردو کا دامن خالی ہی رہ جاتا، مولانا محمد علی، آئی سی ایس کے امتحان میں ناکام رہے۔ کامیاب ہو جاتے تو آئی سی ایس کے گم نام سرکاری ملازموں کی فوج میں ہندوستان کی جنگ آزادی کا ایک بے باک مجاہد اعظم، ایک شعلہ نوا خطیب، ایک جادو بیان ادیب اور ایک درد مند شاعر ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتا!

بعض اوقات فطرت اپنی کوتاہیوں کا کیسے انوکھے انداز میں کس فیاضی کے ساتھ بدل کر دیتی ہے!

سیاست کی بات تو اہل سیاست جانیں۔ میں تو ادب کا طالب علم ہوں۔ دیکھنا اور دکھانا یہ چاہتا ہوں کہ اس سیاست نے ایک عظیم فن کار کے خیالات میں کس طرح تبدیلی پیدا کی شاعری میں اس کی منزل ان اثرات نے کس طرح متعین کی۔ سماجی اور سیاسی حالات نے اس کے نغموں کی کیا صورت گری کی۔

ہر سچے اور بڑے شاعر کی طرح قدرت کی طرف سے مخدوم کو بھی بڑا احساس اور محبت کرنے والا دل ملا ہے۔ ابتداء میں تو حسن کے ہر جلوہ سے وہ متاثر ہوئے اور حسن و عشق کے ترانے انہوں نے غزلوں اور نظموں کی صورت میں خوب گائے کسی پیکر ناز کے وصال میں فراق اور فراق میں وصال کے مزے خوب لوٹے۔ ایسے ہی لمحات میں کہیں بے اختیار ہو کر پکارا ؎

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

کہیں۔ اسی پیکر ناز کی بزم میں اس کے حسن سلوک پر یہ دل دوز فریاد کرتے سنے گئے ؎

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

کہیں کسی ساگر کے کنارے چند مہ وشوں کو دیکھا تو اس جلوۂ رنگین سے متاثر ہو کر گنگنایا ؎

پانی میں لگی آگ پریشاں ہے مچھلی
چند شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے!

پھر کہیں دلبروں اور مہ پاروں کی محفل میں پہنچ گئے تو ان کی جبین نیاز کے سجدوں نے یہ شعری قالب اختیار کر لیا ؎

کیا کہوں کن دلبران خاص کی محفل میں ہوں ٭ کیا بتاؤں کن نگاہوں میں ہوں کیسے دل میں ہوں
واجب و امکاں کی کس اس حد میں ہوں میں کیا کہوں ٭ کیسی کیسی محفلوں کی زد میں ہوں میں کیا ہوں
کیا کہوں کن مہ وشوں، کن دلبروں کا ساتھ ہے ٭ کیسے کیسے آتشیں پیکروں کا ساتھ ہے!

کہیں انہوں نے دو انسانوں کو محبت کرتے دیکھا اور پھر ظالمانہ سماجی بندشوں کی وجہ سے اسی محبت کی چتا پر

ان کی نعشیں جلتی نظر آئیں۔ حساس شاعروں کا دل بے اختیار بھر آیا اور اس جان گسل حادثہ پر ایک پرسوز مرثیہ ہی اس نے لکھ ڈالا۔

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے

انہوں نے شہر حیدرآباد کے بانی، سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ بھاگ متی کے حسن و عشق کی داستان سنی۔ بھاگ متی کی داستان وفا سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ ایک مقتدر بادشاہ کی چہیتی ملکہ کی حیثیت سے نہیں، پیار دیش کی ایک پاکیزہ دیوی کی حیثیت سے اس کی خدمت میں اپنا نذرانۂ عقیدت لے کر حاضر ہو گئے۔

پیار سے آنکھ بھر آئی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

لیکن جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا، جیسے جیسے ان کی نظر وسیع و عمیق ہوتی گئی، وہ بھی ہر عظیم و بلند مرتبت فنکار کی طرح محسوس کرنے لگے کہ زمانے میں محبت کے سوا اور بھی غم ہیں، وصل کی راحتوں کے سوا اور بھی راحتیں ہیں۔ اس جنت ارضی میں حسن ہی نہیں، قبح بھی ہے۔ یہاں پھول ہی نہیں کانٹے بھی ہیں۔ یہاں نیکیاں ہی نہیں بدیاں بھی ہیں۔ یہاں محبت ہی نہیں نفرت بھی ہے۔ یہاں پریم ہی نہیں، ظلم بھی ہے۔ انسان نے جہاں اس جنت ارضی میں اپنی محنت سے پھول کھلائے وہاں کانٹے بھی اس نے بو رکھے ہیں۔ جہاں محبت کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے وہاں اس نے خود غرضی، ظلم اور استبداد کو بھی خوب فروغ دے رکھا ہے۔ ان ہی خاروں نے گلزار انسانیت کو خارستان اور جنت ارضی کو جہنم زار بنا دیا ہے۔

پھر انہوں نے اپنے ملک میں ہر طرف پھیلی ہوئی غربت دیکھی۔ اپنے ملک کی جہالت دیکھی، اپنے ملک کی طالمانہ رسم پرستی دیکھی، اپنے ملک میں مذہب کے نام پر مذہب کے ماننے والوں کی درندگی دیکھی۔ انسان انسان کے درمیان دیوار کھڑی کرنے والی ذات پات کی حد بندیاں دیکھیں، دولت کی نابرابر تقسیم کے بھیانک نتائج دیکھے۔ سامراج کا استبداد اور چیرہ دستی دیکھی۔ مغرب کی عیارانہ بالادستی دیکھی۔ اپنے ملک کی تنگدستی اور بے بسی دیکھی۔ کم و بیش یہی کیفیت پورے مشرق پر چھائی نظر آئی۔ انہوں نے مشرق کے ہر ملک پر ایسی ہی نکبت اور نحوست کا سایہ چھایا دیکھا۔ حساس شاعر کے احساسات نے الفاظ کا جامہ پہنا۔ زوال یافتہ مشرق کی کیسی دل دوز تصویر اس نے نظم "مشرق" میں کھینچ کر رکھ دی ہے۔

جہل، فاقہ، بھوک، بیماری، نحوست کا کال ✦ زندگانی، تازگی، جدت و فرصت کا کال

وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام ⁂ پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جسکے اس مشرق کو دیکھ ⁂ کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک سنگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی ⁂ مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں ⁂ خواب اصحاب کہف کو پالنے والی زمیں

لیکن مشرق کی اس مرثیہ خوانی پر ہی شاعر قانع نہیں رہ جاتا، ان حالات کو دیکھ کر اس کے سینے میں ایک نیا عزم اور ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد ⁂ گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن!

وہ اس فرسودہ اور ناکارہ مشرق کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ایک نئی دنیا اور ایک نیا آدم بسانے کی جد و جہد میں لگ جاتا ہے ؎

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا ⁂ اک نئی دنیا، نیا آدم بسایا جائے گا!

مخدوم نے ڈرائنگ روم کے نرم صوفوں پر بیٹھ کر یا آرام کرسی پر دراز ہو کر، یا مخملیں بستروں پر لیٹ کر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ذہنی عیاشی کے طور پر انقلاب کا نعرہ نہیں لگایا۔ محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کے خواب نہیں دیکھے، جھونپڑوں میں رہ کر جھونپڑے والوں کے لیے محلوں کے خواب دیکھے ہیں۔ ان کی دانست میں اِس ملک کے لیے جو سماجی اور سیاسی نظام بہترین ہو سکتا تھا اس کے قائم کرنے کی جد و جہد کرنے والی جماعت سے انہوں نے اپنے آپ کو دل و جان سے وابستہ کر لیا۔ اس راہ کے جتنے شدائد ہو سکتے تھے وہ سب انہوں نے برداشت کیے۔ عوام میں عوام کی طرح رہ کر کام کیا۔ انہیں کی طرح سوکھی روٹی کھائی، انہیں کی طرح موٹا کپڑا پہنا۔ جب یہ تحریک حکومتِ وقت کی خطرناک ٹھہری تو روپوشی کی ساری صعوبتیں جھیلیں اور آخر میں قید و بند کے کڑے امتحان سے بھی گذرے۔ اسی لیے جب اِن کی زبان سے

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی، آزادی کے پرچم کے تلے

والی نظم عوام نے سُنی تو ہزاروں لاکھوں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مجھ جیسے لاکھوں بے عملوں میں بھی یکبارگی کچھ کرنے اور کر گزرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ مخدوم نے اپنی یہ مشہور نظم اپنے انتخابی جلسوں میں عوام کے شدید اصرار پر بار بار سنائی ہے۔ میرا خیال ہے اِس ولولہ انگیز نظم نے انہیں جتنے ووٹ دلائے ہیں، شاید بلیغ سے بلیغ اور پرجوش سے پرجوش تقریریں بھی انہیں نہ دلا سکتیں۔

پھر انہوں نے کارل مارکس اور لینن کے بعد اشتراکی تحریک کے سب سے بڑے رہنما اسٹالین پر نظم لکھ کر اس عظیم رہنما کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا تو غالباً ان کے ذہن میں واضح طور پر یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ ہمارے ملک کے حالات کو سنوارنے، ہماری زبوں حالی کو دور کرنے، ہمیں شاہراہِ ترقی پر گامزن کرنے، ہماری صفوں میں انتشار کو

صب

رہ گئے، عام قومی خودغرضی، بے ایمانی، اور بے حیائی سے نجات دلانے کے لئے ہمیں اسٹالین جیسے ہی مردِ آہن کی ضرورت ہے۔ جمہوریت چاہے انگلستان یا امریکہ یا یورپ کے کسی دیس میں کتنی ہی کامیاب کیوں نہ رہی ہو، ہمارے جیسے جاہل، ناخواندہ بچھڑے ہوئے ملک کے لئے جمہوری نظامِ حکومت شاید کچھ کامیاب ثابت نہ ہوگا۔ اس نام نہاد جمہوریت میں وہ ساری خودغرضیاں اور خرابیاں جو شخصی حکومت کا لازمہ سمجھی گئی ہیں، در آئیں گی۔ ہم نے پچھلے بیس سالوں میں اس جمہوریت کا تجربہ بھی کر دیکھا اور مدت ہوئی اس کو ایک جسدِ بے جان بنا بھی چکے۔ اور اب آئے دن ہم نہایت دھوم دھام کے ساتھ اس بے جان لاش کے مختلف اعضاء کے جنازہ کے جلوس نکالنے میں مشغول ہیں۔

مخدوم نے دوسری عالمی جنگ کے دوران میں روس پر حملہ آور نازیوں کے مقابلے پر جاتے ہوئے ہندوستانی سپاہیوں کو دیکھا۔ بیوی بچوں سے بچھڑ کر اپنا سر کٹانے جانے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ان کا جی بھر آیا۔ لیکن اس اُمید پر کہ شاید ان کی یہ قربانی ہمارے اس اُس وقت کے حالات کو بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوں، جی کڑا کر کے ان کو رخصت کیا ہے ؎

جانے والے سپاہی سے پوچھو، وہ کہاں جا رہا ہے
کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو، وہ کہاں جا رہا ہے
کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو، وہ کہاں جا رہا ہے
گِر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا!

پھر وہ قید و بند کی مصوبت میں ڈالے گئے تو انہیں اس عالم میں بیوی بچے، دوست احباب، گھر بار، زندگی کی ہر ادا یاد نہیں آئی۔ وہ ان کے لئے تڑپے اور ترسے نہیں۔ انہیں یہاں بھی یہی غم ستاتا رہا کہ انہیں جتنی عمر ملی تھی، وہ سب [illegible]

سینکڑوں لاکھوں عوام کو جو اب بدادِ سیاست سے غمیں اور جو سرمایہ داری سے نڈھال ہیں، سکھی، خوش حال اور سربلند بنانے کی سعی و کوشش میں کیوں نہ صرف کر سکے ۔

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی اُمنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھ کو غم ہے کہ مرا گنج گراں مایۂ عمر
نذرِ زندان ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا !

دورِ حاضر کے ایک اور بہت بڑے شاعر فیضؔ اور مخدومؔ کے کلام کا تقابلی مطالعہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ ان دونوں ہم عصر اور قریب قریب ہم عمر شاعروں کے کلام، طرزِ فکر، سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر اور زندگی کے بعض حوادث میں چونکا دینے کی حد تک مشابہت اور مشارکت نظر آتی ہے۔ دونوں نے نہایت اونچی تعلیم پائی ہے۔ دونوں نے زندگی کی کسی نہ کسی منزل میں کارِ مدرسی کو اپنایا ہے۔ دونوں نے اشتراکیت کو اپنا سیاسی مسلک بنایا ہے۔ دونوں نے نظری طور پر نہیں عملی طور پر اس میں حصہ لیا ہے۔ دونوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ ایک کی قید نے اُردو زبان کو زندان نامہ کی بعض پیاری نظمیں دی ہیں۔ ایک کے قید و بند نے "قیدی" جیسی پُر اثر نظم بخشی ہے۔ دونوں نے اُردو کے مسلمہ اور مروجہ کلاسیکی انداز میں نغمہ سرائی کی ہے اور اس میں نہایت پاکیزہ شعر پیش کئے ہیں۔ دونوں نے مغربی طرز کی شاعری کے نئے سانچوں کے تجربے کئے ہیں اور آزاد، بے قافیہ، بلینک ورس میں بھی نہایت کامیاب اور اعلیٰ درجے کی نظمیں لکھیں۔ دونوں نے نہایت بھرپور رومانی نظمیں لکھیں اور حبِ انسانیت کے نہایت پُر جوش پُر اخلاص ترانے بھی گائے۔ دونوں نے کسی "ساقیٔ گل فام" کو دل کی اتاہ گہرائیوں کے ساتھ چاہا، اور "پیارے وطن" پر کبھی وہ سو جان سے قربان ہوئے۔ دونوں نے زخمی انسانیت کے رستے ہوئے ناسوروں کو دیکھا، اس کے غم میں گھلے اور تڑپے۔ دونوں نہ اس عشق پر نادم ہوئے ہیں نہ اس عشق پر۔ دونوں نے ہر طرح کے داغ سینے ہیں۔ بجز داغِ ندامت۔ دونوں کی شاعری میں مشرقی شاعری کا رچاؤ اور مغربی شاعری کی جھلک ملتی ہے۔ دونوں مشرقی اقدار کے حامی اور مغربی اقدار کے قائل ہیں۔ دونوں کی شاعری میں حسن کاری لہجے کی شیرینی ہے۔ مرصع کاری میں فن کاری ہے، اسی لئے حسن و شش اور جاذبیت ہے۔ دونوں کی شاعری میں زندگی پر اعتماد ہے۔ ایک بہتر اور روشن مستقبل کی نوید ہے، رجائیت ہے، دونوں کے یہاں ایک ولولہ، عزم اور احتجاج ہے، انسانیت کے رستے ہوئے ناسوروں کو دیکھ کر ان کا دل درد سے معمور ہے، احساس ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ دونوں نہ صرف ایک انسان دوست شاعر اور نہایت بلند اور اونچے درجے کے فن کار ہیں۔

جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

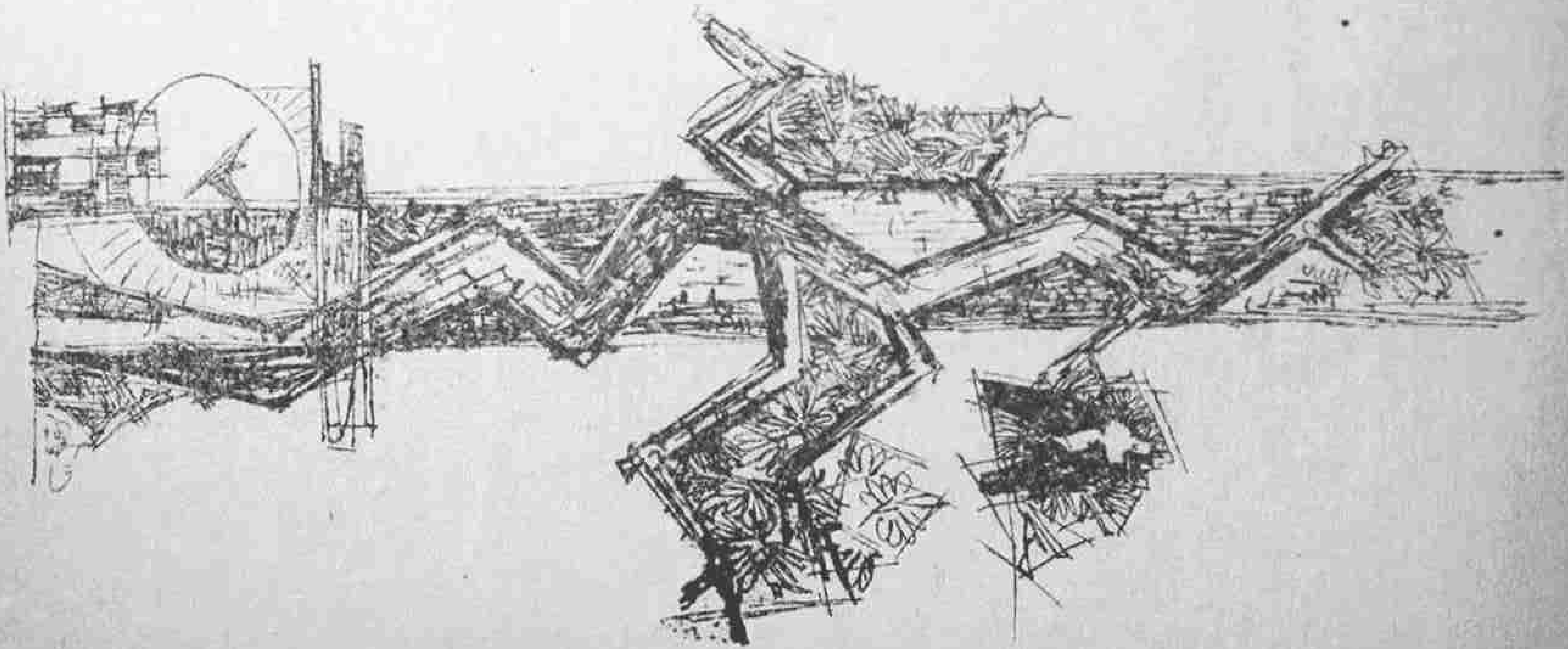

جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

شخصیت کے مختلف پہلو

لکھنے والے

عبدالرحمٰن چغتائی
علامہ حیرت بدایونی
احسان دانش
ماہر القادری
علی جواد زیدی
کوثر چاندپوری
سلام مچھلی شہری
حکیم یوسف حسین خاں
احمد جمال پاشا
غلام حیدر
جی۔ ایم عمر خاں
سلامت اللہ
ظ۔ انصاری
خلیل الرحمٰن اعظمی
گوپی چند نارنگ
شجاعت علی سندیلوی
مسیح الزماں
واجدہ تبسم
جوگندر پال

مخدوم بندہ

عبدالرحمٰن چغتائی

● یہ واقعہ ۱۹۳۹ء کا ہے۔ ایک شام حیدرآباد دکن کے ایک ریستوران میں، چند دوستوں کے ہمراہ بیٹھا تھا جن میں حیدرآباد کے ادبی حلقے کے لوگ بھی جمع تھے۔ اس ہاؤ ہو میں ایک کھچڑی بالوں والا قلندر سا نظر آیا۔ چہرہ مشقت کی مٹی سے اٹا ہوا تھا عوامی لباس میں، مخصوص ترکی ٹوپی میں۔ کھلے کھلے قہقہوں میں عوام کا درد لیے۔ اس کے ارد گرد ایسے لوگ جمع تھے جن کے اندر نئی زندگی جنم لینے کے لیے پر تول رہی تھی۔ ان کے چہروں کی تعمیر میں وہاں کی ثقافتی قدریں پروان چڑھ رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے دل چاہا اس قلندر نما شخص کے بالوں کو ذرا الجھا جائے۔ بلایا جائے، گفتگو کی جائے اور جو وہ بے ربط سے کہے جا رہا ہے سنا جائے۔ قوالوں کی سرزمین پر یہ شام تو یونہی گزر گئی مگر اس شام کی یاد اس گرد کی مانند داغ کو اپنی لپیٹ میں لیے رہی جو اکثر بے ہودہ رئیس شانِ امارت دکھانے کی غرض سے پیدل چلنے والے شہریوں کو گرد و غبار میں لپیٹ کر بے اعتنائی سے گزر جاتے ہیں۔

دوسری صبح وہی قلندر نما بالوں والا مشتبہ سا شخص عابد روڈ پر ایک پان فروش کے ہاں کھڑا نظر آیا۔ چاہا اسے جھنجھوڑوں، شانوں سے پکڑ کر مخاطب کر لوں۔ مگر اس کی اجنبیت اور بے نیازی سے میرا ذہن حکم نہ لے سکا۔

مخدوم جسے عوام کا بندہ، انقلابی شاعر کہا جاتا ہے چند دوستوں کے ہمراہ خود مجھ سے ملنے چلا آیا۔ یاد ہے بے تابی سے بازو پھیلائے اسے چھاتی سے لگا لیا تھا۔ اور پوچھا تھا حیدرآباد کی مٹی سے تو بنا ہے یا اس مٹی نے تجھے بنایا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ تیرے چہرے کی یہ مٹی دھونے سے بھی دھل نہ سکے گی۔ اس نے نچارے اور لٹکے مسکراتے ہوئے کہا یہ تو جانے اور نہ جانے کا سوال ہے۔ یہ وہی مخدوم تھا جس نے تنگ دستی، حقوق کی پامالی اور ذہنی مزدوری غلامی کے خلاف قلم اٹھایا اور اپنی ذہانت سے سب کو

متاثر کیا۔ اور دیدہ وری سے جغتائی کو اپنے قریب کر لیا، دیکھتے دیکھتے دوست بنا لیا۔ وہ واقعی بھی دوست بننے کی اہلیت رکھتا تھا اور اس کی پیشانی سے سعادت مندانہ کھوٹے کھرے کی پرکھ صاف نظر آتی تھی۔ جب بھی وہ ملتا ایسا محسوس ہوا اتنی شاعری سے معاشرے کے نیک و بد سے اس کا پیدائشی رشتہ ہے۔

اسے اکثر میری تصویریں دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ اس نے میری تصویر قلندر پر ایک غیر فانی نظم لکھی جس میں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی بھرپور عکاسی موجود تھی۔ مجھے یاد ہے اور غالباً میں نے کئی بار اپنے الفاظ کو مختلف صورتوں میں دہرایا بھی ہوگا، میں آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے شعر اور نظم کی لطافتوں اور حقائق کو محض متاثر ہونے کا ذریعہ ہی خیال نہیں کرتا بلکہ اپنے عقیدے کے مطابق ادب اور شاعری کو زندگی کے حقائق اور نزاکتوں سے زندگی کے دوام کو دیکھتا ہوں، اور ہمارے شعرا کی یہ حالت ہے کہ وہ تصویر کو الٹے اور سیدھے دیکھنے کا شعور نہیں رکھتے۔ مخدوم جب بھی موقع آیا سب سے نظریۂ فن مواد اور ہیئت سے متاثر ہوتا رہا۔ آرٹ اور آرٹسٹ کو اخلاقی اقدار کا چشمۂ حیات خیال کرتا رہا اور ہمیں اس کی شاعری فرسودگی سے نجات دلاتی رہی۔

جب اس کی قابل قدر تصنیف "سرخ سویرا" شائع ہوئی تو اس کے کردار اور شاعری نے ایک ایسی انفرادیت حاصل کر لی جس کے کئی پہلو روشن تھے۔ جہاں تک مطالعہ کا تعلق ہے اس نے مذہب اور سیاست کے رشتے خیر و شر سے دور انسانیت کا ناتا ثابت کیا۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت، بورژوا نظریوں کی مذمت اس کا نصب العین رہا۔ اس قول و فعل سے انحطاطی خرابیوں کا انسداد ہوتا رہا۔

آزادی۔ آزادیٔ خیال، آزادیٔ اعمال، آزادیٔ اظہار اور جستجو اس انتشار کی روک تھام ہے جو جدید دنیا تنگی اور ذہنی پستی کی پیداوار ہے۔ مخدوم کی شاعری کی تحریکات میں بدرجہ اتم اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ علامہ اقبال پر جو اس نے نظم لکھی ہے۔ قصیدہ نگاری نہیں تخلیقی قدروں کا شاندار مظاہرہ ہے اور یہ اس کا حقیقی انداز شاعر مخدوم، باغی مخدوم، قلندر مخدوم، مزدور کا مخدوم میری توجہ کا باعث بنتا رہا۔ اس انسانی درد کے باعث جو محض دکھنی نہیں، حیدرآبادی دکھنی نہیں وہ سارے کائنات کا جس میں ہر انسان کو جینے اور رہنے کا حق حاصل ہے۔

سیماب اور دبستانِ پنجاب

مذکورہ بالا عنوان پر پروفیسر افتخار احمد صاحب فخر تحقیقی مقالہ تیار کر رہے ہیں۔ سیماب مرحوم کے شاگرد اور دوسرے ادباء اگر اس سلسلے میں کوئی مفید معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں تو موصوف سے شعبۂ اردو، فارسی کایم شاہ کالج جلگاؤں (مہاراشٹرا) کے پتے پر خط و کتابت فرمائیں۔

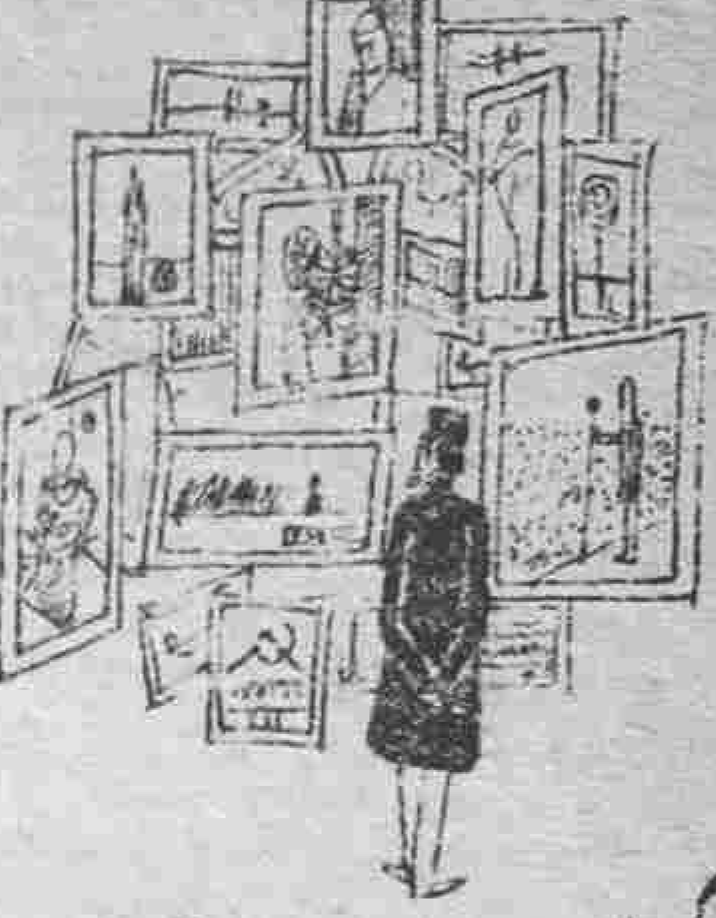

کون ہے مخدوم؟

حیرت بدایونی

• اس نام کے بہت سے چہرے میرے دل پر بھی نقش ہیں، دماغ میں بھی محفوظ ہیں، اور کبھی کبھی میری آنکھوں میں بھی پھر جاتے ہیں

چونکہ یہ سب کے سب مخدوم، اپنی اپنی قسم کے بالکل الگ مخدوم تھے اس لیے لگ بھگ (۳۵) برس یا اس سے بھی زیادہ مدت کے مخدوموں کو یکجا کر کے پیش کرنا، کوئی آسان کام نہیں۔

اس وقت مجھے سلسلہ وار یا بغیر سلسلے کے مخدوم نام کے جتنے روپ یاد آتے جائیں گے میں پیش کرتا جاؤں گا

چنانچہ سب سے پہلے جس مخدوم کو میں نے دیکھا وہ کالج کا ایک حسین و رنگین نوجوان تھا۔ چہرے پر نمک، ہونٹوں میں شہد، دانتوں میں چمک اور باتوں میں افسوں، آنکھوں میں جادو اور آواز میں شعلے، جسم پر ٹویڈ کی شیروانی، سر پر رومی ٹوپی ذرا بانکی۔ میں سمجھا کہ کسی پائیگاہ کا کوئی وارث امیرزادہ ہے۔ معلوم ہوا سنگاریڈی کا غریب زادہ ہے۔ شہر میں آکر تعلیم پاکر اس کا دماغ بھی کھل گیا ہے، آنکھیں بھی کھلی ہیں، زبان بھی کھلی ہے اور آواز بھی کھلی ہے۔ اچھا خاصہ ایک جادوگر تھا جو دن دھاڑے سرِ بازار لوگوں کے دلوں پر ڈاکے ڈالتا پھرتا تھا۔ کسی کو نگاہوں سے مارتا تھا تو کسی کو تکلم سے، کسی کو تبسم سے لوٹتا تھا تو کسی کو ترنم سے۔ شعر میں یوں بھی جادو ہوتا ہے پھر اس پر مخدوم کا شعر، گویا سونے پہ سہاگہ، ترنم کے بعد تو نظم دو آتشہ ہو جاتی تھی۔

فن و فن کی پابندیوں کا وہ زیادہ قائل نہیں تھا کیونکہ ماں کے پیٹ سے وہ شاعری پیدا ہوا تھا اور شاعری کے لیے ہی پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے درد و اثر اس کا خاص تھا جو فطرت سے اس کو ملا تھا۔ حاسد معترضین جھک مارتے رہ جاتے تھے اور مخدوم کا شعر فضاؤں میں شادیانوں اور نغموں کی طرح اٹھتا تھا۔ [illegible]

ہونہار برخوردار کا آغاز تھا۔

ایک مخدوم مجھے ایسے بھی یاد ہیں جو قاری عبدالعزیز ہوا کرتے تھے اور لوگوں سے کہا کرتے تھے لیجئے حضرت ہوش کے ناخن۔ جب ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور نے ان قاری صاحب کو دیکھا تو بہت تعریف کی۔ ایک مخدوم صاحب مجھے ایک دفعہ الفنسٹن تھیٹر کے اسٹیج پر نظر آئے۔ شان ان کی حضرت کی یہ تھی کہ سر پر دو پلی ٹوپی چپکائے، جسم پر باریک ململ کا پردہ دار انگرکھا آستینوں میں چنت۔ ڈھیلے چوڑی دار اور یہی پاجامہ پہنے پاؤں میں دہلی کی سلیم شاہی جوتی "اٹھلاتے اتراتے اکڑتے اماں اماں کرتے۔ نزاکت میں ڈوبے جیسے سچ مچ واجد علی شاہ کے سگے ہیں۔ اور وہ بھی ایک مخدوم ہی تھے جنھوں نے اسٹیج پر ان کے ساتھیوں کے ساتھ قوالی گاتے سنا تھا۔ معلوم ہوا کہ متزاد بھی (وہ میلاد و دشالہ) خود انہیں حضرت کا تصنیف شدہ تھا۔

کسی کالج میں بھی ایک لکچرر صاحب۔ کا نام مخدوم محی الدین ہی تھا۔ پھر ایک دن جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ درس تدریس سب چھوڑ چھاڑ غائب ہو گئے۔ دریافت پر پتہ چلا کہ دل اور دماغ پر ایکا ایک قومی دورہ پڑ گیا اور لالہ گوڑہ ریلوے ورکشاپ میں درانتی ہتھوڑے کی پارٹی کے نقیب بن گئے ہیں۔

مزدوروں میں جا کر حضرت نے اللہ جانے کیا گڑبڑ گھٹالا کیا کہ خبر مشہور ہو گئی کہ مخدومیوں کا مرغ خواب تہہ دام آ گیا اور اسیرِ قفس بلا ہو گیا۔ ایک قلعہ نما عالیشان محل ہیں، بادشاہ بنا بیٹھا ہے اور خدامِ ادب کے پہرے لگے ہیں۔ پھر افواہیں پھیلیں کہ مخدوم کھلنے کی وہیں انگر پردے بیٹھ گئے۔ گر پردہ تو نامحرموں سے ہوتا ہے یہ ہمیشہ کے دیکھے بھالے محرموں سے کیسا پردہ۔ یار لوگوں نے گانا شروع کر دیا۔ آج کیوں ہم سے پردہ ہے۔ اس گانے کی آواز دور دور پہنچی۔ بہرحال اندھیرے اجالے میں سب کچھ ہو سکتا بھی نہیں تھا۔ غرضکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ آنکھ مچولی ہو ہی رہی تھی کہ ایک دن جو سرخ سویرا نکلا تو اس کی قوس قزحی رنگ برنگی اور بوقلمونی کرنوں میں سے ایک کرن آدمی بنکر زمین پر آ گری۔ لوگ جمع ہو گئے بھیڑ لگ گئی آنکھیں مل مل کر جو دیکھا تو ہو بہو ہمیں میں بنے بنائے مخدوم۔

ایسا ایک اور مخدوم صاحب بھی تھے جو واعظِ محترم ہو گئے تھے۔ یعنی مولویوں کو جو دیکھا کہ دینداروں کو دین کا راستہ دکھا رہے تھے تو مخدوم صاحب نے دنیاداروں کو دنیا کا راستہ دکھانے کا ٹھیکہ ہی لے لیا۔ اور جھاڑنے لگے وعظ پر وعظ لیکن تا دم تحریر نہ تو دینداروں کو جنت ملی اور نہ دنیاداروں کو راحت۔ دونوں قسم کے لوگ وعدوں پر جی رہے ہیں اور ہم بھی رہے ہیں۔ پھر بھی یہ سوال جوں کا توں رہ گیا کہ ایک مخدوم کی اتنی قسمیں یا ایک قسم کے اتنے بہت سے مخدوم۔ یہ سب ایک تھے یا الگ الگ۔ بہت سے تو جذب۔ یہ تصوف کا مسئلہ ہے یعنی وحدت فی الکثرت اور کثرت فی الوحدت۔ ایک صوفی نے اس مسئلے کو یوں حل کیا ہے سے

ہر لحظہ بشکلِ آں بتِ عیار برآمد۔ ہر دم بہ لباسِ دگر آں یار برآمد۔ چاہنے والوں نے ایسے رنگ برنگے مخدوم کا اگر جشن منایا اور دو دفعہ منایا تو وہ اسی کا مستحق بھی تھا کہ شعر و محبت کا سہرا اسی کے سر رہے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

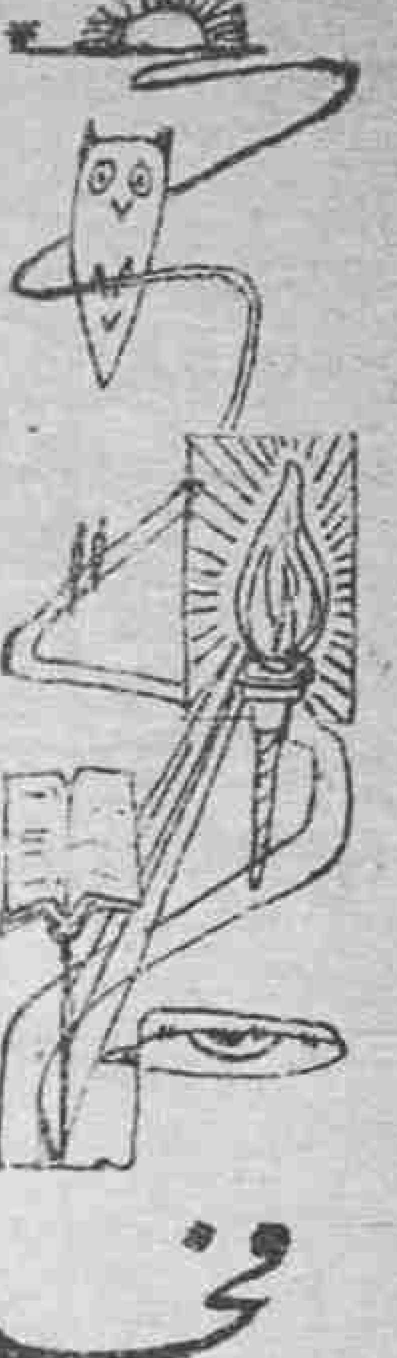

مخدوم

شاعر، ادیب، رہبر، استاد

احسان دانش

● تقسیم ملک سے پہلے جب میں حیدر آباد، مدراس، ناگپور، بلاس پور، چھتیس گڑھ وغیرہ کے مشاعروں میں جایا کرتا تھا تو اسی سلسلے میں جناب مخدوم سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ یہ میرا ایسا دور تھا جب میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ترقی پسندوں کے اقوال و افعال کا جائزہ لے کر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا اور مجھے ترقی پسند ادیبوں سے جس قدر امیدیں تھیں وہ سب یکے بعد دیگرے ہوا کے گھاٹ اترتی جا رہی تھیں لیکن مخدوم کی ملاقات سے میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی بجھتے ہوئے چراغ کی لو کو اکسا دے۔

مخدوم ایک پیکر خلوص ہیں وہ اپنے شعر و ادب میں سب کچھ وہی لکھتے ہیں جو ان کی روح کی آواز ہے اور یہ وصف بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ شعر میں جب تک خلوص نیت کی آمیزش نہ ہو وہ کانوں کے دروازوں پر دستک تو دیتا ہے لیکن دل کے زینے تک اس کی رسائی نہیں ہوتی، مخدوم کا کلام مخدوم کے قول و فعل میں حد فاصل قائم نہیں کرتا۔

جہاں ان کی نظر ملک کی سیاست پر ہے وہیں ان کے دل میں انسانی ہمدردی کا بھی موجزن ہے۔ وہ سیاسی جوار بھاٹا کو دیکھ کر اپنے موقف سے دست بردار نہیں ہوتے یہی سبب ہے کہ جہاں ان کا شعر و ادب میں ایک مقام ہے وہیں سیاست میں بھی ان کی مستقل جگہ ہے۔

جب ہمارے شعر و ادب میں خلوص کے گوشے تلاش کیے جائیں گے تو مخدوم کا کلام سر فہرست آئے گا اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک میں سبط حسن اور علی سردار جعفری بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے

لیکن مخدوم کا میدانِ عمل بڑا وسیع ہے اور اسی عملی جدوجہد نے ان کی شاعری اور ادب کے کینوس کو بھی وسیع کر دیا ہے۔

پاکستان میں بھی مجھے جس قدر ان کے شاگرد ملے ہیں انھیں مخدوم کے حسنِ سلوک اور شرافت کے باب میں رطب اللسان پایا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہم نے مخدوم سے اکتسابِ علم کیا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ مخدوم جہاں اچھے شاعر، بلند پایہ ادیب اور آشنائے منزل رہبر تھے وہیں وہ قابلِ قدر استاد بھی ہیں۔

اگر کسی اچھے اور قابل شخص نے سیاسی شعرا پر کام کیا تو مخدوم کے کلام اور ادب کو تخصیص سے دیکھنا ہوگا۔ کیوں کہ اس میں ان کا حسنِ اخلاق، حسنِ کلام پر حاوی ہے اور رجعیت فکر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے امتیازِ مذہب و ملت سے بالا ہو کر انسانی خدمت کو اپنا شعارِ حیات قرار دیا ہے اور زندگی کی مثبت اقدار کو کہیں نظر انداز نہیں کیا۔

کلپالتا

کوآپریٹیو سوپر بازار، حیدرآباد

کلپالتا میں واجبی داموں اور قابلِ بھروسہ تول پر اعلیٰ اور معیاری اشیاء خرید فرمائیے

★★ ہماری نمایاں خصوصیات

۱۔ بیرونِ شہر سے منگوائی ہوئی تازہ اور بہترین ترکاریاں مسابقتی نرخوں پر دستیاب ہوتی ہیں

۲۔ سنٹرل ڈیلیوری کاؤنٹر پر صرف ریفنڈ ایبل ڈپازٹ جمع کروانے پر مختصر وقفہ میں جب کہ آپ کلپالتا کے لانس پر آرام کر سکتے ہیں آپ کی تمام ضروریات سربراہ کی جاتی ہیں۔ اپنی سہولت کے پیشِ نظر اپنی مطلوبات کی فہرست دے کر انھیں دوسرے روز بھی تیار شدہ پیکٹوں میں حاصل فرما سکتے ہیں۔

برائے مینجنگ ڈائرکٹر

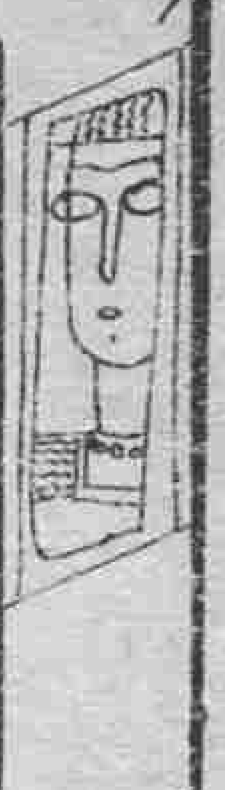

تاثرات

ماہر القادری

● اس عالم میں یہ تاثرات قلمبند کر رہا ہوں کہ کانوں کا ہجوم ہے، چند دن ہوئے ایک سفر سے واپس آیا ہوں اور دوسرا سفر سر پہ سوار ہے۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

ان تاثرات کا تعلق فکر و تعمق سے نہیں، حافظہ اور یادداشت سے ہے، جو کچھ یاد آتا جا رہا ہے سپرد قرطاس کرتا چلا جا رہا ہوں۔

مخدوم محی الدین کو میں نے سب سے پہلے حیدرآباد دکن کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا، عثمانیہ یونیورسٹی ان دنوں عابد شاپ سے تھوڑی دور پر عارضی عمارتوں میں تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنۃ صدر اعظم حکومت آصفیہ اس مشاعرے کے صدر تھے۔

دبلا پتلا بدن، ستواں ناک، آنکھوں کے حلقوں کے آس پاس پرچھائیاں لگ رہی تھیں جیسے سواد شام کی سی کیفیت! اور وہ جو آتش نے کہا ہے:

دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوئے دوست

مخدوم محی الدین کے بکھرے بالوں کا قریب قریب یہی عالم تھا ان کی بے ترتیبی اور پریشانی بتا رہی تھی کہ شاعر بڑی بے چین طبیعت رکھتا ہے۔ مخدوم نے ترنم کے ساتھ اشعار سنائے، لہجہ میں خاصا سوز لیکن انفرادیت تھی مجمع نے ان کے شعروں کو پسند کیا اور خوب داد دی، داد و تحسین نے مخدوم کے لہجے میں اور گرمی پیدا کر دی۔

اس کے بعد مخدوم محی الدین سے بلدہ حیدرآباد اور ریاست کے بعض شہروں کے مشاعروں میں ملاقاتیں بھی رہیں اور دو تین بار سفر بھی۔ نلگنڈے کے مشاعرے میں (غالباً ۱۹۳۹ء میں) تمام شعراء ایک ہی جگہ ٹھہرے تھے۔ مشاعرے کے بعد لطیفے اور ہنسی خوشی کی باتیں قیام گاہ پر شروع ہو گئیں، مخدوم نے اس

"مضاحکہ" میں طبیعت کی پوری آمادگی کے ساتھ حصہ لیا۔ اور ہنسنے ہنسانے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ مشہور ہے اور خود میرا بھی تجربہ ہے کہ کمیونزم آدمی میں "انقلابی خشونت" پیدا کر دیتا ہے۔ مگر میں نے مخدوم محی الدین میں اس نظریہ اور تجربے کے برخلاف "لینت" پائی، شعر و ادب کی زبان میں اسے "گداز" بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب حیدر آباد دکن میں جمہوریت نہیں شخصی بادشاہت کا دور دورہ تھا۔ مگر ہائے وہ زمانہ!

اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے۔

ہمیں استادہ تیرے سرائے فریب ... گہے بر فراز و گہے بر نشیب

اس انقلاب الٹ پھیر اور گردشِ ایام پر خود قرآنِ کریم شاہد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تلک الایام نداولہا بین الناس"

کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں، دنیا میں یہی ہوتا رہتا ہے ؏

زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است

غالباً میں موضوع سے کچھ دور نکل گیا مگر مخدوم محی الدین کا تذکرہ ہو اور حیدر آباد کا ذکر نہ آئے ——— یہ نہیں ہو سکتا۔ ہر داستان و تذکرہ کی یہ خاصیت ہے کہ ——— افسانہ از افسانہ می خیزد۔

تقسیم ہند کے بعد بھی ان سے ہندوستان کے مشاعروں میں ملاقاتیں رہیں۔ اب سے سات سال پہلے کی بات ہے بمبئی میں ماہنامہ "شاعر" کے جشن کے سلسلہ میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے دوسرے دن کرافٹ مارکیٹ کے سامنے ایک ریسٹوران میں مخدوم محی الدین سے ملاقات ہو گئی۔ شاہد صدیقی مرحوم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا پروگرام ہے ——— بولے "جھانسی جا رہا ہوں وہاں پارٹی (یعنی کمیونسٹ پارٹی) کی کوئی میٹنگ ہے۔"

میں نے کہا ——— "مخدوم! تعمیرِ نو اسلام کے لیے کچھ کام کرنا تھا"

ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"جی ہاں! ہم اسلام ہی کا کام کر رہے ہیں۔"

مخدوم محی الدین کو اچھی طرح اس کا علم ہے کہ راقم الحروف ان کے مشن کا مخالف ہے، اور ہم دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں مگر اس اختلاف عقیدہ و فکر کے باوجود وہ ہمیشہ خلوص و محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی روشنی دکھائی دیتی ہے، خدا کرے کہ یہ روشنی نورِ ایمان میں تبدیل ہو جائے!

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے

جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

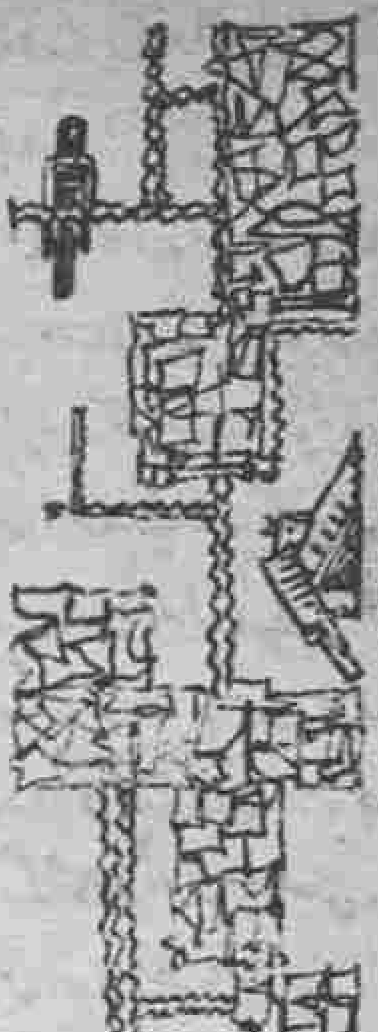

مخدوم

علی جواد زیدی

● میں مخدوم محی الدین سے تقریباً ۲۶ برس پہلے ملا تھا۔ اس ربع صدی میں ہزاروں ہی پلٹے یاروں نے کھائے ہیں، زمانہ ناقابلِ یقین نشیب و فراز سے گزرا ہے خود اپنے ملک میں عظیم الشان تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن مخدوم کی شخصیت کی جاذبیت بڑھتی ہی گئی ہے۔ اس میں یقیناً مخدوم کے خلوص اور یقین کو بڑا دخل ہے۔

ترقی پسندوں کی وہ پود جس نے اب سے ربع صدی پہلے میدانِ ادب میں قدم رکھا تھا، اپنی پہلی سی فعالیت اور یک جہتی سے محروم ہو چکی ہے ان میں سے اکثر نے اپنے لیے الگ الگ راستے بنا لیے ہیں کچھ نظریاتی اختلافات کی بنا پر الگ ہو گئے کچھ تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے بددل ہو گئے، کچھ کو فلموں، چند کو ملازمتوں، کچھ کو انانیتوں نے چھین لیا۔ کچھ قبل از وقت بوڑھے ہو گئے کچھ بوڑھے ہو کر "پیرِ مغاں" بن بیٹھے، کچھ نے جوانی کے اندوختہ ہی پر قناعت کر لی، کچھ ٹولی بنانے کی فکر میں مشغول ہو گئے ـــــ مخدوم اپنی نظریاتی منزل پر جما رہا۔ مگر جمے رہنے والوں میں وہ تنہا نہیں ہے اس لیے میں اس بات کو اس کا طرۂ امتیاز نہیں سمجھتا۔ جو بات اسے اس کے بیشتر ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے فن کو اپنی سیاست پر قربان نہیں ہونے دیا۔

مخدوم کی سیاست سے اختلاف کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کی فنی بلندیوں کا انکار کرنے والے نہیں ملیں گے اور جو ملیں گے وہ ایسے ہیں کہ ان کے اقرار اور انکار سے اصل مسئلہ کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا!

مخدوم کی ترقی پسندی کا خمیر اردو کے بہترین ادبی روایات سے بنا ہوا ہے۔ زبان و بیان کا رچاؤ، اظہارِ خیال و جذبات کی سبھلی ہوئی اور متوازن کیفیت، طریقۂ اظہار کی صناعانہ شگفتگی، ترقی پسندانہ سادگی کی پرکاری، ماضی سے سوچی سمجھی بغاوت، حال سے تعمیر پسندانہ وابستگی و ناآسودگی، مستقبل پر

والہانہ اور رجائی یقین، دنیا کی جمالیاتی قدروں کا فنکارانہ احساس اور زندگی کے غم جھیلنے اور زندگی کو اچھی طرح برتنے کا حوصلہ۔ عناصر ترکیبی مخدوم کی شاعری کو عام ترقی پسندوں کی شاعری سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ مخدوم کے یہاں نعرہ بازی نہیں ملتی۔ دورِ غلامی میں نعرہ حیات قومی کا متحرک اور فعال نشان تھا۔ ہم سب نے اس کی گرمی اور جوان توانائی کو محسوس کیا ہے لیکن مخدوم کا کمال یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں اس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ اس کی شاعری اب گہرے تفکر اور بھرپور سماجی تاثرات کی حلیف بن گئی۔ اس میں گیرائی، گہرائی اور تنوع پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ چونکہ مخدوم اپنے تجربوں سے اپنے احساسات کو مسلسل سینچتے رہتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں پسپائی کا وہ احساس نہیں ملتا جو دوسرے بے عمل ترقی پسندوں کے یہاں آج بھی نعرہ بازی کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

"سرخ سویرا" سے "گُلِ تر" تک ترقی پسندانہ ارتقار کے نقش صاف صاف پڑھے جا سکتے ہیں۔ وہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح نہ تو خطیب بننے کی کوشش کرتا ہے نہ مرثیہ خواں۔ پرانے دور کی قصیدہ خوانی سے بھی وہ دستبردار ہو گیا ہے۔ اب اس کے شعروں میں زندگی گاتی، گنگناتی، ہنستی، کراہتی، آگے بڑھتی، گرتی سنبھلتی زندگی شاہراہ پر گامزن نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری کا پھیلاؤ آفاقی اور اس کے فن کا خلوص ابدی نغمے جگاتا ہے۔

مخدوم سے میری ملاقات نہ بہت سرسری ہے نہ بہت گہری۔ اہلِ حیدرآباد نے اسے زیادہ قریب سے دیکھا ہوگا، لیکن مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ ایسا دوست ہے جس پر ہمیشہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے، وہ ایسا فنکار ہے جو ادب کو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ ادب کے پیکر میں انسانی ضمیر کی آواز ہے۔ میری دعا ہے کہ اس کا فن اور پھلے پھولے، اور وہ ایک اچھے تخلیقی ادیب کی حیثیت سے مدتوں زندہ رہے!

یونانی مرکبات کا جنوبی ہند میں
سب سے بڑا مرکز

احمد اینڈ کمپنی

گلزار حوض، حیدرآباد۔ فون (۴۳۵۸۰)

برانچ :- ترپ بازار کارنر، قریب معظم جاہی مارکٹ۔ فون (۴۲۷۳۶)

غزل کا ایک عمدہ شعر

کوثر چاندپوری

● مخدوم صاحب سے میری ملاقات آل انڈیا اردو کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی اس کا ذکر میں نے اپنے رپورتاژ "کارواں ہمارا" میں کیا ہے مجموعی حیثیت سے ان کے پورے قد و قامت میں وہی حسن ہے جو غزل کے کسی عمدہ شعر میں ہو سکتا ہے۔ مجھے پہلے پہل انھیں دیکھ کر محسوس ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کی رعنائی ہے۔ میں اپنے اس احساس کو قلمبند نہیں کر سکتا بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک ایسا شیشہ ہے نام تھا جسے الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری مرتبہ مخدوم کو ۱۹۶۵ء میں دہلی کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ کیفی اعظمی ان کے ساتھ تھے یہ مشاعرہ دہلی کے مشہور کافی ہاؤس میں ہو رہا تھا۔ جہاں ٹینٹ کے نیچے شام کو ہزاروں آدمی الگ الگ میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور کافی سپ کرتے ہیں ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا طبقہ یہاں آتا ہے جو عجیب شعری اور ادبی گفتگو میں ہوتی ہیں، مباحثے اور مناظرے ہوتے ہیں جو بعض اوقات باقاعدہ جنگ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس دن میرے ساتھ جواں سال ادیب اور ناقد محمود ہاشمی اور دوسرا جا بیٹھا تھے۔ مخدوم نے غزل سنائی تھی ان کے پڑھنے کا انداز نہایت سادہ مگر دلفریب ہے اس میں اثر اور نغمہ کی گھلاوٹ ضروری ہے لیکن بناوٹ بالکل نہیں۔ اسے گانا بھی نہیں کہہ سکتے لیکن نغمگی اس کے اندر کہیں نہ کہیں ضرور چھپی رہتی ہے جو کانوں میں ایک ٹھنڈک سی بھر دیتی ہے جو غزل انھوں نے سنائی تھی وہ متعدد رسائل میں چھپ چکی تھی۔ میں بار بار ہندوستانی اور پاکستانی رسائل میں اسی غزل کو پڑھ کر یہ سوچتا رہا تھا کہ شاید مخدوم کے پاس اب کہنے کو بہت کم باتیں رہ گئی ہیں حالانکہ ایک غزل کے جگہ جگہ چھپنے میں ان کا کوئی قصور نہیں یہ ان کی مقبولیت ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ ہوا کی لہروں میں جذب ہو کر ہر سمت میں پھیل جاتا ہے۔ مخدوم کی زبان سے اسی غزل کو سن کر میں محسوس کرتا

تھا کہ پیغام وہی ہے لیکن کیفیات بالکل بدل گئی ہیں اور ہر شعر نئے پن کے سانچے میں ڈھل گیا ہے ایک ایک لفظ دل کو چھو رہا تھا اور احساس میں کرنٹ بن کر دوڑ رہا تھا۔ مخدوم بہت بیباک اور آزاد خیال فن کار ہیں ان کے یہاں مصلحت اندیشی کا کوئی تصور نہیں وہ اپنا پیغام عوام تک پہونچاتے ہیں اس سلسلہ میں کسی اور چیز کو بیچ میں نہیں لاتے ان کی نظموں میں ایک اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ ہی فن اور زبان کی خوبیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک گرمی، حدت اور آگ سی بھری رہتی ہیں جو صرف پگھلاتی ہیں جلاتی نہیں اس کی آنچ پر جذبات موم کی مانند پگھلتے ہیں جل کر خاکستر نہیں ہو جاتے ان کا پہلا مجموعہ "سرخ سویرا" شائع ہوتے ہی ملک بھر میں پھیل گیا تھا شاید ہی کوئی شخص ایسا رہا ہو جس نے اس کی نظموں سے اثر قبول نہ کیا ہو مخدوم کے یہاں جذبات کی صداقت اور نیت کا خلوص بہت زیادہ ہے یہ دونوں چیزیں فن کی جان ہیں فن انہیں عناصر کی طاقت سے پھیلتا اور بڑھتا ہے نظم گو شاعر غالباً اپنے فرائض سے زیادہ باخبر اور پیغام کو پیش کرنے کے انداز سے زیادہ واقف ہوتا ہے نظم میں گرمی گفتار کی گنجائش بھی غزل کے مقابلہ میں کافی ہے غزل کا آبگینہ تندی صہبا کی تاب بہت کم لاتا ہے جبکہ نظم کے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔ مخدوم کی نظم اور غزل میں یہ فرق بہت نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑی حلاوت اور شبنمیت ہے۔ نظموں میں فولاد و آہن کی سی صلاحیت اور شبنمیت کا احساس ہوتا ہے اودھر انہوں نے نظموں سے زیادہ غزلیں کہی ہیں ان کی غزلوں میں تاثیر اور ابلاغ کا بڑا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر اگر مخدوم نظموں کے لیئے کوئی اچھا موضوع تلاش نہیں کر سکتے تو انہیں غزل کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے اس وادی گل میں ابھی ان کے لئے زندہ رہنے کی بڑی خوشگوار فضا ہے۔

خوشبو کے ساتھ گلبہار کا نام یاد آنا ضروری ہے

استعمال کیجئے اپنی پسندیدہ خوشبو

اسپیشل گلبہار اگربتی جو ہر جگہ ملتی ہے

بنانے والے :- گلبہار کمپنی۔ حیدرآباد دکن۔ اے پی

شاخیں :- افضل گنج ۔ معظم جاہی مارکٹ

ٹیلیگرام "گلبہار" فون (۱۴۰۲۷ ، ۱۴۰۷۶)

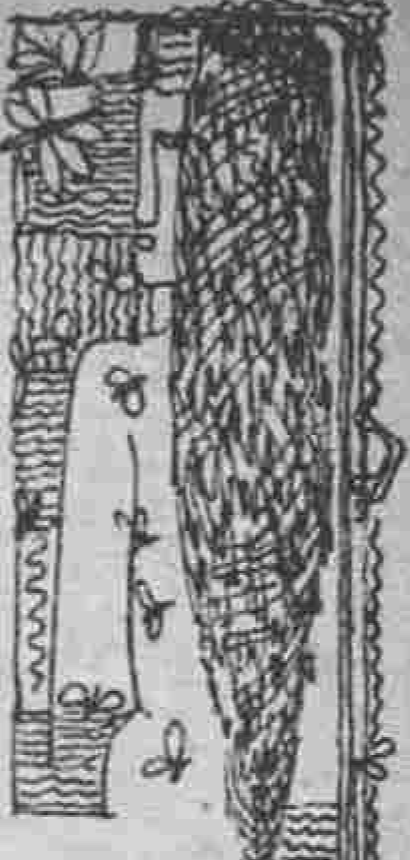

مخدوم محی الدین

(ایک ذاتی تاثر)

سلام مچھلی شہری

● حیدرآباد کا ذکر آتے ہی مجھے مخدوم یاد آتے ہیں اور ان کے ساتھ چہروں کا ایک کارواں گزر جاتا ہے۔ اس طرح حیدرآباد میرے لیے ایک جذبے کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ شہر سے تو میں واقف نہیں ہوں کبھی جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ ممکن ہے شہر سے واقف ہونے کے بعد جذبے کی معصومیت اور رومانیت ختم ہو جاتی ـــــ سنا ہے کہ تاج محل کو دیکھ کر بہت سے لوگ مایوس ہوتے ہیں! میں نے مخدوم کی شخصیت کی دلنوازی اور مضبوط نرمی سے شہر کے مزاج کا اندازہ لگایا ہے۔ میں اس اندازے کے غلط ہونے کے عذاب سے ڈرتا ہوں اور ممکن ہے اس کی تاب بھی نہ لا سکوں مخدوم کے شہر کے بعض بڑے حسین باسیوں سے اپنے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں مل چکا ہوں۔ اُن آہوانِ خوش چشم کے تصور سے آج بھی احساس میں چاندنی سی لہرانے لگتی ہے احساس کی کتنی لذتیں وابستہ ہیں مخدوم کے نادیدہ شہر سے معلوم نہیں خود اپنے شہر میں سیاسی فتوحات کے علاوہ مخدوم کی رومانی فتوحات کا کیا عالم رہا ہے مگر میں ان کے شہر کے سلسلے میں انھیں کا ایک شعر قدرے اعتماد کے ساتھ پڑھنا چاہتا ہوں۔۔

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

مگر یہ شعر تو مخدوم کے ساتھ میرے اپنے تعلق کی بھی تفسیر معلوم ہوتا ہے ـــ شاید شعر کی آفاقیت بھی اسی میں ہے۔ مخدوم بہت سنبھلے ہوئے ـــ سلجھے ہوئے یہ نہ سمجھوں گا کہ اس سے شاعر کے شعری کردار کی توہین کا پہلو نکلتا ہے ـــــ انسان ہیں اور اس گُر سے ہر حال میں واقف رہتے ہیں کہ "نسبتِ پیمانہ" سے پیدا ہونے والی بے تکلفی سماجی رویے کو متاثر نہ کرے۔ انھیں یہ

احساس رہتا ہے کہ ان کی رند شاہد باز والی شخصیت لمحاتی اور وقتی ہے، اور سماجی شخصیت اس سے کہیں زیادہ حقیقی اور اہم ہے۔ وہ "عشق محبت" اور "فرض محبت" دونوں کے منصب و مقام سے آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ دونوں کس حد تک ایک دوسرے کے ساتھ مل سکتے ہیں اور کس منزل پر دونوں کو الگ ہو جانا چاہیے۔ اسی متوازن دیوانگی سے ان کی شاعری اور شخصیت میں رعنائی آتی ہے۔ خود میرے ساتھ یہ اتفاق ہوا ہے کہ کسی لمحے مخدوم بہت گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں ——— بے تکلف اور تمام حدود سے بے نیاز، مگر دوسرے ہی لمحے جب وہ دوسروں کے ساتھ ہوں گے اور کسی سیاسی یا سماجی مسئلے میں الجھے ہوئے ہوں گے تو مجھے صرف رسمی مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔ یہ ہوش مندی (SANITY) اچھی اور بڑی شاعری کی دوست ہے دشمن نہیں۔ مخدوم کی شاعری میں ان کے سماجی اور ذاتی کردار کی ہم آہنگی کامیاب ہم آہنگی کے جلوے نظر آتے ہیں خاص طور پر ان کی رومانی شاعری کے پیچھے جو سماجی کردار ہے وہ بڑا ہی متحرک فعال اور حسین کردار رہے اور اس کے کردار کی فعالیت (DYNAMISM) ان کی رومانی شاعری کو خوابناکی نہیں دیتی بلکہ ایک بیداری بخشتی ہے ——— اور شاید اچھی اور پائدار ترقی پسندی بھی ہے۔ اگر گردوپیش کے ماحول کی بے حسی سے برہم ہو کر آپ ماحول کو سخت و سست سنانے لگیں تو ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کو ترقی پسند کہہ دیں۔ مگر حقیقی ترقی پسندی یہ نہیں ہے۔ اس صورت حال میں مخدوم کا ردِ عمل دیکھیے :-

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ، پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

"پیامِ عمل" دینے کے لیے فوجی بینڈ بجانا ضروری نہیں۔ مخدوم کے لہجے کا شائستہ گداز بھی یہی کام کرتا ہے!

کوہِ غم اور گراں اور گراں اور گراں
غمزدو، تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

مخدوم کی شاعری میں ابتدا ہی سے اس سماجی کردار یا سماجی شعور کی موجودگی رہی ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے مگر اس کا ساتھ حقیقی شاعر کا خلوص بھی موجیں ابھارتا رہا ہے۔ رومانیت اور پرخلوص حقیقت پسندی کے دھارے ان کی ابتدائی نظموں میں بھی نظر آتے ہیں مگر جیسی ہم آہنگی دونوں عناصر کی ان کی موجودہ شاعری میں ملتی ہے وہ پہلے نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے ان کا نظریۂ زندگی احساس نہ بنا تھا یا اس میں نظر کا اضافہ نہ ہوا تھا ——— اب ان کا نظریہ نظر بھی بن چکا ہے اور احساس بھی اس لیے وہ جن حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں ان میں خوابوں کا حسن نظر آتا ہے ——— مگر ان کے یہاں خواب اور رومان کے عناصر کی ہم آہنگی بہت فطری ہے اور ان کی شاعری کے بطن سے ابھری ہے۔
ہمارے مشترک دوست سردار جعفری رومانیت تک ایک طرح کے سجدۂ سہو کے بعد پہنچے ہیں اور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے رومانی انداز کی شاعری نئے طور پر شروع کی ہے، مخدوم نے بس اپنے احساس کی شدت کی مدد سے اس عنصر کو نمایاں کرلیا ہے جو ان کے یہاں موجود تو تھا مگر بہت نمایاں نہ تھا ان کے پچھلے ادبی سرمائے میں اس طرح ان کے شاعرانہ وجدان کی ضمانت ہے.

نوائے درد مری کہکشاں میں ڈوب گئی
وہ چاند تاروں کے سیل رواں میں ڈوب گئی
سمن بران فلک نے شرر کو دیکھ لیا
زمین والوں کی دل کی نظر کو دیکھ لیا
وہ میری آہ کا شعلہ تھا کوئی تارہ نہ تھا
وہ خاک دان کا مسافر تھا کوئی پارہ نہ تھا (ٹوٹے ہوئے تارے)

کتنے لب، کتنی جبینیں، کتنے جلوے کتنے طور
کتنی صبحوں کا اجالا، کتنے نغموں کا سرور
کتنی نو آغاز کلیاں، کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول
(محفل)

کچھ قوسِ قزح سے رنگت لی کچھ نور چرایا تاروں سے
بجلی سے تڑپ کو مانگ لیا کچھ کیف اڑایا بہاروں سے
بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
(شاعر)

شعری احساس کی جلوہ گری ——— رجائی جلوہ گری بھی رومانی انداز سے ہو رہی ہے. ان کی نظم کے یہ ٹکڑے کون بھول سکتا ہے.

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

عام طور پر رجائی شاعری کچھ بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہوتی، اپنے ان دو ذہنی پیکروں میں

مخدوم نے کرب اور امید کو جس طرح ہم آمیز کیا ہے اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ اپنی آج کی شاعری اور پیکر نگاری میں مخدوم احساس کے اسی کرب اور اسی لذت کی آئینہ کاری کرتے ہیں۔ مجھے اسی وجہ سے ان کی "گل تر" کے دور کی شاعری زیادہ خوبصورت اور زیادہ پر خلوص معلوم ہوتی ہے۔ ان کی سیاسی شاعری بھی وقت کا تقاضا تھی اور وہ آج جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ بھی نتیجہ ہے سچے شعری ارتقا کا ——— انھیں بہت ساری سچائیوں اور جذبوں کا اظہار و انکشاف کرنا ہے۔ بہار جذبوں کی شاعری کے اس دور میں مخدوم ایسے شاعر کتنے باہمت ہیں جو تاریکیوں کو محسوس تو کرتے ہیں مگر انھیں اپنا مقدر نہیں بناتے ——— کچھ اجالے بھی دیکھتے ہیں طربناک اور امید افزا ۔۔۔!

گفتگو

سال میں چار بار

ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان

پہلا نمبر فروری ۱۹۶۷ء

سالانہ چندہ: بیس روپے بیرون ہند: تیس شلنگ

زیر ادارت: سردار جعفری

۲۰- کھیتان بھون۔ جے ٹاٹا روڈ بمبئی

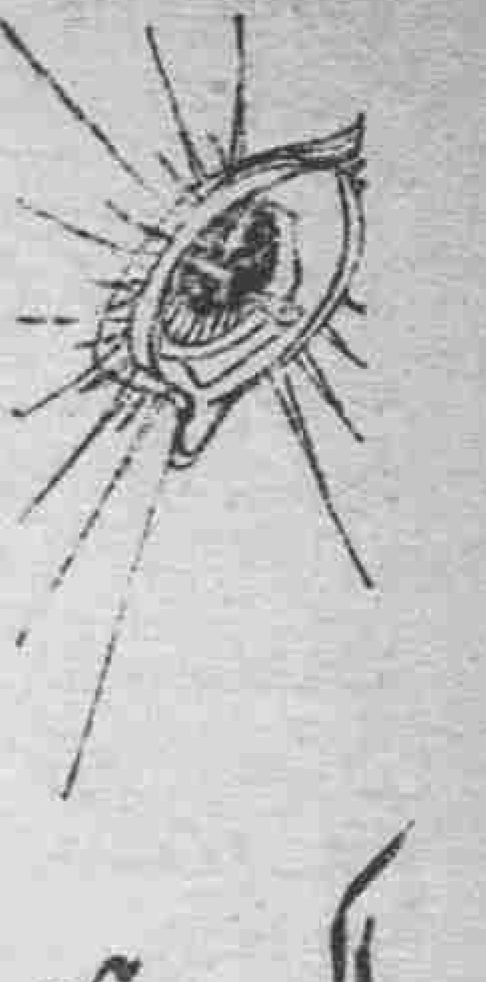

اک ہیرا کچھ کرنیں

حکیم یوسف حسین خاں

● میں مخدوم صاحب سے خوب واقف ہوں میں انھیں اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ اُن کے متعلق یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں ان سے واقف نہیں! بات یہ ہے کہ کسی سے مل لینا سیدھی سادی سی بات ہے، کسی کو جان لینا ایک ایسا عمل ہے جو بہت پیچیدہ بھی ہو سکتا ہے اور جہاں تک مخدوم صاحب کا تعلق ہے میرے ساتھ بھی یہی ہوتا آیا ہے۔ پہلے میں نے صرف ان کا نام سنا تھا جب بھی میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میں انھیں جانتا ہوں۔ پھر میں ان سے ملا ان میں اتنی اپنائیت تھی کہ اس وقت بھی میں یہی سمجھا کہ میں تو ان کو جانتا ہوں۔ آج اُن سے ملے ایک عرصہ ہو گیا ہے وہ اپنائیت بدستور موجود ہے لیکن...

اب جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو اس اپنائیت کے سوا بھی ان کی ایک نہ ایک خوبی ان کا کوئی نہ کوئی نیا رخ سامنے ہی سامنے بے نقاب ہوتا رہتا ہے۔ یہ تجزیہ عمل ختم نہیں ہو سکا ہے جاری ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاری رہے گا۔ اب آپ ہی فرمایئے ایسے شخص کے متعلق اگر میں یہ نہ کہوں تو پھر اور کس شخص کے متعلق یہ کہہ سکوں کہ میں انھیں اتنی اچھی طرح جانتا ہوں کہ انھیں بالکل نہیں جانتا؟

میں نے سنا تھا کہ مخدوم شاعر ہیں یہ صفت کسی کے ساتھ لگا دیجیے اس کے بعد اس کے متعلق بہت سی ناگفتہ بہ خصوصیات بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جب میں ان سے پہلی بار دوچار ہوا تو میرا اندازہ بڑا غلط نکلا۔ نہ وہ نشہ میں تھے نہ بال بڑھے ہوئے تھے نہ وہ منہ ہی منہ میں کوئی مصرعہ الاپ رہے تھے۔ ترنم بھی تو شاعروں جیسا نہ تھا۔ وہ مجھے شاعر ہی نظر نہ آئے تمام وقت انھوں نے کوئی حرکت ایسی نہ کی جس سے ثابت ہو سکتا کہ ان کا کوئی پیچ کسا ہوا نہیں ہے۔ سنایا بھی تو انھوں نے جاتے لے کے چلو

کائنات والے کے جلوہ والا شعر سنایا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ شاعر زمانہ کو ساتھ لے کے کب چلا کرتا ہے وہ تو اسے جھٹلا کر اپنے سے جتنا دور کر سکے اتنا دور کر دیا کرتا ہے میں نے سوچا کہ مخدوم صاحب یا تو بن رہے ہیں یا پھر وہ شاعر نہیں شاعر نما قسم کے کلہ لیڈر رہے ہیں جو درحقیقت مفکر اور مصلح ہوا کرتے ہیں لیکن اس وقت تک مخدوم صاحب کی شاعرانہ حیثیت چونکہ قطعاً مسلّم ہو چکی تھی اس لئے ان کے شاعر ہونے سے انکار بھی نہ بن پڑ سکتا تھا مجبوراً مجھے اپنے ذہنی تضاد سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور میں نے طے کیا کہ وہ کچھ بھی ہوں ان لوگوں میں سے ضرور ہیں جن سے ملتے رہنا چاہیئے۔ اپنے آپ کو شاعر کہہ کر اگر وہ کائنات کو ساتھ لیکر چلنے کا پرچار کر سکتے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ ضرور عظیم ثابت ہونگے چنانچہ ہوا بھی یہی)۔ اس معاملہ میں مجھے ان سے پھر کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔

مجھ سے کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ مخدوم لیڈر ہیں اور ایسے ویسے لیڈر نہیں ہیں بڑے آتش نمرود قسم کے لیڈر ہیں لیڈروں سے مجھے کبھی حسن ظن نہیں رہا نہ "ظ" سے نہ "ز" سے (کیونکہ اس صف میں اب خواتین بھی شریک ہو گئی ہیں)۔ یہ غالباً اس زمانہ کا تذکرہ ہے جب تلنگانہ کا رزمیہ ابھی جاری تھا اور نہایت زور شور کے ساتھ اس کے شاہنامے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ میں بھی مقابلتاً آتش مزاج ہی تھا میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ لیڈر ہیں تو آنے دو ان سے بھی نمٹ لینگے۔ اس سے پہلے بھی میں بہت سے لیڈر بھگت چکا تھا سب نے مجھ پر لعنت بھیجی تھی اور کوئی دوراہے پر کوئی سہ راہے پر اور کوئی چوراہے پر بلکہ بعضے تو صراط مستقیم پر بھی بے سہارا چھوڑ کر اپنی اپنی سمت نکل گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ مخدوم صاحب سے ملا تو وہ بھی دیر یا سویر کبھی نہ کبھی اسی نتیجہ پر پہنچینگے کہ پنج سالہ منصوبوں کی طرح مجھ پر بھی خدا کی مار ہے لیکن مخدوم جب سرخ سویرے سے باہر آئے اور ان سے ملاقات ہو گئی تو میرے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ وہ جب ملے تپاک سے ملے جب جب تک ملے خلوص ہی کی بات کی نہ کبھی انھوں نے رعب گانٹھا نہ اپنے نظریئے آج تک انھوں نے مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جھوٹے منہ بھی کبھی یہ ظاہر نہ کیا کہ مجھے بھی وہ اپنا پیرو بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی لاپروائی اب بھی آخری حدوں کو چھوتی ہے اور آج بھی جب میں ان سے ملتا ہوں تو یہ سوچنے لگ جاتا ہوں کہ آخر یہ کیسا لیڈر ہے کہ سارے غیر لیڈرانہ صفات ایک ہی ذات میں جمع ہو گئے ہیں۔ مخدوم صرف مخدوم ہی رہتے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگرچہ سیاسی نظریات کی حد تک اب بھی میں صرف اپنے آپ کو اپنا لیڈر تسلیم کرتا ہوں لیکن مخدوم صاحب سے ملتے ملتے اتنی تبدیلی تو مجھ میں بھی آ ہی چلی ہے کہ اور بہت سی باتوں میں میں بھی رفتہ رفتہ شریعت مخدومی کی پابندی کرنے لگا ہوں۔ ان باتوں میں پیار کی نرمیاں اتنی ہیں کہ دل بڑھتا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ دوسری تمام فاصل حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اس مرحلہ پر جب پیار کی چاندنی جگمگانے لگتی ہے تو پھر اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بس انسان یہی سوچتا ہے کہ کہاں کی پیری کہاں کی مریدی۔ بھاڑ میں جائیں یہ بندھن اور یہ تصنع۔ ہم ہوں ہاتھ میں ہاتھ دو سوئے منزل چلو اور منزل بھی دار کی نہیں پیار کی۔ دار کا تو بھولے سے بھی خیال نہیں آتا۔

مخدوم صاحب شاعر ہونگے لیڈر ہونگے مگر اس کے علاوہ بھی ان کی ایک حیثیت ہے ایک اہمیت ہے۔ وہ بڑے پہنچے

ہوئے جومیٹری داں معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اپنے فن میں غرق رہتے ہیں اور ہر سیدھے دائرے مثلث یا مربعے بناتے رہتے ہیں۔ یہ اشکال مختلف ضرور ہیں مقصد سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی احاطہ کرنا گھیرنا۔ صرف اتنا ہے ان میں تھوڑا بہت امتیاز ضروری ہے۔ کوئی تو اتنا چھوٹا سا حلقہ بناتا ہے کہ اس کے اپنے وجود کے بھی بہت سے حصے اس کے باہر رہ جاتے ہیں۔ اور کوئی اپنی لکیروں سے اتنا بڑا رقبہ گھیر لیتا ہے کہ افق کے بھی اس پار کائنات کی بہت سی وسعت اس کی حدوں میں سما جاتی ہے مخدوم صاحب اس آخری گروہ سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی جیومیٹری حدود سے تو بے نیاز نہیں ہے لیکن ان کی حد بندی تنگیِ دل سے اس حد تک ماورا ضرور ہے کہ وہ جب کمند ڈالتے ہیں تو ستاروں سے آگے ہی پہنچتے ہیں کسی مخصوص مسلک یا سرزمین یا ازم کی شرط باقی نہیں رکھتے۔ اپنی ذات کی حد تک تو خیر وہ کبھی سوچتے بھی نہیں جب سوچتے ہیں تو دور دور کی جتنی دنیا ہے اور یہاں سے لیکر وہاں تک کی جس قدر بھی مخلوق ہے وہ سب مخدوم صاحب کے کشیدہ کی زد میں آجاتی ہے۔ اس چارہ گر کی زنبیل میں موسی سے لے کر یانگسی، نیل، ڈینیوب، دجلہ اور فرات اور گنگا بلکہ سرمایہ دار ممالک کے دریائے ٹیمز اور مسی سپی سب کا دل سب کا خیال سب کا درد بیک وقت آپ کو مل جائیگا۔ ایسا میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مخدوم صاحب ذکر تو دوسروں کا کر رہے ہوں اور مراد اس ذکر سے خود ہی ہوں یہ میں نے بارہا سنا کہ بات مخدوم صاحب کی ہو رہی ہے اور مسائل حقیقت میں باقی دنیا کے حل ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ اچانک مخدوم صاحب نے زاویہ کو تقسیم کر ڈالا ہے۔ اور پھر وہ اس فکر میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ آخر کو متوازی خطوط ملتے کیوں نہیں اور اگر نہیں مل سکتے تو لاؤ کوئی ایسا عمل کر دیکھو کہ یہ مفروضہ بھی غلط ہی ثابت ہو جائے!

میں مخدوم صاحب کو جانتا ہوں اور بالکل نہیں جانتا میں قطعی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کچھ نہیں اور بہت کچھ ہیں۔ کچھ نہیں تو وہ اس لئے ہیں کہ عرفی پہلے ہی کہہ گئے ہیں کہ از بیابانِ عدم تا سرِ میدانِ وجود بہ تماشے کفنے آمدہ عریانے چند۔ بات صاف ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہیں ہوتا لیکن یہی عریانے چند اگر صرف کفن کی تلاش کو اپنا مقصدِ زیست سمجھ بیٹھیں اور اس سے آگے جستجو نہ کریں تو انسانیت کی اس سے بڑھ کر کوئی توہین بھی نہیں ہو سکتی۔ مخدوم صاحب ان چند گنے چنے سرپھروں میں سے ہیں جنھوں نے ذہنِ انسانی کو اس خود تحقیری سے باہر نکالنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اسی کو وہ تلنگانہ تحریک کا نام دیتے تھے اور اسی کو انھوں نے مزدوروں کا اتحاد قرار دے لیا ہے۔ ان کی بغاوت اتنی سرمایہ داری کے خلاف نہیں جتنی کہ اس احساسِ برتری کے خلاف ہے جو ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف آج بھی روا رکھتا ہے۔ سرخ سویرا اور گلِ تر کے سارے شعر میرے اس ادعا کی گواہی دینگے کہ مخدوم کو جب کبھی تنگ دلی سے سابقہ پڑا ہے تو انھوں نے فوراً احتجاج کیا ہے اور جہاں کہیں انھوں نے سفلہ پن پایا ہے (انسان کے سفلہ پن کی ایک شکل نہیں سینکڑوں شکلیں ہیں اس کے کمینہ پن کے مظاہرات لاکھوں ہیں) وہیں انھوں نے بھی ایک مورچہ قائم کر دیا ہے اور اپنی پوری توانائی کے ساتھ مخالفت پر ڈٹ گئے ہیں۔ وہ تنہا ہی ایسا نہیں کرتے دوسروں کو بھی اکساتے ہیں، اشتعال دلاتے ہیں وہ انہیں بھی للکار للکار کر سینہ تان لینے کے لئے تیار کیا کرتے ہیں۔ اور اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ وہ کچھ نہیں ہیں مگر بہت کچھ ہیں۔ بہت بہت کچھ!

پیارا شاعر

احمد جمال پاشا

● مخدوم صاحب سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس میں ۱۹۵۶ء کو ہوئی تھی۔ اور وہ بھی اس شان سے کہ میں مالک رام اور خانی صاحب سے ملاقات کر رہا تھا اور یہ حضرت کسی صاحب سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک نے مجھے متوجہ کیا اور میں نے پوچھا۔

"یہ کون صاحب ہیں ۔۔۔؟" خانی صاحب بولے۔

"مخدوم!"

میں نے لپک کر اپنا تعارف کرایا ۔۔۔ بڑے تپاک سے ملے اور بولے۔

"اور یہ میرے صاحبزادے ہیں!" عرض کیا۔

"مخدوم زادہ کہیے!" اور سب ہنس پڑے۔

پہلی ہی ملاقات میں ان کے خلوص، انکساری اور سادگی نے بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد ان کو بھر عرصے تک پڑھتے اور سر دھنتے رہے۔

خوش قسمتی سے حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی کانفرنس میں پھر مخدوم صاحب سے ملاقات کا موقع ہاتھ آیا۔ جہاں ہم مہمان اور وہ میزبان تھے پہلے ہی دن وہ مجھے دور سے نظر آگئے! اور انھوں نے دیکھتے ہی حسب معمول گلے لگا لیا۔ ہماری بے کاری اور ان کی مصروفیات کے سبب ملاقات تو بار بار ہوئی مگر ہر بار ادھوری اس کے باوجود ذہنی طور پر ان سے قریب ہوتا گیا۔

بڑے بڑے شاعروں سے ملا اور ان کو دیکھا۔ مگر جو بات مخدوم میں دیکھی وہ کہیں اور نظر نہ آئی۔ عوام اور خواص کے ہر طبقے میں، اتنا مقبول، اتنا ہر دل عزیز اتنا دلآرا اور پیارا شاعر شاید ہی کوئی اور ہو۔ لوگ کہ مخدوم کو دیکھ کر مارے خوشی کے بچھے بچھے جائیں، تالیاں بجانے لگیں۔ پھر کتنا بڑا اور بے قابو مجمع کیوں نہ ہو۔ اگر یہ حضرت ایک دفعہ سامنے کھڑے ہو کر اشارہ کر دیں پھر کیا مجال کہ آپ کو سوئی گرنے کی آواز نہ سنائی دے۔

روزنامہ "سیاست" کے مدیر عابد علی خاں صاحب کے

یہاں کانفرنس کے سلسلے میں ایک ثقافتی شام منائی گئی اس میں جہاں اور دلچسپ پروگرام ہوئے وہاں ایک فنکار نے مخدوم کے مشہور فلمی گیت "ایک چنبیلی کے منڈوے تلے" کی بہت دلچسپ پیروڈی بھی سنائی۔ لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہوتے جارہے تھے۔ لطف کی بات یہ کہ مخدوم لطف لینے والوں میں سب سے آگے تھے۔

یہ زندہ دلی، خوش مذاقی اور خوش مزاجی معمولی ظرف کے آدمی کے بس کی بات نہیں۔

مجھے ان کی طبیعت کا ٹھہراؤ، اعتدال اور توازن بہت بھایا —— نہ ذرا بھی دماغ، نہ تصنع، اتنے ممتاز شاعر ہونے کے باوجود مخدوم نہ لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کرنے کے لیے اپنے اوپر "نقادانہ بوریت" طاری کرتے ہیں نہ مردم بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور نہ کسی قسم کی نقاب ڈالتے ہیں۔

دو بار کی ملاقاتوں کے نتیجے میں مجھے یہ غلط فہمی ہے کہ مخدوم مجھے بہت چاہتے ہیں۔ مگر اس خوش فہمی کا شکار تو ان کے ان گنت پرستار ہوں گے۔

میرے نزدیک اچھا وہ ہے جو اچھا لگے۔ اور اچھا وہی لگ سکتا ہے جس میں بہت سی اچھائیاں ہوں لیکن جس کی ہر بات ہر ادا اچھی لگے بتائیے وہ کتنا اچھا لگے گا —— غالباً اسی لیے مخدوم مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے ایسے بے شمار لوگ ہوں گے جن کو مخدوم بہت اچھے لگتے ہوں گے۔ سنا ہے کہ وہ اچھے لوگ "جشنِ مخدوم" منانے جارہے ہیں۔

"جشنِ مخدوم" تو ایسی چیز ہے کہ جتنی بار بھی منایا جائے کم ہے —— کیوں نہ اس موقع پر اردو کا کوئی ممتاز رسالہ یا ادارہ "مخدوم نمبر" کم از کم اتنا ہی بھاری بھرکم نکال دے جتنا کہ مخدوم صاحب کی شخصیت ہو۔ تعجب ہے کہ تین تین تولے کے شاعروں تک کے نمبر نکالے جاچکے ہیں اور مخدوم جیسے وزن و وقار کے شاعر کا نمبر اب تک نہ نکالا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ "جشنِ مخدوم" کے کرتا دھرتا اس موقع پر مخدوم کے شایانِ شان نمبر نکال کر برسوں سے محسوس کی جانے والی کمی کو پورا کردیں گے۔

اپنے مذہبی معلومات میں اضافہ کیجئے

ہم نے انجیل مقدس کی روشنی میں مذہب کے بارے میں چند ایسے اسباق تیار کیے ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کے مذہبی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا اور آپ کو ایک خوبصورت سند بھی دی جائے گی آج ہی مندرجہ ذیل پتہ پر ایک خط لکھ کر مفت حاصل کیجئے

زندگی کا نور

پوسٹ بکس ۱۴۵ — حیدر آباد۔ اے۔ پی

مخدوم

انقلابی شاعر اور محبوب عوامی رہنما

غلام حیدر

● مخدوم سے عوام کو کس قدر پیار ہے اس کا اندازہ اس جلوس اور جلسہ عام سے لگایا جا سکتا ہے جو پہلے عام چناؤ سے کچھ قبل مخدوم کی قید سے رہائی پر ان کے خیر مقدم کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ مخدوم اور ان کے ساتھی قائدین کا خیر مقدم کرنے اور جلوس میں شرکت کرنے کے لیے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر سڑکوں پر نکل آیا تھا۔ مشیر آباد سے پتھر گٹی تک کئی میل لمبی سڑک کے دونوں طرف شیدائیوں اور پرستاروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع تھے: "انسانی سروں کا سمندر" اور "تل دھرنے کو جگہ نہیں" کے محاورے سنتے تھے لیکن اس جلوس اور جلسہ کے موقع پر ان کی عملی صورت نظر آئی۔ ان لاکھوں لوگوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ تلنگانہ کے ہیرو اور کمیونسٹ مجاہدوں کی صف اول کی ایک جھلک دیکھ لے۔ راستہ کے اس بے مثال اژدحام کے علاوہ خود جلسہ گاہ میں بھی حد نظر تک بس انسانی سر دکھائی دیتے تھے جن کی خواہش یہ تھی کہ غریبوں اور کسانوں کے لیے پولیس اور فوج کا مقابلہ کرنے والے تلنگانہ تحریک کے لیڈروں اور مجاہدوں اور بالخصوص مخدوم کا پیغام سنیں۔

بوڑھوں اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ کسی عوامی قائد کا ایسا زبردست اور شاندار استقبال اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا گیا اور یہ بھی سچ ہے کہ ایسا "ہجوم عاشقاں" دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی ہیں۔

عوام کو مخدوم سے اس قدر پیار کیوں ہے؟ یہ سوال ایسا نہیں جس کے لیے تلاش بسیار کی ضرورت ہو مخدوم نے جو ساٹھ سال کے ہو رہے ہیں اور جن کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے حیدرآباد میں "جشن مخدوم" منایا جا رہا ہے اپنی زندگی کے ہر دور

میں اپنے کام اور کردار سے ایک سے زیادہ نسلوں کو متاثر کیا ہے۔

کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا زمانہ تھا اس ذہین اور الھڑ نوجوان نے اس کی شوخیوں اور اشعار سے نوجوانوں اور طلباء کا ایک پورا طبقہ متاثر تھا۔ مخدوم سے چاہت بلکہ مخدوم پرستی کی حد یہ تھی کہ کج کلاہی اور چال میں بھی "مخدوم اسٹائل" بہت مقبول تھا' مخدوم کے ترقی پسند خیالات اور نظریات نوجوانوں میں موضوع بحث ہی نہیں تھے بلکہ ان کے ذہنوں میں روشنی پھیلائے تھے۔ کالج میں تدریس کے زمانے میں اس نوازشِ میں شدت پیدا ہوگئی۔ حیدرآباد کے ترقی پسند علمی ادبی حلقوں اور سیاسی زندگی میں اہم اور قابل ذکر رول ادا کرنے والے نوجوانوں میں کئی ایسے ہیں جو مخدوم کے ہم خیال' ہم شرب' دوست اور علمی یا روحانی شاگرد رہے ہیں۔ پانچویں دہائی کے پورے عرصے میں ایسے مخدوم زدہ نوجوان صف در صف نظر آتے ہیں۔

سرکاری ملازمت میں انقلابی ذہن اور عزم رکھنے والے مخدوم کا دم گھٹنے لگا۔ ایک دن لوگوں نے اچانک یہ اخباروں میں پڑھا کہ مخدوم سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے ہیں اور ریلوے مزدور یونین کی نائب صدارت مزدور طبقہ کی قیادت اور ٹریڈ یونین تحریک کی کمان سنبھال لی ہے۔ اس وقت ریلوے مزدور حیدرآباد میں ٹریڈ یونین تحریک کا ہراول دستہ تھے اور حیدرآباد میں عوامی جدوجہد کا آغاز ہورہا تھا۔ مخدوم کے اس اقدام سے ایسے کئی نوجوانوں کے حوصلے بڑھے جن کے ذہن میں انقلابی خیالات مچلتے رہتے تھے لیکن ان کی عملی صورت گری کی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔

مخدوم اب میدان سیاست میں تھے جو میدان کارزار بن رہا تھا لوگ اب تک مخدوم کی انقلابی شاعری سن کر ولولہ حاصل کرتے تھے مگر اب مخدوم کی سیاسی سرگرمیوں سے ان کے حوصلے بڑھنے لگے۔ عوام کے تمام کچلے ہوئے طبقوں کی نظریں مخدوم کی طرف تھیں۔ مزدور' کسان' طالب علم' نوجوان' سرکاری ملازم' ادیب' فن کار غرض سب ہی یہ آس لگائے رہتے تھے کہ انہیں مخدوم کی رہنمائی حاصل ہوگی اور ان کے غموں کا مداوا ہوگا۔ مخدوم نے کسی کو مایوس نہیں کیا' آندھرا مہاسبھا' کمیونسٹ پارٹی' ٹریڈ یونین کانگریس' مزدوروں کے چھوٹے بڑے ادارے' انجمن ترقی پسند مصنفین تہذیبی ادارے تقاریب اور مشاعرے غرض کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں عوام' عوام کے مسائل اور عوام کی دل بستگیاں ہوں اور مخدوم نہ ہوں۔

مخدوم سیاسی رہنما ہی نہیں شاعر بھی ہیں۔ یہ بحث مہمل ہے کہ مخدوم زیادہ بڑے شاعر ہیں یا زیادہ بڑی سیاسی شخصیت۔ یہ بحث بھی لغو ہے کہ مخدوم شاعر پہلے ہیں یا سیاسی کارکن۔ ان کی موجودہ شخصیت کی تعمیر میں شاعری اور سیاسی کام دونوں کا حصہ ہے ان دونوں پہلوؤں کو جدا نہیں کیا جاسکتا' اس کا ثبوت مخدوم کے کلام کا جائزہ لینے سے ملتا ہے اگر مخدوم کی شاعری کو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دو ادوار میں تقسیم کیا جائے تو یہ جائزہ زیادہ سہل بن جائے گا۔

آزادی سے پہلے کی نظموں میں جہاں "طور" اور "انتظار" جیسی خوبصورت رومانی نظمیں ملتی ہیں وہیں "جنگ آزادی" "حویلی" "زلف چلیپا" "انقلاب" "جانے والے سپاہی سے پوچھو" "اندھیرا" اور "یہ ہندستان کی جے" جیسی مقبول عام نظمیں ملتی ہیں۔

جن میں مخدوم نے جاگیرداری اور شاہی نظام، سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف عوام کو آوازِ عمل دی ہے، آزادی اور انقلاب کا پیغام سنایا ہے، نئے آزاد ہندوستان کی بشارت دی ہے، اور بین الاقوامیت کا سبق دیا ہے۔ یہ ساری باتیں ذہنی شعور کے ارتقاء، قومی آزادی کی اور عوامی تحریکوں کے ابھار کے ساتھ جاری رہیں۔ ان نظموں میں ان تحریکوں کی عکاسی بھی ہے، عوام کے دلوں کی دھڑکن بھی اور ان کے لئے منزل کی نشان دہی بھی۔ "چاند تاروں کا بن" ایک اہم موڑ ہے جس میں آزادی اور جمہوریت کے لئے عوام کی قربانیوں کا تذکرہ، حصول آزادی کے بعد موجودہ آفات و مصائب اور مایوسیوں کا حوالہ بھی ہے اور جد و جہد کو جاری رکھنے اور انقلاب کی سمت بڑھنے کی ترغیب اور حوصلہ بھی۔ تلنگانہ تحریک کی عظمت اور اس کے مضمرات "نظم تلنگانہ" میں موجود ہیں۔ نظم "قید" تلنگانہ تحریک کے سلسلہ میں نظر بندی کے دوران لکھی ہوئی نظم ہے۔ شاعر جو عوامی جد و جہد کا سپاہی اور سربراہ ہے جیل کی تاریک کوٹھری میں بھی میدان کارزار میں آگے بڑھتے ہوئے عوام کے قدموں کی چاپ سنتا ہے۔ اس سے حوصلہ پاتا اور پیش گوئی کرتا ہے کہ عوام کا بڑھتا ہوا یہ قافلہ "جانے کس موڑ پہ دشمن سے دھماکہ بن جائے"

عوامی اندولن کے ابھار سے متعلق یہ بھروسا اور اعتماد شاعر میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ بھی عوامی آندولن اور انقلابی تحریک کا سپاہی اور مجاہد بھی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل مخدوم مسائلی اور موضوعاتی نظمیں کم اور غزلیں زیادہ کہہ رہے ہیں۔ لیکن مخدوم کے کلام کا اگر اس زاویہ سے جائزہ لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ مخدوم کی منزل سیاسی تھی اور

چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

کے تصور کے علمبردار مخدوم نے عوام کو اپنے ساتھ اس منزل کی طرف لے جانے کے لئے شاعری کے حسین ترین ذریعہ کو بھی استعمال کیا جب ضرورت پیش آئی تقریروں سے عوام کے دلوں کو گرمایا، اور جب ضرورت محسوس ہوئی اپنے کلام کے ذریعہ ان میں گرمی پیدا کی حتی کہ رقص کے وسیلہ سے یہ پیام دیا کہ "صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو"۔

صدائے تیشہ کی کامرانی اور کوہکن کی جیت کے آرزومند مخدوم اپنے کلام ہی نہیں بلکہ اپنے کام کے ذریعہ عوام کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ اپنے خیالات، نظریات، خدمات کے ذریعہ ہر عمر اور ہر نسل کے لوگوں کو متاثر کیا اور انھیں اپنا گرویدہ بنالیا۔

تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانے کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

شاعرِ نغمہ

جی۔ ایم۔ عمر خاں

تیس سال پہلے کی بات ہے کہ میرے ایک پڑوسی دوست نے بڑی خوش الحانی سے مخدوم کی نظم

"ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا"

مجھے سنائی اور کچھ ہی دنوں میں یہ نظم ہمارا کورس بن گئی۔ جب کبھی ہم سیر و تفریح کے لیے شہر کے مضافاتی تفریح گاہوں میں جاتے تو بڑے التزام اور اہتمام سے یہ نظم گائی جاتی۔ لڑکپن اور شباب کے اس درمیانی دور نے جذبۂ شوق کو اس قدر مسحور کیا کہ مخدوم کی ہر نئی نظم کو آنکھیں تلاش کرتی رہتیں۔ فنی نکتہ سنجی سے ہماری لاعلمی کے باوجود مخدوم کی نظموں نے ہمارے اندرونی ذوقِ جمالیات کو پروان چڑھایا وہ دراصل غنائی وضع اور آہنگ کا ایسا دل نواز امتزاج تھا جس کا احساس آج تک باقی ہے۔ جب مخدوم نظم "انتظار" کو تان اور سُر میں گاتے تو ایسا لگتا جیسے نظم کے الفاظ خود ہی راگ کے نشیب و فراز بتا رہے ہیں اور گلے میں سرتیوں کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کا مکھڑا چمک اٹھتا ہے۔

یہاں میں یہ بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان چند سطور میں مخدوم کی شاعری سے متعلق میرے اپنے ذاتی خیال و احساس کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مخدوم کی شاعری کے تین دور ہیں۔ دورِ اول کالج کا زمانہ اور وہ ماحول ہے جہاں خارجی، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی بندھنوں سے آزاد ہو کر شاعر کا نصب العین صرف جمالیات یا حسنِ ازلی ہوا کرتا ہے جہاں شاعر حسنِ فطرت کو آغوش میں لیے مست و سرشار نغمے سناتا ہے اور سننے والوں کو بے خود بناتا ہے۔ دورِ اول کی سرخوشی و سرشاری میں بھی ہمارے شاعر میں احساسِ فردی کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور جیسے جیسے یہ نشہ اترتا گیا ویسے ویسے شاعر کے تخیلات و جذبات بھی زندگی کی ٹھوس اور تاریک حقیقتوں کی طرف مائل ہوتے رہے اور بالآخر نصب العین، انقلاب نے ہمارے شاعر کو سیاسی میدان میں لا کھڑا کر دیا۔

یہیں سے مخدوم کی شاعری کا دوسرا موڑ شروع ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت شاعر یہاں بھی ان کی نظموں میں عمرانی و اقتصادی بدحالیوں کے انکشاف کے باوجود نغمہ اور راگ کی فطری خصوصیت نمایاں ہے۔ مگر راگوں کے سُر بزمیت سے زیادہ رزمیت کی طرف مائل ہیں اور یہاں بھی جمالیاتی سوز کی ایک بے قرار لے باقی ہے اور یہی مخدوم کی شاعری کا حسن ہے۔

یوں تو کالج کے زمانہ ہی سے میں مخدوم سے روشناس ہو چکا تھا اور کافی یاد ہے دو چار دفعہ سرسری سی ملاقاتیں بھی رہی تھیں۔ لیکن اس کے بعد جب مخدوم سے میری ملاقات ہوئی تو یہ وہ زمانہ تھا جب مخدوم جیل سے نئے نئے چھوٹے تھے اور میرے دوست سعادت علی خاں کی دعوت پر ان کے گھر آئے تھے۔ دوست ان سے گھل مل رہے تھے اور گزری ہوئی صحبتوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ اب مخدوم سے میری ملاقاتوں اور صحبتوں کا دائرہ وسیع ہوتا رہا، اور جیسے جیسے ان کے تازہ کلام کو سننے کے مواقع ملتے رہے ویسے ویسے میرا خیال یقین میں بدلتا رہا کہ مخدوم کی شاعری میں فطری طور پر غنائیت ودیعت کر دی گئی ہے اور یہی ان کی شاعری کی وہ مخصوص انفرادیت ہے جس سے شاید اکثر شعرا محروم ہیں۔ مخدوم کی نظم "چنبیلی کے منڈوے تلے" اس کی زندہ مثال ہے۔

مخدوم کی شاعری کا تیسرا دور ان کی غزل گوئی سے شروع ہوتا ہے اردو کی شعری تخلیقات میں غزل کو جو اہمیت حاصل ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن زمانے کے مزاج کے ساتھ ساتھ غزل کا لغوی مفہوم بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے غزل کے سرمایہ میں جہاں عشق و محبت تصوف و طریقت اور رموز و اسرار کا ابلاغ و اظہار کیا جاتا رہا ہے وہیں غزل کا میدان آج اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اقتصادی معاشرتی اور سیاسی واردات اور تجربات ہی غزل کی زینت بنتے جا رہے ہیں لیکن غزل کو اصلاً ناز و نیاز کی کیفیات اور حسن و عشق کی واردات ہی سے مربوط ہونا چاہیے اور یہی بات مخدوم کی غزلوں میں اس قدر اضافہ کے ساتھ موجود ہے کہ جہاں حسن و عشق کی باتیں اور ناز و نیاز کی گھاتیں ہیں وہیں ان میں نغمہ و ترنم بھی ایسا گھل مل گیا ہے کہ اور یہ شراب دو آتشہ بن گئی ہے۔

ایک سہانی شام مخدوم "یوم قلی قطب شاہ" کے جلسے سے واپس ہو رہے تھے کہ سعادت نے انھیں پکڑ لیا اور اپنے گھر لے آئے باتیں ہونے لگیں لیکن مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مخدوم کی آواز میں نغمے مچل رہے ہیں جن میں دیپک کے سر بھی ہیں اور بھیرویں کی تانیں بھی۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی تازہ نظم ہوئی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد مخدوم نے اپنی نظم "سہاگ متی" سنائی۔ وہ نظم سنا رہے تھے اور سہاگ متی اپنے پورے روپ رنگ اور رعنائی و زیبائی کے ساتھ رقصاں تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خود سہاگ متی سات سروں کے پھیر بدل سے اپنے عشق کی داستان سنا رہی ہے اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو ہیں جن میں دکن کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے جلوے بھی نظر آ رہے ہیں اور وطن سے والہانہ محبت کا بھی اظہار ہے۔

"شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے"

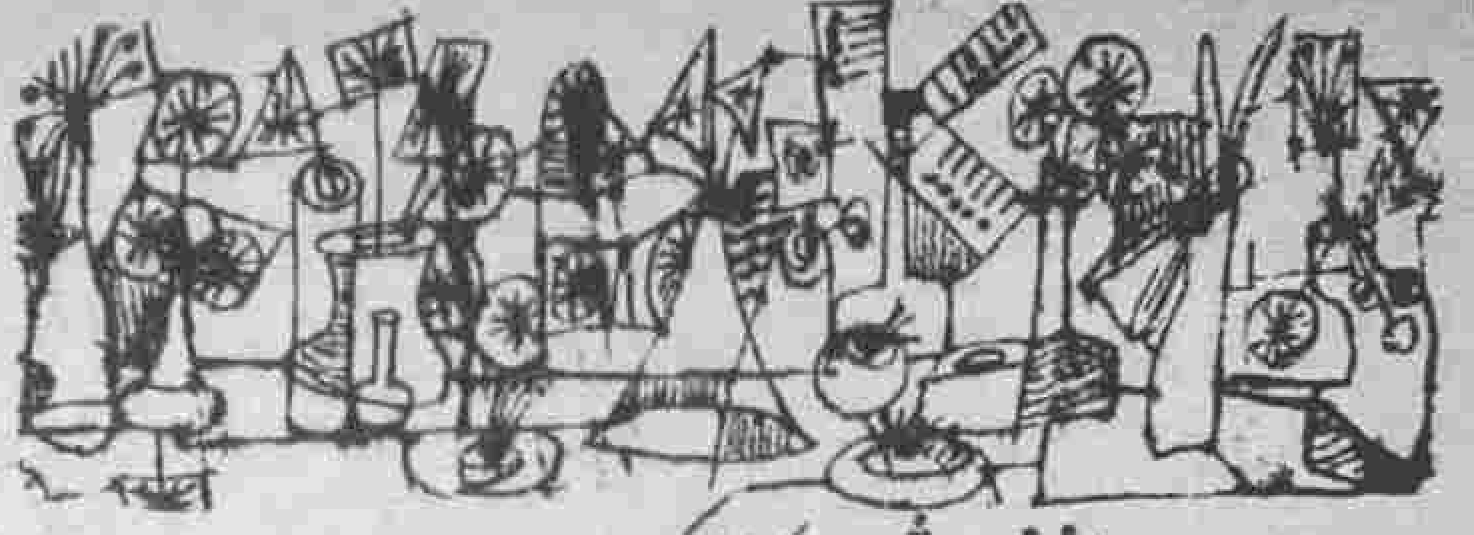

منفرد حیثیت کا مالک

مخدوم اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں کہ بیک وقت خوش گو شاعر بھی ہیں اور پختہ سیاسی کارکن بھی۔ ان میں جوشِ عمل کی گرمی بھی ہے فکر و نظر کی گہرائی بھی ہے اور کردار کی بلندی بھی ہے۔ یہی ان کی شخصیت کے اہم پہلو ہیں۔ اسی منفرد شخصیت کے سبب مخدوم اب بھی عوامی اور تہذیبی دونوں محاذوں پر سرگرم عمل ہیں۔ کتنے ہی انقلابات آئے، کتنے ہی نظریاتی تصورات متزلزل ہوئے، کتنے ہی بت ٹوٹے اور بنے لیکن مخدوم ان سب آزمائشوں سے گزرتے چلے گئے۔ مخدوم نے نہ تو ترکِ نفس کی طرف رجوع کیا اور نہ ذاتی منفعت کو اپنا مسلک بنایا۔ یہی کردار کی بلندی مخدوم کا نمایاں جوہر ہے۔ اسی کی وجہ سے مخدوم دوست اور دشمن، دونوں میں مقبول ہیں، اور اسی کی بدولت مخدوم کو قبولِ عام کی سند حاصل ہوئی ہے۔

سلامت اللہ

حُدی خوان

مخدوم کے معاصروں میں کلامِ منظوم کے پشتارے بہتوں کے پاس ہیں لیکن شہپاروں کا قحط ہے۔ شہپارے کو جسم و جاں کی سچی لگن چاہیے۔ یہ GENUINE کیفیت دل و دماغ میں سما جائے تو شاعر رجز خوانی میں بھی حُدی خوانی کرتا ہے۔ مخدوم کی لَے میں حُدی خوانوں کا سوز اور آہنگ ہے اور ایک پکار ہے جو نقاروں سے زیادہ دل نشیں ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تاریخی ہنگاموں کے اس دور میں جو پچھلے ۲۵ برس سے چل رہا ہے مخدوم کی شاعری کا بلند آہنگ گرسر یا نغمہ ہم سب کا نغمہ ہے اور سب سے الگ۔ وہ حسرت (موہانی) کے بجائے شبلی (نعمانی) کے سلسلے میں آتے ہیں کہ انھوں نے ادبی نظریہ اور سیاسی نظر کو دو مختلف الگ خانوں میں نہیں بانٹا بلکہ فنکارانہ جد و جہد میں جو جلتی جب بھر کے لیوا انھوں نے دیا وہی اپنی شاعری کے شذرے میں بھی مل دیا۔ اردو شاعری کے کھوئے ہوئے شباب کی واپسی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

ظ۔ انصاری

حقیقی شاعر

مخدوم ان شاعروں میں ہیں جن کا میں ہمیشہ سے معترف رہا ہوں۔ وہ ان ترقی پسند شاعروں میں ہیں جنھیں میں حقیقی شاعر سمجھتا ہوں۔ انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو محض فیشن کے طور پر یا مقبولیت کی خاطر نہیں اختیار کیا ہے بلکہ وہ ان کی شخصیت اور ان کے جسم و جاں کا ایک ضروری اور ناگزیر حصہ بن گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی اور سیاسی شاعری میں وہ بے اعتدالیاں نہیں ملتیں جو بعض دوسرے مشہور شعراء کے یہاں بہت نمایاں ہیں اسی لیے ان شعراء کے کلام کی محض دستاویزی اور تاریخی حیثیت رہ گئی ہے۔ مخدوم کی اس قبیل کی نظمیں اب بھی اپنے اندر شعریت اور آب و تاب رکھتی ہیں۔ مخدوم کے احساس جمال اور ان کی فطری غنائیت نے ان کی شاعری کو جو دلآویزی بخشی اس کی بنا پر ان کے کلام کی تاثیر دیرپا اور مستقل ہے۔

مخدوم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے وقت کے ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کیا ہے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ "چارہ گر" سے میرے نزدیک ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ موضوع اور فنی طریقِ کار دونوں اعتبار سے اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں۔ غزل کو بھی انھوں نے ایک نئے ذائقے سے روشناس کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مخدوم کے شعری کارناموں کا اعتراف جیسا ہونا چاہیے تھا ویسا نہ ہو سکا۔ پھر بھی اردو ادب کا ہر صاحبِ ذوق طالبِ علم مخدوم کو اپنا پسندیدہ شاعر سمجھتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

مطربِ انقلاب

مخدوم محی الدین نے اردو شاعری کی دنیا میں قدم رکھتے ہی انقلاب کا ترانہ ایسے والہانہ انداز اور کیف و سرمستی سے چھیڑا تھا کہ نگاہیں خود بخود ان کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ان کی شاعری پیرہن محبوب کی طرح رنگین ہے اور اس کی خوئے دلنوازی اور البیلے پن کا ذہن و وجدان پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ مخدوم کے ہاں انقلاب کا تصور ایک نہایت لطیف جمالیاتی پہلو رکھتا ہے۔ ان کی شاعری نغمے کے رس میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایک طرف یہ نعرۂ مستانہ ہے سامراج، استبداد و باطل کے خلاف اور دوسری طرف یہ نغمۂ عشق ہے دردِ محبت سے چور! اس میں "سیرتِ فولاد" بھی اور لطافتِ "حریر و پرنیاں" بھی!

گوپی چند نارنگ

زندہ و تابندہ

مخدوم میرا محبوب شاعر رہا ہے، کچھ اس وجہ سے کہ وہ ٹھیک اجالا ہے، اور حالات کا

جائزہ بڑی مردانگی کے ساتھ کر کے بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتا ہے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ بھی آزاد ہندستان کی سب سے زیادہ مظلوم زبان اردو کا ایسا فرزند ہے کہ جو اپنے دل میں صالح اقدار کے احساسات رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی زبان بھی زندہ و تابندہ رہے۔ شجاعت علی سندیلوی۔

کردار کا غازی

مخدوم ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے عصرِ جدید کو صرف فکر و خیال کی قندیلوں ہی سے روشن نہیں کیا بلکہ اپنی بے پناہ قوتِ عمل، صبر و استقلال، محنت و جفاکشی، جہد و ایثار سے زندگی کے دھارے کا رخ موڑنے کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے سرمایہ داری، تعصب اور استحصال کے خلاف صرف آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ اس حسین خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جدوجہد بھی کی ہے جو انسانیت کی فلاح کا راستہ دکھا کر زندگی کو حسن اور نکھار بخشتا ہے۔ ان کے ہونٹوں نے محنت کشوں کی ہمدردی کے گیت ہی نہیں گائے بلکہ ان کے لیے خون پسینہ ایک کیا۔ وہ گفتار ہی کے غازی نہیں کردار کے غازی بھی ہیں۔ موضوع سے اسی خلوص نے ان کے فن میں جان ڈالی ہے، ان کی شاعری کو نکھارا ہے۔ ان کا شعری سرمایہ کم سہی لیکن اس میں تجربہ کی سچائی، احساس کی صداقت اور فکر و عمل کی روح ہے اور اسی لیے وہ ہمارے ترقی پسند شعرا میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔

مسیح الزماں

میم سے مخدوم، میم سے محبت

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ آپ کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا؟ جی نہیں اتنی کاہل بھی میں نہیں کہ اپنے اتنے پیارے مخدوم بھائی پر کچھ لکھ بھی نہ سکوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں ابھی خود کو اس بلندی پر نہیں پاتی کہ مخدوم جیسی شخصیت پر کچھ کہنے کا حوصلہ پا سکوں۔ ویسے میں اس لحاظ سے بڑی خوش نصیب ہوں کہ مخدوم بھائی کے ساتھ ایک دو لمحات ہی نہیں بلکہ کئی گھنٹے گزارے ہیں ـــ شاعری کے میدان میں ـــ سیاست کے میدان میں مخدوم بھائی نے جو بھی نام کمایا ہو مجھے اس سے کیا سروکار ـــ میں تو اس مخدوم کو جانتی ہوں جو دلی کے جاڑوں میں میرے پاس سویٹر نہ دیکھ کر کانفرنس میں سے اٹھ کر شال خرید کر لایا ـــ جس نے میری انگلی میں پن چبھ جانے کے سبب اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر مجھے کھانا کھلایا ـــ جس نے سراپا محبت اور خلوص بن کر میرے فن کو سراہا ـــ اردو کے قاعدے میں میم سے بھلے ہی کچھ ہوں میں میم سے مخدوم اور میم سے محبت والا قاعدہ جانتی ہوں بس۔ اور کچھ نہیں ـــ جشنِ مخدوم میں شریک ہونے کی تمنا تھی لیکن اب اپنی بے شمار دعائیں محبت کی

نیک تمنائیں اور دل کا وہ گہرا پیار بھیجتی ہوں جس کے ماپ تول کے لیے آج تک کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہو سکا ہے۔ خدا کرے کہ مخدوم بھائی اتنی لمبی عمر پائیں کہ گنتی کے ہندسے حد کو نہ چھو پائیں۔ واجدہ تبسم

معصوم بزرگ

مخدوم کے اشعار پڑھ کر مجھے ہمیشہ یہی احساس رہا کہ وہ بڑا پیارا، بڑا شعر پرست بڑا معصوم بزرگ ہے پر ملاقاتوں میں سدا یہی محسوس ہوا کہ وہ ایک کائیاں، تجربہ کار اور دنیا شناس ادھیڑ عمر کا ہے۔ بعض روایت پسند نقادوں کو شاید ایک ہی وجود میں چھپے ہوئے ایک انسان اور ایک فنکار میں اس ظاہری تضاد پر تعجب ہو پر میرا خیال ہے کہ مخدوم کی شعری پاکیزگی کا راز اس کے شخصی کائیاں پن میں مضمر ہے۔

مخدوم اس امر کی مثال ہے کہ فکری سادگی کا کمال جس کے حصول کے لیے بڑے بڑے فنکار ترستے رہتے ہیں جہاں دیدگی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ جوگندر پال

جدید ادب کیا ہے اور کیا نہیں ہے

اس کا جواب جاننا ہو تو۔

ماہنامہ

شب خون الٰہ آباد

جو ادب کی بدلتی ہوئی قدروں کا ضامن اور فکر و فن کے نئے رجحانات کا آئینہ دار ہے

مدیر:۔ ڈاکٹر اعجاز حسین

قیمت فی پرچہ:۔ ایک روپیہ

زرِ سالانہ:۔ دس روپے

"شب خون" (ماہنامہ)

۳۱۳ ۔ رانی منڈی۔ الٰہ آباد ۔ ۳

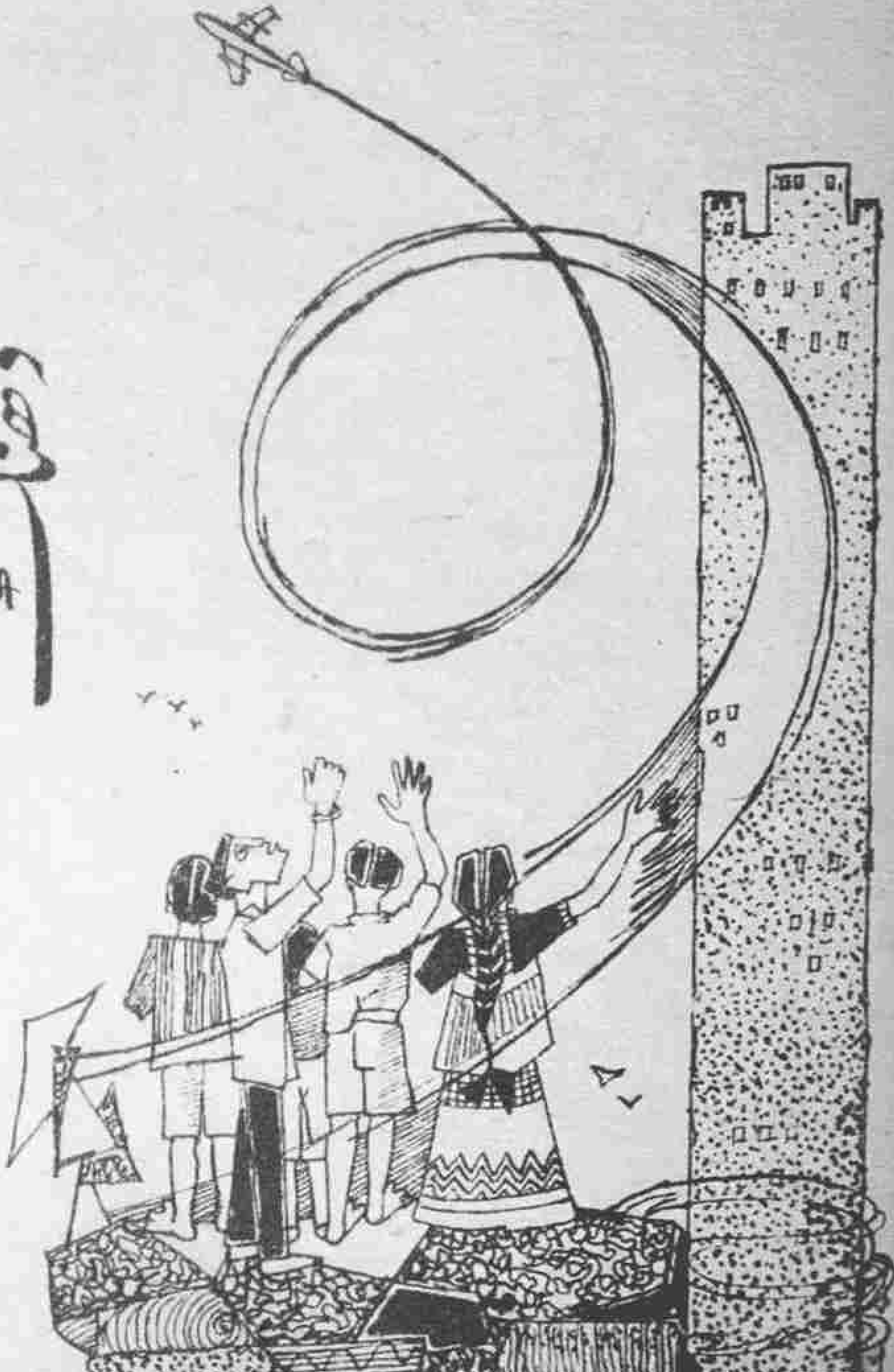

دھنک

متفرقات اور انٹرویوز

لکھنے والے

سجاد ظہیر
صفی الدین صدیقی
امان ارشد
نصرت محی الدین
یحییٰ صدیقی
شجاع احمد قائد
نریش کمار شاد
امیر عارفی

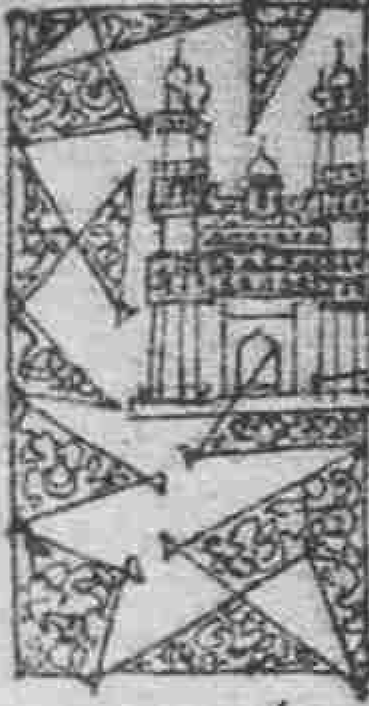

حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک اور مخدوم

سجّاد ظہیر

• ۳۶-۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان ہماری تحریک کا سب سے زیادہ فروغ اردو، ہندی اور بنگالی کے نوجوان ادیبوں میں ہوا۔ حیدرآباد دکن میں بھی سبطِ حسن کی کوششوں سے ترقی پسندوں کا حلقہ قائم ہوگیا۔ مخدوم محی الدین جو ان دنوں ایک کالج میں معلم

تھے، اس حلقے کے روحِ رواں تھے۔ قاضی عبدالغفار جو روزنامہ "پیام" (حیدرآباد دکن) کے مالک اور مدیر تھے اس نوجوان گروہ کے حامی اور سرپرست تھے۔

جولائی ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد (دکن) میں مخدوم محی الدین کی رہنمائی میں باقاعدہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی۔ حیدرآباد میں اب اردو کے نوجوان ترقی پسندوں کا ایک ہونہار گروہ ابھر آیا تھا۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے انجمن کے افتتاحی جلسے کی صدارت کی۔

۱۹۴۵ء تک اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا اچھا اور مضبوط گروہ پیدا ہوگیا تھا اور انجمن کی شاخ یہاں پر پھل پھول رہی تھی۔ گو مخدوم محی الدین رفتہ رفتہ شاعری کے میدان سے دور ہوتے جا رہے تھے لیکن ادبی تحریک سے وہ پھر بھی منسلک تھے۔ یہ زمانہ حیدرآباد میں تلنگانہ کی کسان تحریک اور مزدور تحریک کی تنظیم اور پھیلاؤ کا تھا۔ درمیانہ طبقے کے دانشوروں کا ایک گروہ بھی اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ جاگیری نظام کے زوال کی بدترین خباثتیں حیدرآباد میں موجود تھیں۔ گو حیدرآباد ریاست کے عوام کی اکثریت تلگو، مراٹھی اور کنڑی زبان بولنے والوں کی

تھی اور سو دو کروڑ کی آبادی میں صرف تیس لاکھ کی آبادی اردو بولتی تھی لیکن وہاں کے تعلیمی اور سرکاری نظام میں حیدرآباد کی دوسری زبانوں کو کوئی جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اردو کو سب زبانوں پر ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی جو یہاں کے حکمران اور جاگیردار طبقے کی بھی زبان تھی۔ گو ان حکمرانوں کو اردو ادب یا تہذیب کی ترقی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اور وہ اپنی جہالت اور عیاشی میں مگن تھے اور سمجھتے تھے کہ زیر سایہ برطانیہ حضرت ظل اللہ تاجدار دکن کی مطلق العنانی ابدالآباد قائم رہے گی۔ لیکن حیدرآباد اور ہندوستان کے مسلم عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ اردو زبان کی حمایت کا ڈھونگ رچاتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں نظام شاہی اور جاگیرداری کا وجود، ہندوستان میں اسلام، مسلمانوں کی تہذیب اور اردو زبان کے برقرار رہنے کے مترادف ہے۔ ہندو فرقہ واریت (جسے مارواڑی سرمایہ داروں، ہندو راجے مہاراجوں اور جاگیری عناصر کی حمایت حاصل تھی) کی اقلیت کشی اور دوسری زبوں کاریوں کے سبب سے فرقہ دار رجعت پرستوں کو مسلم عوام میں کسی حد تک پہنچنے کا موقع ملتا تھا۔ برطانوی سامراج فرقہ واریت کے دونوں سرچشموں کی رکھوالی کرتا تھا۔

ان حالات میں حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پوزیشن کافی دشوار تھی۔ جمہوریت ترقی پسندی کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر قوم کی آزادی اور خود اختیاری کے حق کو تسلیم کیا جائے اور کسی قوم یا گروہ کو دوسرے پر سیاسی یا تہذیبی اعتبار سے غلبہ کرنے کا حق نہ ہو اور حیدرآباد میں چونکہ اس زمانے میں اردو کو دوسری زبانوں پر ایک ناجائز غلبہ حاصل تھا اس لیے اردو کے ترقی پسندوں کا خاص طور پر یہ فرض تھا کہ جہاں وہ اردو بولنے والوں میں اپنی زبان اردو کی ترقی و ترویج کریں اور اس میں ترقی پسند ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں، وہاں ریاست حیدرآباد کی ان اقوام کی زبان کو ان کا مناسب مقام دلوانے کے لیے آواز بلند کریں اور کوشش کریں، جنھیں ان کے جائز ثقافتی اور تعلیمی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کا خاص طور سے یہ فرض تھا کہ خود کو اردو کے رجعت پرست (اور فی الحقیقت جھوٹے) حمایتیوں سے ممیز کریں۔

دوسرا سوال حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کے سامنے یہ تھا کہ حیدرآباد کے مخصوص حالات میں ترقی پسندی کے مفہوم کیا ہیں۔ ترقی پسند ادیب عوام کے دکھ درد، ان کی آزادی اور جمہوریت کے خواہش کے ترجمان ہیں۔ سارے ملک سے سامراجی اقتدار کے اٹھ جانے کے لیے تو وہ آواز بلند کر ہی رہے ہیں، کیا حیدرآباد میں ان کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ریاستی حکمران کی مطلق العنانی (طلسمی بت بنائے گئے منعم) کو بھی توڑنے کی بھی کوشش کریں؟ سوال محض یہ نہیں تھا کہ ایک ناقص العقل انسان کو ریاست کے خزانوں، جائداد اور تمام سرخ و سفید کا مطلق العنان سربراہ بنانا دانشمندی نہیں۔ سوال یہ تھا کہ حیدرآباد کے جمہور کو جاگیری نظام سے چھٹکارا دلا کر وہاں جمہوریت کی مضبوط بنیاد رکھی جائے۔

حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند ادیب زیادہ تر درمیانہ طبقے کے مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس درمیانہ طبقے کی حالت بھی روز افزوں زوال پذیر ہو رہی تھی۔ ان کا پڑھا لکھا حصہ بیشتر سرکاری نوکریاں کر کے اپنی بسر اوقات کرتا تھا۔ اب اس میں بھی بڑی بے روزگاری تھی۔ پھر اس طبقے کے کافی بڑے حصے میں حکمران طبقے کا فرد ہونے کا زعم تھا، رسی جل گئی تھی، لیکن اس رسی کے بل نہیں گئے تھے۔ نظام دکن سے وفاداری جیسے ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں

کافی بڑی تعداد مجلس اتحاد المسلمین کی تحریک سے وابستہ ہوتی جا رہی تھی۔ یہ تحریک دوسری فرقہ وارانہ تحریکوں کی طرح قدیم تہذیبی اور مذہبی روایت اور جمہوریت کا زبان سے اعادہ کرتی تھی، جس کے ذریعے مسلم عوام کے ایک حصے کو وہ اپنی جانب کھینچتی تھی۔ لیکن فی الحقیقت اس کا مقصد غیر جمہوری جاگیری نظام اور سامراجی اقتدار کو بدلی ہوئی شکل میں برقرار رکھنا تھا۔

موجودہ زمانے (۱۹۵۳ء) کے بدلے ہوئے حالات میں حیدرآباد کے ترقی پسند ادیبوں کی نظروں میں اوپر لکھی ہوئی باتیں بالکل صاف ہوں گی۔ لیکن ۱۹۴۵ء میں ایسا نہیں تھا۔ مخدوم اور ان کے بالکل قریبی لوگ جو کسی نہ کسی طرح سے عوامی تحریکوں سے وابستہ تھے، حیدرآباد میں اُردو کے صحیح مقام، نظام اور جاگیرداری کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سے ملحق اور اس کے اردگرد بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو ترقی پسند بھی تھے۔ اور نظام کے خلاف بات کرنا بھی ان پر گراں گذرتا تھا۔ ایسے بھی تھے جو اُردو ادب کی ترویج و ترقی اور اس میں ترقی پسند ادب کی تخلیق تو پسند کرتے تھے، لیکن حیدرآباد میں ہی بسنے والی دوسری زبان بولنے والی قوموں کو ان کی زبان کی ترویج و ترقی اور اس میں تعلیم کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھے، یا اگر تیار بھی تھے تو اس بات کا صاف طور سے اظہار کرنے کی ان کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔

بہرصورت، ان خامیوں کے باوجود حیدرآباد کی انجمن اس زمانے میں ہماری اچھی اور مضبوط شاخوں میں سے تھی۔ مخدوم کے علاوہ اس میں ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، نظر حیدرآبادی، کلیم اللہ، سری نواس لاہوتی، نیاز حیدر، عزیز احمد، عالم خوندمیری وغیرہ شامل تھے، اور وہاں لکھی جانے والی نظموں اور تنقیدی مضامین کا معیار کافی بلند تھا۔

حیدرآباد کی انجمن نے مرکز کے سامنے تجویز پیش کی کہ اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی ایک کل ہند کانفرنس کی جائے اور اگر مرکز اسے منظور کرے اور حیدرآباد کی انجمن کے ساتھ تعاون کرے تو وہ اس کانفرنس کو حیدرآباد میں منعقد کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس تجویز پر بمبئی میں آپس میں مشورہ کیا اور دوسری شاخوں کی بھی اس کے متعلق رائے لی۔ ابھی تک ہم نے کسی ایک زبان کی "کل ہند" کانفرنس نہیں کی تھی۔ اس وقت تک ہماری "کل ہند" کانفرنسیں ملک کی تمام ان مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنسیں ہوتی تھیں جہاں ہماری شاخیں یا ترقی پسند ادیب موجود تھے۔ ہمارے آئین میں صوبائی یا ایک لسانی علاقے کی کانفرنس کے لیے تو دفعہ موجود تھی، لیکن اس قسم کی کانفرنس کے لئے نہیں۔ اس کے باوجود عام رائے یہی ہوئی کہ اس قسم کی کانفرنس ضرور ہونا چاہیے اور اس سے ہم کو فائدہ ہوگا۔

حیدرآباد ایسے شہر میں جہاں اس زمانے میں ترقی پسندی کے نام سے ہی لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے وہاں کے نوجوان ادیبوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے کس طرح اتنی شاندار، اتنی منظم، اور اتنی مفید اور ٹھوس کانفرنس کر لی، اس کا خیال کر کے آج بھی مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسندوں کے پاس خود اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ کانفرنس کے کثیر اخراجات، جلسوں کے لیے متعدد ہالوں کا انتظام اور سارے ملک سے آئے ہوئے پچاسوں ادیب اور ڈیلیگیٹوں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا، (اور ان میں اکثر نازک مزاج شعرا بھی تھے) بندوبست کر سکتے تھے۔ ہمارے حیدرآبادی رفیقوں نے یہ سب بڑی خوبی سے کیا اور میرے خیال میں اس کے پیچھے بات ۱۹۴۰ء تک جب تک کا مجھے علم ہے، ترقی پسند مصنفین کی

کوئی کانفرنس ہر اعتبار سے اتنی اچھی طرح اور اتنی کامیابی سے نہیں ہوئی۔

وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے اس لیئے کہ انھوں نے بڑی دانشمندی اور باقاعدگی کے ساتھ حیدرآباد کے تمام ان افراد، گروہوں اور طبقوں کا تعاون حاصل کیا، یا انھیں اپنا ہمدرد بنایا جو اردو زبان، اردو ادب وشعر اور اس کی ترقی سے ذرا بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ حیدرآباد کے لوگ عام طور سے بڑے مہمان نواز اور خلیق مشہور ہیں۔ باہر سے جانے والوں کی وہاں بے حد خاطر کی جاتی ہے اور خاص طور سے اگر باہر سے آنے والا مہمان اردو کا ادیب یا شاعر ہے، تو پھر وہاں کے رئیسوں، جاگیرداروں اور "جنگوں" تک کا بھی ایک حلقہ ان کی آؤبھگت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ غالباً ان کی بے کیف تھکی اور اکتائی ہوئی زندگی میں وہ بھی کسی طرح بھی تفریح کا ایک سامان ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو اور قاضی عبدالغفار ہماری تحریک کے پرانے سرپرست اور مددگار تھے۔ انھوں نے کانفرنس کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

یہ کانفرنس کوئی پانچ چھ دن تک ہوئی۔ اس کا افتتاح مسز نائیڈو نے کیا۔ افتتاحی جلسہ ایک سینما ہال میں ہوا تھا اور اس میں کوئی دو ڈھائی ہزار کا مجمع رہا ہوگا۔ اس کانفرنس کی صدارتی مجلس مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تاراچند، کرشن چندر، فراق گورکھپوری اور احتشام حسین پر مشتمل تھی۔ پہلے دن کے افتتاحی جلسے کی صدارت کرشن نے کی، افتتاحی جلسہ تو دراصل نمائش اور طمطراق کے لیے ہوتا ہے۔ جس میں تحریک کے عام مقاصد بیان کر کے حاضرین کو اس کے ساتھ ہمدردی اور اس کی رائے کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کا زیادہ مفید کام ان چھوٹے چھوٹے اجلاسوں میں ہوا جو بعد کو منعقد ہوئے اور جن میں سو دو سو کی حاضری ہوتی تھی۔ فراق نے شاعری کے اجلاس کی صدارت کی، کرشن چندر نے افسانہ اور ناول، قاضی عبدالغفار نے (جو استقبالیہ کمیٹی کے بھی صدر تھے) جرنلزم، ڈاکٹر تاراچند نے اردو ہندی مسئلے اور احتشام حسین نے اردو تنقید کے اجلاس کی صدارت کی، مولانا حسرت موہانی نے ایک بڑے عام اجلاس کی صدارت کی۔

کرشن چندر نے اردو کے ترقی پسند مصنفین کی اس پہلی کل ہند اردو کانفرنس کے متعلق جو حیدرآباد میں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئی، اپنے تاثرات "پودے" کے نام سے لکھے ہیں۔

مخدوم نے حیدرآباد کی جمہوری تحریکوں میں کام کرنے والے ترقی پسند مصنفین کی وساطت سے جمہوری طلباء، دانشوروں اور محنت کشوں کے باشعور حلقوں کی مدد حاصل کی، جس کے بغیر تنظیم کے سب سے مشکل اور تکلیف دہ اور غیر دلچسپ کام اچھی طرح انجام ہی نہیں پاسکتے تھے۔

...

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال

جیسے پیتے وقت مجھ کو بال بچوں کا خیال

مخدوم محی الدین

(استاد، شاعر اور دوست)

صفی الدین صدیقی

● مخدوم پر کچھ لکھتے ہوئے میری پیشکش کی نوعیت کچھ جداگانہ ہے وہ اس لیے کہ میں اپنے اندر احترام کے اس جذبے کو جاگزیں دیکھتا ہوں جو ایک شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ ہونا چاہیے۔ استاد ایک اچھا دوست بھی ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک افکار اور عقائد کا تعلق ہے ایک شاگرد کو اپنے استاد سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے مگر اس اختلاف کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ اس سے احترام کے جذبے میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہونے پاتی۔ اس سلسلے میں ارسطو کے ایک قول نے میری بڑی رہنمائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"سچائی مجھے عزیز ہے اور افلاطون کو بھی میں
اپنا عزیز سمجھتا ہوں لیکن افلاطون کے مقابلے
میں سچائی مجھے عزیز تر ہے۔"

چونکہ اکثر لوگ مخدوم صاحب کو ایک شاعر اور سیاسی رہنما کی حیثیت میں جانتے ہیں تو انھیں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ مخدوم صاحب شاعری کی حد تک میرے استاد رہے ہوں گے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میں شاعر نہیں ہوں جہاں تک مجھے معلوم ہے مخدوم صاحب نے اصلاحِ شعر کا شغل کبھی اختیار نہیں کیا۔ (پیشہ ورانہ مفہوم میں) لیکن اگر یہ سچ ہے کہ شاعری کی حد تک مخدوم صاحب کے شاگردوں کا کوئی حلقہ موجود ہے تو پھر مجھے تلامذۂ مخدوم میں شامل نہ رہنے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

میں تو ان مخدوم محی الدین کی بات کر رہا ہوں جو ۲۵ سال پہلے ادبیات اردو کے استاد کی حیثیت سے سٹی کالج آئے تھے۔ حیدرآباد کے اس یکتا تعلیمی ادارے کے پرنسپل ان دنوں سید محمد اعظم صاحب (بعد کو نواب اعظم جنگ بہادر) تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اعظم صاحب کے عہد میں یہ ادارہ کوئی جامعہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک جامعہ کی آن بان رکھتا تھا۔ خواہ تعلیم کا میدان ہو یا کھیل کا میدا

سٹی کالج کی اپنی انفرادیت تھی۔ اس کا اپنا یونیفارم تھا۔ تمام طلبا بڑے ذوق و شوق سے شیروانی کے وہ خاص بٹن استعمال کرتے تھے جن میں ایک پرندے کو پرواز کی حالت میں دکھلایا گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اعظم صاحب نے حیدرآباد کے بہترین لوگوں کو اس باغ میں اکٹھا کرلیا تھا۔ ان اساتذہ کی فہرست کافی لمبی ہے جن سے مجھے تحصیل علم کا موقعہ ملا۔ ان میں خاص طور پر سید محمد صاحب، منیب حسین صاحب، مخدوم محی الدین صاحب اور آغا حیدر حسن صاحب (آغا صاحب کچھ دنوں کے لیے نظام کالج سے یہاں آئے تھے) کے نام میں گنواؤں گا۔ کیوں کہ یہ نام اردو زبان و ادب کی تدریس سے متعلق ہیں۔ ہم طالب علموں کے لیے مخدوم صاحب کی شخصیت بڑی جاذب اور سحر انگیز تھی کیوں کہ وہ نہ صرف اردو کے استاد تھے بلکہ ایک شاعر بھی تھے اور کالج کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ میں نہیں جانتا انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کی حد تک مخدوم محی الدین صاحب کا طریقہ درس کیا ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں میرے دوست حسینی شاہد زیادہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کیوں کہ انٹرمیڈیٹ انھوں نے سٹی کالج سے پاس کیا تھا۔ البتہ میٹرک کی تدریس کے بارے میں اپنے تجربات میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مخدوم صاحب نے شاید ہی درسی یا نصابی کتب سے دلچسپی لی ہوگی۔ ہائی اسکول کی اس آخری جماعت میں بھی انھوں نے کالج کے لکچروں جیسا طرز اختیار کررکھا تھا جو ظاہر ہے کہ ہم طالب علموں کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ وہ اکثر زبان و ادب کی باتیں کیا کرتے تھے جو ہمارے اپنے معیار کے اعتبار سے بہت اونچی ہوتیں لیکن ان باتوں کے سننے میں ہم کو بڑا لطف آتا تھا چنانچہ مخدوم صاحب کی ان باتوں نے ہمارے ادبی مذاق کو تو کافی ابھارا لیکن امتحان کے نقطہ نظر سے یہ تجربہ اتنا زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ ہمارے ممتحن یہ کیوں کر گوارا کرسکتے تھے کہ طلبا اپنے جوابی بیاضوں میں زیادہ قابلیت اور ذہانت کا ثبوت دیں۔ یہ تو اردو زبان و ادب کی درسی روایات کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ اب میں سوچتا ہوں تو میرے سامنے مخدوم صاحب کی شخصیت کے وہ خدوخال ابھر کر آجاتے ہیں جو ابتدا ہی سے روایتی بندھنوں کو توڑنے کی عادی رہی ہے خواہ وہ درس و تدریس کی روایات ہی کیوں نہ ہوں۔

ان دنوں مخدوم صاحب جب بھی کلاس میں داخل ہوتے تو ان کے ہاتھ میں ایک پتلی سی مجلد کتاب ہوا کرتی۔ میرے اکثر کلاس فیلو یہ سمجھا کرتے کہ ہو نہ ہو یہ مخدوم صاحب کا مجموعہ کلام ہوگا۔ اور ہم نے مخدوم صاحب سے اس کتاب کے بارے میں پوچھ لیا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہنے لگے۔

”یہ مجموعہ کلام تو ہے لیکن میرا نہیں۔ یہ بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا مجموعہ ہے۔“

اس کے بعد مخدوم صاحب نے نذرل کی کچھ نظمیں پڑھ کر سنائیں جن میں 'باغی' نام کی نظم مجھے یاد رہ گئی ہے۔ یہ نظمیں ہیئت اور مواد کے لحاظ سے ہم طالب علموں کے لیے بالکل نئی تھیں، اور ہمارے ناپختہ ذہنوں نے ان کو شاعری ماننے سے انکار کردیا تھا کیوں کہ اردو کی جن نظموں کو ہمارے ذہنوں نے قبول کیا تھا وہ نذرل کی نظموں سے بالکل مختلف تھیں اور جو ہمارے طفلانہ مزاج سے زیادہ ہم آہنگ بھی تھیں۔ ان میں وزن ہوتا ہے، قافیوں کا

جھنکار ہوتی ہے اور ان کو ترنم کے ساتھ پڑھا بھی جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ہم نے نذرل کی نظموں کو اردو نظمیں سمجھ لیا تھا۔ نذر الاسلام خواہ بنگال کا رہنے والا کیوں نہ ہو اس کی مادری زبان تو اردو ہونی چاہیے۔ (ہم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بنگالی مسلمانوں کی مادری زبان بنگالی، اور ملیالی مسلمانوں کی مادری زبان ملیالی ہوتی ہے) ویسے دیکھا جائے تو اردو کے تعلق سے ہمارا یہ نقطۂ نظر بالکل وہی تھا جو آج کل کے بعض اردو دشمنوں کا ہے، جو اردو کے ادبی سرمائے کو محض اس لیے رد کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس نقطۂ نظر کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں یہ اس وقت کے جاگیردارانہ سماج کی دین تھا اور ہم نوجوان اسی سماج کے پروردہ تھے۔ مخدوم صاحب نے پہلی بار ہم کو یہ احساس دلایا تھا کہ اردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ادب اور شاعری کے انمول خزانے موجود ہیں۔ بعد کو ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ مخدوم صاحب نے ٹیگور کی شاعری پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی طالب العلمانہ زندگی میں جو پہلی کتاب کالج بک ڈپو سے میں نے خریدی وہ نذرل کی بنگالی نظموں کا اردو ترجمہ ہی تھا۔

ہم میں سے اکثر طالب علموں نے مخدوم صاحب کو مشاعروں اور دوسرے ادبی جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ وہ بخصوص ترنم میں اپنی نظمیں سناتے جس کی وجہ سے ان کی اثر پذیری میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ بعض مرتبہ کلاس کے باقاعدہ اوقات میں بھی ہم مخدوم صاحب سے نظمیں سنانے کی خواہش کرتے۔ پہلے تو وہ اس فرمائش کو ٹالتے رہے لیکن جب ہماری طرف سے اصرار بڑھتا گیا تو دو تین بار انھوں نے اپنی نظمیں بھی سنائیں۔ لیکن اکثر یوں ہوتا کہ ان کی پسند کی نظمیں نہیں ہوتی تھیں۔ مخدوم صاحب 'حویلی'، 'انقلاب'، 'دھواں'، اور 'مشرق' نام کی نظمیں سنانا پسند کرتے اور ہم چاہتے تھے کہ وہ اپنی نظم 'انتظار' سنائیں۔ بہت سے ساتھیوں نے اس نظم کو حفظ کر لیا تھا۔ وقفہ یا چھٹی کے دوران ہم اس نظم کو مخدوم صاحب ہی کے ترنم میں پڑھنے کی کوشش کرتے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ 'حویلی'، 'مشرق'، اور 'انقلاب' کے مقابلے میں ان کی نظم 'انتظار' ہمارے لیے اس قدر پسندیدہ کیوں تھی تو اس نتیجے تک پہنچتا ہوں کہ پسند و ناپسند کے معاملے میں عمر اور ذہنی سطح کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ عنفوانِ شباب کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ عمر کی اس منزل پر فرد رومانیت کا زیادہ دلدادہ ہوتا ہے۔ خواہ یہ رومانیت اس کو کسی بھی شکل میں دستیاب ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوعمری میں انقلابی تصورات کو قبول کرنے کی صلاحیت فرد کے اندر بالکل نہیں پائی جاتی۔ وہ ان تصورات سے اثر قبول کرتا ہے لیکن اس کی انقلابی ذہنیت پر بھی رومانیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری شاعری میں انقلابی رومانی نظموں کی کمی نہیں ہے۔ شاید ہم لوگ ابھی ذہن کی اس سطح تک نہیں پہنچ سکے تھے کہ مخدوم صاحب کی شاعری کے رخ کو متعین کر سکتے۔ ہم جس سماج کے اندر سانس لے رہے تھے وہ اس قدر رنگیلا اور ٹھہرا ہوا تھا کہ اس کو بدلنے کا خیال ہمارے ذہنوں میں آنا محال تھا۔ ہم اس کو ایک آئیڈیل سماج سمجھے ہوئے تھے اور ہمیں اس سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ گو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا لیکن اس جنگ کا ہماری زندگیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ہم

کو اس بات کا احساس بالکل نہیں تھا کہ ہم جیسے ہی نوجوان ریاست کے باہر اور اندر ہر محاذ پر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ سے وابستہ ہونے کے بعد میں نے ان کو ہوسٹل کے ایک سالانہ مشاعرے میں سنا۔ گو مخدوم صاحب کو یونیورسٹی چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن ان کی آمد نے طلبا میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا (ارباب اقتدار نے اس سے قبل یونیورسٹی کیمپس میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا تھا۔ ریاست میں مجلس اتحاد المسلمین کی سیاسی تحریک زور پکڑ چکی تھی) اس وقت بھی مخدوم صاحب طلبا کے محبوب ترین شاعر تھے۔ مجھے یاد ہے اسی مشاعرے میں کسی مجلسی ذہنیت کے طالب علم نے ان پر فقرہ چست کیا تھا "مخدوم صاحب اپنی نظم حجاموں کی ہڑتال سنائیے"۔

مخدوم صاحب نے کسی قسم کی خفگی کا اظہار کیے بغیر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ نظم تو میں آپ کی ہڑتال کے بعد سناؤں گا" اس کے بعد مشاعرہ کی معذرت پر مخدوم صاحب نے جو تقریر کی اس کے ہر ہر لفظ میں مادر جامعہ کے لیے بے پناہ عقیدت جھلکتی تھی۔ نوجوان سامعین کا اصرار تھا کہ وہ اپنی نظمیں انتظار اور ساگر کے کنارے سنائیں۔ انھوں نے کہا کہ انتظار کے تھیم ہی پر میں نظم سناؤں گا۔ مگر یہ انتظار پہلے انتظار سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ جب انھوں نے پہلا مصرعہ گنگنایا تو ہم نے سمجھ لیا کہ اب انھیں کسی محبوب کا انتظار ہے ؎

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم محی الدین صاحب اپنے ہم جلیسوں اور ہم عصروں میں مقبول تو رہے ہوں گے لیکن جامعہ اور ہوسٹل کے پرانے "ملازموں" کو بھی ان کی ہر دلعزیزی اور بڑائی کا احساس تھا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ مجھے آج بھی یاد آتا ہے۔ ان دنوں میں بی اے کے پہلے سال میں پڑھتا تھا۔ آرٹس کالج کے نواح میں واقع تینوں ہوسٹلوں کو ہم نے ان کی خصوصیات کے اعتبار سے الگ الگ نام دے رکھے تھے۔ اے ہوسٹل ہاؤز آف لارڈس کہلاتا تھا۔ کیوں کہ اس میں حیدرآباد کے ہی بورژوا طبقہ کے لوگ رہنا پسند کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے اندر ہی انھوں نے اپنے خوشامدی مصاحبوں کا گروہ پیدا کر لیا تھا جو انھیں سرکار اور حضور کے ناموں سے مخاطب کرتا۔ چنانچہ ایک مصاحب کے توسط سے مجھے اپنے ایک صاحبزادہ قسم کے کلاس فیلو کی محفل نشاط میں بھی باریابی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ بی ہوسٹل ہاؤز آف کامنس کہلاتا تھا جس میں محنتی اور سول سروس کا خواب دیکھنے والے طلبار ہا کرتے تھے۔ اس ہوسٹل میں میں نے انٹرمیڈیٹ کے دو سال گزارے ہیں۔ سی ہوسٹل ہاؤز آف یوتھس کے نام سے مشہور تھا یہ اس وقت تعمیر ہوا جب عثمانیہ یونیورسٹی اڈکمٹ کیمپس میں نئی نئی منتقل ہوئی تھی۔ ایک اور ہوسٹل یونیورسٹی کی پرانی عمارتوں میں

میں واقع تھا جس کو ڈی ہوسٹل یعنی ہاؤز آف ڈفرس کے نام سے یاد کیا جاتا۔ پتہ نہیں طلبا نے اس کو یہ NICKNAME کیوں دے رکھا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس میں رہنے والے طلبا کی ہوسٹل لائف نہ ہونے کے برابر تھی۔ چونکہ سی ہوسٹل کا یونیورسٹی کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں ایک خاص حصہ رہا کرتا اس لیے کچھ عجب نہیں جو اس کو ہاؤز آف پوئٹس کا نام دے دیا گیا ہو۔ میں سی ہوسٹل میں لگ بھگ چار سال مقیم رہا۔ اضلاع اور شہر سے آئے ہوئے اکثر طالب علموں کے لیے یہ ہوسٹل پسندیدہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ عمارت کے اعتبار سے شاندار نہیں تھا اور وہاں کا فرنیچر بھی کافی پرانی وضع کا تھا۔ میں جب اس ہوسٹل میں منتقل ہوا تو میرا وارڈ بوائے ایک پرانا ملازم محمد ظہور نامی تھا۔ میں نے جب محمد ظہور سے کمرے اور اس کے فرنیچر کی شکایت کی تو وہ فخریہ انداز میں کہنے لگا۔ آپ خوش قسمت ہیں صاحب جو آپ کو یہ کمرہ اور فرنیچر ملا ہے۔ اس کمرے میں مخدوم صاحب رہا کرتے تھے اور اسی کرسی پر بیٹھ کر وہ شاعری کیا کرتے تھے۔ بے چارے محمد ظہور کو کیا معلوم کہ شاعری کا تعلق نہ تو کسی خاص کمرے سے ہے نہ کرسی سے۔ میرے خیال میں محمد ظہور کا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی گفتگو نے میرے اور اس کمرے کے درمیان ایک طرح کے جذباتی تعلق کو استوار کر دیا تھا۔

۱۹۴۳ء میں مخدوم صاحب نے معلمی کا پیشہ ترک کر دیا۔ عملی سیاست سے وابستہ ہو گئے۔ ملازمت کے ترک کرنے کے منجملہ اسباب میں سے ایک بڑا سبب ان کا مارکسی تعلیمات پر گہرا ایقان تھا۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم ان کا لائحہ عمل بن گیا۔ ان کی زندگی میں یہ موڑ کیوں آیا؟ اس انقلاب کے اندر شعور کا کیا باعث تھا اس پر میں روشنی نہیں ڈالوں گا۔ اس کی مکمل داستان خود مخدوم صاحب قلمبند کر سکتے ہیں لیکن اس تبدیلی پر مجھے تعجب نہیں ہوا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ان کی شخصیت کے اندر ابتدا ہی سے چند ایسے عوامل کارفرما تھے کہ جو ان کی کسی بڑی تبدیلی کی طرف لے جا سکتے تھے۔ ایک محفوظ اور مامون زندگی کو تج کر کسی خاص مقصد کے لیے خود کو وقف کر دینا ہر انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے بڑی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے نئے ایقان کی تلاش میں پرانے عقائد کو تہس نہس کرنا پڑتا ہے اور نئے نئے خطروں کو دعوت دینی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ مخدوم صاحب نے کیا۔ مخدوم صاحب کے اس زمانے کے شب و روز کا حال مجھے معلوم نہیں سوائے اس کے کہ مزدور تنظیموں کے وہ ایک سرگرم کارکن تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو سکندرآباد جانے والی ایک بس میں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ میری نشست کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ ملگجی میلی اور کھدر کی قمیص میں ملبوس ہاتھ میں ایک بڑا سا چرمی بیگ۔ میں نے ان کے لیے جگہ خالی کرنی چاہی مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ ان کے اصرار کے باوجود میں کھڑا ہو گیا تو انھوں نے زبردستی مجھے سیٹ پر بٹھا دیا۔ تمام راستے میری تعلیم کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب میں نے کہا کہ فلسفہ و سیاسیات میرا خاص مضمون ہے تو کہنے لگے مارکسزم کا مطالعہ بھی تم نے پڑھا ہو گا؟ میں نے جواب... دیا۔ اس کے بغیر فلسفہ و سیاسیات کی تحصیل کیوں کر مکمل قرار دی جا سکتی ہے

پوچھنے لگے۔ "اس کے اندر کیا پایا تم نے؟ جو اب تک ماورائے مارکسزم بھی ہے ایک بات؟" "یہ تم اقبال کی زبان میں بول رہے ہو۔" اسی دوران حیدرآباد کا چوراہا آ گیا اور وہ وہاں اتر پڑے۔ مگر مخدوم صاحب کے اس فقرے نے مجھے کافی غور و خوض پر مائل کر دیا۔ سچ پوچھئے تو یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد کے پڑھے لکھے لوگ تعلیمات اقبال سے معتدبہ متاثر ہونے لگے تھے۔ یونیورسٹی کے اندر اور اس کے باہر افکار اقبال کے مفسروں کی کافی تعداد موجود تھی۔ اس کے علاوہ 'بیت الامت' (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی رہائش گاہ) میں درس اقبال کے تحت لیکچروں کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ تعلیمات اقبال کی نشر و اشاعت میں حیدرآباد نے جو حصہ لیا اس کی نظیر خود اقبال کے . . . . . . میں بھی نہیں مل سکتی تھی۔ چونکہ اقبال ایک ایسی اسلامی سوسائٹی کی تشکیل پر زور دینا چاہتے تھے جس کی اساس انسانی اخوت اور مساوات پر رکھی گئی ہو اور جو روحانی و اخلاقی اقدار کی پیکر بھی ہو لہٰذا ایسی صورت میں مارکسزم کا مادی فلسفہ ان کی تنقید کی زد سے کیوں کر بچ سکتا تھا۔ باوجودیکہ اقبال مارکسی فلسفہ کے ناقد ہیں۔ انھوں نے خود مارکس کی عظمت فکر کا کبھی انکار نہیں کیا۔ اس لیے وہ مارکس کو ایک ایسا پیغمبر حق ناشناس کہتے ہیں جو اپنے نظام کی اساس مساوات شکم پر رکھنا چاہتا ہے لیکن اس کا ذہن پیغمبرانہ بصیرت سے مالا مال ہے چونکہ مارکسی تعلیمات اور بالخصوص روسی انقلاب میں انھیں ایک نئے جہان کے آغاز کا سراغ ملا اس لیے وہ انھیں سراہتے بھی ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ اشتمالیت اقبال کے نزدیک مکمل ضابطۂ حیات نہیں۔ واضح ہونا چاہیے کہ ہمارے اردو کے مارکسی ادیبوں نے اقبال کے بعض نظریوں سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی انھیں ایک عظیم مفکر اور شاعر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے مقام کو مارکسی نقطۂ نظر سے متعین کرنے کے مخدوم بھی حامی نظر آتے ہیں۔ مخدوم صاحب کی نظم 'اقبال' ۱۹۴۳ء سے پہلے کی تخلیق ہے جب کہ وہ مارکسزم کے راستے کے ایک راہرو تھے۔ وہ اقبال کے الہامی کلام کے بارے میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے:

عرش کی قندیل اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سینۂ پاک عشق کی اک آگ ہے

۱۹۴۳ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ مخدوم صاحب کی منزل متعین ہو چکی تھی۔ اس راستے کے وہ تنہا مسافر نہیں تھے بلکہ حیدرآباد کے کچھ اور نوجوان بھی ان کے شریک سفر تھے۔ حکومت کے راہزنوں نے کمین گاہوں سے نکل کر اس قافلہ پر چھاپہ مارا۔ وہ اور ان کے ساتھی جیل کی کال کوٹھریوں میں بھیج دیئے گئے۔ مگر قید کی یہ میعاد زیادہ طویل نہیں تھی۔ تین ماہ بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ اسی سال مخدوم کا پہلا مجموعہ کلام 'سرخ سویرا' کے نام سے شائع ہوا جس میں ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک کی لکھی ہوئی شعری تخلیقات شامل تھیں۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ کن حالات میں اور کن مقاصد کے تحت ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس کی شاخیں دیس بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ حیدرآباد میں مخدوم صاحب ہی کا

کوششوں سے یہ انجمن وجود میں آئی، اور اس کا ثمرہ ۱۹۴۵ء کی عظیم کانفرنس تھی۔

ریاست حیدرآباد میں پہلی بار اردو کے نئے ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہوا تھا۔ عابد علی خان، محبوب حسین جگر اور ان کے ساتھیوں نے رات دن ایک کر کے اس کانفرنس کو آرگنائز کیا تھا۔ ساگر اکیڈمی کا وہ شاندار مشاعرہ جس کی صدارت ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے کی تھی حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک یادگار مشاعرہ تھا۔

دوسری جنگ عظیم اتحادیوں کی کامل فتح پر ختم ہوئی۔ اس نے فاشسٹ طاقتوں کا قلع قمع کر دیا لیکن برٹش امپیریلزم کا بھوت اب بھی ہندوستان پر مسلط تھا۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر سیاسی پارٹیوں کا مشترکہ لائحہ عمل ملک کی آزادی تھا۔ البتہ دیسی ریاستوں کے حکمراں برٹش سامراج سے آس لگائے بیٹھے تھے کیونکہ دیس کی آزادی کے ساتھ ساتھ وہ اپنی آزادی کے خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ آزادی ملی لیکن اس طرح کہ عظیم تر ہندوستان دو خود مختار ملکوں میں بٹ گیا۔ اس تقسیم کے بڑے ہی ہولناک اور بھیانک روپ ہمارے سامنے آئے۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس درندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کچھ ادیبوں نے اس آزادی کو DISILLUSIONMENT میں مبتلا کر دیا۔ انھوں نے اس کو داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر سے تعبیر کیا۔ ایک ایسی سحر جس کا انھیں انتظار نہیں تھا۔ اس سے پہلے مخدوم نے بھی انتظار کی بے بس گھڑیاں بتائی تھیں انھوں نے بلند آواز میں یہ گیت گایا تھا۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

عوامی طاقتوں کو ابھرتا اور کامران ہوتا دیکھ کر مخدوم نے ایک خوشگوار مستقبل کی پیشین گوئی کی تھی۔

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

نہ سلطانی و قیصری ہے نہ زاری
نہ تخت سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے
چلا آ رہا ہے چلا آ رہا ہے

جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ادھر حیدرآباد کی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا۔ ایسی سیاست جس میں نہ تو بصیرت تھی اور نہ عقلیت پسندی کا نام و نشان۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے حیدرآباد اور اس کی جنتا کو آتش فشاں کے

دہانے پر بٹھادیا گیا ہے، جو پتہ نہیں کب پھٹ پڑے۔ اس نام نہاد سیاست کا جو انجام ہوا وہ ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ مجھے بے اختیار کسی کا یہ شعر یاد آتا ہے جو اس وقت کے حیدرآباد پر مکمل طور پر صادق آتا ہے ؎

کبھی اپنی رعونت بھی لگادیتی ہے ساحل پہ
کبھی ہم ناخداؤں کے سہارے ڈوب جاتے ہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ مخدوم ۱۹۴۶ء میں انڈر گراونڈ چلے گئے۔ "تلنگانہ تحریک کا وہ غلغلہ بلند ہوا جس نے ریاست کی بنیادوں کو ہلا ڈالا۔ روپوشی کی یہ واردات ہمارے لیے ایک بند کتاب ہے۔ اس پر مخدوم ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی مخدوم کی نظم تلنگانہ خفیہ طریقے سے لوگوں تک پہنچ چکی تھی جو اب ان کے دوسرے مجموعہ کلام "گل تر" میں شامل ہے۔" تلنگانہ کو شاعر نے دیار ہند کی محبوب ارض حسیں سے تعبیر کیا ہے۔

میں مخدوم محی الدین کے اس گیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو بقول سردار جعفری مزدوروں اور محنت کشوں کا ترانہ بن چکا تھا۔ مزدور تنظیموں کے ہر جلسہ کا آغاز اسی ترانے سے ہوتا تھا۔ یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے لیکن آزادی کی اس جنگ کا نعرہ اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اسپین کے فلسفی UNAMONO نے جب آمر فرانکو کی تقریر کا نفسیاتی تجزیہ کر کے یہ بتلایا تھا کہ اس کے اندر سادیت (SADISM) کے جذبے کی تسکین کی طرف اشارہ ملتا ہے تو اسے قید کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔ مخدوم کی نظم جانے والے سپاہی سے پوچھو، ہٹلر، مسولینی، اور فرانکو جیسے آمروں کے سفلی جذبات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مخدوم محی الدین کی شاعری نے ساگر کے کنارے، رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے، سے لے کر جانے والے سپاہی سے پوچھو تک ایک لمبی مسافت طے کی ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے میں مخدوم صاحب کو کن کن تجربوں سے نہیں گزرنا پڑا ہوگا۔ آزادی کی جد و جہد کی ادبی تاریخ لکھنے والا ان نظموں کی اثر پذیری اور مقصدیت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔

مخدوم صاحب جس راستہ پر چل پڑے تھے اس میں خطرات اور رکاوٹیں قدم قدم پر تھیں اور انہیں اس کا پورا احساس بھی تھا۔ ویسے بھی وہ خطرات سے کھیلنے کے عادی ہو چکے تھے بلکہ اکثر اوقات خطرات کو دعوت دینا پسند کرتے۔ ان کی افتاد طبع کا اندازہ اقبال کے اس شعر سے ہوسکتا ہے ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

عوام کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنے کا انعام انھیں قید و بند کی صورت میں ملا جس کی زندگی محروسوں کے تعلق سے دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو سماجی محروسوں کی زندگی ہے جو اپنی بداعمالی کی سزا بھگتنے کے لیے محبوس کر دیئے جاتے ہیں۔ اس سزا کا مقصد ان کے کردار کی درستی ہوتی ہے۔ شاذ و نادر صورتوں ہی میں عادی مجرموں کی اصلاح

ہو سکتی ہے۔ دوسری زندگی ان لوگوں کی ہے جو سماجی برائیوں کے خلاف جہاد کرنے کے جرم میں محبوس کر ڈالے جاتے ہیں۔ وہ اپنی عارضی تنہائی کو خیالات و افکار کی دنیا سجانے کا وسیلہ بناتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایسے لوگوں سے قید و بند کی زندگی نے لٹریچر کے شاہکار لکھوائے ہیں۔ تب مجھے دستوفسکی کی شاہکار تصنیف مُردوں کی بستی کی یادیں (NOTES FROMA DEAD HOUSE) کا خیال آتا ہے۔ میں سقراط، بوعلی سینا، امام ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی، گاندھی، جواہر لعل، ابوالکلام آزاد، فیض اور مخدوم محی الدین کے بارے میں سوچنے لگ جاتا ہوں۔ فیض اور مخدوم سے قید و بند کی اس تنہائی نے اردو شاعری کی بہترین نظمیں لکھوائی ہیں۔ مخدوم کی نظم قید کو میں ان کی بہترین نظم شمار کرتا ہوں۔ رات کی خاموشی اور تنہائی میں ظلم و جور کی شکایت کرنے والا شاعر سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی آواز سنتا ہے۔ اس کا دماغ چونک جاتا ہے اور شمع شبستانِ خیال جاگ اٹھتی ہے۔ تب اسے گزری ہوئی زندگی کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ جیل سے باہر سانس لینے والے سیکڑوں لاکھوں عوام کی غمگین آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے۔ جو جور شاہی اور جبر سیاست سے نڈھال ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ یہی عوام ایک دن دھماکا بن جائیں گے۔ تب نہ سلطانی و قیصری رہے گی نہ تخت شاہی۔ لیکن شاعر کی نظم کے آخری مصرعے شاعر کی اپنی سوزشِ غم کا پتہ دیتے ہیں۔

مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

دسمبر ۱۹۵۱ء میں مخدوم دوسری بار جیل سے رہا ہوئے۔ یہاں سے ان کی سیاسی اور ادبی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ مخدوم صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام "گلِ تر" ہم کو ان کے فن کی نئی کروٹ سے روشناس کراتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ مخدوم نے بعض کٹر ترقی پسندوں کے فسوں کو توڑا ہے کہ غزل اردو شاعری کا دورِ جاہلیت کی یادگار ہے، اور اس کو ترک کر دینے ہی میں اردو شاعری کی نجات ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بار پھر غزل نے اردو شاعری کی آبرو بچائی ہے۔ "گلِ تر" کی اکثر غزلیں اپنی خوبصورتی اور بانکپن کی وجہ سے ناظر اور سامع دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ مخدوم صاحب نے یہ جو کہا ہے تو سچ ہی کہا ہے کہ ؎

کمانِ ابرو ئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

نظموں کی حد تک بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم محی الدین صاحب کی فکر نے نئے امکانات کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ 'چاند تاروں کا بن'، 'بھاگ متی'، 'چارہ گر'، اردو شاعری کی زندہ و تابندہ نظمیں ہیں۔ عملی اور ذہنی زندگی کی دشوار راہوں سے گزرنے کے بعد اب مخدوم صاحب نے اپنے نظریۂ فن کو بھی متعین کر لیا ہے۔ ان کے دوسرے دور کی شاعری اسی نظریے کی غماز ہے۔ میں مخدوم صاحب کے نظریۂ فن کو ان سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ قاری کو "نیا سویرا" کے دور کی شاعری اور

گلِ تر کی شاعری کا فرق بتلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ فرق میری نظر میں ایک بنیادی ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہدِ حاضر کی نوعیت کے اپنے اسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشاندہی کرتا ہے پھر بھی انسان دوستی اور نشاط ہو یا جمالیاتی اقدار مشترک ہیں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"زمان و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIMELESS) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسان کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنونِ لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیبِ نفسی کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔ ... شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو، روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فرد معاشرہ کی حقیقتوں سے متاثر اور متصادم رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں بیٹھتا ہے، شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ ...... شعر میں ہم ماورائی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔"

بعض اصحاب کو مخدوم محی الدین صاحب کی شخصیت اور فن کے تعلق سے یہ کہتے ہوئے میں نے سنا ہے کہ مخدوم صاحب کے فن کو سیاست نے نکھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے نزدیک شخصیت کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کا یہ رجحان بالکل غیر نفسیاتی رجحان ہے۔ شخصیت کا تانا بانا مختلف عوامل کے عمل و ردِ عمل سے تیار ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت قاری کو خود مخدوم صاحب کی مذکورۂ بالا عبارت میں مل جائے گا۔

افسوس تو یہ ہے کہ مخدوم صاحب کی زندگی کا سیاسی پہلو میرے لیے ایک بند کتاب ہی ہے۔ اس پر وہی لوگ روشنی ڈال سکتے ہیں جنھیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ مخدوم صاحب کی نثر میں کتنی دلپذیری اور کشش ہے اس کے بارے میں وہ لوگ خوب جانتے ہیں جنھوں نے مخدوم صاحب کی ڈائری کے اوراق کو پڑھا ہے اور جو اب سے تین چار سال قبل "صبا" میں شائع ہو چکے ہیں۔ ویسے بھی مخدوم صاحب اپنی دیس دیس کی یاترا کے واقعات اکثر نجی صحبتوں میں بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ اب وہ عمر، شہرت اور مقبولیت کی اس منزل پر ہیں کہ ان سے مبسوط خود نوشت سوانح عمری مرتب کرنے کی ہماری خواہش بے جا نہ ہوگی۔

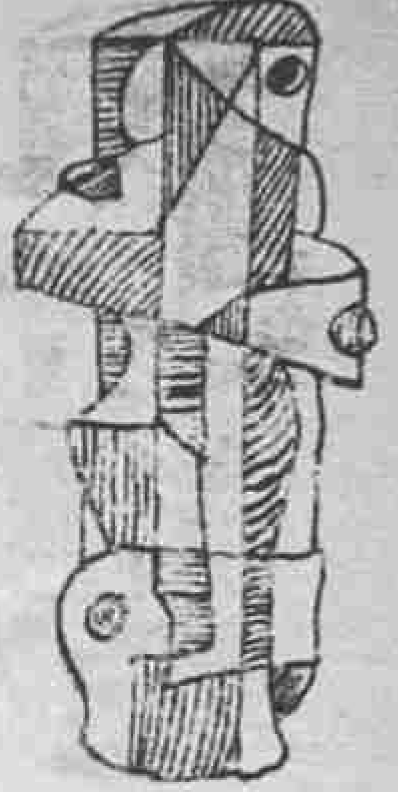

مخدوم محی الدین

بحیثیت استاد

امان ارشد

● لفظ استاد بہت بلیغ ہے۔ لہذا عنوان سے پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی کو دور کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ مخدوم شاعر ہیں اس لیے آپ کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ آپ انھیں فن شاعری کا ایک کہنہ مشق استاد سمجھیں مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ایک واقعہ سے ملتا ہے جس کو مخدوم نے خود بیان کیا تھا۔ ایک بار مخدوم نے اپنی کوئی نظم حکیم آزاد انصاری مرحوم کو سنائی۔ انھوں نے نظم کو بے حد پسند کیا لیکن ایک شعر پر کہا "مخدوم صاحب اس میں ایطا ہے"۔ جس پر مخدوم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا "ہاں قبلہ ایطا تو ہوگا"۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مخدوم صاحب کس قسم کے استاد ہیں۔

۱۹۳۹ء میں میں حیدرآباد کی مشہور درسگاہ سٹی کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ ہماری جماعت کے کمرے کی طرف ایک نوجوان نہایت لاابالی انداز سے ٹہلتا چلا آ رہا ہے۔ ساتھ ہی لڑکوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ "اردو کے نئے مولوی صاحب" بعضوں نے دبی آواز میں کہا "مخدوم محی الدین صاحب ہی ہیں"۔ ہم میں سے بہتوں نے جب تک مخدوم کو دیکھا نہیں تھا مگر ان کے نام سے سبھی واقف تھے۔ اکثروں نے ان کا کلام ہندوستان کے مشہور و معروف ادبی جرائد اور اخباروں میں پڑھا تھا۔ جب وہ کمرے کے اندر آ گئے تو ہم لوگوں نے ان کو بڑی تفصیل سے دیکھا ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے بڑے بھائی کے کوئی دوست ہم لوگوں کو پڑھانے چلے آئے ہیں۔ دبلے پتلے تیس بتیس برس کی عمر کے نوجوان۔ سانولے رنگ سے بھی کچھ دبتا ہوا رنگ، کھڑا ناک نقشہ، ستواں ناک بڑی بڑی ذہین آنکھیں۔ مجموعی اعتبار سے بڑا جاذب توجہ چہرہ۔ گہری نیلی شیروانی میں ملبوس گلے سے سرخ رنگ کا

ترکی ٹوپی پچھتر درجے کے زاویے پر پہنے ہوئے مخدوم نے قدرے ہنستے ہوئے لہجے میں ہم لوگوں کو مخاطب کیا: "میں آپ کو اردو نظم پڑھانے آیا ہوں"۔ جس کا جواب ہم لوگوں نے غیر ضروری "ہی ہی ہی" اور "کھی کھی کھی" سے دیا۔ پہلے دن تو کچھ پڑھایا وڑھایا نہیں، ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور گھنٹہ ختم ہونے کے بعد چلے گئے۔

اس زمانے میں سٹی کالج کے پرنسپل اعظم صاحب تھے۔ جو بعد کو سلطنت حیدرآباد کے صدرالمہام تعلیمات ہوئے اور اعظم یار جنگ کا خطاب پایا۔ اعظم صاحب بڑے وسیع المشرب اور جدید رجحانات کے حامل بزرگ تھے۔ موصوف نے ہمیشہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل جدید خیالات رکھنے والے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائی۔ سلطنت حیدرآباد کا جاگیردارانہ دور اپنے پورے عروج پر تھا۔ جاگیرداری نظام کی جملہ خباثتیں ہر شعبۂ حیات پر مسلط تھیں۔ حکومت کے معمولی اور بڑے عہدے صرف نااہل رئیس زادوں کا مقدر تھے۔ چنانچہ مخدوم نے بی ایم۔ اے کرنے کے بعد سٹی کالج میں آنے سے پہلے دفتر دیوانی و مال ملکی میں تیسرے درجے کی اہلکاری کی جائیداد قبول کر لی تھی۔ ایسے ہونہار اور ذہین نوجوان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دفتر کی اشغلہ کے نذر ہوتے دیکھ کر غالباً اعظم صاحب جیسے دردمند بزرگ سے رہا نہ گیا اور انھوں نے مخدوم کو سٹی کالج میں بحیثیت استاد مامور کر کے ہی دم لیا۔

مخدوم ٹرینڈ ٹیچر نہیں تھے۔ ان کو دوسرے تربیت یافتہ اساتذہ کی طرح پڑھانا نہیں آتا تھا۔ نصاب میں درج غزلوں اور نظموں کو بالعموم پہلے لڑکوں سے پڑھواتے جس سے غالباً ان کا مقصد یہ ہوتا کہ کم از کم لڑکوں کو صحیح طور پر شعر پڑھنا آجائے اس کے بعد ایک ایک شعر کا مطلب خود سمجھاتے۔ مخدوم اس وقت بھی "غزل" کے مخالف تھے۔ غزلیں زیادہ توجہ سے نہیں پڑھاتے تھے۔ حالی، اقبال اور جوش کی نظمیں بڑی دلچسپی سے پڑھاتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے بڑے دلدادہ تھے۔ "آدمی نامہ" اور "ہولی" ان کی پسندیدہ نظمیں تھیں۔ پڑھانے کے دوران کیا اپنے زمانہ طالب علمی کے زمانے کے لطیفے بھی لڑکوں کو سناتے جن میں سے اکثر لطیفے جامعہ کے مشہور و معروف اساتذہ مولانا مناظر احسن گیلانی، پروفیسر مرزا حسین علی خاں اور مولوی عبدالحق صاحب سے متعلق ہوتے۔ لطیفے سنانے کا انداز ایسا عجیب و غریب ہوتا کہ لطیفہ سن کر ہنستے ہنستے ہم لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ قہقہوں سے جماعت کا کمرہ گونجنے لگتا۔ اتنا شور و غل ہوتا کہ دوسری جماعتوں کی پڑھائی متاثر ہونے لگتی۔ ایسے موقعوں پر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا۔ مخدوم نے خود ہی چند ہی دنوں کے اندر اپنی بزرگانہ حیثیت کو محفوظ رکھتے ہوئے روایتی تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ نتیجتاً ہماری جراتیں بھی مقررہ حدود سے کچھ متجاوز ہو گئی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ پڑھائی کی بجائے ہم لوگوں کی یہ ضد ہوتی کہ وہ اپنی "تازہ" یا کوئی پرانی نظم سنائیں۔ ہمارے اس تقاضے کو مخدوم ہمیشہ بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ پورا کر دیا کرتے۔ اور ان کی نظمیں ہمارے دماغوں اور دلوں کو مسحور کرنے لگتیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نویں جماعت کے طالب علم ہونے کے باوجود ہم لوگوں کا ادبی ذوق اس دور کے کالج کے نوجوانوں سے بہتر تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ ابتدائی جماعتوں ہی سے سب فارسی، عربی اور اردو ادب باقاعدہ طور پر پڑھائے جاتے تھے خود طالب علموں کو بھی مقررہ نصابی کتابوں کے علاوہ علمی و ادبی کتب پڑھنے کا شوق تھا۔ مجھے یہ کہنے میں دریغ نہ ہوگا کہ

مخدوم نہ صرف ہمارے لئے اردو نظم کے استاد تھے بلکہ وہ ہمارے ذہن و فکر اور ہمارے عزم عمل کے استاد بن چکے تھے۔ ان کی نظمیں ہم لوگوں کو ایک نئی شاہراہ کی طرف بلاتیں۔ پڑھاتے وقت جب کبھی بھی موقعہ ہوتا مخدوم اس دور کے معاشرے کی تنزل پذیر اقدار کے اصنام پر اپنا تیشۂ تنقید چلانے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان کی یہ نئی باتیں ہم لوگوں کو نہ صرف چونکا دیتی تھیں بلکہ متحیر کر دیتی تھیں۔ غرض تھوڑی عرصہ میں مخدوم نے ہر ذہین، شریر اور با ذوق طالب علم کو اپنا معتقد بنا لیا تھا۔ بعض غیر معمولی شریر لڑکوں کو تو انھوں نے تقریباً سر چڑھا لیا تھا۔ دوپہر کے وقفہ میں عموماً مخدوم کو کمرہ اساتذہ میں گرفتار کر لیا جاتا۔ بعض لڑکے تو ان کے سامنے سگریٹ بھی پینے لگے تھے (میں نے ایسی جرأت کبھی نہیں کی) بعض لڑکوں کی جراتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ اپنی سگریٹیں ختم کر کے ان سے بھی مانگتے تھے اور یہ بغیر کسی تکلف کے ان کو سگریٹ دے دیا کرتے تھے۔ بعض ستم ظریف تو ایسے تھے جو انکو زغے میں لیکر انکی شیروانی کی جیب سے سگریٹ چرانے کی کوشش کرتے۔ مخدوم بھی اپنی جگہ ایک کائیاں تھے۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں دو مختلف قسم کی سگریٹیں رکھتے ...... یعنی ایک میں گولکنڈہ سگریٹ جس کی ڈبیا اس وقت تین حالی میں بکتی تھی اور دوسری میں گولڈ فلیک جو کہ غالباً ڈھائی آنے میں ملتی تھی۔ "گولڈ فلیگ" والی جیب کی حفاظت مخدوم بڑی چوکسی سے کرتے تھے۔ لڑکوں کے ہاتھ عموماً "گولکنڈہ" کی ڈبیا ہی لگتی اور عین موقعہ واردات پر مخدوم کا یہ انکشاف قہقہوں کی پھلجڑی بن جاتا "جناب آپ گھاٹے میں رہے"۔

مخدوم نے ہماری شرارتوں پر محض نظام ہی پر اکتفا نہیں کی۔ ان کو نئی نئی شرارتیں سکھانے کے ڈھنگ بھی خوب یاد تھے۔ کالج کے اسٹاف میں ایک صاحب سعید احمد خاں صاحب تھے۔ جو کہ پڑھاتے نہیں تھے صرف مودب تھے۔ کالج کے اوقات کار میں جماعتیں چھوڑ کر کالج کی عمارت میں ادھر ادھر آوارہ گھومنے والے لڑکوں کو پکڑنا اور ان کو خطرناک قسم کی لانبی سے چھڑی سے پیٹنے کے بعد پرنسپل صاحب کے سامنے مجرم کی طرح پیش کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ ہر شریر لڑکا ان کے خلاف انتقامانہ جذبات رکھتا تھا چنانچہ میرے ایک لمبے تڑنگے ساتھی "سرفراز علی خاں" ایک عرصہ سے ان سے انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے جب مخدوم کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے سرفراز کو مشورہ دیا کہ جب وہ تمہیں پکڑنے کے لئے تمہارا تعاقب کریں تو تیزی سے دوڑتے ہوئے آگے نکل جاؤ اور پھر دبک کر ایسی جگہ بیٹھ جاؤ کہ وہ تمہیں دیکھ نہ سکیں اور جب وہ تم کو دیکھے بغیر سامنے سے گزرنے لگیں تو اپنا پیر آگے بڑھا کر اڑنگا لگا دینا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس مشورہ کو روبہ عمل لایا گیا۔ بیچارے سعید احمد خاں صاحب دھڑام سے پتھر کے فرش پر گر پڑے اور ان کے بہت سی چوٹیں آئیں۔ مخدوم نے اپنے ساتھی اساتذہ کے ساتھ بھی عجیب دلچسپ حرکتیں کرتے تھے۔ کالج کے اسٹاف میں ایک صاحب مسٹر میمون تھے۔ یہ بھی انگریزی پڑھاتے تھے اور اس کے علاوہ مڈل اسکول کی جماعتوں کے انچارج کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ان صاحب کی یہ عادت سی بن گئی تھی کہ جب کوئی استاد غیر حاضر ہوتے تو ان کی جگہ اکثر و بیشتر مخدوم کو ان کے LEAVE SURE PERIOD سے محروم کر کے پڑھانے کے لئے بھیج دیتے۔ مخدوم ان کی اس غیر ضروری مستعدی سے چڑھنے لگے تھے۔ ایک ایسے ہی موقعہ پر ان کی نیت خراب دیکھ کر مخدوم نے کمرۂ اساتذہ سے راہ فرار اختیار کی میمون صاحب نے مخدوم کو

بھگر مخدوم کا تعاقب کیا۔ مخدوم سیدھے بیت الخلاء میں گھس گئے اور وہاں سے کافی وقت گزرنے کے بعد بھی واپسی کا نام نہیں لیا۔ بیون صاحب نے آخر کار انتظار سے اکتا کر کھنکارتے ہوئے جھانکنے کی کوشش کی مخدوم عالم استنجاء میں مستغرق پائے گئے (رہا تھ میں استنجا رکے لئے مٹی کا ڈھیلا واقعی تھا بھی یا نہیں آج تک کسی کو نہیں معلوم ہو سکا)۔ آداب بیت الخلاء کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے بیون صاحب نے آواز دی "مخدوم صاحب میں آپ کا منتظر ہوں" مخدوم نے اندر سے جواب دیا "بیون صاحب میں اس وقت فریضہ دین ادا کر رہا ہوں اور آپ مداخلت فی الدین فرما رہے ہیں" میں پرنسپل صاحب سے آپ کی شکایت کردوں گا۔ یہ سن کر بیون صاحب جھنجھلاتے ہوئے کسی اور استاد کی تلاش میں چلے گئے غالباً پھر کبھی مخدوم کو انکے LEISURE PERIOD میں پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔

زندہ دلی سے قطع نظر مخدوم اپنے مخصوص رجحانات کو بڑی سمجھداری سے نبھاتے تھے۔ کنگ کوٹھی کے عشائیہ کی تقریب میں ولیعہد سلطنت اعظم جاہ مدعو تھے۔ عشائیہ کے بعد اساتذہ، پرنسپل اور ولیعہد بہادر پرمشتمل ایک گروپ فوٹو کا بھی پروگرام تھا۔ پرنسپل صاحب نے تمام اساتذہ کو پابند کیا تھا کہ وہ درباری لباس میں یعنی دستار اور شیروانی پہنے ہوئے بگلوس باندھ کر آئیں لیکن مخدوم نے یہ پابندی قبول نہیں کی اور اس تقریب میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ ان کا یہ طرز عمل ایک عرصے تک لڑکوں اور اساتذہ میں موضوع گفتگو بنا رہا۔ لیکن آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے بہت سے شاگردوں کے انداز فکر کو بدل دیا انھیں حیات کے جدید تقاضوں کو سمجھنے کا شعور عطا کیا۔ سوشلزم کا خواب دیکھنا سکھایا لیکن اس عزیزہ کو کیا کیجئے کہ وطن عزیز میں اب تک اس خواب کی تعبیر نہیں ملی۔

نازک اور خوبصورت جڑاوی زیورات

ماہر کاریگروں کے ذریعہ اطمینان بخش طریقے پر تیار اور درست کیے جاتے ہیں جدید وضع کے ۴۸ اقساط میں اپنے پسندیدہ زیورات

ہم سے حاصل کیجئے

پی۔ ست نارائن جیولرز

مچھلی کمان۔ حیدرآباد دکن۔ فون (۱۳۰۱۸)

چچا بابا

باپ ۔ بیٹے کی نظر میں

نصرت محی الدین

● کامریڈ مخدوم محی الدین کی شخصیت، شاعری اور زندگی کے بارے میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور نقادوں نے ہر زاویہ نگاہ اور ہر پہلو سے دیکھا جانچا اور پرکھا ہے لیکن میں جس پہلو سے مخدوم صاحب کی شخصیت پر قلم اٹھا رہا ہوں اور وہ ہے میرا موضوع ہے "مخدوم بحیثیت باپ"۔ جس وقت میں پیدا ہوا اس وقت دنیا ایک عجیب افراتفری اور غیر یقینی حالات سے دوچار تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا اسی زمانے میں "روسیوں" کو نازی جرمنی کے مقابلے میں فتح و نصرت نصیب ہوئی تھی۔ اسی مناسبت سے میرا نام "نصرت" رکھا گیا۔ والد صاحب نے ہمیشہ نام رکھنے کا کام بحسن و خوبی انجام دیا لیکن وہ خود "انڈر گراؤنڈ" (روپوش) تھے۔ والد صاحب کے روپوش ہو جانے کے بعد ہم مولوی نظام الدین صاحب (جو میرے تایا حضرت ہیں) کی کفالت میں چلے گئے۔ جب میں نے عمر کی آٹھویں منزل میں قدم رکھا تو ایک دن ہمارے گھر میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی، ہر شخص مصروف تھا۔ سارے اخبارات منگوائے جا رہے تھے۔ کل تک ہم سب کے نور نظر تھے اور آج اس بری طرح نظر انداز کیے جا رہے تھے کہ توبہ ہی بھلی۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں ہم سب کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، سوچ رہے تھے کہ آج کیا بات ہو گئی کہ گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ جب تایا حضرت نے کہا کہ مخدوم جیل سے رہا ہو کر آ رہا ہے تو ادھر ہم سب پریشان کہ یہ مخدوم کون بزرگوار ہیں جو جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہیں اور جیل سے رہا ہو کر آنے والا کوئی اچھا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کے آتے ہی ہم کو ان سے ملنے سے قبل ہی ڈر کا احساس ہونے لگا۔ جوں توں کر کے وہ گھڑی بھی آ پہنچی جس کے لیے سب اپنی آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔ ہم نے دیکھا ایک سانولی رنگت اور چھریرے بدن کے صاحب اپنی [illegible]

حشر سا انہوں کے ساتھ آ پہنچے۔ ہر شخص خوش خوش تھا ہر طرف مسرت و شادمانی تھی ہر ایک کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے کہ تایا صاحب نے ہمارا ان سے تعارف کرایا "یہ ہیں تمہارے چچا بابا"۔ ہم ڈرتے ڈرتے ان کے قریب جا پہنچے انہوں نے ہمیں اپنی باہوں میں کھینچ لیا اور بے شمار پیار کئے۔ اس وقت مجھے ایک مجرم کا اس طرح چومنا اور بھینچنا ایک پل کے لئے بھی نہ بھایا۔ دوسرے تیسرے دن ہم کو معلوم ہوا کہ "چچا بابا" کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ ہم بھی نانا سمیع الدین صاحب کے ساتھ دیوان دیوڑھی جا پہنچے۔ اس وقت وہاں انسانی سروں کا ایک امڈتا ہوا سمندر ہماری نظروں کے سامنے تھا۔ اسٹیج سجایا گیا تھا جہاں چچا بابا براجمان تھے۔ ہر طرف لال جھنڈیاں لہرا رہی تھیں لوگ مخدوم زندہ باد اور لال بادشاہ پائندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے، سیکڑوں لوگوں نے چچا بابا کی گلپوشی کی جب انھوں نے ولولہ انگیز تقریر کے بعد اپنی نظم "قیدی" سنائی تو جلسہ گاہ میں بیٹھی خواتین رونے لگیں، پھر جب انہوں نے "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" سنانی شروع کی تو سارے سامعین اس کے بول دہرانے لگے۔ یہ سب مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اور اس وقت تک چچا بابا کے تعلق سے ہمارے ذہن پر جو تاثر تھا دفعتاً ختم ہوگیا اور اس کی جگہ احترام و عقیدت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

چچا بابا کا میں جتنا ادب کرتا ہوں وہ اپنی شفقتوں میں اتنا ہی اضافہ کر دیتے ہیں۔ چچا بابا مجھے اکثر اوقات "دوست" کہکر مخاطب کرتے ہیں مجھ سے شطرنج کھیلتے ہیں۔ بات چیت کے دوران میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ میرے والد ہیں بلکہ ان کا انداز تخاطب اتنا سادہ اور پرکشش ہوتا ہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ کسی پرخلوص و خیر خواہ دوست سے بات چیت و صلاح مشورہ کر رہا ہوں۔ جہاں وہ عوامی رہنما ہونے کے علاوہ سماجی اور ادبی حلقوں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں وہاں مجھے اپنی ادبی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑی ہی فراخدلی سے رائے مشورہ دیا کرتے ہیں۔ اس طرح مشورہ دینا اس بات کی صاف نشاندہی کرتا ہے کہ وہ مجھے سماجی و ادبی حالات سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میری ان مصروفیات سے میں عوامی زندگی اور مسائل سے بخوبی واقف ہو سکتا ہوں۔ میں نے اکثر ان سے نوجوانوں اور ان کی سرگرمیوں سے متعلقہ مسائل پر کھل کر گفتگو کی۔ وہ میری بات پوری توجہ سے سنتے ہیں۔ اور کھلے دل سے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اکثر اوقات ان کی مستقل مزاجی سے ان کے سنگدل ہونے کا شبہ ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے کیونکہ عادتاً بڑے سے بڑی پریشانی و مشکلات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کر جاتے ہیں جو کہ ایک عام آدمی ہرگز نہیں کر سکتا۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود میں نے دیکھا کہ ان کے سینہ میں بھی ایک نرم دل ہے جو اپنی اولاد کے لئے تڑپتا ہے اور دھڑکتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں جب میں بغیر اطلاع گھر سے دوست احباب کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا تو وہ بے حد پریشان ہوگئے اپنے سارے پروگرام اور ساری مصروفیتوں کو منسوخ کر دیا میری تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی وہ میری تصویر لئے گھنٹوں گم سم بیٹھے رہتے تھے۔

جب میں گھر لوٹ آیا تو انہوں نے مجھے لپٹا لیا اور کسی بھی قسم کی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی اور میری مزاج پرسی کی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے جانے سے انہیں ذرا بھی دکھ نہ ہوا ہو۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ بھائی چارگی رواداری کا اپنے عمل سے سبق دیا۔ ان کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ غصہ کے وقت کسی قسم کی بھی باز پرس نہیں کرتے بلکہ جب وہ بالکل نارمل ہوجاتے ہیں تب

ہونٹوں پر ہلکا تبسم لئے میری غلطیوں پر تبصرہ کرتے ہیں جو بہت ہی اثر انگیز ہوتا ہے اور مجھے اپنی غلطیوں کا فوراً...... احساس ہونے لگتا ہے۔

جہاں تک ان کی گھریلو زندگی کا تعلق ہے وہ نہ صرف ایک شفیق باپ ہی نہیں بلکہ بچوں میں بالکل بچے بن جاتے ہیں وہ ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ بات بات پر قہقہے لگاتے ہیں۔ بچوں کو مار پیٹ ڈانٹ ڈپٹ کے سخت مخالف ہیں۔

گھریلو ذمہ داریوں اور معاملات کا جہاں تک سوال ہے وہ ایک عام گھریلو اور ذمہ دار شخص ہی کی طرح بھی پیچھے نہیں کبھی کبھار گھر کا سودا سلف خود لا لیا کرتے ہیں اور یوں وہ بازار کے داموں سے اور گھر کے حساب کتاب سے تک واقف رہتے ہیں۔ ڈھولک کے گیت شوق سے سنتے ہیں۔ گھر کے ہر فرد کو پوری پوری آزادی انہوں نے دی رکھی ہے۔ وہ رسومات اور تقاریب کی انجام دہی میں رکاوٹ کا باعث نہیں ہوتے بلکہ پورا پورا ساتھ دیتے ہیں۔ انہیں جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ ہم کسی وجہ سے جھوٹ بول جاتے ہیں اور کبھی اس کی جواب دہی کے لئے انکے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ غصہ سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور اگر اپنی غلطی کا صاف اعتراف کرلیں تو سیدھے پسیج جاتے ہیں......!! ایک دفعہ شاید میں نے کسی بات پر غلط بیانی سے کام لیا تو وہ یقین کر گئے۔ جب اصلیت ان پر عیاں ہو گئی تو مجھ پر بے تحاشہ برس پڑے اور بات گوشمالی سے بڑھ کر تھپڑ اور پھر چھڑی تک پہونچی۔ غصہ میں تو انہوں نے سزا دے ڈالی مگر جب نارمل ہو گئے تو ان کا رویہ ایسا رہا کہ یہ سب کچھ بھول گیا اور یوں محسوس ہوا کہ انکو میری تکلیف کا احساس ہو چلا ہے۔ انہوں نے مجھے قریب بلایا اور سرگوشی کے لہجہ میں دریافت کیا کہ کہیں مجھے زیادہ مار تو نہیں لگی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

چچا بابا دوسرے والدین کی طرح صرف نصیحتیں ہی نہیں کرتے بلکہ وہ خود اپنے عمل کے ذریعہ ہمیں اس بات پر کاربند ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً چاہے رات دیر گئے ہی کیوں نہ سوئے ہوں حسب عادت علی الصبح بیدار ہو جاتے ہیں۔ نہاتے ہیں۔ اخبار دیکھتے ہیں۔ پھر ناشتہ کرتے ہیں اور پھر اپنے کام پر رجوع ہو جاتے ہیں۔ ان کی روزمرہ زندگی کو دیکھتے ہوئے ہمکو علی الصبح اٹھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اگرچہ میری تعلیم پر وہ بہت زور دیتے ہیں۔ میری عدم توجہی کے باعث وہ پریشان سے نظر آتے ہیں۔ انھیں کے کہنے پر میں نے I.T.I کا ٹیسٹ پاس کر لیا۔ پھر نوکری کی تلاش شروع ہوئی مگر افسوس ابھی تک وہ نہیں ملی۔ چچا بابا چاہتے تو کہیں کسی بھی سروس میں منسلک ہو سکتا تھا مگر وہ بطور خاص میرے لئے سفارش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے کیسے نوکری نہیں ملتی؟ میں تو کامریڈ مخدوم کا بیٹا ہوں۔ اور اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ مجھے نوکری کی ضرورت کیوں لاحق ہے جب کہ میرے والد بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ بھلا میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں۔

بہر حال والد محترم ایک مکمل انسان ہونے کے علاوہ ایک شفیق باپ اور خلوص اور پیار کا پیکر ہیں۔ وہ جہاں سیاسی و سماجی زندگی میں بے حد مصروف رہتے ہیں۔ وہاں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔ ہم تینوں بھائی بہن ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ واقعی ہم میں سب سے زیادہ کسکو پیار کرتے ہیں لیکن مجھے اب یقین کامل ہو چلا ہے کہ وہ جہاں ہر شعبۂ زندگی میں مساوات کے علمبردار ہیں وہاں انکی چاہت بھی ہم سب کے لئے یکساں ہے۔

ہمارے اداکار

یحییٰ صدیقی

کلیہ کی ڈرامائی مصروفیات کا آغاز ۱۳۴۲ف (۱۹۳۲ء) میں ہوا جب کہ عزیز احمد صاحب کا لکھا ہوا ڈرامہ "کالج کے دن" کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا۔ ڈرامہ کی کامیابی اور مقبولیت نے مقیمین اقامت خانہ فرحت منزل کو بھی ہمت دلائی اور انھوں نے اشتیاق حسین صاحب کا لکھا ہوا ڈرامہ "بہزاد" جنازیم ہال میں اسٹیج کیا رقم کی کمی اور منگ کی مجبوریوں کے باوجود اس ڈرامہ کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ اب تو یہ کلیہ کی روایت ہو گئی ہے کہ یوم کلیہ کے موقع پر ڈرامہ کیا جائے۔ چنانچہ اب تک "فاوسٹ" ترجمہ عابد حسین صاحب اور "ہوش کے ناخن" مصنفہ مخدوم محی الدین صاحب و میر حسن صاحب اسٹیج کیے جا چکے ہیں۔

فرحت منزل والوں نے بھی جلسہ کرسی نشینی کے موقع "پردۂ غفلت" مصنفہ عابد حسین صاحب پیش کیا جو بے حد کامیاب رہا۔

ہمارے کلیہ کے بعض اداکاروں نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان میں سے اکثر "انجمن ترقی ڈرامہ" کے رکن ہیں اور اس انجمن کے ڈراموں کی کامیابی کا سہرا انھیں کے سر رہا ہے۔

مرزا شکور بیگ، شرافت اللہ بیگ اور مرزا رفعت اللہ بیگ ہمارے ہی کلیہ کے طالب علم ہیں ان کا شمار حیدرآباد کے اچھے اداکاروں میں ہوتا ہے۔ شکور اور شرافت بعد فراغت تعلیم کالج چھوڑ چکے۔

ہیں۔ رفعت میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ کلیہ کے موجودہ قابل ذکر اداکاروں کے مختصر کارنامے ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

مخدوم محی الدین

دبلے پتلے، سانولے رنگ کے میانہ قد آدمی ہیں۔ ناک نقشہ اچھا ہے۔ جو اسٹیج کے اغراض کو کلیتہً پورا کرتا ہے۔ بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ اسٹیج پر ہی نہیں بلکہ عام طور پر بھی لوگوں کو خوش کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ مزاحیہ اداکاری بہت اچھی کرتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس صنف میں حیدرآباد کے چوٹی کے اداکار ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

تبدیلِ ہیئت کے بعد آپ کی صورت اتنی مضحکہ خیز بن جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اسٹیج پر آجانا ہی لوگوں کو ہنسا دینے کے لیے کافی ہے۔ آپ کی اداکاری کی خصوصیات یہ ہیں کہ اظہارِ جذبات میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ہاتھوں اور سر کی لطیف جنبش اتنی برمحل ہوتی ہے کہ اصل کا لطف آجاتا ہے۔ لیکن سب سے اہم خصوصیت جو ان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اپنے اندرونی جذبات کو ظاہر کرنے میں خاص قدرت رکھتے ہیں جو حیدرآباد کے کسی اداکار کو نصیب نہیں ہے۔ پارٹ کرنے سے پہلے کردار کا بہت گہرا مطالعہ کر لیتے ہیں اور خود کو اس کردار میں ضم کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اداکاری میں بے ساختہ پن آجاتا ہے اور کردار کی بالکل صحیح نمائندگی ہوتی ہے۔ آپ کی اداکارانہ زندگی کا آغاز ۱۳۴۱ف سے ہوتا ہے جب کہ آپ نے "کالج کے دن" میں وحید کا پارٹ ادا کیا۔ لیکن اس ڈرامہ میں نمایاں نہ ہو سکے۔ کیونکہ پارٹ ان کی طبیعت کے مناسب حال نہ تھا۔ دوبارہ ڈرامہ "ہمزاد" میں وزیر کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ اس مرتبہ آپ کا پارٹ نہایت ہی عمدہ رہا۔ بلکہ ڈرامہ "ہمزاد" کی کامیابی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا۔ اس مرتبہ ان کی اداکارانہ صلاحیتیں پورے طور پر ظاہر ہوئیں اور کالج پبلک کی اکثریت ان کی معتقد ہو گئی۔ اس کے بعد "ظاہر باطن" "نئی روشنی" "پردۂ غفلت" "ہوش کے ناخن" "حشرات الارض" "طبیب حاذق" اور "غلط در غلط" میں بہت کامیابی کے ساتھ اپنے پارٹ ادا کئے۔ بہترین اداکاری کے کئی انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔

آپ نہ صرف ایک اچھے اداکار ہیں بلکہ اچھے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ آپ کا ڈرامہ "ہوش کے ناخن" میر حسن صاحب کے ساتھ مل کر لکھا گیا تھا۔ یوم کلیہ کے موقع پر کالج میں اور بعد میں اکسلیر میں اسٹیج کیا جا چکا ہے اور بے حد کامیاب رہا۔ آپ کا لکھا ہوا ایک دوسرا ڈرامہ "مرشد کامل" تیار ہے جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

محمد اظفر الحسن

صاف رنگ، گول چہرہ، آنکھیں سیاہ، اور بڑی بڑی، چھوٹا سا قد۔ اسی وجہ سے احباب میں "پاکٹ ایڈیشن" کے نام سے مشہور ہیں۔ اپنی آواز کی باریکی اور چھوٹے قد کی وجہ سے زنانہ کردار کے لیے خاص طور پر موزوں ہیں۔ گو میک اپ کے بعد بھی چہرے میں وہ کشش اور دلفریبی نہیں پائی جاتی جو ایک لڑکی میں ہونی چاہئے۔ اور نسوانی لوچ بھی جو اس صنف کو ممتاز کرتا ہے آپ میں باقی نہیں رہا۔ پھر بھی آپ ہمیشہ ہیروئین کا پارٹ کرتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ یہ اب سے تقریباً چار پانچ سال قبل عمر میں چھوٹے تھے، نسوانی کردار کے لیے موزوں تھے۔ اسی موزونیت کی وجہ سے آپ تک بھی روایتاً زنانہ پارٹ کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر انہیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ نسوانی کردار کے لیے [illegible]

اس لئے اس صنف میں کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

حیدرآباد کی ڈرامائی کوششیں آپ کی اور آپ ہی کے قبیل کے دوسرے اداکاروں کی ممنون ہیں کہ ان لوگوں نے ایثار اور فنکارانہ قابلیتوں سے اُردو ڈرامے کو مکمل اور مقبول بنانے میں مدد دی۔ اور وہ بھی ایسے نازک زمانے میں جب کہ اُردو اسٹیج پر صنفِ نازک کا وجود تو کجا اس کا خیال بھی نہیں آسکتا۔ آپ کردار کا مطالعہ توجہ سے نہیں کرتے اور بہت کم پارٹ یاد کرتے ہیں۔ پھر بھی کردار کی نمائندگی اس خوبی سے کرتے ہیں کہ دیکھنے والا کبھی شبہ نہیں کر سکتا کہ آپ نے کردار کا مطالعہ نہیں کیا ہے یا پارٹ یاد نہیں کیا ہے۔ آپ کو نسوانی جذبات کی ترجمانی میں خاص ملکہ ہے جو اس صنف کے دوسرے اداکار کو نصیب نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو بجا طور پر اس صنف کا ممتاز ترین اداکار کہا جاسکتا ہے۔

ان کی اداکارانہ زندگی اس وقت سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی جب کہ حیدرآباد میں اُردو ڈراموں کا احیاء ہوا۔ ایسٹی کالج اور فرینڈس یونین کے شکسپیر کے ڈراموں میں بہت کامیابی کے ساتھ پارٹ کیا کرتے تھے۔ کلیۂ عثمانیہ میں پہلی مرتبہ "کالج کے دن" میں کام کیا۔ بعد میں اقامت خانہ فرحت منزل کے پیش کردہ ڈرامہ "ہمزاد" میں کام کیا اور ڈرامہ کی کامیابی میں بہت بڑی حد تک ممد و معاون ہوئے۔ اب تک "نئی روشنی" "ظاہر باطن" اور "ہوش کے ناخن" میں کامیابی کے ساتھ پارٹ کرچکے ہیں۔

آپ نہ صرف اچھے اداکار ہیں بلکہ ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ کئی ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ جن میں سے "طبیبِ حاذق" نہایت کامیابی کے ساتھ جناز یم ہال میں اسٹیج کیا جاچکا ہے۔

شہریار کاؤس جی

دبلے پتلے، رنگ گورا، قد لانبا، چہرہ کتابی، ناک ستواں، آنکھیں متناسب۔ بہت پُر مذاق اور احباب پرست آدمی ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ یہ نسوانی پارٹ کے لئے عمر اور قد و قامت کے لحاظ سے بہت موزوں تھے مردانہ پارٹ ادا کیا کرتے تھے۔ اب جب کہ وہ کیفیت نہیں رہی، زنانہ پارٹ شروع کیا ہے۔ چونکہ ان میں اداکارانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اس لئے جس صنف کی نمایندگی کرتے ہیں اس کے جذبات کو بہت کامیابی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی اداکاری میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

قد کی لمبائی اور مردانہ آواز کی وجہ سے آپ زنانہ پارٹ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ مگر ان دونوں پہلوؤں پر آپ نے قابو پالیا ہے۔ آواز پر آپ کو قابو ہے۔ زنانہ پارٹ کرتے وقت اپنی آواز میں وہی لوچ اور باریک پن لے آتے ہیں۔ جو اس کے لئے ضروری ہے، اور اس کو آخر تک نباہتے ہیں۔ کسی کو آواز کے بدلنے کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ عموماً بڈھی عورت کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ ضعیفی کے جھکاؤ سے قد کی لمبائی کے عیب کو چھپا دیتے ہیں۔ آپ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ نسوانی لوچ بھی خود میں پیدا کر لیتے ہیں۔ جس میں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

آپ کی اداکارانہ زندگی اُردو ڈراموں کے احیاء سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی۔ بالعموم فرینڈس یونین کے شکسپیر کے ڈراموں میں مردانہ پارٹ کیا کرتے تھے۔ نظام کالج میں بھی کئی ڈراموں میں کام کرچکے ہیں۔ پہلا اُردو ڈرامہ جس میں آپ نے

پارٹ کیا۔ وہ بادشاہ حسن صاحب کا "غلط فہمی" تھا۔ آپ کی حقیقی شہرت "نئی روشنی" میں فصاحت بیگم کا پارٹ کرنے کے بعد ہوئی۔ گو یہ پہلا زنانہ کردار تھا جس کی آپ نے نمائندگی کی۔ اس کے بعد آپ نے "پردۂ غفلت" "غلط در غلط" "حشرات الارض" اور "طبیب حاذق" میں کامیابی کے ساتھ پارٹ کیا۔

چونکہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ کلیہ کے ہر اداکار کا تفصیلی ذکر کیا جاتا اس لئے ہم نے صرف اُن چند (مخدوم محی الدین، مرزا ظفر الحسن، شہریار کاظمی، جمیل احمد فاروقی، میر عباس علی خان، غلام علی، محمد فضل اللہ صدیقی، اور سید مہدی علی) کا ذکر کیا ہے جو سب سے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے بہت سے ہیں جن کو اداکاری سے دلچسپی ہے۔ اور جو کسی نہ کسی ڈرامے میں پارٹ کر چکے ہیں مثلاً عبداللطیف مہاجر، عبدالصمد رضوی، مصلح الدین، محمد غوث صدیقی، محمد عبداللہ، سکندر علی وجد، مقصود علی خان، امین الدین، ابوالخیر سیشاہ، ابراہیم حسینی، میر حسن، محی الدین، سمی الدین اور سید عبدالحلیم وغیرہ وغیرہ

ان میں سے اکثر کا تعلق کلیہ سے بہت جلد منقطع ہونے والا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کلیہ سے یہ فن ہی ختم ہو جائے گا۔ ہمیں اُمید ہے کہ جو حضرات اداکاری سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ زیادہ محنت کر کے اچھے اداکار بننے کی کوشش کریں گے، تاکہ کلیہ کے اسٹیج پر ایک ہی "مخدوم محی الدین"، ایک ہی "ظفر الحسن" باقی نہ رہیں بلکہ کئی ایسے اداکار پیدا ہو جائیں جو ایک دوسرے کی ٹکر کے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک خود کو زیادہ کامیابی کے ساتھ کلیہ کے اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح نہ صرف ڈرامے کو جو ادب کا ایک ضروری جزء ہے ترقی دے بلکہ اداکاری کا بھی ایک صحیح معیار قائم کر کے پبلک کو اس کا عادی بنائے

(۱۹۳۵ء)

بھوپال کے شفق رنگ ادبی افق پر

ماہنامہ **جوئبار** کی نمود

نامور اہل قلم کی ادبی تحریروں سے آراستہ پہلا شمارہ جنوری ۶۷ء میں شائع ہو رہا ہے

چیف ایڈیٹر۔ سید اقبال احمد   مجلس ادارت، عشرت قادری، مظفر حنفی، اظہر راہی اور مسعود قرابال

۸۰ صفحات   زر تعاون دس روپے   فی پرچہ ایک روپیہ

تاج بلڈنگ ۔ بدھوارہ ۔ بھوپال

مخدوم

۱۱۴ میٹر پر

شجاع احمد قائد

ہندوستان کا پہلا ریڈیو براڈکاسٹنگ اسٹیشن جس کو محبوب علی صاحب (چراغ علی مرحوم کے فرزند) نے حیدرآباد میں قائم کیا تھا "نشرگاہ لاسلکی" کہلاتا تھا۔ اس کے پروگرام ۱۱۴ میٹر پر نشر ہوا کرتے تھے۔ ادیب

● مخدوم محی الدین —— جسمانی اعتبار سے کچھ ہوں یا نہ ہوں، ذہنی اعتبار سے سب کچھ ہیں —— ۱۹۳۸ء میں مجھ سے ان کا تعارف ایک شاعر کی حیثیت سے کرایا گیا اور وہ تھے اور ہیں بھی شاعر لیکن میرا ان کا ساتھ بحیثیت ناشر (BROADCASTER) رہا۔ اسی لیے جب میں سنتا ہوں کہ مخدوم ایک ممتاز شاعر یا ممتاز لیڈر ہیں تو پچھلی یادیں ابھر کر کہتی ہیں۔ وہ ممتاز ناشر بھی ہیں۔

چراغ علی گلی اور اس کی نشرگاہ، لاسلکی، ایک زمانہ تھا، شمع حیات تھی اور مخدوم اس کا ایک ناقابلِ فراموش رقصاں پروانہ۔ ہر قسم کے اسکرپٹس لکھتے اور نشر کیا کرتے تھے —— وقت کا قابلِ لحاظ فاصلہ درمیان میں ہونے کے باوجود ان کا لکھا ہوا ایک مباحثہ اب تک یاد ہے۔ عنوان تھا ٹوپی اور اس کا استعمال —— اس سلسلے میں تائیدی اور تردیدی دونوں نقاطِ نظر بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیے گئے تھے اور آخر میں تو قلم پورے عروج پر تھا۔

"سر کے بال، بجائے خود ایک ٹوپی ہیں ایسی صورت میں جب وہ دماغ کو مزید بار برداشت کرنے پر کیوں مجبور کیا جائے۔ وہ دن آئیں گے جب اس بار کو لوگ محسوس کریں گے اور ٹوپی کو ہمیشہ مزدوری سمجھنے لگیں گے۔"

آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر سر اور ہر گھر میں یہ الفاظ گونج رہے ہیں ـــــ ۱۹۳۰ء میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا اور نشر کرنا میری محبوب مصروفیت تھی۔ میں نشری ڈراموں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ مرزا محی الدین بیگ جو اس زمانے میں ڈرامہ پروڈیوسر تھے۔ میری آواز اور صداکاری کو سراہا کرتے تھے ـــــ ایک روز انھوں نے بلایا تو ہم سمجھے اسی سلسلے کی کوئی بات ہوگی ـــــ لیکن انھوں نے تو ایسی بات کہی جسے سننے کے لیے ہم قطعی تیار نہ تھے۔ سنانے میں آگئے ـــــ ڈرامہ اور جنرل پروگرام کے لیے لکھنا میرے واسطے ہمالیہ کی کسی نئی چوٹی کے سر کرنے سے کم نہ تھا لیکن بات مرزا صاحب کی تھی جو کسی قیمت پر بھی نہ ٹالی جاسکتی تھی اس لیے مرتے کھپتے ایک ڈرامہ لکھ ہی ڈالا۔ کاپیوں کی ٹائپ غلطیاں درست ہونے کے لیے سامنے آئیں تو اپنے مسودے پر بھی نظر پڑی۔ کافی گھائل تھا ـــــ مرزا صاحب کی طرف دیکھا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے ڈرامے کی تعریف کر ڈالی۔

صداکاروں میں مخدوم سرِفہرست تھے۔ انھیں ہیرو کا رول دیا گیا تھا اور ہیروئین کے لیے کسی بائی کا چناؤ کیا گیا تھا ـــــ شاید سرلا یا کملا بائی ـــــ ریہرسل کے سلسلے میں وقت سے بہت پہلے پہنچا دیکھا تو ایک صاحبہ اپنے کھلے ہوئے پاندان سے پان بنا رہی تھیں ـــــ اور یہ پان تھا مخدوم کے لیے ـــــ ڈرامے میں بھی ایک جگہ ہیرو، ہیروئن کو ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا تھا ـــــ یعنی ؎

یاد اتنی تمھیں دلاتے جائیں : پان کل کے لیے لگاتے جائیں

قسم کی ـــــ ہم ڈرامے کی ریہرسل میں اس حقیقی "پچ" کو دیکھ کر ابھی اچھی طرح محظوظ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ہیروئن کو چھینک آئی ـــــ آواز، نزلے میں ڈوبی ہوئی ـــــ ڈرامے میں تو ہیروئین کو نزلہ نہ تھا لیکن ہو کیا سکتا تھا سوائے اس کے کہ ریہرسل شروع ہوجائے کیونکہ مرزا صاحب کی آواز "شروع کیجیے" گونج چکی تھی شروع ہوگیا ریہرسل لیکن صداکاری اور ہدایت کاری دونوں ہیروئن کی زد پہ تھیں۔ نہ تو مرزا صاحب کی بات ہمارے پلّے پڑ رہی تھی اور نہ ہماری ان کے ـــــ دونوں طرف سے "جی" یا کبھی کبھی "مکرر ارشاد" کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر مرزا صاحب نے تنگ آکر اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا ـــــ "ارے بھئی اگر چھینکیں کم نہیں ہوسکتیں تو ان کی آواز تو کم کی جاسکتی ہے" ـــــ وہ چھینکنے کے محتاط انداز کی جانب اشارہ فرما رہے تھے ہر بات میں آگے آگے رہنے والے مخدوم یہاں بھی پیچھے نہ رہے، فوراً بول اٹھے ـــــ "ہم کوشش کریں گے" لیکن دلچسپ اتفاق ہی کہیے کہ اس جملے کے ساتھ ہی انھیں بھی چھینک آگئی اور بے تحاشہ ہونے کی وجہ سے پورے زور سے آئی ـــــ اس پر بیگ صاحب نے کہا یہ آپ کمی کی کوشش کر رہے ہیں یا اضافے کی ـــــ مخدوم نے فوراً کہا ـــــ یہ چھینک بھی ان ہی کی سمجھ لیجیے کیوں کہ ـــــ جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد ـــــ یہ اللہ بات سنتے چلیے کہ ادھر "ہم نشیں" کا لفظ مخدوم کے منہ سے نکلا، ادھر ہیروئن کو پھٹاک سے چھینکیں ـــــ اور پھر تو جناب قہقہوں کی گونج میں ریہرسل ملتوی کر دیا گیا ـــــ تیسرے دن ریہرسل ہوئے اور ڈرامہ نشر ہوا۔

اس ڈرامہ میں مخدوم نے ہر قدم پر اپنے ہیرو ہونے کا ثبوت دیا ــــ ریڈیو ڈرامے اور ایکٹنگ کے تمام نشیب و فراز سے علمی و عملی تعارف کے بعد آج جب خیال آتا ہے مخدوم کی ایکٹنگ کا تو ــــ تو یہ بات مجھ ہی میں نہیں آتی کہ مخدوم نے ریڈیو ڈرامے میں ایک ذرہ دار کردار اتنا اچھا کیسے ادا کیا؟ ــ لیکن ــ لیکن پھر یہ سوچتا ہوں کہ جو پیدا ہی ہیرو ہوا ہے اس کے متعلق ایسا سوال ایک لاجواب سوال ہی ہو سکتا ہے۔

خطوط حرکت و حیات الگ الگ ہونے یا مجھے گوشۂ تنہائی اور تماشہ بننے سے زیادہ تماشائی بنا پسند ہونے کی وجہ سے میری اور مخدوم کی ملاقات، اجتماع ضدین یا قران السعدین جیسی ہو گئی ــ مخدوم کا خلوص اس سلسلے میں جو تشنگی محسوس کرتا رہا اس کا اظہار اکثر ملنے پر ہوا ــــ عرصے کی بات ہے، باغ عام کے سامنے سے جا رہا تھا ایک پر خلوص آواز کانوں سے ٹکرائی

"تم صرف سنائی دیتے ہو، دکھائی تو دیتے ہی نہیں"

ادھر ادھر دیکھا، تو مخدوم، میں نے کہا ــــ آسمانی آواز والا دکھائی نہیں دیتا ــــ خوب ہنسے پندرہ منٹ ساتھ رہا ــــ لیکن وقت کا یہ ننھا منا ٹکڑا کافی وزنی اور قیمتی تھا اس وقت بھی یہ ہیرو ہی معلوم ہو رہے تھے ــــ اسٹوڈیو کے نہیں زندگی کے اسٹیج کے ــ اور اسی وقت کیا، ادیبوں، شاعروں اور اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ سے جتنی بھی ان سے ملاقاتیں ہوئیں ان سب میں مخدوم کا یہی مقام رہا ــ سچ پوچھیے تو مخدوم بنی نوع انسان کا ایک ایسا سچا خادم ہے جو ہر میدان میں مخدوم رہے گا۔

کسی بھی وقت — کسی بھی موسم میں — کتنے بھی دن کے لیے

ہوٹل ناز آپ کی خدمت کے لیے تیار ہے

جب بھی آپ دہلی تشریف لائیں

ہوٹل ناز میں قیام پذیر ہوں

ہوٹل ناز

جامع مسجد۔ فون (۲۶۲۵۲۵)

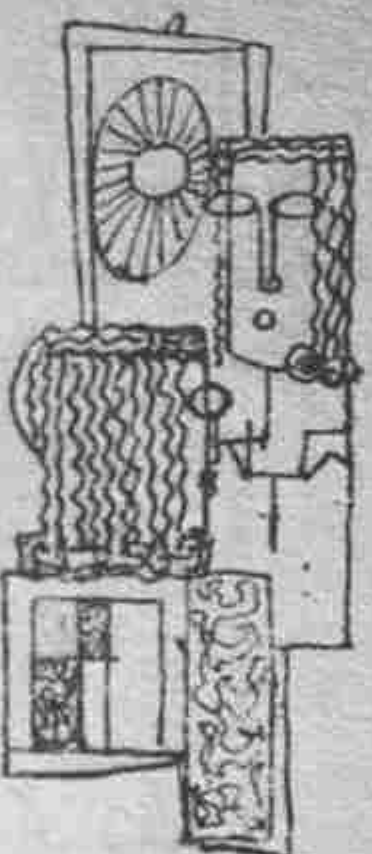

مخدوم سے انٹرویو

نریش کمار شاد

● شاد:۔ مخدوم صاحب! آپ کا سنِ ولادت کیا ہے؟

مخدوم:۔ ۱۹۰۷ء

شاد:۔ کہاں پیدا ہوئے۔

مخدوم:۔ حیدر آباد دکن کے ایک گاؤں میں۔

شاد:۔ ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی۔

مخدوم:۔ عربی اور فارسی کی گھر میں۔ پھر گاؤں کے ایک مدرسے میں جو مندر میں واقع تھا۔ ہنومان کی مورتی کے سامنے بیٹھ کر۔

شاد:۔ اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم۔

مخدوم:۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۷ء تک۔

شاد:۔ ایم اے میں آپ کا سبجیکٹ کیا تھا۔

مخدوم:۔ ایم اے اردو ڈراما اور ناٹک میں کیا۔

شاد:۔ شاعری کا آغاز کب ہوا۔

مخدوم:۔ ۱۹۳۳ء میں۔

شاد:۔ کیوں کر۔

مخدوم:۔ اتفاقیہ طور پر ویسے یہ ضرور تھا۔۔۔۔ کہ میں نے اس وقت تک اکثر شعراء کے دواوین پڑھ لیے تھے اور خاص طور پر مشہور ایرانی شعرا کا کلام میری نظر سے گزر چکا تھا۔

شاد:۔ آپ کا سب سے پہلا شعر کیا تھا۔

مخدوم:۔ میری شاعری کے سلسلے کا آغاز ایک مزاحیہ نظم سے ہوا۔ اس نظم کا عنوان تھا "پیلا دوشالہ" قصہ یہ ہوا کہ ایک لڑکے کا پیلا دوشالہ کسی نے اڑا لیا اور دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اسٹیٹ فلیگ بھی پیلے رنگ کا تھا۔ اس نظم کا آخری ٹکڑا مجھے یاد ہے ؎

اگر گم کن پھلوٹے من باز یابی ــــــــ گریم زجدائی
آں روز بیاد آر کہ من زیرِ تو بالا ــــــــ او پیلا دوشالہ

شاد:۔ آپ نے ابتدائی شاعری میں اصلاح کس سے لی۔

مخدوم:۔ کسی سے نہیں۔

شاد۔ آپ شروع میں کس کس اردو شاعر سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔

مخدوم :۔ مجھے امیر مینائی کی غزلیں اور عظمت اللہ کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ بعد میں میر اور غالب سے بھی متاثر ہوا۔ اس دور کے شعرا اقبال، فانی اور اصغر سے اور پھر حفیظ کے گیتوں اور جوش اور اختر شیرانی کی نظموں سے۔

شاد۔ اقبال سے تو آپ خاص طور پر متاثر رہے ہیں۔ اقبال کے متعلق آپ نے یہ شعر بھی تو کہا ہے ؎

نعرۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں ۔۔۔ صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

کیا اب بھی اقبال کے بارے میں آپ یہی کہتے ہیں۔

مخدوم :۔ یہ شعر ۱۹۳۲ء کا کہا ہوا ہے جب میں اقبال سے روایتی طور پر زیادہ متاثر تھا۔

شاد :۔ آپ کے خیال میں اس صدی کا سب سے بڑا اردو شاعر کون ہے۔

مخدوم :۔ سب سے بڑے کا میں قائل نہیں۔ کئی چھوٹے شاعروں کے بعض مصرعے بھی لافانی ہوتے ہیں۔

شاد :۔ آپ کے نزدیک بہترین شعر کی تعریف کیا ہے۔

مخدوم : جو دل پر اثر کرے اور زندگی کی دلکشی کا احساس دلائے۔

شاد :۔ کیا آپ موجودہ غزل کے معیار سے مطمئن ہیں۔

مخدوم :۔ موجودہ غزل میں عمدہ اشعار ضرور ملتے ہیں لیکن میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ مطمئن تو میں کسی بھی چیز سے نہیں ہوں۔

شاد :۔ اپنی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ بیان کیجئے جس نے آپ کی شاعری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو۔

مخدوم :۔ ایک نہیں کئی ہیں لیکن اس وقت کوئی واقعہ یاد نہیں آ رہا ہے مسلسل واقعات ہیں جو اثر ڈالتے رہتے ہیں اور جن سے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا رہتا ہے۔

شاد :۔ آپ شعر کیوں کر کہتے ہیں۔

مخدوم :۔ کچھ مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں جن کی پہلے سے دماغ میں تشکیل ہوتی رہتی ہیں۔ پھر ایک لمحہ جو میرے اختیار میں نہیں ہوتا ٹرین میں، بس میں یا ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے یا رکشا میں جاتے ہوئے، یا کڑکتی دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے یا کسی سیاسی میٹنگ میں بیٹھے ہوئے، شور و غل یا تنہائی میں میرے اندر سخت URGE پیدا کر دیتا ہے اور میں آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو کر شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

شاد :۔ شاعر کی "انا" اور "انفرادیت" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

مخدوم :۔ شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فرد معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی

دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آ جاتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ یہی باہمہ اور بے ہمہ کا وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب انا اور انفرادیت سے تعبیر کرتا ہے۔

شاد:۔ کیا یہ درست ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے۔

مخدوم:۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے مگر میں ایک محروم بے کاری انسان ہوں۔ میری نظمیں اور غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ سماجی تقاضے مجھ سے پر اسرار طور پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔

شاد:۔ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے۔

مخدوم:۔ مجھے معلوم نہیں۔

شاد:۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں کہ ہندوستان میں اردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ دیوناگری رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔

مخدوم:۔ کسی رسم الخط سے میرا جذباتی لگاؤ نہیں ہے۔ دیوناگری ہو خواہ رومن۔

شاد:۔ لیکن ہر زبان کا اس کے مخصوص رسم الخط سے باطنی تعلق بھی تو ہوتا ہے۔

مخدوم:۔ اجتماعی مفاد کے پیش نظر اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ترکوں نے رومن رسم الخط کو اپنا لیا۔ سوویت یونین میں بھی بعض جگہ رسم الخط کو تبدیل کر لیا گیا۔ چین میں بھی باتصویر لیکن بے حد پیچیدہ رسم الخط پر رومن کو ترجیح دی گئی لیکن اردو کو آئینی حقوق دینے کے باوجود اس سے جو ناانصافیاں کی جا رہی ہیں ان کے ضرور خلاف ہوں۔ اور موجودہ رسم الخط کو مٹانے کے لیے ارادی طور پر جو کوشش کی جا رہی ہیں انھیں بھی مذموم خیال کرتا ہوں۔

شاد:۔ آپ کے خیال میں مشاعرے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مفید ہیں۔

مخدوم:۔ مشاعرے اردو کی بول چال کا حصہ ہیں۔ شعر و ادب کی ہلکی پھلکی جذباتیت جس میں فکر کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے ترجمان ہیں۔ بڑے بڑے عام مشاعروں کی اہمیت واقعی ہے لیکن زبان کی ترویج و اشاعت کے معنی چند مصرعوں کے نہیں۔ یہ اس کی علمی زبان پر منحصر ہے۔

شاد:۔ کیا ہمارا موجودہ ادب واقعی جمود کا شکار ہے۔

مخدوم:۔ ہرگز نہیں۔

شاد:۔ تو یہ مسئلہ پیدا ہی کیوں ہوا۔

مخدوم:۔ لوگ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ پڑھنے والے مطمئن ہیں۔ اگر یہ اطمینانی ہے تو اور اچھی بات ہے لیکن آزادی کے

بعد جو بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا شعور جتنا ہونا چاہیے اتنا ہمارے ادیبوں میں نہیں ہے۔ بعض تو ۱۹۴۷ء سے پہلے کا شعور لیے بیٹھے ہیں اور نئے سماجی میلانات کو شعوری طور پر قبول نہیں کر رہے۔ میں نئی اور پرانی نسل کی تفریق غلط سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ پرانے لکھنے والوں نے نئے لکھنے والوں کے متعلق اظہار خیال کرنے کا فرض ادا نہیں کیا اور نئے لکھنے والے بھی ناراض ہو کر اپنے تاریخی ورثے سے دست بردار ہو رہے ہیں۔ درحقیقت دونوں قصوروار ہیں اور دونوں کا یہ طرز عمل اس مسئلے کی پیداوار کا باعث ہے۔

شاد۔ اچھا آپ ہی یہ فرض ادا کیجیے اور نئے لکھنے والوں کے متعلق اظہار خیال فرمائیے۔

مخدوم۔ بہت شرمندہ ہوں کہ بہت کم پڑھتا ہوں لیکن جتنا پڑھتا ہوں اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں کی بعض تخلیقات بہت اچھی ہیں ان میں جدت بھی ہے اور تازگی بھی۔ بعض کی کاوشیں بھدی ہوتی ہیں۔ شاعروں کے یہاں آرٹ کی لگن کم ہے اس لئے وہ تخلیق کے بُرے نمونے پیش کرتے ہیں۔

شاد۔ آپ غیر ملکی شاعروں میں کن کن سے متاثر ہیں۔

مخدوم۔ حافظ شیرازی، ناظم حکمت اور اسپین کے شاعر لورکا سے اور اس چینی شاعر سے جس کا نام اب مجھے یاد نہیں آ رہا ہے جو ایک طویل مدت تک جیل میں رہا اور وہیں فوت ہوا۔

شاد۔ کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔

مخدوم۔ بعض لوگ کسی ادیب کی چھوٹی خامیوں کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی اچھائیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ادیب نجی اور جنسی معاملات میں نا پسندیدہ آدمی ہونے کے باوجود نیک دل انسان ہوتا ہے۔

شاد۔ شاعری کے علاوہ ادب کی کن کن اصناف سے آپ کو دلچسپی ہے۔

مخدوم۔ تنقید اور ڈرامہ سے۔ میں نے طالب علمی میں کئی ڈرامے خود بھی لکھے تھے اور خود ایکٹ کرنے کے علاوہ خود ڈائرکٹ بھی کیے تھے۔

شاد۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز کب ہوا۔

مخدوم۔ ۱۹۲۲ء میں۔

شاد۔ کس طرح۔

مخدوم۔ اس زمانے میں سودیشی اور خلافت تحریک کا اثر ہندوستان کے گھر گھر پہ تھا۔ میرے چچا اس تحریک کے مویدین میں تھے۔ ہمارے گھر میں گاندھی جی، شوکت علی، محمد علی اور ان کی والدہ بی اماں کے چرچے اکثر رہا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ اکٹھے حیدرآباد میں آئے تو مکہ مسجد میں بڑی دھوم تھی۔ میں نے بھی مسجد میں جلسے کے لیے ضد کی لیکن مجھے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ البتہ وہاں سے واپس آتے ہوئے چچا نے میرے لیے کھدر کی ٹوپی لادی۔ اس ٹوپی ہی کو میری سیاسی زندگی کا آغاز سمجھیے۔

صبا

شاد: آپ مارکسزم سے کب آشنا ہوئے۔

مخدوم: سنہ ۱۹۳۴ء میں۔

شاد: سیاست نے آپکی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔

مخدوم: میں شروع ہی سے نہرو اور سبھاش چندر بوس سے بہت متاثر تھا۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں مارکسزم کے مطالعے سے دماغ میں کشادگی پیدا ہوئی، اور سنہ ۱۹۳۶ء سے میں کمیونسٹ پارٹی کا عملی کارکن بن گیا۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں فرقہ پرست جماعت اتحاد المسلمین کے سوا باقی تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی تھی۔ قومی تعصب اور بادشاہت کے خلاف میرا غصہ اسی زمانے میں ستورا اور نکھرا۔ اس تصور کے اظہار کا ذریعہ مجھے شعر ہی مل سکیوں کہ شعر پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اسی زمانے میں حبشہ پر مسولینی کے حملے کے بعد میں نے اپنی پہلی سیاسی نظم "جنگ" لکھی جو فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی صدائے احتجاج ہے۔

شاد: اس نظم کا کوئی شعر یاد ہو تو فرمایئے۔

مخدوم: نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
اور آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو اور انجمِ حیاتِ یزداں طلوع ہو

اسی زمانے میں ایک نظم اس وقت کہی جب نظام کی جوبلی منائی جا رہی تھی:

ہاں وہی سب کے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا ہاں مری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا
مخملِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

شاد: ظاہر ہے کہ سیاست کو ادب سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا آپ کی طرح ہر ادیب کو سیاست سے سو فی صد وابستہ ہو جانا چاہیئے

مخدوم: نہیں بالکل نہیں۔ سو فیصدی کسی تحریک سے وابستہ ہونا قطعاً ضروری نہیں لیکن ہر ادیب کے لیے زندگی کے بارے میں کوئی واضح نظریہ رکھنا ضروری ہے۔ اسے سماجی طور پر باشعور ہونا چاہیئے۔ ورنہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود ن۔ م راشد کی طرح انتقام جیسی گندی نظمیں لکھنے لگے گا۔ ہر اچھے آرٹسٹ کا ایک واضح نقطۂ نظر ضرور ہی ہوتا ہے۔

شاد: مثلاً برنارڈ شا کا کیا تھا۔

مخدوم: سوشلزم۔

شاد: اور ٹالسٹائی کا۔

مخدوم: REALISM

شاد: سیاست سے سو فیصدی وابستگی نے آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔

مخدوم۔ نہیں بالکل نہیں بلکہ میری شاعرانہ صلاحیتوں کے حق میں یہ وابستگی مفید ثابت ہوئی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میرے دماغ کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے۔

شاد۔ آپ حب الوطنی کے قائل ہیں یا نہیں۔

مخدوم۔ بالکل ہوں۔

شاد۔ کیا بین الاقوامی اخوت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

مخدوم۔ بے شک

شاد۔ تو کیا ان حالات میں بھی آپ حب الوطنی کے قائل رہیں گے جن میں بین الاقوامی اخوت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

مخدوم۔ نہیں چین کا ہندوستان پر حملہ ہمارے طرزِ عمل کے کڑے امتحان کا وقت تھا۔ چونکہ چین کا حملہ بین الاقوامی مفاد کے خلاف تھا اس لیے ہم نے اس کی مخالفت کی۔

شاد۔ ادب اور سیاست کے علاوہ آپ کے پسندیدہ مشاغل کیا ہیں۔

مخدوم۔ مجھے دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکنا یا بچوں سے کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے۔

اپنے مہمانوں کی تواضع

عمدہ اور لذیذ کیک پیسٹری، کری پفس ڈبل روٹی وغیرہ سے کیجئے

جن کو ہمارے ماہرین نہایت صفائی اور احتیاط سے تیار کرتے ہیں۔ ہندوستان بھر کی مشہور فیکٹریز میں تیار ہونے والے بہترین چاکلیٹ سوئٹس ان کے علاوہ تازہ خشک میوے

ہر تقریب، تفریح، محفل اور پارٹی کے لیے ہمارے شوروم میں محفوظ ہیں

آپ کے استقبال کے آرزومند

کراچی بیکری

پراوپرائٹرن اسٹور، معظم جاہی مارکٹ۔ فون (۳۵۰۲۰)

نوٹ:۔ معظم جاہی مارکٹ کے سوائے شہر میں کوئی دوسری برانچ نہیں ہے

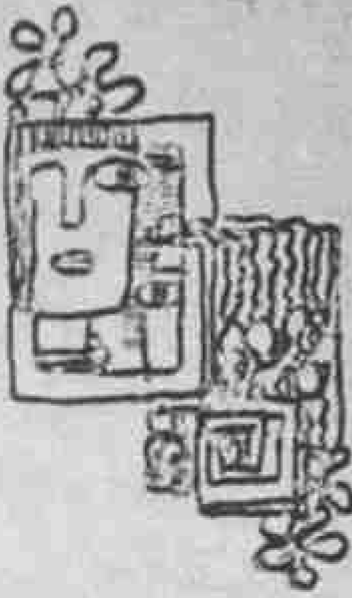

مخدوم محی الدین سے انٹرویو

امیر عارفی

● میری بہت دنوں سے خواہش تھی کہ مخدوم صاحب سے بھی شعر و ادب کے مسائل پر بات کروں اور اس گفتگو کو انٹرویو کی صورت میں پیش کروں۔ اردو ادب کی جو اہم اور قد آور شخصیتیں ہیں ان میں مخدوم کا نام بہت اہم ہے۔ میرے خیال میں ۱۹۳۶ء کی نسل میں فیض مخدوم اور سردار ایسے شاعر ہیں جو اب تک برابر CONTRIBUTE کر رہے ہیں ورنہ کسی نے فلم میں پناہ لی ہے اور کوئی اس سوچ میں گم ہے کہ اب کیا کہیں؟ کوئی اپنی پرانی شہرت کی گرتی ہوئی دیواروں کو سنبھالنے میں مصروف ہے تو کئی ایسے ہیں جنھوں نے چپ سادھ لی ہے۔

اس انٹرویو کا خیال مخدوم کی ان نظموں اور غزلوں کو پڑھ کر ہوا جو زندگی پر بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ مخدوم کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک سیاسی دوسری ادبی۔ مخدوم صرف شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے سینکڑوں محنت کرنے والے جفاکش عوام کا محبوب لیڈر اور آندھرا پردیش قانون ساز کونسل کا اپوزیشن لیڈر بھی ہے۔ میں دس بارہ سال سے لیڈر مخدوم کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن آج مجھے شاعر مخدوم کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔

مخدوم کی زندگی جس نشیب و فراز سے گزری ہے ہندو پاک کا اگر کوئی دوسرا شاعر اس طرح کی زندگی بسر کرتا تو وہ یا تو سیاسی زندگی ترک کر دیتا یا پھر شاعری ـــ لیکن مخدوم ایک ایسا البیلا شاعر ہے جو دونوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کر رہا ہے۔

مخدوم کی شخصیت کا ایک اور پہلو اس وقت ہمارے سامنے آیا جب فلم والوں نے مخدوم سے بمبئی میں رہ کر گانے لکھنے کی خواہش کی ۔۔ اور مخدوم نے ان کی اس پیشکش کو رد کر دیا۔ ورنہ ایسے کتنے شاعر ہیں جو فلم میں گانے لکھنے کے لیے سب کچھ داؤں پر

لگا دیتے ہیں۔

میں چھٹیوں میں علی گڑھ سے ۲۴ر دسمبر ۶۲ء کو حیدرآباد پہنچا اور یہ سمجھ لیجئے اچھا موقع تھا کہ میں نے اپنے محبوب شاعر مخدوم سے انٹرویو کی دیرینہ خواہش کو پورا کروں چنانچہ ۲۰ر جنوری ۶۳ء کو میں اور مخدوم ایک پرسکون کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے چائے پینے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور میرے سوالات کے لئے ماحول سازگار ہو گیا اور میں نے سوالات کا آغاز کیا۔

امیر عارفی۔ مخدوم صاحب آپ نے کب اور کس ماحول میں شاعری کا آغاز کیا۔

مخدوم محی الدین۔ میری شاعری کا آغاز ۱۹۳۳ء سے ہوا جب کہ میں کالج کا طالب علم تھا۔ میری ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور تلگو میں ہوئی۔ ۱۵ سال کی عمر میں میں نے سکندر نامہ، دیوانِ حافظ، دیوانِ صائب، اخلاق محسنی، مثنوی مولانا روم کا کچھ حصہ اور سعدی کی گلستان، بوستان ختم کر لی تھی۔ ان کا مجھ پر بہت بڑا (IMPACT) تھا۔ ادب سے دلچسپی ۱۹۲۸ء میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس دور کے مشہور رسالے "نگار" اور "ایوان" میں دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ کالج کے ابتدائی دور ہی میں مجھے کلاسیکل ادب پڑھنے کا موقع ملا لیکن کبھی شعر کہنے کی خواہش نہیں ہوئی حالانکہ میرے دو چچازاد بھائی ایک صبا اور دوسرے ادیب شاعر ہو چکے تھے اور خود میرے دادا شاعر تھے جو فطرت تخلص کرتے تھے، وہ عشق میں پاگل ہو کر مر گئے۔ میرا گھریلو ماحول مذہبی تھا اور ہمارا خاندان درس و تدریس کے لئے مشہور تھا۔ ہمارے خاندان میں پیراکی، قراءت اور خطاطی کے ماہرین گذرے ہیں۔ تجوید میں نے نہیں پڑھی لیکن گھر میں لوگ قرآن شریف تجوید سے پڑھتے تھے۔ البتہ مجھ سے خطاطی ضرور کرائی گئی۔ میری ابتدائی تعلیم گھر پر عربی فارسی میں ہوئی اور تلگو گاؤں کے مکتب میں پڑھی، مجھے وہ مندر اور پیپل کا درخت اب تک یاد ہے جس کے نیچے بیٹھ کر ہم "سرسوتی" لکھا کرتے تھے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میرا گھریلو ماحول بڑا مذہبی تھا میں نے نو نسری کے بچوں پر ختم خواجگان، مولود شریف، پڑھنے سے لیکر مسجد کی جاروب کشی، اور اذان تک دی ہے۔ مسجد میں نمازیوں کے لئے کنوئیں سے پانی نکالنا، ہر جمعہ کو سر منڈوانا، سخت گرم پانی سے نہانا اور روزانہ کے معمول میں فرض سنت اور نوافل کے علاوہ اشراق اور چاشت کی نمازیں پڑھنا اسی قسم کے مذہبی مشاغل سے میری طبیعت اکتا جاتی تھی۔ لیکن گاؤں میں میں نے گھر والوں کی چوری سے شرر کے ناولوں کا پورا سیٹ پڑھ لیا تھا۔ کالج کے ابتدائی سالوں میں جب کہ میں شعر نہیں کہتا تھا میری آواز بہت اچھی تھی، اور اچھا خاصا گا لیتا تھا۔ کھیل کود اور شکار کا زیادہ شوق تھا۔ میں سو گز کی دوڑ، ہائی جمپ، لانگ جمپ، اور فٹ بال میں کئی انعامات لے چکا ہوں۔ فٹ بال میرا پسندیدہ کھیل رہا ہے۔

۱۹۳۳ء میں میں نے اتفاقیہ طور پر جو نظم کہی وہ "پیلا دوشالہ" تھی جو مزاحیہ ہے۔ انھیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی، "تلنگن" اور "ساگر کے کنارے" بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

امیر عارفی۔ مخدوم صاحب ابھی تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کا آپ کی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا تو پھر آپ سیاست میں کیسے آئے؟

مخدوم محی الدین۔ میرا گھریلو ماحول مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرستانہ بھی تھا۔ اور میں گھر پر گاندھی جی، مولانا محمد علی اور "بی اماں" کے قصے سنتا تھا۔ گھر میں چرخہ کاتا جاتا تھا۔ چچا کھادی کی بڑی تعریف فرماتے خود بھی کھادی پہنتے اور مجھے بھی

پہناتے، لیکن مجھے وہ کلفت سے اکڑی ہوئی کھادی مطلق پسند نہ تھی۔

خلافت تحریک کے زمانے میں میری عمر ۱۱، ۱۲ سال کی تھی، میرے چچا خلافت تحریک کے سرگرم موید تھے۔ وہ مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ دنیا میں ایک ملک روس ہے جہاں بادشاہ کو ہٹا کر غریبوں نے حکومت قائم کرلی ہے۔ اب وہاں امیر، غریب سب ایک دسترخوان پر ساتھ ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیاز کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ مارکسسٹ ادب سے میں ۱۹۳۴ء میں واقف ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کا ۱۹۴۰ء میں ممبر ہوا۔ گو میرا تعلق ۱۹۳۴ء سے کمیونسٹ پارٹی سے رہا ہے لیکن ۱۹۴۰ء سے ممبر اس لئے ہوا کہ حیدرآباد میں پارٹی ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت پارٹی غیر قانونی تھی۔ جواہر لال نہرو کی قیادت میں ۱۹۳۶ء میں فاشزم کے خلاف ہندوستانی قومی تحریک زوروں پر تھی، ہم لوگ جنگ اسپین سے بہت متاثر تھے۔ میری پہلی سیاسی نظم "جنگ" ہے۔

حیدرآباد میں سبط حسن، اختر رائے پوری، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، ایم نرسنگ راؤ (سابق مدیر رعیت) اور چند لوگوں نے مل کر جن میں میں بھی تھا انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ہمارے جلسے سروجنی نائیڈو کے مکان پر ہوا کرتے تھے اسی دور میں ہماری مقبولیت اور مخالفت شروع ہو گئی تھی۔ مقبولیت کی بنیاد یہ تھی کہ ہماری شاعری زندگی اور عوام کے قریب تھی اور غزل کے روایتی انداز سے ہٹی ہوئی تھی۔ اور ہماری مخالفت محض سیاسی مفادات اور رجعت پسندی کی بناء پر ہوتی تھی۔

امیر عارفی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو متاثر کیا ہے؟

مخدوم محی الدین۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ ہم نے روایت کی دیواریں توڑ دی تھیں، اور ادب کو زندگی کا رفیق بنا چکے تھے۔ ادب میں ہمارا نقطۂ نظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اس طرح نئی نسل کا اس ادب سے متاثر ہونا ضروری تھا چنانچہ نظر حیدرآبادی، سلیمان اریب، سیکش، دہقانی، ظہیر ماہر، لطیف ساجد، تحسین سروری، عزیز قیسی، وغیرہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔

امیر عارفی۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر آپ نے انقلابی شاعری کی آجکل کس "انسپریشن" کی بناء پر شعر کہہ رہے ہیں

مخدوم محی الدین۔ شروع سے میں ترقی پسندی کے "انسپریشن" کے تحت شعر کہہ رہا ہوں۔ اس دور میں جب کہ سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد، طبقاتی جدوجہد، ہماری نجی زندگی، عشق، عشق کی محرومیاں سب کچھ شامل ہیں۔ ترقی پسندی کے مفہوم میں آفاقیت آگئی تھی۔ جنگ اور امن کو موضوع بنایا، اردو شعر کو تنگنائے غزل سے نکال کر دھرتی پر کھڑا کر دیا۔ غزل سے بندھے ٹکے الفاظ نکال کر اس کو نئی تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے دیئے نیا جمال و جلال دیا۔

موجودہ شاعری میں ہماری زندگی ہی انسپریشن ہے۔ آج کی دنیا وہ دنیا نہیں ہے جو ۱۹۴۵ء سے پہلے تھی آج امن عالم کے تحت قومی آزادی کی تحریک اور سوشلسٹ نظام کا دنیا میں فیصلہ کن مقام حاصل کرنا سامراج کا کمزور ہونا امن اور جمہوریت پسند طاقتوں کا وسیع ہونا غلام ملکوں کا آزاد ہونا، فکر، احساس اور عمل کا بلندیوں پر پہنچنا یہ ماحول دوسری جنگ سے پہلے نہ تھا پہلے تاریخ سوشلزم بنا رہی تھی، اب سوشلزم تاریخ بنا رہی ہے" اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا" قسم کی شاعری

اب ہم دوسرے ڈھنگ سے کرتے ہیں کیوں کہ آج ایک نئی دنیا اور نیا آدم پیدا ہو چکا ہے۔ آج ہم ایک غلام ملک کی نہیں بلکہ صدیوں کی دبی ہوئی امنگوں، ولولوں اور لطافتوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

امیر عارفی۔ مخدوم صاحب آپ کے پہلے مجموعے "سرخ سویرا" میں SEX کا دور دور تک پتہ نہیں، لیکن آج کل آپ کے یہاں اس کا شدت سے احساس ہوتا ہے اس کی کوئی وجہ آپ بتا سکتے ہیں؟

مخدوم محی الدین۔ دراصل آج ہم اپنے احساسات کا بقایا چکا رہے ہیں۔ پہلے ترقی پسندی کا مضمون محدود تھا۔ لیکن آج دنیا بدلی ہوئی ہے۔ آج ہمیں داخلی مسائل بھی متاثر کرتے ہیں۔ SEX انسانی فطرت کا ایک اہم جزو ہے۔ دنیا کے شعر وادب کا ۹۰ فیصد حصہ SEX پر مبنی ہے۔ لیکن اس میں نکتہ یہ ہے کہ آپ کس زاویے سے اس کو محسوس کرتے اور پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ شعر کا کام انسانی جبلتوں کو تہذیب عطا کرنا ہے۔ نظموں میں SEX صاف اس لیے نظر آتا ہے کہ نظم کی زبان غزل کی زبان نہیں ہے۔ غزل میں تو SEX عریانی کی حد تک پہونچ گیا ہے لیکن غزل مورد الزام اس لیے نہیں ٹھیرتی کہ اس میں SEX ڈھکے چھپے انداز میں آتا ہے۔

امیر عارفی۔ سرخ سویرے کے بعد آپ کی طویل خاموشی "قید"، چارہ گر، اور چاند تاروں کا بن۔ جیسی خوبصورت نظموں کے ذریعہ ٹوٹی۔ پھر آپ آج کل غزل کیوں کہہ رہے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے؟

مخدوم۔ غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے۔

کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخر شب ؎ کھٹ کھٹا جاتا ہے زنجیر در میخانہ

اس غزل کی تمام علامتیں سیاسی ہیں۔ اس کی ساری فضا کیرالا الیکشن کی ہے۔ دراصل انقلابی شاعری میں بھی میرے پاس جمالیاتی عنصر زیادہ ہے مثلاً "گزر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے" والی نظم میں گو انقلاب کو دعوت دی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں رومانیت اور جمالیاتی عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ جس کو آپ (LYRICAL) بھی کہہ سکتے ہیں۔

"سرخ سویرا" کی نظمیں مثلاً موت کا گیت۔ انتظار، طور اور آتش کدہ میں بھی آپ کو جلال اور جمال یعنی انقلاب اور حسن دونوں کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ اس دور میں میں نے ایک نظم طویل لکھی لیکن اس سے کچھ تسکین نہیں ہوئی تو دوسری نظم۔

وہ خم گردن و دست ناز، وہ ان کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلم وہ نگاہوں کا پیام

لکھی اور اب حالیہ نظموں میں "چارہ گر" "رقص" وغیرہ کو دیکھئے کہ کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں۔ آج عشق اور انقلاب ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔

امیر عارفی۔ آپ نے طویل خاموشی کیوں اختیار کی، کیا بڑی شاعری کیلئے وقفہ ضروری ہے؟

مخدوم - میں نہیں جانتا کہ میری شاعری بڑی ہے یا نہیں لیکن اس وقت تحریک کے سامنے جو مسائل درپیش تھے، اس کی وجہ سے میرے نزدیک شاعری اہم نہیں تھی۔ ایک آرٹسٹ کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ تحریک کے تقاضے اور آئندہ آنے والے زمانے کے مسائل کیا ہیں۔ جو شخص کسی تحریک میں عملی طور پر شامل نہیں ہے۔ اس پر بھی ایسا دور آتا ہے — اقبال بھی فکری کشمکش میں برسوں مبتلا رہے۔

امیر عارفی - مخدوم صاحب کیا کسی ادیب کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ہو، کیا بغیر ممبر بنے وہ اچھا ادب پیش نہیں کر سکتا۔

مخدوم - کسی ادیب کی تخلیقات میں آفاقیت، ہمہ گیری، انسانی دل کی تہہ در تہہ جانکاری اور زندگی کا جتنا وسیع تجربہ اور مطالعہ ہوگا وہ اتنا ہی اچھا ادب پیش کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ہونا ضروری نہیں۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کی ممبری قبول کرلے۔

امیر عارفی - آپ کی نظم "وصال" کیا ان مصرعوں کے بغیر

"دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں
بڈھا ناگ کھڑا روتا ہے" مکمل نہیں ہو سکتی

مخدوم - ہاں ٹھیک ہے۔ میری نظم "وصال" ان دو مصرعوں کے بغیر بھی مکمل ہے۔ لیکن سوچئے کہ ان دو مصرعوں کی وجہ سے بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ ایک مرد اور عورت کے وصال میں آج بھی کتنی سماجی رکاوٹیں ہیں۔ آخر کیوں، یہ سوال بہت اہم ہے ۔۔۔ اور یہ رکاوٹیں روپیہ، جائداد، طبقہ، ذات پات، مذہب، رنگ و نسل کی ہیں۔ ایک نیگرو کسی گوری عورت سے شادی نہیں کر سکتا، خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتے ہوں۔ یہاں اگر ادیب باشعور ہوگا تو بات ڈھنگ کی کرے گا ورنہ گوری چمڑی والوں کے خلاف نسلی منافرت کا اظہار کر کے حساب برابر کر دے گا۔ نظم وصال میں "دولت خاں کی ڈیوڑھی" وہ مردہ روایتیں ہیں جو ان روحوں کے آپس میں ملنے پر آج ڈس نہیں سکتیں، بلکہ صرف آنسو بہا سکتی ہیں۔ کیونکہ زمانے نے ان کی قوت جبر کو روند دیا ہے۔

امیر عارفی - شاعری میں نئے تجربوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میرے نزدیک شاعری اور نظم دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ضروری نہیں کہ ہم نثر ہی میں شاعری کریں۔

مخدوم - میں نئے تجربوں کا خیر مقدم کرتا ہوں بشرطیکہ اس میں شعریت اور شعور کی کارفرمائی موجود ہو۔ ابھی حال تک نظم میں ضمیر ضروری نہیں جتنا وزن ہوتا ہے۔ چنانچہ آزاد نظم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ شاعری نہیں ہے لیکن آج یہی نظمیں مقبول ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا کہ ان نظموں کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں مثلاً "چارہ گر" اور "چاند تاروں کا بن" آزاد نظمیں ہوتے ہوئے بھی گائی جاتی ہیں۔ دراصل اس کی وجہ جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ آزاد نظم کو زیادہ سے زیادہ مترنم ہونا چاہیے کیونکہ آج کی نظم اپنا مرکزی خیال، اپنے الفاظ، اپنی موسیقی، اپنا پیکر، اپنا پیراہن، اور اپنی ہیئت لے کر پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے

اس کا حلقۂ اثر بڑھتا جا رہا ہے۔

امیر عارفی ۔ پچھلے دنوں غالباً "سویرا" اور "سوغات" میں بغیر وزن کی کچھ نظمیں شائع ہوئی تھیں، اور ادھر تنے بھائی بھی بغیر وزن کی یعنی (SPEACH RHYTHM) میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اس نئے تجربے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

مخدوم محی الدین ۔ میں نے "سویرا" اور "سوغات" میں شائع ہونے والی نظمیں تو نہیں پڑھیں لیکن انگریزی میں ایسی شاعری کا رواج ہے۔ تلگو کا جاکوی سری سری بھی بلا بحر اور بلا وزن کی نظمیں لکھتا ہے۔ لیکن میں بلا وزن کی نظمیں نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ میرے شعروں کی تخلیق موسیقی سے ہوتی ہے۔ اور دل کی دھڑکن ہی میرے بحر کا وزن بن جاتی ہے۔

میں نے تنے بھائی کی نظمیں سنی۔ اور پڑھیں ہیں۔ میں ان سے لطف لیتا ہوں۔ لیکن ہمیں نیا تجربہ کرتے وقت اس بات کی احتیاط برتنی چاہیئے کہ ماضی کے گھسے پٹے پیمانوں کو ترک کرتے ہوئے ان کی جگہ کون سے نئے پیمانے پیش کریں تاکہ ہمارے سننے اور پڑھنے والے عوام "نئی چیز" کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

امیر عارفی ۔ دکنی زبان کی عوامی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مخدوم محی الدین ۔ عوامی دکنی شاعری کی زندہ مثال سرور ڈنڈا کی شاعری ہے۔ ڈنڈا کی شاعری کے دو پہلو ہیں ایک اس کی زبان اور فارم، دوسرے اس کی نظموں کا خیال۔ جہاں تک اسکی زبان اور فارم کا سوال ہے وہ قدیم دکنی کے ساتھ آج کی مروجہ زبان اور لوک گیتوں کی بحروں کے ساتھ دکنی اور تلگو گیتوں کی بحریں بھی آزادی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اور جہاں تک اس کی نظموں کے خیال کا یعنی اس کے سیاسی اور سماجی شعور کا تعلق ہے وہ معاشرے میں بنیادی تبدیلی ضرور چاہتا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کو نظر انداز کر دیتا ہے جو آج تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔ ڈنڈا کے پاس ظلم جبر کے خلاف ایک شدید جذبہ ملتا ہے۔ وہ سامراج اور مطلق العنانیت کا دشمن ہے۔ وہ عوام کی سیاسی لڑائیوں میں شریک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ "انقلاب" کا اس کا اپنا ایک تصور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمہوریت کا قائل بھی ہے اور اس سے ناخوش بھی۔ اور یہیں وہ تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ دراصل ڈنڈا جہاں سیاسی حیثیت سے باشعور ہے وہاں سماجی حیثیت سے کچھ قدامت پرست بھی ہے۔ چنانچہ لڑکیوں کی وضع قطع میں ذرا سی تبدیلی کو بھی وہ بُرا سمجھتا ہے۔ اور یہاں تک کہ عورتوں کی آزادی کا مخالف بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ڈنڈا سوشلزم میں یقین رکھتا ہے اور اس کی زبان اور شاعری کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ...... دکنی شاعری کے ساتھ البتہ یہ ظلم ضرور ہے کہ یہ صرف سننے تک محدود ہے جب یہ لکھی جائے تو پڑھنے میں تکلف ہوتا ہے۔

امیر عارفی ۔ مخدوم صاحب ہمارے ادب میں (FRUSTRATION) کیوں بار بار آ رہا ہے۔ جب کہ ہمارا ملک ترقی کر رہا ہے۔ اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

مخدوم محی الدین ۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب شاعر کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق سائنٹفک نہ ہوگا تو وہ

(FRUSTRATION) کا شکار ہو جائے گا۔

ہمارے شاعروں کا ایک گروہ ایسا ہے جس نے داخلی طور پر انقلاب کا ایک تصور قائم کر لیا تھا۔ اور چونکہ ان کے لیے وہ لمحہ نہیں آیا جس کا انھیں انتظار ہے۔ اور وہ صبح نہیں آئی جس کی انھوں نے تمنا کی تھی۔ اس لیے وہ حبس فضا میں سانس لے رہے ہیں اور حبس صبح سے گذر رہے ہیں اس سے مایوس ہیں۔ اس قسم کے شاعر یا تو ۱۹۴۵ء کے زمانے کی شاعری کر رہے ہیں یا پھر کسی خیالی وادی میں گم ہو گئے ہیں۔

شاعروں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو عالمی تغیرات کے اثرات اور زندگی کا کوئی شعور نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ سے ان کی نجی زندگی میں سخت گھٹن آگئی ہے۔ اور ان کے اعصاب میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اس ذہنی گھٹن کے خول کو توڑ کر باہر آسکیں۔ لہذا ایسے شاعروں کی فکر میں قنوطیت اور تشکیک راہ پا جاتی ہے یا پھر وہ sex کے دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو چاہیے کہ وہ عوام کے قریب رہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ان کے دکھ درد اور ان کی خوشیوں کا پاس کریں بالفاظ دیگر وہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ زندگی کیا ہے تو پھر ان کا غم آگ اور خوشی شبنم بن جاتی ہے ؎

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو
گاہ ہنستی ہوئی گاہ روتی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

حیدرآباد کے پرفضا اور مصروف ترین مقام عابد شاپ پر
بالکلیہ جدید، آرام دہ اور ترقی پسند انتظامات کے ساتھ

اورینٹ ہوٹل

کی تازہ دم چائے فرحت بخش مشروبات اور خوش ذائقہ حیدرآبادی کھانوں سے لطف اٹھائیے

اورینٹ ہوٹل
عابد شاپ
حیدرآباد

پردھان منتری خشک سالی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیجئے، پردھان منتری خشک سالی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیجئے

آپ کی امداد
کی ضرورت ہے
آپ!

"ہمارا ایک ملک ہے، ہماری ایک قوم ہے۔ بہار، اُتر پردیش اور خشک سالی سے متاثرہ ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کی مصیبت ہماری مصیبت ہے آیئے ہم متحد ہو کر خشک سالی کا مقابلہ کریں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے مل بانٹ کر استعمال کریں اور مل جل کر مستقبل کو بہتر بنائیں۔"

اندرا گاندھی
پردھان منتری

پردھان منتری خشک سالی امدادی فنڈ
میں دل کھول کر چندہ دیجئے

اپنے عطیات، نقدی یا سامان
پردھان منتری خشک سالی امدادی فنڈ
کیبنٹ سکریٹریٹ، راشٹرپتی بھون، نئی دہلی ۔۴ کو بھیجئے

DA 66/F3

پردھان منتری خشک سالی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیجئے، پردھان منتری خشک سالی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیجئے

پیمان وفا

پیمانِ وفا

منظومات

لکھنے والے

تمکین سرمست
عزیز قیسی
علی احمد جلیلی
ابن احمد تاب
شمس الدین تاباں
راشد آذر
بانو طاہرہ سعید
سعیدہ عروج مظہر
برق یوسفی
وقار خلیل
رئیس اختر
غیاث متین
روف خلش
حسن فرخ
مسعود عابد
علی الدین نوید
رگھویندر راؤ جذب
ابوالخیر صہبا
سلیمان خطیب

تمکین سرمست

مدعیانِ انصاف سے

(مخدوم محی الدین کی گرفتاری پر)

یہ بھی تو ذرا دیکھو خطا دیکھنے والے
اس جرم میں نیکی کوئی پنہاں تو نہیں ہے
اے سطح بیں اک بار ذرا ڈوب کے بھی دیکھو
ظلمت میں کوئی نور پُرافشاں تو نہیں ہے
زندانِ شبِ تار کی بے نور فضا میں
محبوس کوئی صبحِ درخشاں تو نہیں ہے
انبارِ خس و تودۂ خاشاک کی تہ میں
پوشیدہ کوئی لعلِ بدخشاں تو نہیں ہے
تصویر کا اک دوسرا رخ بھی تو ہے ناداں
تخریب میں تعمیر کا ساماں تو نہیں ہے
پیغامِ سکوں تو نہیں یہ شدتِ طوفاں
پردے میں بیاباں کے گلستاں تو نہیں ہے
جس چیز نے ہمدرد کو بے درد بنایا
وہ جذبۂ ہمدردیٔ انساں تو نہیں ہے
ہاں سوچ لے ملزم کو سزا دینے سے پہلے
اس فیصلے میں ظلم کا امکاں تو نہیں ہے
کیا ظلم ہے مظلوم کو ظالم سے بچانا؟
کیا ظلم ہے حق دار کو حق اس کا دلانا؟

عزیز قیسی

میں نے گو تجھ کو دیکھا نہیں ہے مگر

(یہ نظم اس وقت کی ہے جب مخدوم طویل روپوشی کے بعد گرفتار ہوئے تھے اور جیل میں تھے۔ تذکرے اور افسانے سنے تھے۔ انھیں دیکھا نہیں تھا۔ قیسی)

گیت نے ہوش جب سے سنبھالا تجھے دیکھنے کی تمنا بسائے ہوئے
ایک مدت سے دل میں اپنے چمن تھا اک عقیدت کی دنیا بسائے ہوئے
اور سلاسل یہ کہتے تھے مجھ سے کہ تو آج بے بس ہے قیدی ہے مجبور ہے
سخت پتھر کی دیوار چلا رہی تھی کہ تو اس کے زنداں میں محصور ہے
نظم جاگیر یہ چیختا تھا تجھے میں کسی طرح بھی دیکھ سکتا نہیں
رات کہتی تھی میں آہنی - تاریک ہوں مجھ کو سورج سے اب کوئی خطرہ نہیں
میں نے دیکھا سحر کے وطن میں تجھے تو اجالے کا پرچم اڑاتا ملا
میں نے دیکھا سنورتے چمن میں تجھے تو ہر اک پھول میں مسکراتا ملا
میں نے سوکھے ہوئے کھیت دیکھے جہاں تو تمناؤں کے ہمراہ گاتا ملا
مل کے سوچا کہ یہ ہڑتال کے ہاتھ میں تو ارادوں کی مشعل جلاتا ملا
تو افق سے افق تک ہر اک دیس میں صبح نو کے ترانے سناتا ملا
میں نے گو تجھ کو دیکھا نہیں ہے مگر سینکڑوں بار دیکھا ہے میں نے تجھے
ولولوں کے جہاں میں رجز خواں جواں گرم پیکار دیکھا ہے میں نے تجھے
اور میں نے حکومت سے مڑ کر کہا اپنے ناکام ہاتھوں سے سر پیٹ لے
نظم جاگیر تو میری اس جیت پر اپنے زنداں سے ٹکرا کے دم توڑ دے
میرے شاعر سویرے کے شاعر تجھے قید کر لے کوئی آج ممکن نہیں
تو امید زمیں آرزوئے زمیں، نو بہار زمیں ارتقائے زمیں
تو بہاراں کی آہٹ سحر کی جبیں ابر نیساں کا اک درد بھرا گیت ہے
ایک ہڑتال ہے سرخ بھونچال ہے تو ندیم جہاں وقت کا میت ہے

(۱۹۵۱ء)

علی احمد جلیلی

ایک فن کار

ایک فن کار
نئے دور کی آوارہ فضا میں ابھرا
اپنے جلتے ہوئے افکار کے دامن میں لیے
پیار کی آگ میں جلتے بدنوں کی خوشبو
نفرت و طنز و حقارت کا لہو
گرد افلاس زدہ چہروں کی
ایک فن کار
نئے دور کی آوارہ فضا میں ابھرا

لڑکھڑاتے ہوئے اندھیاروں میں
سرخ صبحوں کے دہکتے ہوئے اجیاروں میں
پھولوں کی سیج پہ گاتا کبھی رخسار کے گیت
گیسوؤں کے لب گلنار کے گیت
خارزاروں میں کھلاتا کبھی زخموں کے کنول
چاک سینوں کے کنول
ایک فن کار
نئے دور کی آوارہ فضا میں ابھرا

آہنی عزم لیے
ایک اک گام پہ سلگاتا ہوا
اپنے قدموں کے چراغ
ایک اک بزم میں چھلکاتا ہوا
اپنے نغموں کے ایاغ
زر و اموال کے ایوانوں پہ دستک دیتا
کھولتا اک نئی منزل کے دریچوں کے کواڑ
ایک فن کار
نئے دور کی آوارہ فضا میں ابھرا

ابن احمد تاب

مخدوم کے پہلی بار غزل کہنے پر

داخلِ بزمِ غزل آج وہ دیوانہ ہوا
میرؔ کا دردِ دل لیے دردؔ کا عرفان لیے
بادۂ حافظؔ و غالبؔ کا پرستار آیا
مطربہ ساز اٹھا چھیڑ کوئی تازہ غزل

داخلِ بزمِ غزل آج وہ دیوانہ ہوا

جس کے آجانے سے ہوتا ہے دریکدہ باز
جس کے ہر اشک میں پوشیدہ کئی زخم کے راز
سنگ اندازوں سے اونچا رہا جس کا انداز

داخلِ بزمِ غزل آج وہ دیوانہ ہوا

جو سراپا غمِ آفاق کا دیوانہ ہے
جس کے ہاتھوں میں ابھی جہد کا پیمانہ ہے
جس کی ہر سانس میں تحریک تلنگانہ ہے

داخلِ بزمِ غزل آج وہ دیوانہ ہوا
مطربہ ساز اٹھا چھیڑ کوئی تازہ غزل

شمس الدین تاباں

"آج کی رات نہ جا"

آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
(مخدوم)

میرے محبوب ستاروں کی برات آئی ہے
میرے ارمانوں کی دولہن ترے ساتھ آئی ہے
ناچتی گاتی ہوئی آج کی رات آئی ہے
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
نغمے ہوے، آہیں ہوئیں راگ آج کی رات
مل گیا حسن و محبت کو سہاگ آج کی رات
بھاگ جاگے ہیں مرے تو بھی تو جاگ آج کی رات
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
تو پھر آئے بھی تو یہ بات نہیں آسکتی
ایسی تنہائی ہمیں ہات نہیں آسکتی
راتیں آسکتی ہیں یہ رات نہیں آسکتی
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
مدھ بھرے نینوں میں کجرارے ہوئے کاجل کی قسم
مرمریں شانوں پہ ڈھلکے ہوئے آنچل کی قسم
جانے والے تری بجتی ہوئی پائل کی قسم
آج کی رات نہ جا۔ آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے

راشد آذر

اک قدم اور

(مخدوم کے نام)

اک قدم اور اٹھایا سوئے منزل میں نے

اور پھر میں نے یہ دیکھا کہ ستارے ٹوٹے
ایک لمحے کو سیاہی کا جگر چیر گئے

رات بھر رات ہے، کتنے ہی ستارے ٹوٹیں
رات کا کام اندھیرے کو جنم دینا ہے
آفتاب ابھرے تو ظلمت کا بھرم ٹوٹے گا

صبح کے چہرے پہ شبنم کی نمی ہو کہ نہ ہو
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں چمک تو ہوگی
ہر چٹکتے ہوئے غنچہ میں مہک تو ہوگی

میرا بچہ تو نہ بھٹکے گا اندھیرے میں کبھی
میں شفق چھونے کی اس آس میں جیتا ہوں ابھی

بانو طاہرہ سعید

سنہرا خواب

جشنِ مخدوم کی رنگیلی رات
ذہن میں اس طرح ابھرتی ہے
جیسے قوسِ قزح کی یاد آئے
خوشبوئیں آئیں اڑ کے گلشن سے

بزمِ شعر و سخن نرالی تھی
جعفری صدر، میزبان مخدوم
سحرِ ساحر، فضا میں چھایا ہوا
دل فریب و حسیں نگار کی بات
ابنِ احمد کا دل نشیں نغمہ
دکنی نظمیں خطیب کی نکھی!
رس میں ڈوبی رباعیات اریب
آبِ انگور سے ڈھلے اشعار
پھول کھلتے ہوئے کنول کے کہیں!

اردو ہندی کا امتزاج جمال
حیدرآباد کا سنہرا خواب!
جشنِ مخدوم نامدار کی رات
یاد آتی ہے مجھ کو رہ رہ کر
مسکراتی ہوئی بہار کی رات

سعیدہ عروج مظہر
(کراچی سے)

نقش ہے حیراں حیراں

ذوق میں شوق کے رنگوں کی شفق جب گھل جائے
افقِ ذہن پہ یادوں کی کمانی کھل جائے
وادیٔ فکر میں انوار کی بارش برسے
نخلِ احساس کا ہر برگ و ثمر تک دھل جائے
جیسے پردے سے ہٹیں، یادوں کے لشکر نکلیں
لے پہلو میں چراغاں کا وہ منظر نکلیں

جگ کئی بیت گئے، بات گئی، رات گئی
گلستاں چھوڑ کے ساون گئے برسات گئی
محفلیں لٹ گئیں، دھندلا ہے تصور باقی
نغمہ گر چھوٹ گے لذت نغمات گئی
ہم کہاں ہیں، یہ ہیولا ہے ہمارا رقصاں
رنگ تصویر کہاں، نقش ہے حیراں حیراں

"جشنِ مخدوم" مناؤ گے تم اب اہلِ دکن
جگمگائیں گے چراغاں سے در و بام وطن
کیا بتائیں دلِ مغموم پہ کیا گزری ہے
بیتے لمحوں کے تصور سے ہے آنکھوں میں جلن
ماحصلِ عمرِ بہاراں تھے چمن میں ٹھہرے
بستے وہ لوگ کہ جو ملکِ دکن میں ٹھہرے

برق یوسفی

شمعِ منزل

شہرِ دل میں ہے تجلی ترے نام سے
کوچۂ یار سے دار تک تیرا نام!
تیرے شعروں نے بخشی نئی زندگی
تیرے آدرش میں ہیں زندگی کا نظام

زندگی تیری خورشیدِ نو کی کرن
شاعری میں تری، چاندسا بانکپن

اک گلِ تر کے کانوں میں تو نے کہا
رات کے درد کا صبح انجام ہے
گلشنِ زیست میں کوئی گلچیں نہ ہو
جبرِ گلچیں مٹے تیرا پیغام ہے

راستوں کے لیے شمعِ منزل ہے تو
شمعِ منزل رہے ضوفشاں کو بہ کو

وقار خلیل

صلیب بردوش

قلب کے اس شہرِ آرزو میں
اُسی کی بوئے وفا کا مظہر
وہ ایک شاعر وہ اک سخنور
حیاتِ نو کا وہ اک گُلِ تر
سحر کے قصے سنا رہا ہے
کلی کلی کو جگا رہا ہے
روش روش مسکرا رہا ہے
چمن چمن سبزہ و بہاراں
نظر نظر ہے ہجومِ یاراں
نفس نفس بوئے گُل خراماں
روش روش جشنِ دل نگاراں
بساطِ فکر و نظر کی ہر رہ گزر پہ ہمراہ چارہ گر ہے
صلیب بردوش دیدہ ور ہے
یہ رہنما کتنا معتبر ہے
خزاں سے کہیو ادھر نہ آئے
یہ رہ گزر، میری رہ گزر ہے
شعورِ فن کی نئی ڈگر ہے
یہ چاندنی کا حسیں نگر ہے!

...یس اختر

ایک صدا

اک صدا جھومتی کرن کی طرح
افقِ زندگی پہ — لہرائی
وقت کے منجمد اندھیروں میں
صبحِ نو کا خیال جاگ اٹھا
ریشمی خواب سرسرانے لگے
دردِ انساں نے لی نئی کروٹ
مدتوں کا طلسم ٹوٹ گیا
اک صدا جھومتی کرن کی طرح
دیدہ و دل کے پاس آ ٹھہری
پیار کے نیم وا دریچوں سے
دور تک جھانکتے حسیں چہرے
فکر و فن کے نئے اجالوں کا
نکہت و نور کی فضاؤں میں
کر رہے ہیں کسی کا استقبال
اک صدا جھومتی کرن کی طرح
کتنے ذہنوں سے آ کے ٹکرائی
ہر اندھیرا پگھل گیا — آخر
دل دھڑکنے لگے وفاؤں کے
دشت و کہسار نے سلام کیا
کاروانِ سحر کی راہوں میں
جگمگائے ہزار نقشِ قدم
زندگی نے ہزار بار کہا
لو مرے غم کا چارہ گر آیا

غیاث متین

بولتی لکیریں

کچھ آڑی ترچھی لکیریں ہیں کچھ ستون نما
انہیں لکیروں میں
رنگوں کی آمیزش
رنگوں میں بھی ہے ہر اک رنگ کی زبان جدا
کہیں خیال کہیں خواب اور کہیں تعبیر

اداسیوں کی کہر سے پرے ابھرتی ہے
ہر ایک لفظ کی تصویر چاندنی اوڑھے
نظر میں سرخ سویرے کی دھیمی آنچ لیے
وہ دھیمی آنچ کہ شیشے پگھل کے جڑ جائیں

ہے بات ایسی کہ جیسے شگفتگی گل کی
تو لہجہ ایسا ہے جیسے کھنکتے جام ہنسیں

"کمان ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل"
تو نظم ہے کسی تیھر میں نقش آئینہ
اس آئینے میں جہاں
سبھی دلوں کی تمنا، سبھی دلوں کا سکوں
سبھی دلوں کا ملال

ہے ماورائے زمان و مکاں یہ آئینہ
جو آنکھ ہو تو پڑھو
جو سن سکو تو سنو
اس آئینے میں لرزتی لکیریں بولتی ہیں
وہ آڑی ترچھی لکیریں ہوں یا ستون نما
انھیں لکیروں میں
کہیں خیال کہیں خواب اور کہیں تعبیر

رؤف خلش

خوشبو کا پجاری

برسوں سے یہی دیکھا ہے بہتوں سے سنا ہے
وہ حوصلہ ساماں کر ہے دیوانۂ غم بھی
اک گھور اندھیرے میں شعاعوں کو بکھیرے
سو اندر دھنش اپنی صداؤں کے بنائے
دھیمے لب و لہجے میں کبھی ہم سے کہے وہ
"کیوں دل کی شرافت پہ کوئی حرف بھی آئے
اس دورِ ہوس میں نہ کرو پیار کی باتیں"
اور اس کی نگاہیں کبھی کہہ جاتی ہیں چپ چاپ
ہم شعلہ فشانی سے بھی واقف ہیں حریفو
بے سود ہیں "تاراجیٔ گلزار کی باتیں"

برسوں سے یہی دیکھا ہے، بہتوں سے سنا ہے
وہ گرم سفر ہے رہِ آفاق میں جیسے
شمشیر کی جھنکار میں ہو موج کی رفتار
ہر موڑ پہ گھائل ہے مگر پھر بھی ہے شاداں
پیچ و خمِ گیتی ہو کہ دلدار کا کوچہ
مہتاب کی محفل ہو کہ بزمِ رسن و دار

زخموں کی دوا مانگنے آئے ہیں کئی دل
دھرتی کے ہر اک دکھ نے مچایا ہے بہت شور
بہتیرے سنیں گے اسے دیکھیں گے ابھی اور
دو چار قدم شوق کی منزل سے بھی آگے
پھر جرأتِ گفتار کا ہر پھول مہک جائے
پھر صبر کا پیمانۂ لبریز چھلک جائے
تندیٔ شباب اور تپاں اور تپاں ہو
دلداریٔ عزم اور جواں اور جواں ہو

حسن فرخ

دھنک کا خالق

میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے کئی زاویوں سے
صاف، مانوس لکیریں ہیں بہت سادہ نقوش
فقط احساس کی لہریں ہیں فقط پیار کے رنگ
غمِ دوراں، نہ غمِ دل، نہ غمِ یار کے رنگ
نہ ضرورت ہے پسِ منظر کی
بس یہی سوچ کے کھینچی تھیں لکیریں میں نے
مگر اس چہرے پہ اک شعلہ سا لہرانے لگا
کاسنی رنگ کا اک نقطہ ابھر آنے لگا
میں نے اس شعلے کو اس کاسنی نقطے کو
لکیروں میں سمٹ جانے دیا
اب جو دیکھا
تو اسی چہرے پہ انوار کی شبنم برسی
ان لکیروں پہ کسی پیار کی شبنم برسی
نور کی، پیار کی بارش کو پیالوں میں
لکیروں کی انڈیلا میں نے
پھر دھنک پھوٹ پڑی چہرے پہ

جھلملانے لگے رنگیں سائے
نظر آنے لگے ٹوٹتے ہوئے عکس
میں نے ان عکسوں کو، ان سایوں کو
جو چھوٹے تھے دھنک بن کے جو اس چہرے پر
یوں ہم آہنگ کیا
سمٹ آئیں وہی مانوس لکیریں وہی سادہ سے نقوش
وہی ہونٹوں کا تبسم، وہی پیشانی کا نور
ایک اک رنگ وہی
ایک اک نقش وہی
ایک اک جذبہ وہی، جذبوں کا اظہار وہی
اس کی تاثیر وہی چشمِ جنوں بار وہی

بے نیازی میں لپٹی ہوئی پرتیں کھولیں
بند احساسِ انا سے جو تھیں آنکھیں کھولیں
تو یہ دیکھا کہ وہاں
صاف، مانوس لکیریں ہیں بہت سادہ نقوش

مسعود عابد

آتش نوا موسیٰ

شعر کا بانکپن تیری تنظیم میں
ہاتھ باندھے ہوئے سرنگوں
نغمگی تیرے اسلوب میں
تیرے اشعار کے ایک اک لفظ میں
گھُل گئی
تو کہ آتش نوا
تیری آواز سے
کتنے دیپک جلے
کتنی شاموں کی دھندلاہٹیں
سرمئی سرد کجلاہٹیں
تیرے تخئیل کے نور سے دُھل گئیں
شعبدوں کی سیہ ناگنیں
ذہن کے گوشہ گوشہ میں جو
بس گئی تھیں کبھی
ساری اوجھل ہوئیں
تیرا انداز فن
شعر کا بانکپن معجزہ بن گیا
دستِ موسیٰ کا جیسے عصا بن گیا

علی الدین نوید

نورِ سحر

وہ ایک انساں!
دکن کے ماتھے پہ علم و فن کا دمکتا سورج
وہ نسلِ نو کا عظیم قائد
کہیں مسیحا کہیں مجاہد!
عظیم شاعر
کہ جس نے شعروں کے بانکپن سے
حیاتِ نو کا نظام بدلا
کلی کلی کے فسردہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ کا نام لکھا
گلوں کے رخ پر دھنک کا غازہ
چمن چمن کو بہارِ نو کا پتہ بتایا
وہ اک مسیحا
کہ جس کی سانسوں میں گھل گئی ہے
ہر ایک انساں کے دل کی دھڑکن
سسکتی آنکھوں کے دریچوں سے لہو کے تازہ گلاب چنتا
دلوں کے زخموں کے چاک سیتا
گزر رہا ہے وفا کی پُرپیچ رہگزر سے
صلیبِ دوراں کا بوجھ اٹھائے
قدم قدم پر لہو سے تازہ دیئے جلائے
وہ اک اجالا!
اندھیری راتوں کی وادیوں میں
مثالِ "نورِ سحر" ہے رقصاں
نئے سویرے کی جستجو میں
چلا ہے چلتا ہی جا رہا ہے
نہ جانے اس کی کہاں ہے منزل!؟

رگھویندر راؤ جذب

دعا

ہر شخص کا ہر فرد کا پیارا مخدوم
ہر عاجز و بیکس کا سہارا مخدوم

مخدوم کی دنیا کو بڑی حاجت ہے
سو سال رہے اور ہمارا مخدوم

ابوالخیر صبا

پنکھڑیاں

کلیاں چٹکی ہیں پھول مہکے ہیں
سرو و شمشاد کی قطاریں ہیں
جس طرف دیکھیے چمن میں آج
جشنِ مخدوم کی بہاریں ہیں

خود بخود پاؤں بڑھتے "سرخ سویرے" کی طرف
کس لیے نظریں اٹھی ہیں "گلِ تر" کی جانب
ولولے، حوصلے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
کوئی دیکھے تو ذرا قلب و جگر کی جانب

جشنِ مخدوم ہے، پینے کو تو مل جائے گا
چاک اپنے بھی گریبان کا سل جائے گا
ایک مدت سے تو چپکا نہ تھا غنچہ دل کا
آج کی رات بہرحال وہ کھل جائے گا

سلیمان خطیب

لوک دوانہ

جاکو میدک[1] گھر گھر پوچھا بانکی ترچھی ٹوپی والا
من کا موجی ننھا ساتھی مخدوم دوانہ کہاں ہے جی

دل میں چھالے آنکھ میں آنسو پاؤں میں کانٹے ہاتھوں میں پیالا
مسجد مندر اُگے[2] پیچھے ایسا دوانہ کہاں ہے جی

چمپا چنبیلی دونا مروہ گیندہ سبزہ جوہی بیلا
جاکو جس کے گیت میں مہکے سائیں سیانہ کہاں ہے جی

بھاگ نگر کے بانکے لوگاں لے کو بھاگے بنسی والا
باپ بچارا پیٹ کا مارا ٹھاؤ ٹھکانہ کہاں ہے جی

بھیگے پلکاں دیکھے ساجن نرم کلیجہ چھننی چھننی
مُنڈی تلے جھکے بیٹھے حال اٹھایا لوک دوانہ کہاں ہے جی

۱ حیدرآباد کا ایک ضلع ۲ آگے ۳ بھوکے

With best compliments from ;

TAJ MAHAL GROUP OF HOTELS

Leading Vegetarian Hotels in the Twin Cities of
HYDERABAD AND SECUNDERABAD, (A. P)

TAJ MAHAL HOTEL

88, Sarojini Devi Road, Secunderabad.

Grams :- "COURTESY"

Phones :- 73171 (Office)
70105-3 lines
connecting all rooms.

TAJ MAHAL HOTEL

King Kothi Road, Abid Road, Hyderabad.

Grams :— "COURTESY"

Phones :— 35591 (Office)
38451-10 lines
connecting all rooms.

TAJ MAHAL CAFE

University Road, Himayatnagar, Hyderabad.

Grams :— "TAJ CAFE"

Phones :— 33466 (Office)
32136-3 lines
connecting all rooms.

صب

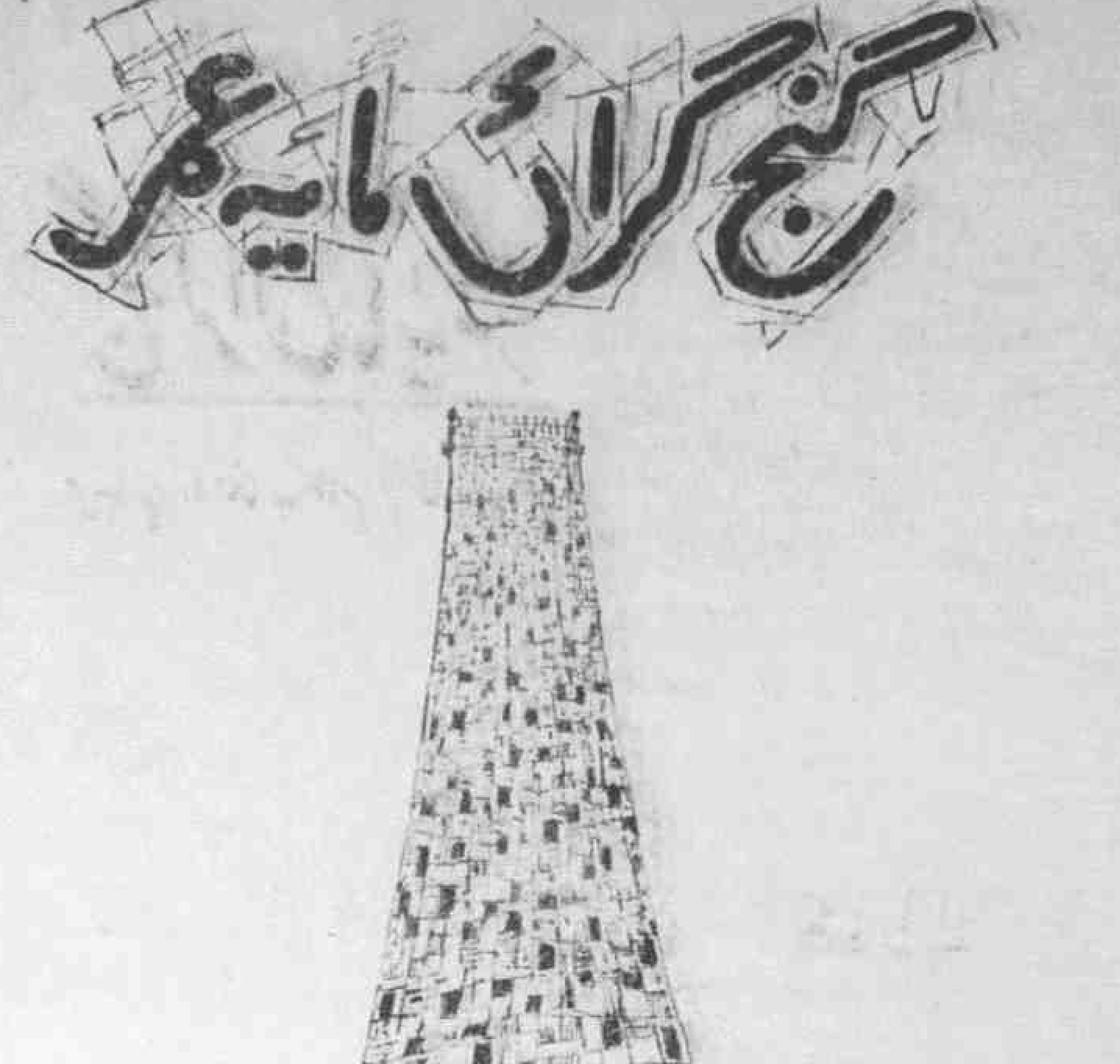

گنجِ گراں مایۂ عمر

دیباچہ، انتخابِ کلام، انتخابِ نثر

لکھنے والے

سبط حسن
پرکاش پنڈت
مخدوم محی الدین

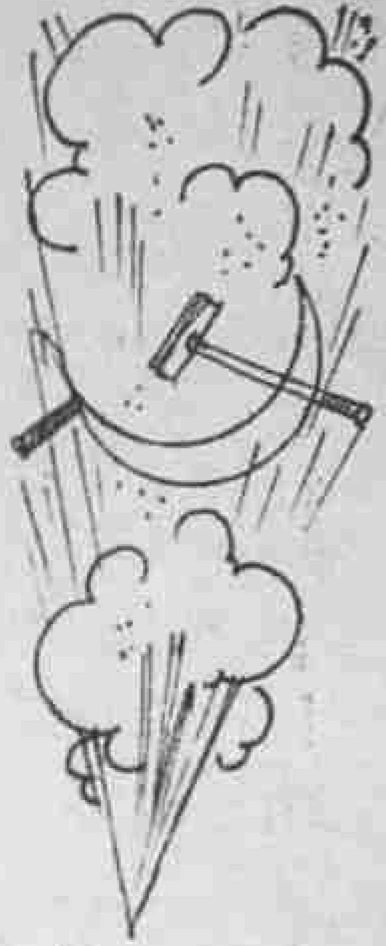

"سُرخ سویرا" کا دیباچہ

سبطِ حسن

مجبی مخدوم

● مجھے آج نہ جانے کیوں آٹھ سال پہلے کی برسات یاد آرہی ہے جولائی کی شام حیدرآباد کے ایک وسیع ہال میں بزمِ مشاعرہ، میں محفل کے لیے اجنبی محفل میرے لیے اجنبی کرا ہے میں تم نے اپنی ایک نظم سنائی "یہ سیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی" یہ نظم "طور" کے عنوان سے ایوان مرحوم میں اس سے پہلے چھپ چکی تھی، اور مجاز نے اور میں نے اسے یادش بخیر علی گڑھ میں کئی بار لذت لے لے کر پڑھا بھی تھا لیکن نظم لکھنے والے سے اب تک ملاقات کی نوبت نہ آئی تھی۔ بارے یہ خواہش بھی پوری ہوئی نظم پڑھتے پڑھتے جب تم اس مصرعے پر پہنچے تھے کہ "خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے" تو میں نے قاضی صاحب[۱] کہا تھا دیکھیے ہمارے نوجوان شاعروں میں محبت کا کتنا پاکیزہ اور معصوم تصور پیدا ہو رہا ہے اور انھوں نے جواب دیا تھا کہ "خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جس کا خدا بھی اتنا مشفق اور مہربان ہے کہ محبت کے اس معصوم مظاہرے پر خوش ہوتا ہے۔" اسی رات میری اجنبیت دور ہوگئی ہم دونوں پہلی بار ملے اور دوست بن گئے۔

سوچتا ہوں اس آٹھ سال میں تمھاری شاعری نے کتنی منزلیں طے کی ہیں، کتنے دوراہوں سے گزری ہے؛ ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے کہ اس آٹھ سال میں ہمارے سماج نے کتنی منزلیں طے کی ہیں، کتنے دوراہوں سے گزری ہے، کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور آج ذہنی پستی اور اخلاقی شکست کے کس گرداب میں پھنسی ہوئی ہے سوسائٹی کے اس کرب کو اس بے چینی اور جدوجہد کو بڑے سے بڑے شاعر کا قلم بھی پوری قوت سے بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جن کے

---

۱ قاضی عبدالغفار مرحوم

باخبر زمانے کی نبض پر رہتے ہوں اور جو وقت کی رفتار تیز کرنے پر قادر نہ سہی لیکن اس سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوں اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوں۔ اسی لیے تو مجھے تمہارے اشعار بہت پسند ہیں۔

مخدوم! بتاؤ زندگی سب سے بڑی حقیقت ہے یا زندگی کا ارتقاء۔ تم کہوگے زندگی اور اس کا ارتقاء دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں لیکن تم ان ادیبوں اور آرٹسٹوں کو کیا کہوگے جو زندہ ہیں لیکن زمان و مکاں کی تمام ذمہ داریوں سے بے نیاز ہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی بڑھ جائے۔ آلامِ حیات کتنی شدت اختیار کرلیں لیکن انہیں اپنی داستانِ غم کے اوراق کا آموختہ پڑھنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ کیا یہ لوگ اپنے آرٹ کے بارے میں مخلص نہیں۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے شاعری کرتے ہیں کہ انہیں کچھ اور آتا ہی نہیں یا اشعار موزوں کرنا ان کی عادتِ ثانیہ بن گئی ہے۔

خیر چھوڑو اس قصے کو یہاں تو ذکر تمہاری دس سالہ شاعرانہ زندگی کا تھا۔ اس کا فیصلہ تو مورخ ادبی کرے گا کہ تمہاری شاعری نے ہندوستانی نوجوانوں ــــ بالخصوص دکن کے نوجوانوں ــــ کے فکر و عمل پر کیا اثر ڈالا ہے لیکن ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمہاری شاعری عصرِ حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ضرور رہی ہے۔ تمہارے فنی شعور میں ہر جگہ سماجی شعور کی روح ضرور تڑپتی نظر آتی ہے۔

ہمارے اکثر ادیبوں میں بعض خیالات مشترک ہیں۔ غلامی کی لعنتوں سے بغاوت کا احساس اور پھر آزاد اور روشن مستقبل کا دھندلا سا تصوّر۔ یہ ایک مثلث نما محور ہے جس پر پچھلے دس سال سے ہماری سماجی زندگی اور ہمارے فنونِ لطیفہ دونوں گھوم رہے ہیں۔ اس مثلث کا ایک زاویہ ہمارے اکثر نوجوان شاعروں کا منظورِ نظر ہے روایتی قدروں سے بغاوت کا زاویہ۔ ہر نوجوان جس نے عشق کیا ہے اور نامراد ہوا ہے جانتا ہے کہ سماج کی روایتی قدروں نے اس کی عشقیہ زندگی پر کیسی کیسی ضربیں لگائی ہیں۔ خاندان کی مخالفت، بدنامی کا ڈر، اخلاقی جرأت کی کمی، طبقاتی اونچ نیچ کا احساس غرض نہ جانے کیسے عناصر ہیں جن کی بدولت محبت کا دل خون ہوا ہے۔ پچھلے دس بارہ سال کے ادبی رسالوں اور مجموعوں کو دیکھ جاؤ تمہیں سیکڑوں ایسی نظمیں ملیں گی جن میں ان سماجی پابندیوں کے خلاف دل کا بخار نکالا گیا ہے ان دنوں کی یاد تازہ کی گئی ہے جب زندگی سرشار اور شادکام تھی۔ ۱۹۳۵ء کے دور کی تمہاری نظمیں محرومی کے احساس سے خالی نہیں ہیں اور خالی کیسے ہوتیں جوانی کا آغاز عشق کی ابتداء جذبات کی شدت اس پر واردات قلب کو موزوں کرنے کی صلاحیت پھر تیر کیوں کر خطا کرتا۔ "انتظار" کی گھڑیاں گزر گئیں۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

اور حسن کی خلاقی تو دیکھیے کہ ع بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی ــ اور جب وہ مدت کے انتظار کے بعد آیا تو عاشق پیشہ شاعر نے "سجدہ" کیا اور جب وہ چلا گیا تو شاعر کو وہ گھڑیاں یاد آنے لگیں، ہم بولا۔

ا

ملے تھے، یوں باتیں کی تھیں۔ یوں پیار کیا تھا، یوں کھیتوں میں پانی کے کنارے بیٹھے تھے لیکن ؎

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

مگر تمھاری ان نظموں میں شکوہ ہے کہ یا دماضی کی تلخی اور ذہنی ملالت نہیں جھلکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ان تجربوں سے خوش ہے زندگی کے ان واردات سے نہ نفرت کرتا اور نہ ان پر شرمندہ ہے بلکہ ان کو یاد کرتا ہے اور لذت لیتا ہے۔

مجھے اکثر نوجوان شاعروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ محبت کا عجیب و غریب معیار قائم کیے ہوئے ہیں ان کے خیال میں اس انقلابی دور میں "ہمارے لیے" یعنی "مردوں کے لیے" یہ مناسب نہیں کہ عورتوں کی محبت کے "خیال" میں پھنسیں۔ یہ عمل کا وقت ہے ہاں انقلاب لانے کے بعد جب فرصت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ اسی لیے بعض شاعر اپنی محبوبۂ دلنواز کو بڑے پندار اور پدرانہ شفقت سے نصیحت کرتے ہیں تم گھر لوٹ جاؤ کیوں کہ تم میں مجھ جیسے انقلابی کے پہلو بہ پہلو چلنے کی طاقت نہیں ہے۔ البتہ جب مجھے انقلاب سے فرصت ملے گی تو میں آجاؤں گا بیچارے بر خود غلط شاعر — اس کے برعکس تمھارا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ میں ان کی جوانی ساتھ ہے

شاید تمھیں یرقان کبھی نہیں ہوا؟ گھبراؤ نہیں میں طبابت نہیں کرنا چاہتا میرا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ تمھارا مشاہدہ، تجربہ اور زاویۂ نظر کبھی کسی ایسی ذہنی بیماری کا شکار نہیں ہوا جس کا اثر تمھاری شاعری پر پڑتا۔ تمھارا عشق اور زندگی کا تصور اور سماجی کشاکش کا شعور سبھی صحت بخش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فاشزم کی امن شکن اور تہذیب سوز آندھیاں چلنے لگیں تو تم نے بہتوں سے پہلے اس آنے والے خطرے کو محسوس کر لیا مجھے وہ دن یاد ہے جب حبشہ پر مسولینی کے حملے کے بعد تم بڑے جوش میں آئے تھے اور اپنی نظم "جنگ" مجھے سنائی تھی ؎

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ

غالباً یہ تمھاری پہلی سیاسی نظم تھی اور فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی پہلی صدائے احتجاج لیکن اس نظم کے آخری اشعار سے وہی بے بسی اور بے چارگی ٹپکتی ہے جو اس وقت ہماری پوری قوم پر طاری تھی۔ فاشزم اپنی تباہ کاریوں سمیت بڑھ رہا تھا اور یورپ کی سامراجی طاقتیں — برطانیہ اور فرانس — فاشزم کی رضاجوئی میں لگی تھیں اس بھوکے دیو کو انسانیت کا خون پلا پلا کر مضبوط کر رہی تھیں۔ ہندوستانی قوم حبشہ کی آزادی کی حامی تھی اس کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کے باعث مجبور تھی اس میں اتنی طاقت

نہیں تھی کہ آزاد ہو کر فاشزم کا مقابلہ کرتی ۔

اسی بے بسی کا ردعمل تھا جو "مشرق" میں ظاہر ہوا، اور پوری تلخی کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے جو مشرق کی تاریخی عظمت کا گن گاتے تھے تم نے مشرق کو ایک نئے روپ میں پیش کیا اور کہا دیکھو یہ ہے تمہارا مشرق ؎

جہل فاقہ بھیک بیماری نجاست کا مکاں
زندگانی تازگی عقل و فراست کا مساں
پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول
ایک مرگِ بے قیامت، ایک بے آواز ڈھول
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خواب اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

لیکن شاعر مایوس نہیں ہے وہ جانتا ہے کہ ہر رات، وہ شبِ ہجراں ہی کیوں نہ ہو، اپنے بطن میں ایک نئی صبح کی پرورش کرتی رہتی ہے اور اسے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ ؎

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

کیسے ؟ کب اور کہاں ؟ یہ تو اسے خود بھی نہیں معلوم لیکن وہ انسانی ارتقا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ عوام اور ان کی بڑھتی ہوئی قوت پر اعتماد کرتا ہے ۔ شاید اسی بنا پر وہ اس خیال کو اس مستقل پسندی کو اکثر دہرایا کرتا ہے اور جب بے بسی کا احساس تیز ہوتا ہے، ذہنی بغاوت کو تعمیر کی راہ نہیں ملتی، غلامی کی زنجیریں زیادہ کسنے لگتی ہیں یا "شوق کی بلندی اور ہمت کی پستی" میں تصادم ہونے لگتا ہے تو اس آگ کو بجھانے کے لیے جو سماجی اور سیاسی پابندیوں کے باعث شاعر کے دل میں بھڑک رہی ہے وہ نراج یعنی دہشت پسندی ـــ ادبی دہشت پسندی ـــ کا شکار ہو جاتا ہے، ستارہ تخریب کی قصیدہ خوانی کرنے لگتا ہے ؎

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشہ ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

کتنی گھن گرج ہے اس شعر میں! کتنا زور ہے، کتنی پیغمبرانہ خود اعتمادی ہے مگر جذبات کے اس سیلاب میں جنوں کی حد تک بڑھے ہوئے خلوص کے طوفان میں عقل کی کشتی کا دور دور پتہ نہیں۔ "موت کا گیت" بڑا سامعہ نواز ہے، سن کر خون میں ابال پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن جب اسے خرد کی کسوٹی پر کسو تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موت سے لذت لے رہا ہے ۔ تمہاری اس دور کی کئی نظموں کا مرکزی ـــ اگر میں غلطی نہیں کرتا ـــ تو یہی ادبی دہشت پسندی ہے ۔ لیکن تمہاری شاعری کا یہ دور زیادہ دن تک نہیں رہا ۔ عقل اور جنون میں جلد ہی ہم آہنگی ہو گئی۔ "قمر فالباً اس امتزاج کی یادگار ہے ۔ دو تین شعر

سنو جن میں حسن کے دو پہلو زندگی کے دو رخ دکھائے گئے ہیں ۔

حیات نو مجھے آواز دے رہی ہے سنو

دبی زبان میں کچھ گنگنا رہا ہے قمر

اداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے

کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر

"کہاں ہے ساقیٔ گلفام کہاں ہے سرخ شراب"

فسانۂ غم گیتی سنا رہا ہے قمر

یہ وہ زمانہ تھا جب نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ سارے ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ عوامی قوتیں ابھر رہی تھیں، طبقاتی جد و جہد بڑھ رہی تھی۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے تھا آن بان کے ساتھ فضا میں بلند کیے جا رہے تھے۔ کسان اور مزدور اپنے حقوق منوانے کے لیے اٹھ رہے تھے اور آرزوئیں اور ارمان جنھیں ہندوستانی قوم نے مدتوں خون جگر پلا پلا کر پالا تھا اب پروان چڑھنے والے تھے۔ غالباً انھیں حالات سے متاثر ہو کر تم نے کئی قومی نظمیں لکھیں جن میں مجھے "ہندوستان کی ہے" سب سے زیادہ پسند ہے شاید اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ بعض بڑی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ طلبا کے جلسے اور ان میں تمھارا اس نظم کو کورس کی شکل میں گانا ایک سماں بندھ جاتا تھا ؎

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردار آزادی

وطن کا پاسباں وہ تیغ جوہر دار آزادی

انھیں دنوں کسان اور جاگیردار کی کشمکش آقا اور غلام کی کشمکش پر تم نے ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی جس کا عنوان اب تو دھواں ہے لیکن اس وقت کچھ اور تھا۔ اس نظم کی شان نزول اور اس کا عنوان میرے سوا بہت کم لوگوں کو معلوم ہے یہ راز، راز ہی رہے تو اچھا ہے ؎

ہاں وہیں میرے دل زار نے یہ بھی دیکھا

ہاں میری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا

خون دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں

ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

لیکن بہت دن نہ گزرے تھے کہ میت کے دھوئیں پر جنگ کے بادل چھانے لگے اور یورپ کی فضا تیرہ و تار ہو گئی۔ رجعت پسند طاقتیں جواب تک سوویت یونین کو تہ بہ کر جانے کی فکر میں لگی ہوئی تھیں خود ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ سرمایہ داری نظام سخت بحران میں مبتلا ہو گیا اپنے داخلوں سے اپنی توسعات خو ہے تھا۔ "زلف چلیپا" کے دو شعر سنو ؎

زر گری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچہ میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے
برہمی زلفِ چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

سامراجی جنگ کے دور میں مشکل سے آدھی درجن ایسی نظمیں کہی گئی ہوں گی جن سے اس جنگ کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہیں تم نے اس دور میں غالباً تین چار نظمیں کہی ہیں۔ "زلف چلیپا" "سپاہی" اور "رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری"۔ "سپاہی" میں سپاہیانہ شان نہیں نہ "جنگجوئیت" ہے اور نہ خود اعتمادی الٹے اتنی افسردگی ہے۔ پھر بھی اس کی سادگی اور استعارے اور محاکات کی ندرت قابلِ داد ہے ؎

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جنگ کا ایسا نقشہ نظر سے بہت کم گزرا ہے۔

فنی اعتبار سے "رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری" میرے خیال میں تمہاری بہترین نظموں میں سے ہے۔ افسوس ہے کہ وہ نظم اس وقت یہاں موجود نہیں البتہ آخری شعر یاد ہے ؎

رات کے ہاتھ پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

ان فنی موشگافیوں سے قطع نظر کرکے تمھیں ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں تمھیں معلوم ہے کہ وہ کونسی نظم ہے جس نے تمھیں ہندوستان کے عوام کا ایک محبوب اور مقبول شاعر بنا دیا ہے۔ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس نظم کا لکھنے والا کون ہے۔ لیکن جلسوں کی جو روئداد یہاں آتی ہے اس میں لکھا ہوتا ہے کہ جلسے کی کارروائی "یہ جنگ ہے جنگِ آزادی" سے شروع ہوتی ہے جسے پانچ لڑکوں کے ایک جتھے نے، دس لڑکوں نے مل کر گایا شاید خود نامہ نگار کو بھی اس کی خبر نہیں کہ یہ نظم مخدوم کی ہے۔ قبولِ عام کی یہ سند ہزاروں ادبی تنقیدوں پر بھاری ہے میں نے خود ایسے کئی جلسوں میں شرکت کی ہے اور جب گانے والوں کی ٹولی اس بند پر پہنچی کہ ؎

لو سرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانا گاتا ہے آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

تو اکثر ایسا ہوا کہ جلسہ کے مختلف گوشوں سے یہی مصرعے دہرائے گئے اور سننے والے خود سنانے والوں میں بدل گئے۔

پرسوں ہم نے استالین کی ۷۰ ویں سالگرہ جانتے ہو کس طرح منائی؟ تمہاری شاہکار نظم "استالین کی آواز" پڑھ کر ـــــ اس نظم میں تمہاری شاعری اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ـــــ اپنے پیار، خلوص، اپنی برجستگی ہوئی ... صداقت پسندی اور خود اعتمادی ـــــ "جلوہ افروز" ہو گئی ہے۔ تمہاری یہ نظم انقلابی حقیقت پسندی کی بہت اچھی مثال ہے۔ پڑھو تو سارے بدن میں بجلی سی دوڑ جاتی ہے، قوت ارادی انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور دل تخیل کے بازوؤں پر پرواز کرنے لگتا ہے۔ ان مصرعوں میں ہم کو پوری زندگی کا پیام دیا گیا ہے ؎

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی ہوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ ہوں؟

کل ایک صاحب سے تمہاری شاعری پر بحث ہوئی انھیں تمہاری فنی خامیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ میں نے کہا آپ کا ارشاد بجا و درست، مخدوم الفاظ کے انتخاب میں احتیاط نہیں برتتے، بعض اوقات بندشیں ڈھیلی ہوتی ہیں محاورے بھونڈے ہوتے ہیں ان خامیوں کے باوجود آپ کو مخدوم کی جدت فکر ادبی صداقت اور خلوص اور خود اعتمادی سے تو انکار نہیں ہو سکتا ہے تو اُس کے دس و سال کا حاصل ہے فنی خامیاں تو خشک پتیوں کی طرح تھوڑے دنوں میں خود ہی جاتی رہیں گی۔

تمہارا

سبط حسن

(بمبئی ۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء)

عمیق حنفی کی نظم

سندباد

اردو شاعری کے امکانات روشن کرنے والی، روایت اور فنی امتزاج پیش کرنے والی، فکر و فن، موضوع اور ساخت کے اعتبار سے صحیح معنوں میں طویل نظم جو کثرت میں وحدت کی جلوہ نما ہے شائع ہو گئی ہے۔ ناشر عبدالحمید حنفی۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

۱۴۴ گاندھی پارک کالونی۔ اندور

ذوق جمال

(عنوان چشتی کی غزلوں کا معیاری انتخاب)

کتابت و طباعت خوبصورت، کاغذ بہترین مجلد معہ رنگین گرد پوش

قیمت: صرف تین روپے

(ملنے کا پتہ)

سیدہ اختر "اردو سماج"

(رورل انسٹی ٹیوٹ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵)

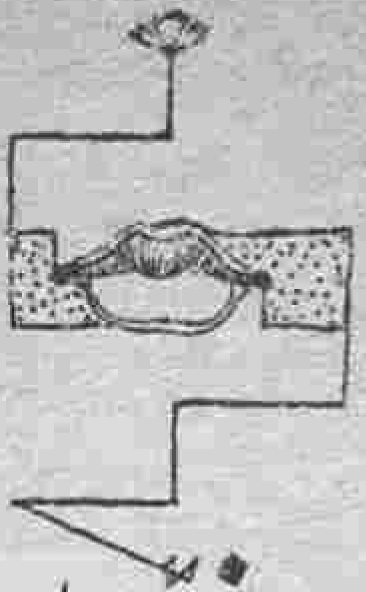

پیش لفظ

(انتخاب کلام :- ہندی رسم الخط میں)

مطبوعہ راجپال پبلشرز۔ دہلی

پرکاش پنڈت

● "مخدوم ان دنوں انڈر گراونڈ ہیں۔ مخدوم ان دنوں جیل میں ہیں، مخدوم پر ہنسا دوارا کرانتی لانے کا آروپ لگایا گیا ہے۔ مخدوم حیدرآباد اسٹیٹ اسمبلی کا رکن چن لیا گیا ہے؟ مخدوم نے ایک جلسے میں دو گھنٹے تک بھاشن دیا اور جنتا نے اسے کندھوں پر بٹھا کے اس کا جلوس نکالا ہے"

یہ ۱۹۴۲ سے ۱۹۵۲ء تک کا کال تھا جس میں مخدوم کے سمبندھ میں ادھک تر اسی پرکار کے سماچار ملتے تھے۔ اور یہ سماچار کبھی کبھار ہی سننے میں آتا تھا کہ اس نے ایک نئی نظم بھی لکھی ہے۔ میرے اس لیکھ کا ودشے مخدوم کے سامایک جیون اور اس کی شاعری تک سیمت ہے۔ لیکن میں شاعر مخدوم اور راج نیتک مخدوم کے بیچ کوئی وبھاجن ریکھا کھینچنے میں سنگم کر اسمرتھ پا رہا ہوں۔ واستو میں مخدوم کی شاعری ہی اس کی راج نیتی ہے اور اس کی راج نیتی اس کی شاعری ـــــ اور ان دونوں کا سمبندھ گہرا سہج ہے۔

اپنے شکشا کال میں ہی اس کا سمبندھ ودیارتھیوں کے اندولنوں سے بہت گہرا تھا اور حیدرآباد کی "نظام شاہی" کے اتیاچاروں اور وہاں کی جنتا کی دردشا دیکھ کر تو وہ بے طرح تڑپ اٹھتا تھا، رو دیتا تھا اس کی آتی ریکت جگ جگ پرانے دیش کی پرادھینتا کا انوبھو ہوتا تھا، ان سمست انوبھو انوبھوتیوں نے مل جل کر ایک سیدھے سادھے ودیارتھی کے من مستشک میں ایک ایسا وِش گھول دیا کہ اس نے نہ کھیل اپنے کھیلنے کھانے کے دن، نہ کیول اپنی جوانی کی خوبصورت بہاریں بلکہ جنتا کے کلیان اور دیش کی سوتنترتا کے سنگرام میں اپنا سب کچھ ارپن کر دیا۔ اپنے بیوی بچوں کے گزارے کا اچھا خاصا سادھن حیدرآباد سٹی کالج کی پروفیسری چھوڑ کر کمیونسٹ پارٹی کا ہول ٹائمر

سُندر سے بن گیا۔ اور آج اپنی انتھک سیوا اور بلیدان دوارا وہ حیدرآباد کا ایک پریہ جن نیتا ہے۔ لوگ اس کے پاس اپنے دکھ درد کا دکھڑا لے کر جاتے ہیں اور وہ سوئم بھی ان کا دکھ درد بٹانے ان کی اندھیری اور سیلن بھری کوٹھریوں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں جاتا ہے۔ حیدرآباد کا کوئی راجنیتک تتھا ساہتیک ادھیویشن اس سمے تک پھیکا اور اپورن پرتیت ہوتا ہے جب تک مخدوم اس میں بھاگ نہ لے۔

مخدوم کا شابدک ارتھ ہے — "سیویہ"۔ لیکن اپنے نام کے الٹ وہ دوسروں کی سیوا کو اپنا دھرم مانتا ہے۔ پچھلے دنوں (یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے) گرودت نامک بمبئی کے ایک فلم نرماتا اور نردیشک نے جب اسے اپنی فلموں کے لیے گیت لکھنے اور پاریشرمک سوا روپ ہزاروں روپے دینے کی پیش کش کی تو اس نے سب سے پہلا پرشن جو کیا وہ یہ تھا کہ کیا حیدرآباد میں رہتے ہوئے وہ یہ کام کر سکے گا؟

"یہ تو ممکن نہیں!" گرودت نے فلمی آدھکاری کی درشتی سے کہا۔ "رہنا آپ کو بمبئی پڑے گا!"

مخدوم نے ہاں نا کیے بنا دوسرے دن حیدرآباد کا ٹکٹ کٹوا لیا۔

یہاں یہ چرچا اسنگت نہ ہوگی کہ آج کل فلمی گیت لکھنا ایک یانترک اور اس کارن کافی کٹھن کاریہ ہو گیا ہے کیول وہی شاعر یا کوی گانے لکھ سکتا ہے جو میوزک ڈائرکٹر کی پہلے سے بنائی یا چرائی ہوئی دھنوں پر بول فٹ کر سکے۔ اور وہ بھی ستھتی (سچوئیشن) کے مطابق۔ لیکن مخدوم کی ایک نظم "چارہ گر" (جو اس سنگرہ میں سنگرہیت ہے اور جس کے بول ہیں "اک چنبیلی کے منڈوے تلے") کی دھن بنا کر اور ریڈیو سروں کو سنا کر حیدرآباد کا ایک وکھیات میوزک ڈائرکٹر بن گیا۔

مخدوم سے ملاقات سے پہلے میرے مستشک میں اس کا ایک وچتر چتر تھا۔ تلنگانہ سنگرام کے سماچار پڑھ پڑھ کر (جس کا وہ ہیرو تھا) میرے مستشک میں اس کے نین نقش بہت بھیانک روپ دھارن کرتے گئے۔ میں اسے ایک ایسے مارشل لیڈر کے روپ میں دیکھنے لگا جو کیول آدیش دینا جانتا ہے اور کسی پرکار کی اُدنڈتا سہن نہیں کر سکتا۔ اپنی کچھ نظموں میں بھی وہ مجھے پاشان دکھتا تھا۔ ویششٹ: جب کبھی میں اس کی نظم "اندھیرا" کی یہ پنکتیاں پڑھتا۔۔

باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑپتے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی

یا "مشرق" کی یہ پنکتیاں:۔

ایک ننگی نعش بے گور و کفن، ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی

ایک قبرستان جس میں ہوں وہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

تو اس کے کھینچے ہوئے ان چتروں سے میرے شریر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور میں نظم کی پنکتیوں سے نظریں ہٹا کر جیل، فاقہ، بھیک، گولی، خون آدی شبدوں کے اس شاعر کے وِیکتیتو کے بارے میں وچتر باتیں سوچنے لگتا تھا لیکن ۱۹۵۳ء میں جب پہلی بار کلکتہ میں سانسکرتک سماروہ میں اور پھر دلّی میں شانتی سمیلن کے اوسر پر میری اس سے بھینٹ ہوئی اور مجھے کافی سمے سے اسے دیکھنے کا موقع ملا تو میری کلپنا کے شانت دیوتا مجھے اتینت آکرشک اور سجاؤ دکھائی دیا۔ میں نے اسے بچوں کے ساتھ بچہ بنتے، انھیں کی طرح توتلی زبان میں ان سے باتیں کرتے اور ان کے کھلونوں کے لیے اپنی جیبیں الٹتے دیکھا۔ ودیارتھیوں کے ساتھ ودیارتھیوں کی سمسیاؤں پر ودیارتھیوں ہی کی طرح سبھاوک ڈھنگ سے باتیں کرتے اور لطیفے سناتے دیکھا۔ ساہتیہ کاروں کی بیٹھکوں میں اپنی نظم پر داد پا کر اس پرکار پرسن ہوتے دیکھا جیسے جیون میں پہلی بار اسے داد مل رہی ہو اور وہ ان سب کو اپنے سے کہیں بڑے اور ساہتیہ کار سمجھتا ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں مخدوم کی یہ وشیشتا ہے جہاں اس کے راج نیتی سمبندھی کلا کوشلتا کا ہاتھ ہے وہاں اس کی لوک پریتا میں اس کے ان سہجاوک گنوں کا بھی بہت بڑا یوگ ہے۔ بچے اسے بچہ سمجھتے ہیں۔ ودیارتھیوں میں وہ ودیارتھی نظر آتا ہے۔ مزدوروں کے جلسے میں اسے ایک پڑھے لکھے بدھی جیوی کے روپ میں پہچاننا کافی کٹھن ہو جاتا ہے۔ کسان اسے کسان بھیا سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی استریاں بھی اسے اپنا سہجاتیہ سمجھ بیٹھتی ہیں اور بنی سنکوچ اپنے من کا بھید اس پر پرکٹ کر دیتی ہیں۔ اس پرسنگ میں مجھے دلّی کی ایک گھٹنا کبھی نہیں بھولتی۔

ایک بار جب ایک چھوٹی سی بیٹھک میں مخدوم اپنی پرمدھور رومانٹک نظم "انتظار" سنا چکا تو ایک نوجوان لڑکی نے جو اس کی نظم سے بہت پربھاوت معلوم ہوتی تھی اسے الگ لے جا کر کہا کہ وہ چاہتی ہے اس کا پریمی اس نظم کو اوشیہ سنے لیکن اسے یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ اس کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔

مخدوم کے حامی بھرنے پر لڑکی نے بتایا کہ اس کا پریمی دلّی میں نہیں بلکہ دلّی سے تین سو میل دور امرتسر میں رہتا ہے۔ انت طے پایا کہ دوسرے دن پرات سمے مخدوم اس کے پریمی کو ٹرنک کال کرے گا اور ٹیلی فون پر وہ نظم سنائے گا۔ اور سچ مچ دوسرے دن اپنے سو کام چھوڑ کر مخدوم ٹیلی فون پر اس لڑکی کے پریمی سے کہہ رہا تھا:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

مخدوم کی شاعری کا پرادربھاؤ اس زمانے میں ہوا جب "انگارے" (سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی، آدی پرگتی شیل لیکھکوں کی رچناؤں کا ایک سنکلن (۱۹۳۲ء) جسے انگریزی سرکار نے ضبط کر لیا تھا) کے پرکاشن دوارا پرم پراگت کے ورودھ ودروہ شروع ہوا تھا۔ نئے لیکھک اردو ساہتیہ کو نئے نئے موڑ دے رہے تھے، نئی نئی شیلی سے پریچت کرا رہے تھے۔ لیکن یہ یگ کال ہونے کے کارن ساہتیہ کے لگ بھگ پرتیک ودروہی کے یہاں ابھی کلاتمک پری پکوتا نہیں آئی تھی۔ مخدوم کی پرارمبھک شاعری میں بھی کئی جگہ بھاشا آدی کی ترٹیاں ملتی ہیں لیکن یدی اس کی انترچیتنا کو دیکھا جائے تو وہ سوابھاوک شاعر ہے اور کلا کے "پیمانوں" سے الگ رہ کر وہ اپنے دل کے ٹکڑے کاغذ پر رکھ دیتا ہے۔ اس کی شاعری میں پہاڑی جھرنوں ایسا ویگ بھی ہے اور میدانی نالوں ایسی شور گتی بھی۔ اپنی شاعری دوارا وہ جنتا کی سانسکرتک بھوک بھی مٹاتا ہے اور انھیں نئے جیون اور نئے سماج کے نرمان کے لیے پریتن شیل ہونے پر بھی اکساتا ہے۔ اپنے سماکالین شاعروں کو سمبودھن کرتے ہوئے ایک بار اس نے کہا تھا (یہ گھٹنا اس پرکار گھٹی کہ اردو کا پرسدھ پرگتی شیل شاعر اور مخدوم کا پرم متر مجاز لکھنوی سبھا والوں سار ایک مشاعرے میں اس بری طرح شراب پی کر آیا کہ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور اس کے منہ سے شبد نہ نکلتے تھے۔ اپنی مترتا کے باوجود مخدوم نے مائکروفون تھام کر مجاز کو بری طرح ڈانٹنا شروع کر دیا)

"تم اپنی کلا، کویتا کا پرکاش لے کر جنتا کے اندھکار دلوں میں اترتے ہو۔ تیدپی شاسک ورگ نے انھیں ودیا، ساہتیہ، سبھیتا اور سنسکرتی سدگنوں سے ونچت کر رکھا ہے وے پیاسوں کی طرح تمھارے گرد ایکتر ہو جاتے ہیں۔ انھیں تمھارے شراب کے جھٹکوں کی آوشیکتا نہیں ان کے جیون میں پہلے ہی بہت سی گندگیاں موجود ہیں۔"

اور اس کا یہ کتھن ہی اس کی شاعری کا تاتوک گن ہے۔ اس کے انوسار شاعر اپنی شاعری اور کلا کا تبھی سمان کر سکتا ہے جب وہ اپنے دیش کی جنتا، اس کے سوتنترتا اور سمردھی کے سنگرام کا سمان کرے۔ جہاں تک اس کے اپنے وکتتو کا سمبندھ ہے، وہ نہ کیول اس سنگرام کا سمان کرتا ہے بلکہ تن، من، دھن ہر پرکار سے اس سنگرام میں اپنا یوگ دے رہا ہے۔ حیدرآباد کے ترون شاعروں کے لیے تو وہ ایک دم پوجنیہ ہے۔ وہاں کا کوئی ترون لیکھک اتھوا شاعر ایسا نہیں ہے جو مخدوم سے اور مخدوم کی شاعری سے پربھاوت نہ ہوا ہو اور جس نے مخدوم کے ڈھنگ میں شعر کہنے کا پریاس نہ کیا ہو۔

حیدرآباد کے ترون لیکھک اور شاعر ہی نہیں حیدرآباد کی جنتا کو بھی اس کی پرتی ایسا سنیہ اور شردھا ہے۔ اس سنیہ اور شردھا کا ایک ادبھت ندرشن: وہاں کا ایک دیہاتی جس نے مخدوم کو کیول دور سے دیکھا تھا اس سے اتنا پربھاوت ہوا کہ اس نے مخدوم جیسی اپنی داڑھی بنا لی، اسی کول نمر میں بات چیت، اسی جیسے وستر، یہاں تک کہ جب اسے معلوم ہوا کہ مخدوم کا وزن اس کے وزن سے کم ہے تو گھول کر کے اس نے اپنا وزن کم کرنا شروع کر دیا۔

یہ تو خیر ایک دیکھی کا اُداہرن ہے، ذرا اس سنیہ اور شردھا کا انومان لگائیے: ایک بار مخدوم حیدرآباد کے ایک دس ہزار کے جن سموہ میں بھاشن دے رہا تھا اور شہر میں اس کی گرفتاری کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ سبھا سماپت ہو گئی لیکن لوگ اسی پرکار بیٹھے رہے۔ مخدوم نے اس کا کارن پوچھا تو لوگوں نے بتایا: "ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے ورنہ حکومت آپ کو گرفتار کر لے گی۔" مخدوم کے لاکھ سمجھانے پر بھی لوگ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پریشان ہو کر اس نے کہا: "اچھا آپ لوگ یہاں بیٹھے رہیے میں جاتا ہوں۔" لیکن وہاں بیٹھے رہنے کی بجائے پورا جن سموہ مخدوم کے ساتھ ہو لیا اور جب ایک مِتر کے مکان پر پہنچ کر مخدوم نے پھر کہا: "مجھے تو آپ نے گھر پہنچا دیا اب آپ لوگ بھی اپنے اپنے گھر جائیے۔" تب بھی کوئی گھر جانے کو تیار نہ ہوا اور سب کے سب باہر کھڑے اس کا پرسدھ گیت ۔

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

گاتے رہے۔ مخدوم "نورس" "اندھیرا" "انتظار" "انقلاب" "مشرق" "حویلی" "قید" اتیادی بہت کی سندر نظموں کا رچیتا ہے لیکن جس گیت یا نظم نے اسے سب سے ادھیک کھیاتی پردان کی اور جن سادھارن کا لوک پریہ شاعر بنایا وہ نظم یا گیت ہے "جنگِ آزادی" ہے۔ یہ گیت اس نے ۱۹۴۲ء کے آندولن کال میں لکھا تھا جب کانگریس پارٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی تھی۔ سمست نیتا جیلوں میں ڈال دیے گئے تھے اور چاروں اور ایک وچتر پرکار وواشتا سی نظر آتی تھی۔ ایسے میں ساہتیہ کاروں کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں یا کیا لکھیں؟ مخدوم نے یہ گیت لکھ کر انھیں ایک مارگ سجھایا اور کیول ساہتیہ کاروں کا ہی نہیں سوتنترا پریمی جنتا کا بھی پتھ پردرشن کیا۔ ساہتیک درشٹی سے کچھ سمالوچکوں نے اس گیت کے بارے میں کہا تھا کہ یہ پروپیگنڈا ہے اس کا ورشے وستو ستھائی نہیں۔ لیکن مخدوم کے اس گیت نے سدھ کر دکھایا کہ یدی لیکھک یا کوی آتما انوبھو کی نیو پر ساہتیہ رچنا کرے تو رچنا اپنے سمے کے ساتھ کبھی نشٹ نہیں ہوتی۔ آج دیش سوتنتر ہے، آج یدھ سماپت ہو چکا ہے لیکن مخدوم کا یہ گیت آج بھی بھارت کے کونے کونے میں گایا جاتا ہے اور کئی مزدوروں اور کسانوں کے جلسوں کا تو شری گنیش ہی اس گیت سے ہوتا ہے۔ میرے مت انوسار لوک پریتا کی یہ اُپادھی سیکڑوں ساہتیک سمالوچناؤں پر بھاری ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک ماتر کارن وہی سَگُن ہے کہ مخدوم جو کچھ لکھتا ہے آتما انوبھو کے آدھار پر لکھتا ہے۔ اس کی رچناؤں میں اس کے دل کی دھڑکنیں ودیمان ہوتی ہیں۔

مخدوم کیول ایک سنکشپت سے کویتا سنگرہ "سرخ سویرا" کا رچیتا اور اپنی سادھارن راجنیتک گتی ودھیوں کے کارن ایک سمے سے اس نے شاعری چھوڑ رکھی ہے، پھر بھی کسی نہ کسی ورش یہ سماچار مل ہی جاتا ہے کہ اس نے ایک نئی نظم لکھی ہے۔

پڑھنے والوں سے

مخدوم محی الدین

● شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا جاتا ہے۔ شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے اپنے تجربے کی بنا پر جب آپ "گلِ تر" پڑھیں تو شاید آپ بھی

اس طرح گزریں ذہن "سرخ سویرا" اور "گلِ تر" میں مقابلہ بھی کرنے لگے گا۔ شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا مجموعہ اپنی سج دھج، نفسِ مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیف و کمیت اور تاثر کے اعتبار سے "سرخ سویرا" سے مختلف ہے۔

بعض قارئین کو "سرخ سویرا" کی وہ نظمیں اور اشعار شاید یاد آجائیں جو انھیں متاثر کر چکے ہیں۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

٭

جو چھولیتا ہیں اس کو وہ بنا جاتا پسینے میں

٭

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

٭

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں

٭

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

٭

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

٭

اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

یہ تھا "سرخ سویرا" "نقارِ نگم" "مگلِ تر" میں یہ رنگ ملے گا:

ہجوم بادہ و گل میں ہجوم یاراں میں ÷ کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر ÷ قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل ÷ تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں
آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے ÷ گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن ÷ ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

غزل در تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے
اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

ہمسفر ہو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جالیاتی اثر قدرِ مشترک ہیں۔

زماں و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIMELESS) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں تہذیبِ انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے، جالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے، اگر انسان کو سماج سے الگ کر دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا، جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنون لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔

شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی

تضاد تخلیق کی قوتِ محرکہ بن جاتا ہے۔

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اُجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر ہوتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالمِ خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب "انا" اور "انفرادیت" سے تعبیر کرتا ہے۔

شعر میں ہم ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بیکاری کی اولاد ہے، مگر میں ایک محروم بیکاری انسان ہوں۔ "گلِ تر" کی نظمیں غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۶۱ء — مخدوم محی الدین

گزشتہ یوم خواتین پر سب سے زیادہ ہجوم

المونیم کے اسٹال

پرتھا جو روزمرہ کی سینکڑوں اشیا سے سجا ہوا ہے اپنی ضرورت کی ہر چیز

کمپنی دام پر ہی خریدیئے

جیون لعل (۱۹۲۹) لمیٹڈ

ڈسٹری بیوٹرس

انڈیا کراکری ہاوز

شوروم ۲:- قریب عابد سرکل حیدرآباد۔ فون (۴۴۰۷۰)

مخدوم کا عکسِ تحریر

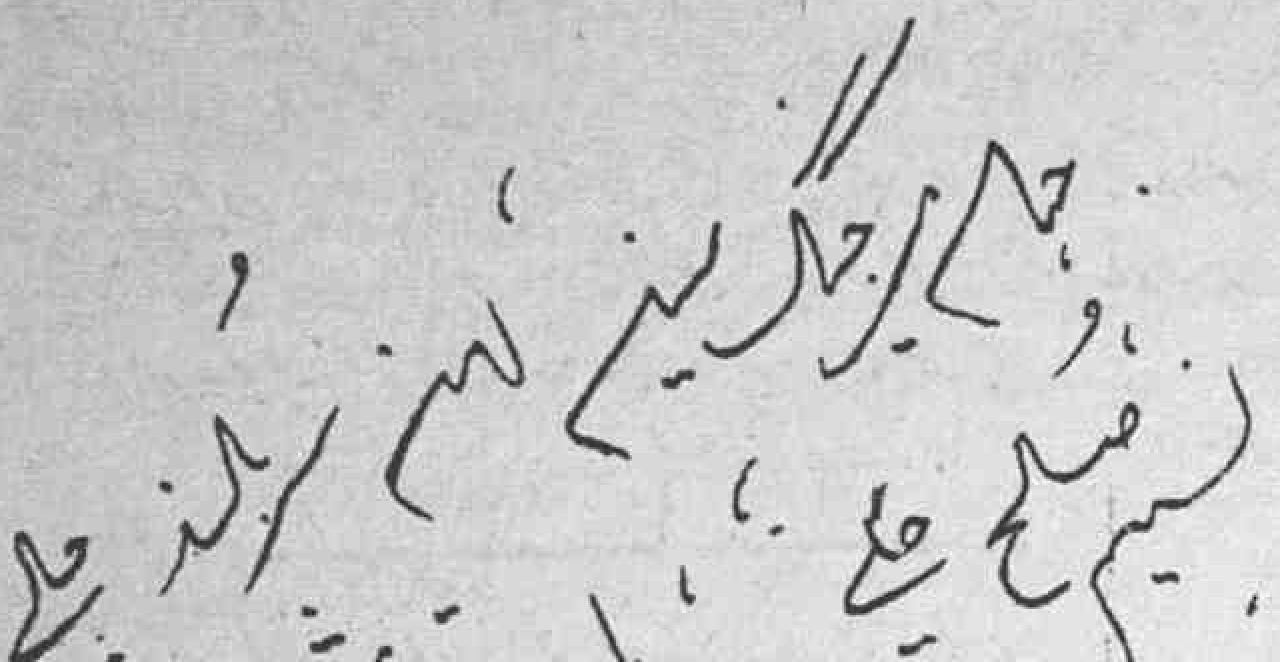

انتخابِ کلام

سُرخ سویرا

طُور

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأتِ اظہار حسنِ مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

دلوں میں ازدحامِ آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں رباب آتا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شباب آتا
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے ہر ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
ربابِ دل کے تاروں میں مسلسل لرزشیں ہوتیں
خفائے راز کی پُر لطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں
جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرورِ سرمدی سے زندگی مخمور ہوتی تھی

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ نور ہوتی تھی
ملک جھولا جھولاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ رواں باقی
مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

تلنگن

بچھڑنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

ارض یکسر گوش ہے خاموش ہیں سب آسماں
راگ سننے رک گئے ہیں بادلوں کے کارواں
ہاں ترانہ چھیڑ جنگل کا مری غنچہ دہاں
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دیکھنے آتے ہیں تارے شب میں سن کر تیرا نام
جلوے صبح و شام کے ہوتے ہیں تجھ سے ہم کلام
دیکھ فطرت کر رہی ہے تجھ کو جھک جھک کر سلام
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

دخترِ پاکیزگی نا آشنائے سیم و زر
دشت کی خودرو کلی تہذیبِ نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

لے چلا جاتا ہوں آنکھوں میں لیے تصویر کو
لے چلا جاتا ہوں پہلو میں چھپائے تیر کو
لے چلا جاتا ہوں پھیلا راگ کی تنویر کو
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

دھواں

جنّتیں خاک پہ جس رات اُتر آئی تھیں
بدلیاں رحمتِ یزداں کی جہاں چھائی تھیں
عشرت و عیش کی جس جا کہ فراوانی تھی
جس جگہ جلوہ فگن روحِ جہاں بانی تھی
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا
ہاں مری چشمِ گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

آزادیٔ وطن

کہو ہندوستاں کی جے   کہو ہندوستاں کی جے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو دھو نہیں سکتی
وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستاں کی جے   کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی
وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
وہ شمعِ زندگانی آندھیوں نے جس کو پالا ہے
اک ایسی ناؤ طوفانوں نے خود جس کو سنبھالا ہے
وہ ٹھوکر جس سے گیتی لرزہ بر اندام رہتی ہے
وہ دھارا جس کے سینے پر عمل کی ناؤ بہتی ہے
چھپی خاموش آہیں شورِ محشر بن کے نکلی ہیں
دبی چنگاریاں خورشیدِ خاور بن کے نکلی ہیں
بدل دی نوجوانِ ہند نے تقدیر زنداں کی
مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی
کہو ہندوستاں کی جے   کہو ہندوستاں کی جے

وہ

وہ خمِ گردن وہ دستِ نازداراں کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلم وہ نگاہوں کا پیام

دہکتی آنکھوں کا رس گلرنگ عارض کا جمال
مسکراتا سا تصور گنگناتا سا خیال
ایک ایسا غم جو آنسو بن کے بہہ سکتا نہیں
دل جسے محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں
اور کیا ہوگی کسی کی کائنات سال و سن
عشق کی دو چار راتیں حسن کے دو چار دن
آہ پہلے نارسا تھی اب کہیں رکتی نہیں
اب کسی کے آستانے پر جبیں جھکتی نہیں

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
مار رگزیدہ کا سا تھکا ناجس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک
جن میں رہتے ہیں خدا جن جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصر عشرت قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
زیست کروٹیں بدل دیتی ہے جس کی بارگاہ
قہقہے بن کر نکلتی ہے جہاں مزدور کی آہ
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
ایک جانب ہیں وہیں اُن بے نواؤں کے گروہ
ہاں انھیں بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ
جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال
جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال
اے خدائے دو جہاں لے وہ جو ہر اک دل میں ہے
دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے
جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہمدم کون ہے
کون ہے پروردگار بزم ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوس دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں
اے جوان سال جہاں جان جہان زندگی
سارباں زندگی روح روان زندگی
جس کے خون گرم سے بزم چراغاں زندگی
جس کے فردوس تنفس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی، روحِ غارت گری
موت کی ہم سفر، مرگھٹوں کی پری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر
کچھ پجاری اِدھر کچھ پجاری اُدھر
وہ شب اندام وہ تیرگی تیرگی
میرے گھر میں وہ کل یک بیک گھس گئی
ناچتی کودتی شور کرتی ہوئی
میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
پرچمِ غم ہوا میں نچاتی ہوئی
مسکراتی ہوئی کھل کھلاتی ہوئی
ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی
خون پی پی کے گرتی ابھرتی ہوئی
موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دم بدم
اے مری ہم نفس اے مری ہم قدم
تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں
کونسی وہ بلا ہے جو مجھ میں نہیں
کیا مجھے جوعِ ارضی نے پالا نہیں
کیا یہ انسان میرا نوالہ نہیں

پشتِ گیتی پہ میں بھی تو نا سہ بر رہوں
دیکھ تو کون ہوں روحِ فغفور ہوں

آتشکدہ

کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کن نگاہوں میں ہوں کیسے دل میں ہوں
واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں؟
کیسی کیسی بجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں
کتنے لب کتنی جبینیں کتنے جلوے کتنے طور
کتنی صبحوں کا اُجالا کتنے نقلوں کا سرور
کتنی نو آغاز کلیاں کتنے خوشبو دار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر مرتے ہیں رنجور و ملول
کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشے میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں
کیا کہوں کن مہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں کن کاکلوں کا ساتھ ہے
کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

زلفِ چلیپا

آخری ہے ہچکی پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرقِ گیتی پر نظر آتا ہے پھر کا سوں کا تاج

موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات
لُٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات

جس زمیں سے ارتقا کے انبیا پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و عظمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمد کی زمیں وہ ابن مریم کی زمیں

اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے

مندروں میں معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت
خلوتوں میں موت ہے شاہی شبستانوں میں موت

زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے

اب کسی سینے میں روح شاداں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہل چل نظر آتی نہیں

برہمیِ زلفِ چلیپا یں کبھی دیکھی نہ تھی
برہمی دیکھی نہ تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

پی اور اپنے ہاتھ سے پی لے کے سرمایے کا نام
موت کا لبریز ساغر، عصرِ حاضر کے غلام

عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد

سپاہی

(یہ نظم دوسری عالمی جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی تھی)

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلا رہی ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے
کیسے ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خون ہو رہا ہے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

گر رہا ہے سپاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کے جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

انقلاب

(آنے والے نئے نظامِ عالم کے پیش رس کی تمنا میں)

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکیٔ رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے گل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخِ حیات پہ کاکل کی برہمی نئی نہیں
نگارِ دہر میں اندازِ برہمی نئی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قحبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیمِ صندل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

اندھیرا

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوسِ عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک
سرد ہوا
نوحہ و نالہ و فریاد کناں
کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی

چاند کے تاروں کے ماتم کی صدا
رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

جنگ آزادی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سارا سنسار ہمارا ہے
پورب پچھم اُتّر دکھن
ہم افرنگی ہم امریکی
ہم چینی جاں بازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن
آہن پیکر فولاد بدن
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا
دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی
جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی، آزادی کیا
مزدوروں کا جس میں راج نہ ہو

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

لو سرخ سویرا آتا ہے
آزادی کا آزادی کا
گلنار ترانہ گاتا ہے
آزادی کا آزادی کا
دیکھو پرچم لہراتا ہے
آزادی کا آزادی کا
یہ جنگ ہے جنگ آزادی آزادی کے پرچم کے تلے

استالین

قازقستان کے نوّے ۹۰ سالہ بوڑھے تاتاری
شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ

جابر انقلاب روس سے قبل کا انقلابی شاعر ہے جس کا رنگ آج تک بدستور قائم ہے اس کی نظموں کے مجموعہ کا اٹھارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور گورکی ایسے ادیب نے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے

صفِ اعداء کے مقابل ہے ہمارا رہبر
استالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
اُن کی محنت کا اخوّت کا محبت کا خمیر
وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں

کیا میں تلوار اٹھاؤں : وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے مغرور وسیع بدن کی خاطر
ایسے ہنگام قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا؟
قرۃ العین! مری جان! عزیز
او مرے فرزندو
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالارِ جہاں استالین

وہ مرا ملک جواں
وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو
میری نوخیز مسرت کا جہاں
وہ مرا شہرِ رواں ملک جواں
ولد الجرم خطا کار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی ـــ ایک نوآغاز بشر
وہ مرا ملک جواں
سچ کہا ہے کہ "زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھرتھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
نکل آئے ہیں بلوں سے باہر

اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کرو
اور فاشست شغالوں سے کہو
نعرۂ اول و آخر ہے یہی
قرۃ العین! مری جانِ عزیز
اور مرے فرزندو!
برق یا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالارِ جہاں استالین

یہی محشر ہے، دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پُرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں
دوسرا۔ ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک
ستمگار
دورِ وحشت کے درندے
موذی
دہنِ آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
میرے شاہین کے خلاف
رات دن باہیں کر چلے آتے ہیں
نہیں جائیں گے کبھی رائیگاں میرے نغمے
اور مرے ہم وطنوں کے نغمے

میرے شاہین تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم
سوسمارانِ خزندہ و دو گونہ
میرا شاہین، مرا استالین
سُرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند
اِن مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو تو تیز کرو
سُرخ فوجوں میں ملو
جوئے پُرجوش بنو، برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے لوہے کا سمندر بن کر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشست خنازیر کو
فی النّار کرو
میرے بلخاش کہاں ہے وہ مِسِ سُرخ ترا
اس سے گن سرِ دشمن پہ گرے شل بن کر
بحرِ اخضر کے ادا ہی گیرو! غوطہ زنو
اپنا ذخیرہ لاؤ
معدنوں سے کہو اور کھیتوں کو آواز تو دو
لائیں وہ اپنے حسن وسائل کا حاصل لائیں
اور قربانِ وطن کر ڈالیں
یہ تہی رہوار، یہ پشمینہ ہے یہ خرمن ہیں
میرے محبوب وطن
سب کے سب تیرے ہیں، سب تیرے ہیں
استالین نے میدان میں بلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر
قازقستان!

وطن!
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال
بہ ہزاراں جبروت
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمنِ ناپاک کی خاکستر کو

تلنگانہ

دیارِ ہند کا وہ راہبر تلنگانہ
بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ
بلا رہا ہے بہ سمتِ دگر تلنگانہ
وہ انقلاب کا پیغامبر تلنگانہ

امامِ تشنہ لباں خضرِ راہِ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مرا شباب مری کائنات میری حیات
سلام مہرِ بغاوت سلام ماہِ نجات

سیاہ رات جرائم پناہ ظلم بدوش
سیاہ رات میں بدکار مست اور مدہوش
سیاہ رات میں مقتول عصمتوں کا فروش
سیاہ رات میں باغی عوام برق بدوش

اٹھے ہیں تیغ بکف یوں بصد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتیوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال
بنائے قصرِ امارت شکستہ و پامال

لرز لرز کے گرے سقف و بامِ زرداری
ہے پاش پاش نظامِ ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

بدل رہی ہے یہ رنج و عذاب کی دنیا
ابھر رہی ہے نئے آفتاب کی دنیا
نئے عوام نئی آب و تاب کی دنیا
وہ رنگ و نور کی محفل شباب کی دنیا

سلام سرخ شہیدوں کی سرزمین سلام
سلام عزمِ بلند آہنی یقین سلام
مجاہدوں کی چمکتی ہوئی جبین سلام
دیارِ ہند کی محبوب ارضِ چین سلام

گُلِ تر، اور اس کے بعد

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لو
جاگ اٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش
ان کی آنکھوں میں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جورِ شاہی سے غمِ جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دامن سے دھماکا ہو جائیں
سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوئی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی شورش کا پتہ دیتا ہے
مجھے غم ہے کہ مرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادیٔ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

(سنٹرل جیل حیدرآباد دکن)

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے

جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر!

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اُجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگھور گھٹائیں ہیں نہ ہن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے دلداریٔ جاں باقی ہے
سر فہرست نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

چاند تاروں کا بن

(آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

کچھ امامانِ صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

رقص

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آگیا

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوئی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوئی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
بدن جھپک جھپک کے چل
کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل
وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آگیا

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

جانِ غزل

اے دلِ زار آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول
وہ مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹ گئیں بدلیاں کھل گئے پیچ و خم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل
خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پئیں
راستے منتظر، گل بداماں ہے ہر رہ گزر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل

چپ نہ رہو
(لومبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیت کا ضمیر
پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گزری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گزری ہے
خیر ہو مجلس اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی، صداقت کی، جہاں بانی کی

اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا۔
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو چپ نہ رہو

سنّاٹا

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ سنچل
نہ کوئی موج
نہ ہلچل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سنّاٹے میں اک آدھ تو پتّا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہگزر
کوئی رخسار تو چمکے کوئی بجلی تو گرے

لختِ جگر

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنویں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
وہ آواز
ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کی ہادی بنی
پھر خدا بن گئی
کوئی ماں
کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سرِ رہگزر
اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی
وہ ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کا ہادی بنا
پھر خدا بن گیا

صب

خواہشیں

خواہشیں
لال، پیلی، ہری چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی، تھرکتی ہوئی جاگ اٹھیں
جاگ اٹھی دل کی اِندر سبھا
دل کی نیلم پری جاگ اُٹھی
دل کی پکھراج
لیتی ہے انگڑائیاں جام میں
جام میں تیرے ماتھے کا سایہ گرا
گھُل گیا
چاندنی گھُل گئی
تیرے ہونٹوں کی لالی
تری نرمیاں گھُل گئیں
رات کی، اَن کہی، اَن سُنی داستاں
گھُل گئی جام میں
خواہشیں
لال، پیلی، ہری چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی تھرکتی ہوئی جاگ اٹھیں

وصال

دھنک ٹوٹ کر سیج بنی

جھومر چمکا
سناٹے چونکے
آدھی رات کی آنکھ کھلی
برہ کی آنچ کی نیلی لَو
نَے بنتی ہے
لَے بنتی ہے
شہنائی جلتی روتی تھی

اب سر نیوڑھائے
لال پوٹے بند کیے بیٹھی ہے
نرم گرم ہاتھوں کی مہندی
ایک نیا سنگیت سناتی
دل کے کواڑ پہ رک رک کر کوئی راتوں میں دستک دیتا تھا
دل کے کواڑ پہ رک رک کر وہ دستک دیتا ہے
پٹ کھُلتے ہیں
آنکھ سے آنکھ دلوں سے
دل ملتے ہیں
گھونگٹ میں جھومر چھپتا ہے
گھونگٹ میں مکھڑے چھپتے ہیں
دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں
ٹڈھا ناگ کھڑا روتا ہے

گونگے سناٹے بول اٹھے
گھونگٹ، مکھڑے، جھومر، پائل
چمک، دمک، جھنکار امر ہے
پیار امر ہے
پیار امر ہے
پیار کی رات کی آنکھ امڈ آتی ہے
اور دو پھول
تنو ربدن
شبنم پی کر سو جاتے ہیں

نہرو

ہزار رنگ ملے، اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبارِ مشتِ بہار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ کشش جنت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

وقت ۔ بے درد مسیحا

درد کی رات ہے
چپ چاپ گزر جانے دو
درد کو مرہم نہ بناؤ
دل کو آواز نہ دو
نورِ سحر کو نہ جگاؤ
زخم سوتے ہیں تو سو رہنے دو
زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام، پھپھولوں کو سکون ملتا ہے
وقت ۔ بے درد مسیحا ہے
ہر اک حکم، جگا دیتا ہے جلا دیتا ہے
قبر سے اٹھ کے نکل آتی ملاقات کی شام
ہلکا ہلکا سا وہ اڑتا ہوا گالوں کا گلال
بھینی بھینی سی وہ خوشبو، کسی پیراہن کی
شب کے سناٹے کے جادو نے کمندیں پھینکیں

گوشۂ دل کے کسی چاک میں لپٹی ہوئی
حسرت نے جو انگڑائی لی
خواہشیں رینگتی پھرتی نظر آتی میں کمیں گاہوں میں
کوئی یوسف نہ زلیخا
یہ وہ محمل ہے

یہ رات
درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات
رات اک ساقیٔ بے فیض کی مانند گزرتی ہے
گزر جانے دو
وقت!
او مشفق و محسن قاتل
رات کی نبض میں نشتر رکھ دے
رات کا خون ہے
بہہ جاتا ہے
بہہ جانے دو

بلّور

منوّر خموشی کے بلّور چھنکے
کرن مرمریں فرش پر جیسے ٹوٹی
کلی چٹکی، آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی سروں کی کوئی کہکشاں
کھل کھلاتی ہوئی گود میں آ پڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے، ساز چونکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق، رنگ در رنگ
عارض کا حسرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے
کسی کو یہ قصّہ سناؤں تو کیسے؟
قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے؟

غزلیں

سیماب وشی، تشنہ لبی باخبری ہے
اس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی مے وہی میخانہ وہی ہے

اس عہد میں بھی دولتِ کونین کے باوصف
ہر گام پہ ان کی جو کمی تھی سو کمی ہے

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

سحر سے رات کی سرگوشیاں بہار کی بات
جہاں میں عام ہوئی چشمِ انتظار کی بات

دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

جہاں بھی بیٹھے ہیں جس جا بھی رات مے پی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصے انھیں کے پیار کی بات

چمن کی آنکھ بھر آئی، کلی کا دل دھڑکا
لبوں پہ آئی ہے جب بھی کسی قرار کی بات

یہ زرد زرد اُجالے یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بے قرار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

گل ہے قندیلِ حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

وہ جو چھپ جاتے تھے کعبوں میں صنم خانوں میں
ان کو لا لا کے بٹھایا گیا دیوانوں میں

فصلِ گل ہوتی تھی کیا جشنِ جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

آج تک طنزِ محبت کا اثر باقی ہے
قہقہے گونجتے پھرتے ہیں بیابانوں میں

وصل ہے ان کی ادا، ہجر ہے ان کا انداز
کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم
تذکرے رستوں میں چرچے ہیں پری خانوں میں

(اماں مرحوم کے نام)

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہجر میں ملنے شبِ ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی جلتا ہی نہیں، کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ، پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چشم و رخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

آج ہو جانے دو ہر ایک کو بدمست و خراب
آج ایک ایک کو پلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

کسی خیال کی خوشبو، کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

قطعات

گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا
تری آنکھوں سے آنسو بن کے ڈھل جاؤں تو کیا ہوگا
جنوں کی لغزشیں خود پردہ دارِ رازِ الفت ہیں
جو کہتے ہو سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤں تو کیا ہوگا

اسی ادا سے اسی بانکپن کے ساتھ آؤ
پھر ایک بار اسی انجمن کے ساتھ آؤ
ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

کوئی محفل ہو کہ مقتل ہو کہ مے خانہ ہو
دل وہ کافر ہے جو ہر دم تری صورت مانگے

خواب بیداری

(مخدوم کی یہ نظم ان کے ابتدائی مشقِ سخن کے زمانے کی ہے جو ہنگامہ ہونے سے پہلے کسی رسالے میں شائع ہوئی تھی لیکن یہ نظم مخدوم کے حافظے سے محو ہو چکی تھی چنانچہ یہ نظم "سرخ سویرا" میں شامل ہے نہ "گلِ تر" میں اور نہ تازہ مجموعے "بساطِ رقص" میں جو گویا مخدوم کا اب تک کا کلیات ہے۔ ادیب)

جمالِ حسن نے پھر گدگدایا دل کے تاروں کو
مری رگ رگ سے نکلیں گے تمناؤں کے فوارے
پری چہروں نے مجھ کو لے لیا ہے اپنے جھرمٹ میں
تبسم سے اشاروں سے بلاتے ہیں مجھے سارے
قیامت قامتانِ مژگاں دراز انِ شوخ رفتاراں
شرارے چلبلے سیماب تن نو خیز مہ پارے
شراب آنکھوں سے ڈھلکاتے لبوں سے پھول برساتے
چلے نہ چھیڑ کر ترچھی نظر کی برچھیاں مارے
گلابی آنچلوں کی اوٹ سے ناوک فگن آنکھیں
نقابِ ابر سے جس طرح جھانکیں چرخ پر تارے
بوقتِ رنگ پاشی کنگنوں کی زمزمہ ریزی
کہ گویا بج رہے ہیں چاندنی راتوں میں اکتارے
کسی کی سانس کی گرمی مرے ہونٹوں کو چھوتی ہے
مری آنکھوں میں چھا جاتا ہے نشہ نیند کے مارے

پیلا دوشالہ

(مخدوم کی پہلی مزاحیہ نظم جس سے وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ اور حیدرآباد کے عوام میں روشناس ہوئے
(ادیب)

جس دم یہ سنا چل بسا وہ ناز کا پالا — وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا — وہ پیلا دوشالہ
وہ کون ملا ڈر تھا جو چٹ کر گیا تجھ کو — پٹ کر گیا مجھ کو
نوکون سے موئے کا بنا تازہ نوالہ — وہ پیلا دوشالہ
وہ ماٹی ملا کون تھا جو لے اڑا تجھ کو — چھوڑا وہ کیوں مجھکو
جانے سے ترے ہو گیا یاں عیش کا لالا — وہ پیلا دوشالہ
کیوں چھین لیا او ملک الموت کے بچے — او عقل کے کچے
مجھ سے وہ مرا ماہ جبیں بانکا نرالا — وہ پیلا دوشالہ
اب کون مجھے گود میں لے لے کے سلائے — بے بس ہوں میں ہائے
جا تار باوہ راحتِ جاں دل کا اجالا — وہ پیلا دوشالہ
او گرم کُن پہلوئے من باز بیا آئی — گریم ز جدائی
آں روز بیاد آر کہ من زیر تو بالا — وہ پیلا دوشالہ

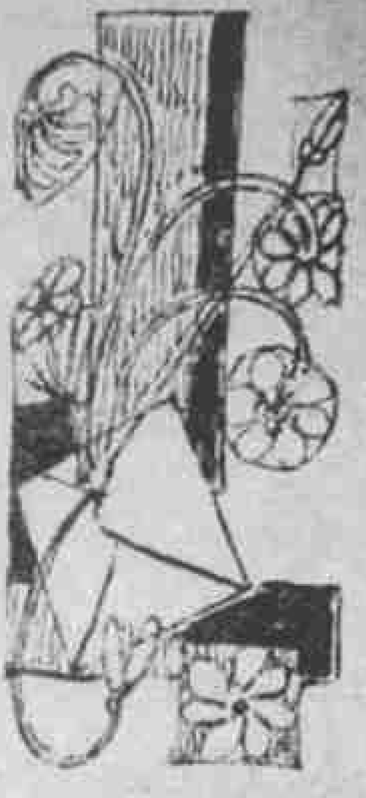

مخدوم محی الدین کا خط

سبطِ حسن کے نام

برادرم! آرٹ کی تعریف اس دوران میں یہ بھی ملی:

"آرٹ نہ تو فطرت ہے اور نہ اس کا ہو بہو عکس جو فن کار کی مسخ شدہ ذہنیت کی مدد سے دیکھا جاتا ہے بلکہ آرٹ فطرت کو ابھارنے اور اپنی مخصوص سماجی ضروریات کے لیے اس طرح ڈھال لینے کا نام ہے جو ہماری فطرت کے مطابق ہوں۔"

جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی جاتی ہے ہمارے احساسات اور جذبات کی نازک لسیں کمزور پڑتی جاتی ہیں۔ روزمرہ کی اسفل حقیقتیں ہماری زندگی میں اتنی داخل ہو جاتی ہیں کہ ہم زندگی کو ایک بھاری بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی خیال ابتدا ہے موت کا۔ اب آرٹ کا کام یہی ہے کہ ہمارے ارادوں میں جان ڈال کر تازگی اور شگفتگی عطا کرے۔ آرٹسٹ خود مرتا چلا جاتا ہے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اس سے بچ کر چلتے ہیں۔ ہمارے بعض اسلاف شعرا باوجود ایک ہی بات کو دہرانے کے زندہ رہے۔ ان کی بقا کا گر شاید ان کا انداز بیان تھا جس میں تازگی اور نیا پن ہوا کرتا تھا۔ مگر اب خیال کی تبدیلی سے دوسرے اور پیچیدہ سوال ادب میں پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

میں "زلف چلیپا" کے آخری دو شعروں کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ان میں سے پہلا شعر لفظی تعقید کی وجہ سے زیادہ حسین نہیں رہا۔ دوسرا شعر اس مایوسی اور اندھیری فضا میں کچھ ہمت دلاتا ہے اسی لیے عزیز ہے ورنہ اگر نظم کو پہلے ختم کر دیا جاتا تو مجھے زندگی بڑی ڈراونی معلوم ہوتی ہے اور جینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ محل کو گراں دیکھ کر بھی کیا تم مذہبی خدائی کو تسلیم کرنے کے قائل نہیں ہو۔ کوئی آرٹ پر دیکھتا نہیں۔ کیا تم یورپ کے کلیساؤں کو مسیحیت سے، یونان کی آزادی کو فطرت پرستی سے، الحمرا اور اجنتا کو [illegible] اور گورنمنٹ کے معاشرتی فلسفے سے علیحدہ کر سکتے ہو۔

یورپ کے رقص خانوں اور تھیٹروں میں اور خود تمھارے تغزلی ادب میں جنسی معاملات کی ہنگامہ خیز تبلیغ اور تشہیر کے سوا ہے کیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ طرز بیان میں فرسودگی اور بڑھاپا محسوس ہو تو سمجھو کہ آرٹسٹ سے اس کی بقا کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے، وہ مر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی بالجبر آرٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ فرد تو فرد مملکت بھی مجبور رہے اس سلسلے میں (   ) کی تاریخ مطالعے کے قابل ہے۔ لیکن جہاں غیر معتدل معاشرے میں آرٹ کی غایت معین کی جا رہی ہو اور اس تیشے کا کام لیا جا رہا ہو، یہ سمجھنا کہ آرٹ پروپگنڈے سے ماوریٰ کوئی قائم بالذات وجود ہے! میں تو نہیں مانوں گا۔

رضا کے خط میں میں نے تمھیں خوب ڈانٹا ہے۔ ذرا پڑھو۔

یہ موضوع دلچسپ ہے۔ فرصت ملی تو ارادہ ہے کہ آرٹ اور پروپگنڈے پر مضمون ہی لکھا جائے۔ میں آرٹ اور پروپگنڈے کے فرق کو محسوس کرتا ہوں مگر ویسا آرٹ نہ آرٹ ہے نہ پروپگنڈا، کیوں کہ مہملات کا نام نہ آرٹ ہو سکتا ہے نہ پروپگنڈا۔

تمھارا

مخدوم

۱۹۴۱ء

الہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو
(مخدوم)

مخدوم محی الدین کا تیسرا مجموعہ کلام

بساطِ رقص

جس میں "سرخ سویرا" "گل تر" اور اس کے بعد کا پورا کلام شامل ہے

نئے سال کا منفرد ادبی تحفہ

اس کتاب کا ٹائٹل عبدالرحمن چغتائی نے بنایا ہے

قیمت:۔ پانچ روپے

ملنے کا پتہ:۔

ادبی ٹرسٹ بک اسٹال

معرفت:۔ روزنامہ "سیاست" جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد۔ ۱

ٹیگور کا پیام

مخدوم محی الدین

کئی سال قبل ۱۹۳۲ء میں مخدوم نے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کی سوانح عمری لکھی تھی۔ یوں تو نیاز فتح پوری کے ترجمہ گیتان جلی کی بدولت ہماری جامعہ کے طلبا میں ٹیگور کی تصانیف کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو چکا تھا لیکن سوانح عمری لکھنے کی تحریک غالباً گرودیو سے مخدوم کی شخصی ملاقات کی وجہ سے پیدا ہوئی طالب علمی کے زمانے میں مخدوم اور میں نے مل کر ایک ڈرامہ "ہوش کے ناخن" لکھا تھا جو ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے اسی زمانے میں شائع ہو چکا ہے۔ اس ڈرامے کو لیاقت منزل (حالیہ اسٹیٹ بنک حیدرآباد توپ کا سانچہ) میں جہاں کلیہ جامعہ عثمانیہ کی جماعتیں ہوتی تھیں اور دفتر قائم تھا ٹیگور نے اسٹیج پر دیکھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور مخدوم کو اور مجھے مبارکباد دی تھی۔ اور اس کے بعد غالباً حیدرآباد میں پہلی بار اسٹیج پر جا کر "جن گن من" سنایا تھا۔ جو بعد میں قومی ترانہ بن گیا۔ (میر حسن)

● یہ کہنا غلط ہے کہ رابندر ناتھ مغربی برکات سے بالکل چشم پوشی کرتے اور مشرق ہی کو جا و بے جا سراہتے ہیں۔ نیکی اور صداقت سے بغل گیر ہونے کے لیے اللہ کے بازو ہمیشہ پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ مشرق کی طرف سے ہو یا مغرب کی طرف سے۔ ان کا مقولہ ہے "انسان کی تمام اعلیٰ ترین کارگزاریاں اور اس کی عظیم ترین شوکتیں۔ مجھے اجازت دو کہ میں انھیں اپنی کہوں"۔ وہ مغرب کی آزادی تنظیم اور اس معاشرتی خدمت کی اسپرٹ کے جو سارے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے دل سے ثنا خواں ہیں۔ "توپوں کے دھویں اور بازاروں کی گرد میں سے اُس کی (یورپ کی) اخلاقی روشنی چمک رہی ہے جس کی بنیادیں

سماجی معتقدات سے ہٹ کر بہت ہی عالمگیر ہیں"۔ (قومیت)

"یورپ نے ہمیں عوام کی بہبود کے اصول اور قانون کا احترام سکھایا جس کی وجہ سے معاشرہ میں ربط اور آزادی برقرار رہتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یورپ نے اپنے صدیوں کو قربان اور شہادتوں کے بعد ہمارے آگے حریت کا علم بلند کیا۔ حریت شعور۔ حریت خیال اور عمل آرٹ اور ادب ہیں"۔ (قومیت)۔

ٹیگور اس احسان کو نہیں بھولتے کہ یورپ نے اپنے تصورات اور تعلیمات سے مشرق کو مستفید کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے دوسرے رخ کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

مغرب کا تمدن

مغربی تمدن کی بنیادیں افادیت پر کھڑی ہوئی ہیں وہ بجائے روحانی کے میکانکی اور بجائے مذہبی کے معاشرتی اور بجائے امن کا مبلغ ہونے کے قوت کا پرستار ہے۔ وہ صداقت کی قربان گاہ پر روحانیت کی بھینٹ چڑھا کر قوت حاصل کر رہا ہے۔ وہ فطرت سے برسرِ پیکار ہے۔ "اپنے ماحول پر غلبہ پانے کے لئے انسان اپنی پوری قوتیں تلاش کے راستہ پر صرف کر رہا ہے۔ وہ مغرب ہمیشہ خود کو منظم بنا رہا ہے تاکہ فطرت اور دوسری نسلوں سے جنگ کرے۔ اس کے ہتھیار روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس کی مشینیں آلاتِ حرب تنظیمیں روز افزوں ترقی پر ہیں"۔ برخلاف اس کے وہ کہتے ہیں کہ ہندوستانِ قدیم کی تہذیب کچھ دوسرا ہی زاویہ نگاہ رکھتی تھی جس میں کائنات کا ہر ذرہ داخل تھا۔ خدا کی مخلوق کو اپنے وجود سے علیحدہ تصور نہ کیا جاتا تھا۔ انسانی آزادی اور اکملیت کا حصول مغربی عقیدے کے خلاف جنگ، استدلال اور قوت کے ذریعہ نہیں بلکہ محبت کے ذریعہ ہوتا تھا۔

ٹیگور جذبۂ وطنیت کے خلاف نہیں مگر یورپ کے اس انسانیت سوز تخیل قومی کو ضرور بری نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کا نتیجہ جنگِ عظیم تھا اور نہ معلوم ایسی کتنی جنگیں ہونگی جہاں مغرب کا اتحاد قومیت کے جنون میں تیر چلاتا ہے۔ "صرف ملک سے محبت رکھنا کافی نہیں۔ پورے طور پر مسلح ہو کر محبت کرو۔ ہر اس وجود سے نفرت کرو جو وہ (اپنا ملک) نہیں ہے۔ نفرت مقدس اور قابلِ احترام ہے"۔ گیتانجلی کے محبِ وطن کی آواز اس سے کس قدر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے "جہاں دماغ خوف سے خالی اور بلند سر ہے جہاں دنیا تاریک دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہوئی ہو جہاں دماغ وسیع نیت اور عمل کے ساتھ بڑھ رہا ہو۔ او مالک آزادی کے آسمانوں میں میرے ملک کو بیدار کر"۔ اسی کے دوش بدوش ان کے دوسرے گیت "غمگین عورت" کو بھی پڑھیئے جہاں وہ تخریبی یلغار سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ "میں نے اسے فتح کی رتھ میں بٹھا کر ارض کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پھرایا۔ مفتوح دل اس کے قدموں پر گر پڑے۔ نعرۂ تحسین سے آسمان ہل گیا۔ اس کی آنکھیں افتخار کی روشنی سے کچھ دیر کے لئے چمک اٹھیں پھر کچھ دیر بعد آنسوؤں سے دھندلی پڑ گئیں غم زدہ عورت پکار اٹھی مجھے اس فتح میں کوئی خوشی نہیں"۔

جنگِ عظیم اور دوسری یورپی جنگوں کی خونی داستان شاعر کے پیشِ نظر ہے جس سے اس کا دل دکھتا ہے اور اس عقیدہ کا کامل یقین ہوتا ہے کہ یورپ نے روحانیت کو بالکل تباہ کر ڈالا۔ انسانی زندگی کے اس ناقابلِ تلافی نقصانِ عظیم

کی وجہ سے دل غصہ سے بھرا ہوا ہے اور بے ساختہ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ ذیل کی نظم ۱۹۱۶ء میں کرسمس کے تہوار میں شاعر نے پڑھی تھی:۔

'اپنی مسرتوں سے مجنوں ہو کر انھوں نے تیرے پیرہن کو خاک آلود کرنے کے لئے گرد اڑائی جس کی وجہ سے حسن مجسم میرا دل بیمار پڑ گیا۔ میں نے تجھے پکارا "اپنا تازیانہ اٹھا" اور ان کا فیصلہ کر دو۔"

قوت کی یہ فرعون سامانیاں اور یہ خود غرضانہ روش جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں بے شمار بندگان خدا کی زندگیوں اور جانوں کی پامالی تھا۔ مغربی تہذیب کو موت اور تباہی سے قریب تر لا کھڑا کیا۔ تمام قدیم سلطنتوں اور تہذیبوں کی تباہی انسان کش ذہنیت کا نتیجہ تھی۔ شاعر اس دردناک حقیقت سے ناواقف نہیں ہے۔ کہتا ہے:۔

"جب کبھی قدیم تہذیبوں پر تنزل کا دور آیا اور وہ سرنگوں ہوئیں تو اس کا سبب سخت دلی اور انسان کی قدر کی ارزانی تھا جب سلطنتوں یا کسی طاقتور انسانی گروہ نے انسان کو اپنی قوت کے بڑھانے کا آلہ سمجھا جب انسان نے دوسری کمزور قوموں کو غلام بنا کر ممکنہ طور پر انھیں زیر رکھنے کی کوشش کی اور اقتدار حاصل کیا تو پھر تہذیب خود کو قائم نہ رکھ سکی اسے مٹنا پڑا۔

یورپ نے ہوا کو بویا ہے جس سے آندھیاں بگولے اور جھکڑ پیدا ہوں گے۔ اور جدید تہذیب کو خس و خاشاک کو گرد و غبار کی طرح لے اڑیں گے۔ مادہ کی حکمرانی ہے۔ سائنس کو تباہی کا آلہ کار بنایا گیا ہے۔ حرص و آز کے بحران میں ایک قوم دوسری قوم کو بے رحمی سے دبوچ رہی ہے۔ دنیا کی تمام سیاہ کاریاں مغرب کے سر پر آ پڑی ہیں یہ علامات اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے دوش پر مغربی تہذیب کا جنازہ نکلنے والا ہے۔ جو حالت نزع میں وہم توڑ رہی ہے مغربی نظام انسان کو روح نہیں بلکہ مشین سمجھتا ہے۔ وہ تباہیوں اور بربادیوں کو جلوس لئے ہوئے زندگی اور اس کی مسرتوں کو نظر انداز کر کے مادہ کی بارگاہ میں سر بسجود ہے روح اور وجدان کو قربان کر کے ذہن کو نواز رہا ہے

اس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی دماغی قوت اس مبالغہ آمیز زراف کی سی ہے جس کی گردن اچانک حد سے زیادہ دوسرے اعضائے جسم سے میلوں دراز ہو گئی ہے۔ اس کا حریص منھ اور اس کے دہشتناک جبڑے دنیا کے انتہائی بلند درختوں کے پتوں کو چباتے میں مصروف ہیں۔ مگر غذا کو اس کے معدے تک پہنچنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ اس لئے اس کا جسم کمی خون سے بیمار ہے۔" (قومیت)۔

قومیت

قومیت بجائے خود کوئی بری چیز نہیں مگر جب وہ خود غرضانہ اور تخریبی مفہوم اختیار کر لیتی ہے تو بری بن جاتی ہے جب تک یہ انسانوں کے تحفظ کے لئے لڑے تو یہ آزادی اور حق کی حامی ہے مگر جہاں اس سے کمزوروں کو غلام بنا کر ان پر حکومت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا وہ بربریت اور بہیمیت کے مترادف ہوگا جذبہ وطن پرستی قابل احترام ہے جب تک کہ اس کی حیثیت دفاعی ہو۔ مقدس ہے جب تک کہ وہ آزادی اور حریت کی علمبردار ہے مگر جہاں اقتدار کا جذبہ کارفرما ہوا قابل ملامت ہے۔

جذبہ قومی ایک فطری جذبہ ہے۔ مذہب اور اخلاق سے بڑھ کر انسان کو اپنے سرزمین سے محبت ہوتی ہے اگر یہ

اور تعمیری بنیادوں پر کار فرما ہو تو یہ حیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی فلاح کا باعث ہے جب کسی قوم یا ملک کے لوگ مخلصانہ طور پر یہ محسوس کریں کہ ہمارا ملک بہتر ہے تو حقیقتاً یہ جذبہ صحیح تمدن اور تہذیب کا معمار اور ترقی و آزادی کا ضامن ہوگا۔ اگر ہم میں حق و صداقت کی روشنی ہے اور دوسرے مگر اس نور سے محروم ہیں تو ہمارا یہ فرض ہوگا کہ ان سیہ خانوں کو منور کریں چاہے اغیار ہمارے اس طرز عمل کو بطیب خاطر قبول کریں یا بجبر۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیان و مذاہب اولوالعزم ہادیان و علمبرداران حق و صداقت نے جیسا موقع ہوا کبھی امن و سلامتی کے وسیلہ سے اور کبھی جبر و قوت کے ذریعہ سے دنیا کو ظلمت سے نور میں تبدیل کیا اور گمراہی سے راہ راست پر لگایا مگر ان مبلغین و مرسلین حق کے بعد ان کے متبعین اور عاملین میں جہاں خود غرضی، دنیا پرستی اور نفس پروری کا عنصر غالب ہوتا گیا تو اسی شمع سے جس سے کہ ہدایت کا کام لیا جانا بجائے گھروں کو منور کرنے کے گھروں کو جلانا شروع کیا تاکہ اپنا مطبخ گرم رہے۔ اسی مسخ شدہ حالت نے قومیت اور قومیت نے شہنشاہیت کی صورت اختیار کی۔ مغرب کی وطن پرستی بھی دراصل اسی خود غرضی اور تنگ خیالی کا ثمرہ ہے۔

مغرب میں ہر قوم اپنا علیحدہ وجود بنا کر دوسروں کو زیر کر کے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی بے شمار ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ یورپی اقوام میں اس حسد، مسابقت اور حریفی کا نتیجہ جنگ ہے۔ یورپ اب تک اپنے باطل تصورات سے چمٹا رہا اس پاداش میں اسے جنگ کی صورت میں تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ "مغرب کے ساحل پر (انسانیت) خود غرضی اور تنزل پذیر تہذیب کی شمع سے جلائی ہوئی نعش کے آخری شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میدان جنگ اور کارخانوں میں توانائی کی پرستش کی جارہی ہے۔ اور تمام کائنات کے محافظ خدا وہ تجھے نہیں پوج رہے ہیں۔"

قومیت ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ یہ ایک قوم کو دوسری قوم سے علیحدہ کرتی ہے ان کے اس شگاف و خلیج کو پر کرنے والی چیز محبت نہیں بلکہ تجارتی معاہدے ہیں۔ ان کی دوستی کی بنیادیں خلوص پر نہیں بلکہ خوف و ہراس پر ہیں۔ اس خوف کا سبب اسلحہ، عسکریت، بحری بیڑے، طیارے اور کروپ کی توپوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قوت ہے۔ وہ ممالک جہاں سیاسی تہذیب کا دور دورہ ہے۔ وہاں ہر قوم دوسری قوم کی مادی دولت کا شکار کرنے کی وجہ سے خوف، حرص اور پریشانی کی فضا میں پل رہی ہے۔ "ان کی تہذیب درندگی کی ہم معنی ہے جس کی زندگی کمزور اقوام کے خون پر منحصر ہے۔ اس کا واحد مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا کی ساری عظمت اس کے گھر میں رہے۔ اس سے پہلے کبھی حسد کے ایسے مظاہرے دیکھے نہیں گئے اور نہ دن اعتماد کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ اور ایسے حب وطنی کہا جاتا ہے جس کا مسلک سیاسی ہے۔" (قومیت)۔

الغرض مغربی قومیت کا نتیجہ نفرت اور رنگ و نسل کا امتیاز اور تعصب ہے۔ دنیا اس وقت تک امن کی صورت نہیں دیکھ سکتی جب تک کہ خود ساختہ امتیازات اور تعصبات نہ اٹھ جائیں۔ اگر قومیت کا خاتمہ نہ ہو سکا تو پھر قوموں کا خاتمہ ہے۔

موجودہ نظام قومیت دوسری قوموں کو ابھرنے اور اپنی خصوصیات کو نمایاں کر کے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع نہیں دیتا۔ رابندر ناتھ اس کے قائل ہیں کہ ہر قوم ہر فرد کی طرح مخصوص ملکات اور شخصیت کی مالک ہے۔ "ہر گروہ ایک جیتا جاگتا وجود ہے جو ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے۔ اور علیحدہ روح اور ذہن کا مالک ہے اسے موقع ملنا چاہیے کہ اپنی شخصیت

اور خوابیدہ قوتوں کا اظہار کرے۔ ہمیں انفرادیت اور ذاتی کردار کو تسلیم کرنا چاہئے چاہے وہ کمزوروں میں ہو یا طاقتوروں میں۔ اسی حقیقت سے انکار ہمیں جنگ کی طرف لیجائیگا۔

رابندرناتھ اپنے خطبات 'قومیت' میں قوم اور عوام میں فرق ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قوم سے مراد مغربی نمونہ قومیت ہے اور عوام سے مراد قدیم مشرقی نمونہ۔ مغربی قوم ایک ایسا گروہ ہے جس کا شیوہ قتل و غارت گری ہے۔ دوسروں کو مطیع کرکے حصول اقتدار اور سائنس کی مدد سے تباہی ہے۔ یہ ایک مردہ بے روح مشین ہے۔ اور وہاں کے لوگ کل پرزوں کا کام دیتے اور اپنی زندگی کو مار کر مردہ مشین کے اجزا بن جاتے ہیں۔ مگر عوام ایک زندہ روح ہیں۔ مشرقی خود کو قوت کے لئے نہیں بلکہ تکمیل کے لئے منظم کرتے ہیں۔ وہ نفرت، قتل، تشدد اور حسد نہیں کرتے۔ بلکہ زندہ رہتے اور محبت، پرستش اور عبادت کرتے ہیں۔ قوم کے افراد مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے مشرقیوں میں زندگی اور روح کی جھلک موجود ہے۔ مگر اب مغربی اثرات کے تحت مشرقی اپنی ان خصوصیات کو کھوتے جاتے ہیں۔

"جاپان بھی ہمیں لوگوں میں سے تھا۔ مگر مغرب نے اپنی گرجدار توپوں کی آواز سے اس سے کہا کہ تو قوم بن جا۔ اور وہ قوم بن گیا اور جب تمہارے سامنے جاپانی قومیت کا کارنامہ پیش کیا جاتا ہے تو تم بھی سر ہلاتے ہو کہ یہ اچھا نہیں۔"

اس وبا نے اس قدر عالمگیر اثرات پھیلا دئے ہیں کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ قومیت بری بلا ہے ہر ملک اسی کے پھندے میں ناگزیر طریقہ پر پھنس رہا ہے۔ یورپ نے جاپان کو اس وقت تک کچھ نہ سمجھا جب تک اس نے قومیت کا جوا اپنی گردن میں ڈال نہ لیا اور اب اس کی خاطرداری اور سلوک میں احترام برتا جاتا ہے۔

"جاپان دولت، انسانیت، حسن اور حب وطن اور خود اظہاری کے توازن سے مالا مال تھا۔ مگر مغرب نے اس کے احترام کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک جاپان نے یہ ثابت نہ کر دیا کہ ابلیس کے خونخوار کتے نہ صرف یورپ کی خندقوں میں بلکہ جاپان میں بھی پرورش پاتے ہیں جن کی غذا انسانی مصائب ہیں۔"

اگر مغرب مشرق کے تصورات اور مطمح نظر کی سطح پر پہنچ جائے تو اس کا مستقبل "یقیناً" اپنے ماضی سے زیادہ روشن رہیگا

مغرب کا مستقبل

رابندرناتھ رجائی ہیں۔ انھیں مغرب کا مستقبل خوش آئند نظر آتا ہے۔ دنیا موجودہ تجارتی وار دیگر حق تلفی اور غصب سے بیزار ہو چلی ہے۔ جنگ کے بعد اس احساس میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ باوجود اپنی تباہ کاریوں اور خون آشامیوں کے ایک نئے باب کا آغاز کرے گی اور انسان موجودہ مصائب سے رہا ہو کر امن کی طرف مائل ہوگا۔ جنگ کے جہنمی راستہ پر چلنے کی وجہ سے اسے جنت سے اور زیادہ محبت ہوگی۔ خودی کا بت ٹوٹ جائیگا۔ خود غرضی ایثار سے اور نفرت محبت سے بدل جائیگی۔ ایسی ہی فضا میں روحانی بنیادوں پر سلطنتوں کے قائم ہونے کا امکان ہے۔

"کیا انسان کی یہ قربانیاں، خون، ماؤں کے آنسو یوں ہی بلا معاوضہ خاک میں مل جائیں گے۔ کیا یہ اپنی قیمت سے آسمانوں کو نہیں خرید لیں گے؟"

شاعر کے عقیدے میں مضبوطی یوں بھی ہوتی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وقتاً فوقتاً یورپ سے ایسے اعلیٰ دماغ افراد نکلتے رہے ہیں جنہوں نے بلا امتیاز رنگ و نسل حق کی حمایت پر کمر باندھ کر انسانیت کی فلاح کی خاطر موجودہ عسکریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور خود اپنے لوگوں سے ذلت بھی اٹھائی، یہی وہ لوگ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حیات ابدی کا جاودانی سرچشمہ ابھی خشک نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مغرب آہستہ آہستہ دوسرا جنم اختیار کرے گا۔

یہ کہنا عین بداخلاقی ہے کہ سیاسیات میں اخلاق کی کوئی جگہ نہیں جیسے فرد کے لئے یہ ضروری ہے مملکتوں کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے جب تک بالطبع انسان صلۂ رحم، ہمدردیٔ بنی نوع انسان کو اپنا مذہب نہ بنائے اور جب تک دنیا میں "جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو" کے اصول پر کاربند نہ ہوگی اور جب تک خود غرضی کو گناہ نہ سمجھا جائے گا اور ہر مملکت دوسری مملکت سے محبت، خلوص، ایثار، اور قربانی سے ترقی میں ہاتھ نہ بٹائے گی تو تمام انجمنیں اور ادارے چاہے وہ بین الاقوامی نقطۂ نگاہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں اور عالمگیر برادری قائم کرنے کیلئے ہی کیوں نہ قائم ہوئے ہوں بے معنی ہیں۔

رابندرا ناتھ نے جب مغربی قومیت کی مذمت کی تو ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس بنا پر قومیت کو برا کہتے ہیں جب کہ خود ہندوستان محض اس کی کمی کی وجہ سے قعر مذلت میں پڑ کر "مفتوح اور شکستہ قوم" بنا ہوا ہے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ خاک جس پر ہندوستانی جھکے ہوئے ہیں ان محلوں اور ایوانوں سے زیادہ مقدس ہے جو قوت اور افتخار کے نام نہاد اینٹ گارے سے بنے ہوئے ہیں کیونکہ یہ خاک زندگی حسن اور پرستاری سے معمور اور زرخیز ہے۔"

"وہ جو اپنے پاؤں سے زندگی کو پامال کرتے ہوئے حماقت کے راستہ پر گامزن ہیں۔ وہ جو اپنے خون آلود قدموں سے زمین کی نازک سبزی پر اپنے نقش قدم چھوڑتے جا رہے ہیں، انھیں خوشیاں منانے دے، مگر مالک میں تیرا شکر گزار ہوں کہ میری قسمت ان کے ہاتھ ہے جو حقیر ہیں۔ اور قوت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ جو تاریکی میں اپنا چہرہ چھپا کر آہیں بھرتے کیونکہ ان کے درد کی ہر ٹیس رات کی مضمر گہرائیوں کو چھوتی ہے۔ اور ان کی بدولت خاموشی میں جمع ہو گئی ہے .... اور صبح ان کی ہے۔

او آفتاب طلوع ہو"

ٹیگور ہندوستانیوں کو اپنی مادی پسماندہ حالت پر شرمندہ ہونے سے باز رکھتے ہیں بلکہ انہیں اس پر فخر کرنے کی تلقین کرتے ہیں:۔

"میرے بھائیو، ان سفید سادہ لباسوں میں طاقتور اور مغرور لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے شرمندہ مت ہو، انکسار سے اپنا تاج بناؤ اور تمہاری آزادی روح کی آزادی ہے۔ اور روزانہ خدا کے تخت کو اپنے خشک اور افلاس زدہ چہرہ سے آراستہ کرو، یقین مانو ہر وہ چیز جو جسیم ہے بڑی نہیں ہے غرور کبھی دیرپا نہیں۔"

ہندوستان جو مشرقی ممالک کا واحد نمائندہ بن سکتا ہے تجارتی فتوحات پر کبھی اپنی قوت صرف نہیں کی۔ اسکو اس بات پر فخر رہا ہے کہ یہ ہمیشہ اعلیٰ تصورات حسن صداقت اور محبت کا سرچشمہ بنا رہا۔ اگر مغرب موجودہ پریشانیوں سے نجات کا طالب ہے تو سوائے مشرقی خیالات کی اتباع کے اور کوئی علاج نہیں۔

ہاں روشنی اور مسرت کی شعاعیں مشرق سے نکل رہی ہیں تاکہ دنیا کی مقید روح کو آزاد کریں۔

پھول اور پتھر

مخدوم محی الدّین

● ایک تھا پتھر اور ایک تھی پھولوں کی بیل؛ دونوں ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ بیل ایک خوشحال خاندان کی طرح بال بچوں یعنی کلیوں اور پھولوں کے ساتھ دن گزار رہی تھی۔ کلیاں صبح میں کھلتیں، پھول بنتیں اور شام — دھوپ کھا کر کمھلا جاتیں۔ بیل ہری بھری تھی.

ایک دن کلیوں کو مذاق سوجھا. مذاق میں جس میں طنز بھی ملا ہوا تھا کلیوں نے پتھر سے کہا "میاں پتھر! معاف کرنا. آخر آپ کا بھی کچھ مصرف ہے اس دنیا میں؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" یہ سن کر پتھر کے دل پر چوٹ پڑی. جل کر اس نے کلیوں سے کہا: "اور آپ سے دنیا کو بڑا فائدہ ہے! صبح میں کھلنا اور شام میں مرجھا کر گر پڑنا. واہ رے زندگی!" پتھر نے دینے کو جواب دے تو دیا. مگر کلیوں کی بات اس کے دل سے نہ نکلی. وہ غم سے کالا پڑتا گیا.

کلیوں نے کرنے کو مذاق کر تو دیا مگر پتھر کے جواب سے ان کا نازک دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ پیلی پڑتی چلی گئیں.

دن گزرتے گئے. صبح ہوتی تھی، کلیاں کھلتی تھیں. شام ہوتی تھی، کلیاں مرجھا جاتی تھیں — پیلی کلیاں — کالا پتھر —

دونوں کے دونوں اپنے غم میں گھل رہے تھے — دونوں میں بات بند تھی. ایک دن وہاں ایک پاگل کا گزر ہوا. وہ آیا گھبرایا ہوا — دیکھا کہ وہاں ایک کالا پتھر ہے. اچھل گیا — پاگل کے دل میں ایک مورت تھی. پاگل نے پتھر سے ایک مورت بنائی — بڑی حسین. زمین نے کہا "یہ دیوی ہے" "آسمانی دیوی!"

مورت بن گئی. پاگل کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے. وہ مورت کو پہروں گھورا کرتا. دیکھا کہ پاس ہی پیلی پیلی کلیاں پڑی ہوئی ہیں. پاگل نے کلیاں چن لیں اور مورت کے قدموں پر کلیاں ڈال دیں. کلیوں نے آنکھ کھولی اور مسکرا دیں.

۱۹۴۰ء

کھوئے ہوئے تارے

مخدوم محی الدین

میں نے اپنی نظم کا پانچواں شعر ختم ہی کیا تھا کہ میرے نوکر نے آکر کہا: "حضور! باہر دو فرشتے ہیں جو آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا: "کیا انھوں نے اپنے نام کے کارڈ نہیں دیے؟"

نوکر: "حضور، کارڈ میرے پاس ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دو ملاقاتی کارڈ دیے۔ ایک پر لکھا ہوا تھا "ہیلائیل" اور دوسرے پر "جیفائیل"۔

"میں نے نوکر سے کہا: "انھیں اندر بلاؤ۔"

ان باوقار ملاقاتیوں کا میں نے بڑی شگفتگی سے استقبال کیا۔ ان کے بڑے بڑے پردار بازو تھے اور ہر بازو میں سات سات مہین پروں کے معطر طرے جن پر نمودۂ سحر کی سی صباحت اور قوس قزح کے سے سات رنگ تھے۔ ان کا جسم ایسی برف کی طرح شفاف تھا جس میں ہلکا گلابی رنگ ملا ہوا ہو۔ میں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور نہایت شائستگی سے عزت بخشی کا مقصد دریافت کیا۔

ہیلائیل نے کہا: "ہم اختصار سے کام لیں گے۔ اب سے سولہ سال پہلے کا ذکر ہے کہ بہار کی ایک خوشگوار رات میں آسمان کے سبز قالین پر میں اور جیفائیل بلیرڈ کھیل رہے تھے۔"

میں۔ "قطع کلام معاف۔ غالباً آسمان کا رنگ نیلا ہے۔"

"ہاں۔ بعض مقامات پر نیلا ہے۔ مگر دوسرے مقاموں پر خصوصاً ایران کے ان خطوں میں جہاں شہزادہ کھلے مرغزاروں کی خبریں ملتی ہیں وہ سبز ہے۔ جو آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

ہیلائیل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے آسمان کے حسین ترین تاروں سے گیندوں کا کام لیا ہے۔"

"اور بلیرڈ کی چھڑیاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"دُم دار ستارے! بازی بہت دلچسپ تھی۔ میں اب جیتنے والا ہی تھا کہ میری زوردار زد سے دو گیندیں کنارے سے باہر چلی گئیں۔"

"کنارے سے باہر؟"

"ہاں افق کے کنارے سے باہر! یہ ہماری بدنصیبی تھی کیوں کہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آسمان میں سے دو تاروں کا گم ہو جانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آسمان کے حکمران نے ہمیں آگاہ کیا کہ ہم اس وقت تک فردوسی مسرتوں میں حصہ نہیں لے سکتے جب تک کہ ان کھوئے ہوئے تاروں کو واپس نہ لائیں۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ہم نے سولہ سال کے عرصہ میں ان کی تلاش میں کیا کیا نہ کیا ہوگا؟ زمین کا چپہ چپہ چھان مارا۔ کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ وہ ستارے سوائے زمین کے کسی اور جگہ گر ہی نہیں سکتے۔ مگر افسوس کہ ہماری ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔

ہم ابدی جلاوطنی کا ارادہ کر ہی چکے تھے کہ ہم نے ایک لڑکی کی بے مثال آنکھوں کا ذکر سنا۔ اگر عام افواہ جھوٹ نہیں ہے تو وہ لڑکی آپ کی محبوبہ ہی ہے۔ ہر طرح سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس دنیائے آب و گِل کی آنکھوں کی بجائے اس کی آنکھوں میں ایک الوہی چمک ہے۔ اب ہماری درخواست ہے کہ وہ انھیں واپس کر دے!"

یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ یہ خیال کہ کوئی میری محبوبہ کی آنکھیں نکال لے جائے گا مجھے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اتنی تو مجھ میں قدرت تھی کہ میں ان فرشتوں کی مدد کر سکوں تاکہ وہ اپنی گم شدہ آسمانی زندگی کو واپس لے سکیں۔ میں نے اپنی محبوبہ کو بلوایا اور مختصر الفاظ میں سارا حال سنایا۔ نہ تو اُسے تعجب ہوا اور نہ وہ گھبرائی۔ — کچھ سوچ کے بعد اپنی آنکھوں کو جتنا پھیلا سکتی تھی، پھیلا کر فرشتوں کی طرف مخاطب ہوئی اور کہا: "حسین فرشتو! اگر تم اپنے کھوئے ہوئے جواہر کو پہچان سکتے ہو تو پہچانو اور مجھے جواب دو۔"

فرشتے قریب تر ہو گئے۔ بڑے غور سے انھوں نے میری محبوبہ کی آنکھوں کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تک وہ دبی ہوئی آواز میں کچھ باتیں کرتے رہے جیسے ممتحن عموماً تبادلۂ رائے کرتے ہیں۔ پھر ہیلائیل نے کہا: "یہ وہ تارے نہیں جو آج سے سولہ سال پہلے آسمان سے گم ہوئے تھے۔ گو وہ بہار کی رات کے تارے تھے مگر نہ ان میں اتنی روشنی تھی اور نہ ایسی چمک۔"

نہایت مایوسی کے عالم میں رخصت ہوئے۔ ان کی حالت پہ مجھے دلی افسوس ہوا اور خوشی بھی کیوں کہ انھوں نے مجھ سے میرے سرچشمۂ محبت کو نہیں چھینا۔

اور میری محبوبہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "میں نے چکما تو اچھا دیا؟" اس نے کہا "یہ صحیح ہے کہ کئی دفعہ میری ماں نے بھی مجھ سے کہا کہ میرے پیدا ہونے کے بعد کھلے ہوئے دریچے میں سے دو ستارے آئے اور میرے حلقۂ چشم میں گر گئے۔ مگر جب وہ فرشتے مجھے دیکھ رہے تھے تو میں نے خود پر اس احساس لذت کو طاری کیا جو تمھارے بوسۂ اولین سے مجھ میں پیدا ہوا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اس مسرت کی یاد میری آنکھوں میں اجرام فلکی سے زیادہ روشنی اور چمک پیدا کر دے گی!!"

۱۹۲۵ء

یورپ کا لکھنؤ — ویانا

مخدوم محی الدینؒ

• ویانا۔ ۲۳ جون ۱۹۵۳ء کو میں ویانا پہنچ گیا جہاں دنیا کے مزدوروں کی انجمنوں (WFTU) کا صدر دفتر ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں یہاں دنیا کے مزدوروں کی تیسری عالمی کانگریس ہونے والی ہے، جس کی تیاری ہر جگہ بڑی دھوم دھام سے جاری ہے۔ میں یہاں ہندوستانی نمائندہ کی حیثیت سے عالمی تیاری کمیٹی میں ہوں، ویانا میں لگ بھگ ایک سال رہنے کا موقع ملا۔ شاید اسی لیے یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلوں میں اسے کسی قدر زیادہ جانتا ہوں، لوگوں کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے گھروں میں، کارخانوں، دفتروں میں، تفریح گاہوں، ناچ رنگ کی محفلوں میں، اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے رنگ (RING) میں مظاہرہ کرتے ہوئے بھی۔ لوگوں کو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور زندگی کی تاب نہ لاکر خودکشی کرتے بھی۔ پستی، بلندی، شادی غمی کے نظارے، ذہن کے تہہ خانوں میں کچھ جاگ رہے ہیں، کچھ سو رہے ہیں، جنھیں جگانا ہوگا اور یہ سب ایک نشست میں ہو نہیں سکتا۔ اس سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ خود آسٹریا کے بارے میں جس کی راجدھانی ویانا ہے مختصر طور پر کچھ کہا جائے؟ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں یہ تاریخی پس منظر مفید ہوگا۔

ویانا کے قیام کے ...... دوران میں مجھے چیکوسلواکیہ سوویت یونین اور چین ہوتے ہوئے سیلون جانے اور ان ملکوں کو کسی قدر نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کا تذکرہ اپنے اپنے موقع محل پر آئندہ ہوگا، اب پہلے آسٹریا کا تاریخی پس منظر اور ویانا کا ذکر جمیل۔

آسٹریا وسطی یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کی آبادی (۷۰) لاکھ سے زیادہ نہیں، جس کی زبان جرمن ہے، صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے جہاں سرمایہ دارانہ

جمہوری نظام رائج ہے۔ رومنوں کے زمانے (۹۰ء) سے لے کر ہاپسبرگ خاندان کے آخری بادشاہ (۱۹۱۸ء)
تک آسٹریا اور اس کی راجدھانی ویانا تجارت، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت کا گہوارہ اور دنیا کے لئے جاذب
نظر رہے ہیں۔ اس کے شمال میں چیکوسلواکیہ، مشرق میں ہنگری، جنوب میں اٹلی اور یوگوسلاویہ اور مغرب میں جرمنی اور سوئٹزر
لینڈ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم تک ہیپسبرگ خاندان کی شاہی رہی، جوزف، آسٹریا کا شہنشاہ اور ہنگری کا بادشاہ رہا۔ آخری بادشاہ
جس کے زیر نگیں آسٹریا، ہنگری کے علاوہ پولینڈ، بوہیمیا (چیکوسلواکیہ) بوسینیا (یوگوسلاویہ) وغیرہ کے اکثر حصے تھے
یہ شہنشاہ (۵) کروڑ انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب فرانس کے زیر اثر یورپ کے اور ملکوں کی طرح
ہنگری اور آسٹریا کے عوام نے بھی علم بغاوت بلند کیا، مگر انقلاب کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۷ء کے بولشویک انقلاب
نے سامراج پر ضرب کاری لگائی اور لبرل طاقتیں کمزور ہو گئیں۔ عوام کو آگے بڑھنے کا حوصلہ اور موقع ملا بہت سے
ملکوں کی طرح آسٹریا نے ۱۹۱۸ء میں شاہی کو نیست و نابود کر کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔

دو جنگوں کے بیچ میں آسٹریا میں بڑی اتھل پتھل ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد شکست خوردہ جرمنی نے فوجی طاقت
کے بل بوتے پر ملک گیری اور انتقام کے جذبے سے پاگل ہو کر فاشزم اور ہٹلر کو جنم دیا۔ جس کے جھنڈے پر جرمن
نسل کی برتری، کمیونسٹ دشمنی اور یہودیت دشمنی کے ساتھ دنیا کو تسخیر کرنے کا نعرہ ہے۔ آسٹریا جو شمال میں
جرمنی سے ملا ہوا ہے اس اثر کی زد میں آئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ویانا کے بہادر مزدوروں نے ۱۹۳۴ء میں اپنے
حاصل شدہ حقوق اور جمہوریت کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو کر ہتھیار اٹھا لئے۔ "مارکس ہاف" مزدوروں کی بستی جنگی
قلعہ میں بدل گئی، آسٹریا کے حکمران سرمایہ دار طبقہ نے ہٹلر سے ساز باز کر کے ملک سے غداری کی اور سوشیل
ڈیموکریٹس نے فاشزم کے خلاف عوام کو تیار کرنے کے بجائے کمیونسٹ دشمنی کا شکار، فاشزم کے سامنے ہتھیار
ڈال دیئے۔ ویانا کے (۱۰۰۰) سے زائد مزدور مارے گئے اور ملک ہٹلر کے چنگل میں آگیا۔ آسٹریا جرمنی ہی کا ایک
حصہ قرار پایا۔ دوسری جنگ کے کامیاب اختتام یعنی ہٹلری فاشزم کے خاتمہ کے بعد از روئے معاہدہ سوویت یونین
امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے آسٹریا کو اپنے مشترکہ قبضہ میں لے لیا۔ ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے سوویت یونین نے آسٹریائی
حکومت سے فوجیں ہٹا لینے کا معاہدہ کیا اس شرط کے ساتھ کہ آسٹریا امن اور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا رہے گا
بعد میں دوسری طاقتوں نے بھی معاہدے کئے۔ اب وہاں غیر ملکی فوجیں نہیں ہیں۔ آسٹریا ایک آزاد جمہوریہ ہے جہاں
سرمایہ دار نظام ہے۔ آسٹریا کی راجدھانی ویانا، وسط یورپ کا حسین و جمیل شہر ہے جو اپنی عمارتوں کے طرز تعمیر، علم،
طب اور فن موسیقی، نفاست و نزاکت میں شہرہ آفاق ہے۔ یہ شہر لندن، پیرس اور ماسکو کے مقابلہ میں چھوٹا ہے
جس کی آبادی (۱۷) لاکھ ہے جس کے شمال اور مشرق میں ڈینیوب بہتا ہے، جنوب اور مغرب میں آلپس کی پہاڑیوں
کے سلسلہ کی آخری حد ہے۔ پہاڑیوں پر انگور کے کھیت اور ویانا کے وہ مشہور جنگل (Vienna Woods)
ہیں جس نے عوام کے مزاج پر اور خاص کر شاعروں اور سنگیت کاروں کے تخیل اور فن پر ساحرانہ اثر ڈالا ہے۔

متحدین کے قبضہ کے زمانہ میں ویانا پانچ زونوں میں بٹا ہوا تھا، سوویت، امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور انٹرنیشنل زون۔ لوگ ایک زون سے دوسرے زون میں آ جا سکتے تھے، کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ۱۹۵۵ء تک ویانا کے جنگ کی خراشیں موجود ہیں۔ ہٹلر نے جاتے جاتے اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ ویانا کے مشہور زمانہ اوپرا ہاؤز پر بم باری کر کے تباہ کر دیا تھا جو پچھلے برس درست ہونے کے لئے مکمل کیا گیا ہے جس کی پہلی رات کے لئے ایک سال پہلے ٹکٹ بک ہو چکے تھے۔ ویانا اپنی خوش مزاجی، نفاست و نزاکت میں مجھے یورپ کا لکھنؤ معلوم ہوتا ہے۔ جرمن جیسی زبان بھی جو کہنے میں کرخت اور بولنے میں سخت معلوم ہوتی ہے ویانا میں آ کر نرمی اور مٹھاس پیدا کر لیتی ہے۔ لوگ بات بات پر شکریہ، مہربانی اور آداب کرتے ہیں، شراب، موسیقی، رقص اور سیر و تفریح کے شیدائی ہیں۔ یورپ کے اور ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کی عورتیں پکوان میں تکلف کے لئے مشہور ہیں۔

ویانا میں ہی نہیں بلکہ پورے آسٹریا میں جتنی تعداد نازی پارٹی کے ممبروں کی تھی کسی اور ملک میں نہیں رہی اور فوج میں بھرتی بھی یہاں سے خوب ہوئی۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے جہاں محبان وطن کو نازی گرفتار کر کے اذیت پہنچاتے اور بالآخر جیل بھیج دیتے یا مار ڈالتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کے مقبوضہ ملکوں میں سب سے کم مدافعت یہیں رہی۔ ایک آسٹریا کی دوست نے مجھ سے کہا کہ ہٹلر کی فوج میں ویانا والوں کی مدافعت صرف ان کا جرمن لہجہ تھا اور کچھ نہیں۔ دو جنگوں نے اس خوش مزاج قوم کا تانا بانا بکھیر دیا ہے۔ اسے اپنے بھولے پن کی بہت قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ یہاں کے لوک گیت ان کی خوش مزاجی اور غمگینی کے امتزاج کے اچھے آئینہ دار ہیں۔

ویانا کا ایک نفسیات کا پروفیسر خجالت کے لہجے میں مجھ سے کہا کرتا تھا کہ یار تم ویانا کا زوال دیکھ رہے ہو، عروج دیکھنے کے قابل تھا۔ موسیقی ابلتی تھی، تین سو آرکسٹرا تھے، تھیٹر، آپرا، قہوہ خانے ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں سے آباد رہتے تھے، شوخ اور چنچل حسین لڑکیاں بازوؤں میں چٹکیاں لے لے کر سرگوشیاں کرتی نظر آتی تھیں۔ نامہ و جام، عہد و پیمان ہوتے تھے۔ اب دیکھو کیا حال ہو گیا ہے، پورے شہر میں تین آرکسٹراؤں کا پنپنا مشکل ہے اور قہوہ خانوں میں، میں اور تم بیٹھے ہوئے ہیں، کرسیاں خالی پڑی ہیں۔

تیسری عالمی ٹریڈ یونین کانگریس کا ویانا کی طرف سے استقبال کرتے ہوئے ویانا کے ایک بزرگ مزدور رہنما نے دنیا کے نمائندوں سے کہا تھا: "ویانا کی حسین سڑکوں پر جب آپ چلیں گے تو ویانا کے تین لاکھ بیروزگار لڑکے لڑکیاں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہوں گے، آپ انہیں نہ بھولئے۔"

صبح ۸½ سے ۵½ شام تک کام کرنے کے بعد خوش ذائقہ کھانے کی تلاش اور وقت گزارنے کا مرحلہ تو شروع شروع میں بلائے جان بنا ہوا تھا۔ سنیچر کے بارہ بجے سے سوموار کی صبح تک ہفتہ وار چھٹی کا گزارنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

ایشیا کے ایک ملک کو ایک ضروری خط مزدوروں کی عالمی کانگریس کے سلسلے میں بھجوانا تھا، میں نے اپنی اسسٹنٹ ٹائپسٹ کو مسودہ لکھوا دیا۔ سنیچر کا دن تھا، کام ۱۲ بجے ختم ہو جاتا ہے، اس دن دفتر کی کینٹین میں کھانے پر

ٹائپسٹ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ کھانے کے بعد خط کو پورا کر دو، تاکہ آج ہی کی ڈاک سے روانہ کیا جا سکے وہ ہنس کر کہنے لگی۔ "سوموار کی صبح کو ملیں گے"۔ اس جواب سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ وہاں کے کام کرنے کی تکنیک ہی یہی ہے۔ لوگ آٹھ گھنٹے روزانہ سکنڈ سکنڈ کی پابندی کے ساتھ بڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور فرصت کے اوقات کو جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اپنا پروگرام بناتے ہیں۔ یورپ کے مزدور جینے کے قابل اجرت (LIVING WAGE) آٹھ گھنٹے روزانہ کا کام ہفتہ میں دو یا ڈیڑھ دن کی چھٹی کے لئے سال میں پندرہ دن سے لے کر ایک مہینہ کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی کے "حق" کو برسہا برس کی شدید جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اور وہ اس کا استعمال بھی خوب جانتا ہے۔ آسودگی کے ساتھ ہی انسان کو فرصت کے مشاغل کی سوجھتی ہے بقول سودا ہمارا تو یہاں یہ حال ہے ؎

یاں فکرِ معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

فرصت اور فراغت سے محرومی نے کام کام اور کام کی وجہ سے زمانہ نے ہمیں جن عادتوں پر مجبور کر دیا ہے ان سے یورپ میں چھٹکارا ہوتا ہے مگر دھیرے دھیرے۔

میرے دماغ میں ایک غلط خیال یہ جما ہوا تھا کہ یورپین کارکن وقت کی پابندی کے نام پر مشترکہ مسئلے کو تیزی سے حل نہیں کرتے ہیں۔ کام اتنا تھا کہ اتوار کے دن کام نہ کرنا تضیعِ اوقات معلوم ہوتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو بھی کام کروں۔ اس خیال پر ہمارے ایک انگریز ساتھی پہلے تو مسکرائے پھر سنجیدگی سے کہا "آپ کو یہاں کوئی نہیں ہوگا"۔ ایک اتوار کو جب میں کام کے شوق میں دفتر آیا سوائے تعلیمی اسٹاف کے جو باری باری سے دن رات کام کرتا ہے۔ دوسرے شعبوں میں سناٹا تھا میں اپنے کمرے میں بمشکل دس منٹ بھی نہ بیٹھا ہوں گا کہ مارے سردی کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے، کمرہ کو گرم کرنے والا کوئلے ڈالنے والا ملازم دور بھی تو اتوار کو چھٹی مناتا ہے میں دفتر سے نکل کر چلا گیا اور پھر کبھی اس "شوقِ فضول" کی جرأت نہ ہوئی۔

اندرا سین گپتا، ہندوستانی ساتھی نے اپنے دوستوں سے ملا دیا، جن میں سے اکثر و بیشتر انگریزی جانتے تھے اٹھارہ زبانیں بولنے والے کوئی (۱۵۰) تو خود ہمارے دفتر کے ساتھی تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کے احباب کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، اجنبیت اور اکیلے پن کا جان لیوا احساس جاتا رہا۔ رنگ (RING) دو رویہ درختوں سے ڈھنکی ہوئی ایک حسین شاہراہ، پرانے شہر کو گھیرے ہوئے ہے جو اپنی دلکشی اور زیبائش کی وجہ سے دنیا کی مشہور اور خوبصورت شاہراہوں میں سے ایک ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ شہر فن کاروں، عالموں، سنگیت کاروں اور معماروں کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ بادشاہوں اور خصوصاً ملکہ ماریا تھیریسیا کے عہد میں دنیا کی ایک بڑی شہنشاہیت کی راجدھانی کی حیثیت سے اسی قدیم شہر نے بڑی ترقی کی۔ مشہور شاہی محل، گرجا گھر،

شاہراہیں، گلی کوچے، تھیٹر، آپیرا، دکانیں، باغ، احاطے، مورتیاں، قہوہ خانے، میوزیم، مدرسے زیادہ تر اسی رنگ پر ہیں، یا رنگ کے اندر قدیم شہر ہیں۔

اب جہاں یہ شاہراہ ہے کسی زمانہ میں یہیں قدیم شہر کی فصیل تھی، صلیبی جنگوں کے زمانے میں ترک ویانا کی اس فصیل تک پہنچ چکے تھے، مگر ۱۶۸۳ء میں یہاں ترکوں کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تحت جب فصیل ٹوٹی اور شاہراہ بنی تو اس پر سوائے سرمایہ دار کے مزدوروں کے قدم رکھنے کی مجال نہ تھی۔ ویانا کے مزدور نے اس سڑک پر چلنے کے حق کو مسلسل جد وجہد کے بعد حاصل کیا۔ اب تو یہ عالم ہے لاکھوں مزدور اپنے مظاہرے اسی سڑک پر کرتے ہیں اور جب کبھی سرمایہ دار سے ٹکر لینے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہتے ہیں "چلو رنگ پر"۔ جارج سے بہتر مجھے کوئی اور نہیں ملا جو اس قدیم شہر کی شکل وصورت اور مزاج سے روشناس کرا سکے۔ جارج مصور بھی تھا اور شاعر بھی تھا۔ اسکی ماں ایک سنگیت کار تھی جو اساتذہ کی قدیم دھنوں سے اپنے مہمانوں کی ضیافت کیا کرتی تھی۔ جارج شہر کے چپہ چپہ سے واقف تھا۔ اسے اپنے شہر سے بلا کا پیار تھا اور پیار میں گہرائی تھی۔

ایک دن ہم دونوں نے موزارٹ کافی ہوز میں سیاہ تلخ کافی پی اور شہر کی سیر کو نکلے۔ بچنہ، دو منزلہ سہ منزلہ مکانات، شاہی محلات، استفانی کا شہرہ آفاق کلیسا اور دوسرے گرجا گھروں کی اندرونی سجاوٹ، کلس، تنگ گلیاں اور ان کے پراسرار موڑ خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ اب آپ یکایک ایک دروازے میں داخل ہوتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی گھر میں جا رہے ہیں، پر وہ چھت دار گلی ہے، پتھر، صحن، حوض، فوارے۔ بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پرانی دلی، بنارس یا اجین جیسے اپنے ہی شہر میں گھوم رہا ہوں۔ شہر کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔ طرزِ تعمیر میں، قدیم سے لے کر جدید تک ہر طرزِ تعمیر کی عمارتیں ملتی ہیں۔ رومنسک (Romanasque) طرز کی سادگی، گاتھک (Gothic) طرز کا دبدبہ اور سنجیدگی، باروق (Baraque) طرز کا جذبۂ آزادی، دل پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ انسانوں کی طرح شہروں کا بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ نئی دہلی باوجود اپنی جدید عمارتوں اور سہولتوں کے کردار کے اعتبار سے بالکل سپاٹ ہے، بہ مقابل پرانی دلی کے۔ ویانا کا یہ قدیم حصہ تو یوں بھی دل چھین لیتا ہے کہ یہاں قدیم بو باس کے ساتھ ساتھ نئی چمک دمک کی خوبصورت آمیزش ہے۔ جارج نے پرانے شہر کی گلیوں میں، ایک مکان کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ موزارٹ نے یہاں فلاں آپیرا لکھا تھا، فلاں مکان میں بیتھوون (Beethovem) نے فلاں سنفنی لکھی تھی، فلاں مکان سے اس کا فلاں عشق وابستہ ہے تو مجھے ہندوستانیوں کی تہذیبی یادگاروں سے بے رخی پر رونا آگیا۔ وہاں ایسی عمارتیں قومی ورثہ کی حیثیت سے محفوظ ہیں، مگر پرانی دلی کے کوچہ بلّی ماران میں غالب کا گھر کسی ہندوستانی دوا خانے کا گودام بنا ہوا ہے۔ سروجنی نائیڈو کا گولڈن تھرشل ہول جس سے

ہماری زندگی کی گراں قدر یادیں وابستہ ہیں اب ایک معمولی ہوٹل بن کے رہ گیا ہے، کسی کے دل کو دھکا نہیں لگتا، افسوس تو اسی کا ہے۔

دو گھنٹوں تک پیدل چلنے کے بعد تھک کر ہم نے ایک ریستوران میں پناہ لی۔ یہ وہ احاطہ ہے۔ جہاں ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں طلباء نے حصہ لیا تھا، انھیں گلیوں میں وہ قدیم ریستوران بھی ہیں جہاں دنیا کے مشاہیر موزارٹ، بیتھوون سے لے کر بڑے بڑے سیاس اور عالم بیٹھا کرتے تھے۔ ایک کمرے میں ان مشاہیر کے دستخط دیواروں پر اب تک موجود ہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کا اب بھی یہ مرکز ہے۔ یہیں وہ زمین دوز شراب خانے ملتے ہیں جہاں داخل ہو کر انسان صدیوں پرانے طلسماتی ماحول میں گم ہو جاتا ہے۔ اندھیرا، اندھیرا، دبی دبی سی روشنی، قدیم دلآویز وضع، قدیم دیواریں پرانے ساز و سامان، ہتھیاروں، مرتبانوں جام اور صلیبوں سے سجی ہوئی حتیٰ کہ ماحول میں سچائی پیدا کرنے کے لئے ایک جگہ چھت کے لٹکتے ہوئے جالے تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہاں سوائے مرد عورت اور شراب اور سنگیت و رقص کے ہر شئے پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے جسے جدید الشان کے خلاق ہاتھ نے اور بھی نکھار دیا ہے۔

جارج کی ماں نے ایک شام کھانے پر بلایا تھا وہاں حسنِ اتفاق سے ہنری سے ملاقات ہوئی جس نے ہندوستان پر جرمن زبان میں ضخیم کتاب لکھی ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس کتاب میں میری نظم "تلنگانہ" کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ میں ہنری اور جارج کی ماں کھاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ جارج نے اتنے میں میری تصویر بنا ڈالی۔ آئیل میں، ہمیں بتائی، ہو بہو کریلانی کی شبیہہ میں انکار کر رہا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں مگر وہ اصرار کرتا رہا کہ نہیں تم ایسے ہی ہو۔ میں آج تک قائل نہیں ہو سکا کہ وہ شبیہہ میری ہے۔

۱۹۵۷ء

"خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے"

سردار جعفری کا

"ایک خواب اور"

جسے ہند سوویت کلچرل اسوسی ایشن کا "نہرو ایوارڈ" مل چکا ہے

قیمت :- چھ روپے

حلقۂ ادب - ۱۰ ایسیتا محل بومن جی پیٹٹ روڈ بمبئی ۲۶

اپنا کھانا
اپنا گانا

مخدوم محی الدین

● کامریڈ داگنے کی بیوی نے جنھیں ہم سب نانی کہہ کر پکارتے ہیں یورپ جاتے ہوئے مرچ مسالے کی شیشی میرے ساتھ کر دی تھی۔ دفتر کا کینٹین ہو یا کوئی رستوران وہ شیشی برابر ساتھ رہتی۔ بیرے کھانا پروسنے والی لڑکیاں پوچھتیں "کیا یہ پیپر کا (PAPRICA) مرچ ہے؟" تو میں ہاں (YA) کہہ کر ولائتی کھانا زہر مار کرتا۔ مگر ایک مہینے کے اندر وہ سارا مرچ مسالہ ختم ہو گیا۔

"اپنا کھانا، اپنا گانا" بزرگوں کے اس قول میں کتنی سچائی ہے اس کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہمیں خود ہندوستان میں ہو جاتا ہے جہاں زبانوں اور تہذیبوں کی طرح ذائقہ اور پکوان میں باوجود (بظاہر) یکسانیت کے بلا کا تنوّع موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اور فنون کی طرح قبائل اور قوم نے کھانے پینے کے فن کو بھی ترقی دے کر اپنا اپنا ذائقہ پیدا کر لیا ہے جس کے بنانے میں عضویاتی عمل آب وہوا، معاشی مسائل کے علاوہ تہذیب وتمدن مذاہب کے حلال وحرام کی تفریق اور بے بنیاد تعصبات نے بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ جو تسلسل اور تواتر کی وجہ سے عادت بن گئے ہیں۔ ترغیب وتکریہہ کے اکسانے میں ان عوامل کو بڑا عمل دخل ہے، جو بے شعوری طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔

ویانا میں میرا ایک ہندوستانی دوست جین تھا جو مذہبی نہیں تھا۔ مگر دسمبر کی سردیوں میں بھی وہ دہی چاول اور سبزیوں پر گزارہ کرتا تھا۔ اس سے پوچھو کہ "بھئی یہ کیا؟" تو کہتا، "عادت" اور اس کی فلسفیانہ اور جمالیاتی توجیہہ بھی کر دیتا۔

کئی ہندوستانی اور پاکستانی احباب برسوں سے ماسکو میں ہیں۔ مگر جب کبھی کوئی ہندوستانی ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو بڑے ترس سے کہتے ہیں "یار مرچ مسالے بھیجو ہندوستان سے، مرتے ہیں اپنے مزے کے لیے۔"

تاشقند میں مفتی اعظم بادشاہ جان اور ان کے

صاحبزادے حاجی ضیاء الدین کے ہاں جب ہم ہندوستانی نمائندے مدعو تھے تو بار بار کٹ اٹ کی رکعت کان میں پڑی اور میز پر کئی قسم کے نان، کباب، قورمہ، شوربہ، پلاؤ دیکھا۔ ان کے نام، ان کا رنگ، ان کی خوشبو اور ان کے ذائقہ نے ذہن سے یہ محو کر دیا کہ ہم کسی غیر ملک میں ہیں۔ بنگالی ساتھی چٹرجی نے کہا۔ بھیا! یہ تو اپنا ہی کھانا ہے۔ دو مرے ہلکم تک کھاتے رہو۔ کئی مسلمان مختلف ملکوں کے ایسے ملے جو شراب تو شوق سے پیتے ہیں مگر سور کے گوشت سے نفرت کرتے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ملے جو مرغ، مچھلی، جھینگا تو چٹ کر جاتے ہیں مگر گائے کے گوشت کے نام سے چڑھتے ہیں۔

خود یورپ میں گھوڑے کا گوشت لوگ کھاتے ہیں مگر غریب لوگ، ابلا ہوا سوکھا، پسا ہوا گوشت ہوتا ہے جیسے سلامی کہتے ہیں جو روزانہ لوگ ہر کھانے پر شوق سے کھاتے ہیں جب میں نے کہا: یہ گدھے کا گوشت ہے تو ہمارے دوست بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ہم اس لئے نہیں کھاتے ہیں کہ گدھے کا گوشت ہے بلکہ اس لئے کہ لذیذ ہے۔

چین میں ایسے بھی سبزی خور موجود ہیں جنہوں نے دودھ کو چکھا تک نہیں۔ وہ ایسے بھی گائے کا ایک حصہ سمجھ کر حرام قرار دیتے ہیں۔ بھیکڑے کا مغز تو ناشتے میں مرغوب غذا ہے۔ روس کے کبوتر تازہ مچھلی کے انڈے دنیا کی نفیس غذاؤں میں سے ایک ہے۔ مگر بہت سے لوگ کو پچتی نہیں۔ چین میں سانپ کھا لیا جاتا ہے۔ میں نے کینٹن میں چینی احباب سے فرمائش کی کہ سانپ کھلائے تو وہ ہنس کر ٹال گئے کہ خزاں کے موسم میں آئے تو کھلائیں گے۔ حالانکہ میں نے دیکھا، بازار میں سانپ بک رہے تھے۔ شاید اسی خیال سے کہ کہیں ہیں تے دے نہ کر دوں۔ ان دوستوں نے اچھا کیا کہ میری فرمائش پوری نہیں کی۔ مگر میں نے دیکھا کہ خود ہندوستان میں قبائلی لوگ اور وہ لوگ جنہیں "جرائم پیشہ" کا نام دیا جاتا ہے زندگی کے تقاضوں سے کیا کیا نہیں کھاتے ہیں۔ بہار کے کوئلہ کے کان کن چپکے سے آپ کو دعوت دیں گے "سانپ کھاؤ گے بھیا"۔

پینے کا بھی یہی حال ہے پینے والے و نہیں پینے والے۔ دونوں قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ جہاں ہاں کچھ آب و ہوا کے اثر سے کچھ مذہبی اور سیاسی احکامات اور روایات کے تحت زہد و تقویٰ اور ریاکاری عام ہے۔ مگر لوگ اچھی بری جیسی بھی ملے پی لیتے ہیں۔ پینے والے تو وہاں بھی پیتے ہیں جہاں کہا جاتا ہے کہ ممانعت ہے۔ مگر خانہ کشید مضر صحت شراب پی کر اپنی صحت و عافیت کو غارت کر لیتے ہیں۔

یورپ میں شراب غذا اور تہذیب کا جزو ہے۔ مگر کہیں قانونی طور پر منع نہیں۔ ہاں اسکینڈی نیون ممالک جیسے ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور فن لینڈ میں سوشل ڈیماکریٹس کی حکومتوں نے پینے پر پابندیاں ضرور لگا دی ہیں۔ فن لینڈ میں تو کمیونسٹ پارٹی نے اپنے ممبروں پر حرام قطعی کر دیا ہے۔ پینے والے کو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے کمیونسٹ ممالک میں قانونی طور پر منع نہیں۔ البتہ بچپن ہی سے نئی نسل کو الکحل کے مضر اثرات سے واقف کر دیا جاتا ہے چنانچہ

سوویت یونین میں نوجوانوں میں شراب سے زیادہ دودھ پھلوں کا رس بہت مقبول ہیں۔ ویانا میں مدرسین کی بین الاقوامی کانگریس میں ایک روسی نوجوان بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ میں نے کہا "ووڈکا . . . . اپنی قومی شراب کیوں نہیں پی رہے ہو؟" تو اس نے کہا: "ووڈکا سے مجھے نفرت ہے!" چین کے لوگوں نے ہمیں فخر سے بتایا کہ شراب کا استعمال چین میں بڑھ رہا ہے کیونکہ لوگوں کی خوشحالی بڑھ رہی ہے۔ مگر وہ روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ میں ایک آدھ بار پی لیتے ہیں۔ پہلے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھی اب بڑے پیمانے پر سب پیتے ہیں۔

یورپ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو گوشت، شراب اور سگریٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔ مگر ایسے خاصانِ خدا خال خال ہیں۔ بہت سے ملکوں کی سیاحی نے یہ حقیقت تو روشن کردی کہ حضرت انسان ایک ایسے جانور ہیں جو زندہ رہنے کے لئے سب کچھ کھاتے ہیں۔ نہ صرف کھاتے ہیں بلکہ ذائقہ دار بنا کر لطف لیکر کھاتے ہیں اور پیتے بھی ہیں۔

راحتِ جاں

مخدوم محی الدین

● میری ولسٹون کرافٹ، انگریز لڑکی نہ صرف اچھی جرنلسٹ تھی بلکہ اچھی ماں، اچھی بیوی، اچھی دوست ہونے کے علاوہ پکوان میں بھی استاد تھی۔ اس کا امریکی نژاد شوہر جان اقتصادیات کا عالم، عجیب خصوصیات کا نوجوان تھا۔ آج عورتوں کے بناؤ سنگھار سے چڑ تھی۔ کہتا کہ مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے عورتیں ایسا کرتی ہیں۔ ناچ بھی اسے پسند نہیں تھا۔ کہتا کہ ناچ میں جو تھکن ہوتی ہے وہ ایک دو میل پیدل چلنے سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔ میری نے اب تک خیام کا صرف نام سنا تھا، پڑھا نہیں تھا۔ میں نے ویانا کے ایک دوست سے انگریزی خیام کا انگریزی ترجمہ (فٹز جیرلڈ کا) اسے دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا: ”کیا رائے ہے تمھاری خیام کے بارے میں؟“ تو میری نے کسی قدر معذرت خواہی کے انداز میں میں کہا۔ ”جان نے خیام کو پڑھنے کے بعد کہا کہ کیا تم خیام پر ایک گھنٹہ ضائع کرو گی؟ تو خیام کے اقتصادی نظریے کو میں تمھیں ۲ منٹ میں سمجھا دوں گا بغیر پڑھے۔“ اس نے کتاب مجھے لوٹا دی۔ حقائق کی توجیہہ میں جان کا نقطۂ نظر بڑی حد تک میکانکی تھا۔

میں نے یہ قصہ ایرانی دوست ایرج اسکندری کو سنا دیا تو ان پر شاق گزرا۔ ایرج اسکندری ایران کی تودہ پارٹی کے قائد اور اس کی حکومت کے وزیر تھے۔ رجعت پرستوں کے ہاتھوں تودہ حکومت کی معزولی کے بعد وہ ویانا میں مقیم تھے ۔۔۔ نوآبادیاتی ممالک کی سیاست اور معیشت پر وسیع معلومات اور گہری نظر رکھتے تھے۔ سیاسی ہم خیالی کے ساتھ ساتھ ہند ایرانی کلچر کے صدیوں پرانے استوار رشتے بھی باہمی خلوص اور محبت کی بنیاد تھے۔ ایرج اسکندری کو حافظ خیام کے علاوہ جدید شعرائے فارسی (ہند و ایرانی) کے ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ ہم جب کبھی ملتے تو فارسی اشعار ہی پر گفتگو ہوتی۔ میں نے ان سے خاص طور پر ملک الشعرا بہار کی ایسی نظمیں سنیں جو اس سے پہلے نہ کہیں پڑھی تھیں اور نہ سنی تھیں۔ ایسے بھی موقعے ملے کہ سالٹی ان اشعار کو خوش الحانی کے ساتھ خاص ایرانی لہجے اور طرز میں سناتا۔ انھیں اس کی

بیوی گوشت بھونتی اور علی رہسن رانتشا اور کلام کے نکات سمجھا جاتا۔ ان تمام نعمتوں کا دیا میں اکٹھا ہو جانا قدرت کی بے بہا دین تھی۔

میں ایرج اسکندری اور جان کے مزاج اور طبائع کے اختلاف کا لطف لیتا رہا۔ جان کو قائل کرنے کی کوشش فضول تھی۔ جان دوسری جنگ عظیم میں فاشسٹوں کے خلاف امریکی فوج میں بڑے عہدے پر فائز تھا مگر اب وہ جلاوطنی میں اپنے وطن سے دور دیا میں تھا کیونکہ امریکہ کے جنگ باز حکمراں اس کے امن عالم اور بین قومی دوستی اور جنگ کے خلاف خیالات کو خطرہ سمجھ کر امریکہ میں داخل ہونے نہیں دیتے ہیں۔ الزام یہ تھا کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ مگر جان کھانوں کا شوقین تھا اور وہ بھی تیز کھانوں کا۔ کھانے کے وقت میز پر وہ پیاز۔ مرچ اور لہسن کاٹ کاٹ کر مہمانوں کی طرف بڑھاتا اور خود بھی مزے لے لے کر کھاتا تھا۔

ذائقہ کی تلاش میں، میں نے دیا کے معروف اور غیر معروف سب ہی مقامات آزما ڈالے۔ فرنچ، اطالوی، روسی، چینی، ہنگرین، یوگوسلاوی سب کھانوں کا مزہ چکھا۔ ایک دو ریسٹوران ایسے ملے جہاں تمام کا کھانا اپنے ڈھب کا مل جایا کرتا تھا۔ بفٹ یا تھ کے کنارے شیشے کی الماریوں میں لال لال مرچ کے گچھے راہرؤوں کو کام و دہن کی آزمائش کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے نظارے ہی سے منھ میں پانی آجاتا تھا اور احباب تو تفریحاً تبدیلِ ذائقہ کے لئے تیز کھانے گوارا کر لیتے۔ مگر جان ایک ایسا تھا جو مزے لے کر کھاتا۔ کھانوں کا ذائقہ تو خیر عام یورپین گھرانوں سے ہٹ کر کسی قدر تیز ہوتا تھا۔ مگر ان کا نام بھی میرے لئے کچھ کم ترغیب کا باعث نہیں تھے۔ کوفتہ۔ قورمہ۔ کباب۔ سیخ۔ شامی کباب۔ ایک اور کھانا تھا جس کا نام تھا "شمشیر سلطان الحمید" جو محض مرچ کی تیزی کی مناسبت سے شاید رکھا گیا ہے۔ اور آخر میں ترکی مٹھائی "راحت جان" جسے ایران میں "راحت حلقوم" کہتے ہیں "ذائقہ" کی تکمیل کر دیتا۔

یہاں نہ صرف سیاح، سفارت خانوں کے افسر اور عملے والے بلکہ خود دیا کے چٹورے جمع ہوتے ہیں۔ ریسٹورانوں کی خاموش فضا میں سنگیت کے استادوں کی دھنیں ہلکے ہلکے سروں میں دل و دماغ پر خوشگوار اثر ڈالتی رہتی اور کانچ کی خوشنما انگیٹھیوں پر تازہ اور گرم گرم غذا میزوں پر پروسی جاتی۔ سردیوں میں تابے سے نکلتی ہوئی بھاپ منظر میں اشتہا انگیز فضا پیدا کر دیتی تھی۔ یہ مزیدار کھانے سربیا اور مقدونیہ کے ہوتے تھے جن پر ترکوں کی تہذیب کا گہرا اثر ہے کام ختم کر کے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر گرم گرم ساسیج (SASEGS) چٹنی کے ساتھ بطور ناشتہ کھا لیا کرتا۔ اور شام میں اگر جیب میں پیسے ہوتے تو مرچوں والے ریسٹوران میں چلا جاتا۔ ایسا کھانا مہنگا تھا اور گاہے گاہے نصیب ہوتا تھا۔

ہندوستان کے مقابلہ میں یورپ میں عام طور سے لوگوں کی صحت بہتر ہے جس میں آب و ہوا، معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ غذا کو بڑا دخل ہے۔ غذا متوازن ہے تو بھی ذائقہ کے پیش نظر جدید طب کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے دل و دماغ اور جسمانی صحت کے لئے ضروری اجزا غذا میں شامل ہیں۔ گوشت، روٹی، سبزی، چکنا ہٹ، پھول، الکحل، کافی وغیرہ میں غذا کے ضروری عناصر شامل ہوتے ہیں۔ مگر اچھی یا بری غذا کا انحصار اس پر بھی ہے کہ ہماری آدمی کیا ہے —— جس کی زبان پر تگڑ بگھار بیگن، انباڑے کی بھاجی، کھٹی دال، قیمہ میتھی کی بھاجی چڑھے ہوئے ہوں، اس کے سامنے یورپ کا خوانِ نعمت

بھی سچ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ولایتی غذا گوارا ہونے لگی تھی۔ ایک دن میری نے کھانے پر بلایا۔ کہا کہ ہندوستانی کھانا کھاؤ گے تم آج؟ میں کسی قدر وقت سے پہلے ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ میری نے گیاس کے چولھے پر چاول، ترکاری، گوشت آدھ پون گھنٹے میں بنا دیئے۔ جان نے برتن دھوئے اور میز چن دی۔ اس دوران میں، میں ان کی بچی سارا سے کھیلتا رہا۔ جب مجھے ماں بن کر کوچ پر تھپک تھپک کر سلاتی اور کبھی کہتی کہ آنکھیں بند کر دو۔ اس کی ماں سلانے کے لیئے جو جو ترکیبیں کرتی ہوگی سارا نے وہ سب مجھ پر صرف کر دیں۔

میرے علاوہ ایک انگریزی شاعر اور اس کی بیوی، ایک آسٹریائی مزدور اور اس کی انگریزی بیوی بھی مدعو تھے میں نے تو صرف مشروم مخانہ، گوشت کا سالن، چاول کے ساتھ کھایا۔ واقعی ہندوستانی سالن تھا۔ میں حیران تھا میری نے آخر یہ بنایا کیسے؟ وہی مرچ مسالا، وہی خوشبو، وہی رنگ، وہی ذائقہ۔ مہینوں بعد اس دن مونچھوں پر تک پسینہ آگیا۔ دوسرے دن کسی کو تو کچھ نہیں ہوا۔ مگر میں پیچش میں مبتلا ہو کر تین دن تک فرش پر رہا۔

کچھ دن بعد ویانا میں عالمی امن کونسل کے اجلاس میں روسی شاعر تیخونانف سے ملاقات ہوئی۔ جن سے میں بڈاپسٹ میں مل چکا تھا۔ پوچھا کہ یہاں کی غذا کیسے چل رہی ہے؟ میں نے کہا کہ اب معدہ اس قدر "مہذب" ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستانی غذا کے خلاف بغاوت کر رہا ہے ——!

۱۹۵۷ء

پتھر گٹی پر امتیازی ہوٹل

آرام

خوبصورت، آرام دہ، ماڈرن فرنیچر سے آراستہ

ویجٹیرین و نان ویجٹیرین ہوٹل

خاص اہتمام سے تیار کیے ہوئے خصوصی پکوان جو نفاست، لذت اور ذائقہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے

فون (۴۲۶۷۶)

آج ہی دوست احباب کے ساتھ لطف اندوز ہوئیے

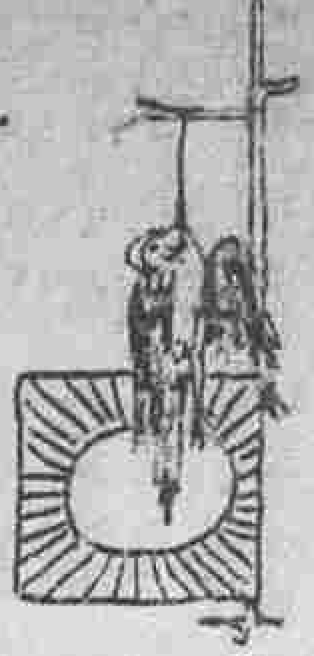

عید اور خودکشی

مخدوم محی الدین

سب لوگ اسے "موتی" یعنی ماں کہہ کر پکارتے تھے۔ ویانا میں یوں تو ہر سڑک پر ہر گلی اور نکڑ پر ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ درجے کے کیفے مل جاتے ہیں۔ مگر موتی کے کیفے کا جواب نہ تھا۔ ہفتہ میں چار یا پانچ دن تو بالکل سناٹا رہتا، البتہ جمعہ کو جو تنخواہ کا دن ہوتا

چہل پہل ہوتی، چھوٹا سا کمرہ جس میں بمشکل دس پندرہ آدمی بیٹھ سکتے بھرا ہوا نظر آتا۔ جمعہ، سنیچر اور اتوار کی رات میں عام طور سے مزدور، ملازم پیشہ، چھوٹے کاروباری …

طالب علم، بے روزگار اور کچھ مشتبہ لڑکے اور لڑکیاں جمع ہوتے، رات گئے تک کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، ناچتے گاتے اور چلے جاتے، جھگڑے بھی ہوتے مگر شاذ و نادر۔

غریب طالب علم ہارمونیکا اور دوسرے ساز بجاتے، یہی اس کیفے کا آرکسٹرا تھا۔ حاضرین ان پر ناچتے گاتے اور طالب علموں کو سب لوگ حسب مقدور پیسے دیتے جن سے وہ اپنے جیب خرچ اور تعلیمی اخراجات کی تھوڑی بہت تکمیل کر لیتے تھے۔ یہ کیفے میرے ہوٹل کے نیچے فرش پر تھا۔ پراٹر (PRATER) ویانا کا ½۲ مربع میل باغ سامنے ہی ہے، جہاں ہر روز میلہ سا لگا رہتا ہے۔ طرح طرح کے کھیل تماشے، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہیں وہ (۲۱۱) فٹ اونچا بڑا پہیا ہے جس میں جھولے ٹنگے ہوئے ہیں اور جہاں سے لوگ رات میں جگمگاتے ویانا کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہوٹل آتے جاتے موتی سے میری علیک سلیک ہو جایا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی موتی کے کیفے میں بھی وقت گزار لیا کرتا تھا۔ بڑی بی اکثر اکیلی ہی رہتیں، مجھ سے میرے حالات پوچھتیں۔ معنی خیز انداز میں یہ سوال بھی کر دیتیں "کیا تم ویانا میں خوش ہو؟"

میں نے موتی کو ہنستے ہوئے بہت کم دیکھا۔

. . . . ایک گاہک بھی کیفے میں نہ ہوتا مگر وہ اپنے سفید فریم کا چشمہ لگا کر حساب کتاب میں یا کوان …

… افراد … موتی کے دوستوں میں …

ایسے تھے جو اکثر پابندی سے شام میں آیا کرتے تھے۔ ایک تو ہاسٹل کی نرس تھی عمر ہوگی کوئی پندرہ سال کے لگ بھگ۔ شوہر کو چھوڑ چکی ہے کہتی ہے کہ اسے مردوں سے نفرت ہے۔ ڈیوٹی ختم کر کے آنے کے بعد یہ میز صاف کر کے کھانے پینے کی چیزیں میز پر لا کر رکھنے کا کام کر دیا کرتی تھی اس کے چہرے پر راہبوں کی سی اداسی اور اس کی نیلی آنکھوں میں غم کا گہرا سمندر نظر آتا ہے بہت کم ہنستی جب ہنستی تو معلوم ہوتا کہ طنز کر رہی ہے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا سوائے اس کی دس برس کی بچی کے اور منہ بولا ماں ہوتے کے۔ ایک اور دوست تھا جس کی عمر (۴۰) سال سے تجاوز تھی جس کے سر میں ایک بال بھی نہ تھا انگریزی بہت اچھی بولتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ بلوبیرشرٹ کہہ کر مخاطب کرتا انگریز قوم کا بے انتہا ثنا خواں چرچل سے لیکر ہیری پولٹ تک سب انگریز اس کی نظر میں برابر تھے چرچل کی مخالفت کرو تو وہ برا مانتا کہتا کہ کوئی انگریز برا نہیں جس انگریز قوم نے مجھے جنگ میں پناہ دی وہ بری نہیں ہو سکتی۔ جب ہٹلر نے میرے خاندان کے ۲۳ آدمیوں کو یہودی کہہ کر بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تو کس نے مجھے پناہ دی؟" وہ یہودی تھا۔ جنگ کے دوران میں بچ بچا کر لندن پہنچ گیا تھا جہاں کسی جہاز میں اسے نوکری مل گئی تھی وہ یہودی تھا اور اکیلا تھا۔ ہفتہ میں ایک دو دن اس کیفے میں نظر آتا بہت خاطر مدارات کرتا کبھی کبھی وہ مجھے دوسرے کیفے میں لے جاکر میرے ساتھ بلیرڈ کھیلتا۔

دسمبر میں حضرت مسیح کی ولادت کی عید کے زمانے میں ایک شام میں ہوتے کے کیفے میں بیٹھا ہوا تھا۔ نرس اور جرنلسٹ بیٹھے تھے ہوتے میری میز پر بیٹھی ہمیشہ کی طرح میرے گھر اور بچوں کے بارے میں سوالات پوچھ رہی تھی۔ اس شام وہ ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر سوالات کرتی جا رہی تھی مجھ سے دریافت کیا: "کیا تمہیں ہماری یہ عید پسند ہے؟" میں نے کہا۔ کیوں نہیں! لوگ بہت خوش و خرم نظر آتے ہیں بڑی دھوم دھام ہے شہر میں۔ اس جواب پر ہوتے رونے لگی آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ میز سے اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ ہوتے کیوں رو رہی ہے۔ جرنلسٹ کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی آنا باقوی شخص بالکل چپ تھا۔ میں نے نرس سے پوچھا کیا بات ہے ہوتے رو کیوں رہی ہے؟ غمگین آنکھوں سے اس نے مجھ پر طنزیہ نظر ڈال کر کہا: آپ جانتے ہیں ہوتے کا کیفے کیسے چلتا ہے۔ یہ کرسمس کی عید تو ایسی عید ہے جس میں خاندان والے سال میں ایک بار ملتے ہیں ماں باپ بچے رشتے دار یہ عید گھر میں مناتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے ہوتے کا شوہر اور اس کا اکلوتا بیٹا جنگ میں مارے جا چکے ہیں، ہوتے کو ان کی یاد آرہی ہوگی۔ مفلسی اتنی ہے کہ سردیوں میں ہوتے کے پاس گرم کوٹ اور جوتا خریدنے کے لئے پیسے نہیں۔ اب وہ روئے نہیں تو کیا کرے۔" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا گرم کوٹ اور جوتا کون دلائیگا۔ ہوتے کو اور اس کے بیٹے اور شوہر کو کون واپس لوٹائے گا .... رات میں ولیم نے کھانے کی دعوت دی تھی وہ اور میں ٹرام میں ویانا کی سڑکوں پر سے گزر رہے تھے، ویانا کی دکانیں اپنی سجاوٹ میں مشہور ہیں۔ عید کے موقع پر ان کا حسن دوبالا ہو گیا تھا کرسمس کا درخت اور اس میں رنگ برنگی روشن قمقمے اکثر دکانوں میں دکھائی دے رہے تھے حضرت مسیح سے پہلے بھی پیگن (PAGAN) عہد میں یورپ کے لوگ یہ تہوار منایا کرتے تھے۔ جاڑوں کی اندھیری رات

میں چراغ جلا کر تاریکی کو دور کیا جاتا، انڈے اور خرگوش کھائے جاتے، یہ دراصل افزائش نسل انسانی کے لئے بہت موزوں سمجھی جاتی تھیں، گو اب مذہبی رنگ چڑھ گیا ہے مگر لوگ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ملنے ملانے پر خرچ کرتے ہیں سال میں ایک عید مناتے ہیں مگر ڈھنگ کے ساتھ سال بھر اس کا اہتمام رہتا ہے۔

ولیم کوئلہ کی کان کا خاندانی مزدور تھا۔ اس کے بیوی بچے ویانا میں رہتے تھے وہ کان کنوں کے انٹرنیشنل میں کام کرتا تھا ولیم فیاض اور دردمند دل رکھتا تھا، چھوٹا ہو یا بڑا ہر شخص سے خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے ملتا جب وہ ہنستا تو آنکھ کے گوشوں پر لال لال جھریاں شعاعوں کی طرح نکل آتیں وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا Mak, Iam the first English Colony and not you یعنی میک انگریزی کا پہلا غلام میں ہوں تم نہیں جو اس کے چہرے پر محبت یا نفرت کے دو ہی جذبے حاوی رہتے مگر جب کچھ زیادہ پی لیتا تو آنکھیں بند کرکے ویلش زبان کا ایک درد انگیز گیت گانے لگتا، جو کوئلہ کی کانوں کے مزدوروں کی مناجات ہے جس کا متن لال جھنڈا اور دھن مسیحی دعاؤں کی سی ہے اس وقت اس کے چہرے کی ایک ایک شکن کان کنی کی درد بھری داستان بن کر ابھرتی جاتی۔ ولیم کے پاس اور احباب بھی مدعو تھے، جاپانی، انڈونیشیائی، عرب اسرائیلی، حبشی اور آسٹریائی کھانے پینے، گپ شپ اور گیتوں کے بعد بالآخر وہ مقام آیا جہاں ولیم نے اپنا محبوب ویلش گیت کان کنوں کی مناجات شروع کیا، محفل پر افسردگی چھانے لگی محفل میں ویانا کی پولیس کا ڈاکٹر بھی موجود تھا جو ویانا کے ایسے ایسے حالات بیان کر رہا تھا کہ عید کی رات بھیانک معلوم ہونے لگی۔ اس نے کہا ویانا میں کرسمس کی رات جتنی خودکشیاں ہوتی ہیں سال بھر میں کبھی اور وقت نہیں ہوتیں، اس رات کا ایک اور ہی ویانا نظروں کے سامنے تھا بیتھوون اور موزارٹ کی رسیلی دھنوں کا نہیں بلکہ ان کی خودکشی کا۔

میں اور ایک اسرائیلی دوست حبیبی ٹیکسی لیکر اپنے ہوٹل آنے کے ارادے سے ولیم کے گھر سے نکل گئے۔

شوفر سے میں نے پوچھا کیا تم انگریزی جانتے ہو۔ اشارے سے جواب دیا "نہیں" میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن میں پتہ بتایا اور ہم چلنے میں اور حبیبی عرب اسرائیل پر باتیں کر رہے تھے، شوفر ہماری باتوں سے دلچسپی لے رہا تھا، اس سے رہا نہ گیا انگریزی میں اس نے پوچھا "کیا بات کر رہے ہیں آپ، کس ملک کے ہیں آپ لوگ۔"

ہم نے کہا "تم تو انگریزی نہیں جانتے تھے؟" اس نے کہا "اتنا تو بول لیتا ہوں"

"میں ہندوستانی ہوں اور یہ اسرائیلی عرب"

اس نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا "میں اب جنگ نہیں چاہتا میں کسی کو بھی خاکی وردی میں دیکھنا نہیں چاہتا" موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کہانی بھی سناتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا ایک اتوار کو میری شادی ہوئی اور پیر کو مجھے فوج میں بھرتی کرکے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ گیارہ برس جنگ کے ہولناک تجربے کے بعد جب میں ویانا لوٹا تو شہر میں میرا گھر نہیں تھا جرمن نازیوں نے جاتے جاتے گھر گرا کر نیست و نابود کر دیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری بیوی کہاں ہے میری بچی گیارہ برس کی ہو چکی تھی میں اسے دیکھنے کے لئے بے چین تھا مگر پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے آخر کار میں اپنی بیوی اور بیٹی سے ملا۔

اب میں نہیں چاہتا کہ جنگ ہو۔ وہ ہندوستان اور امن کی پالیسی کا بھی بیچ بیچ میں ذکر کرتا۔ ہوٹل پر موٹر کی شوفر نے اتر کر دروازہ کھولا اور پرتپاک طریقے سے مصافحہ کیا اور کہا "آسٹریا اور ہندوستان دوست ہیں آپ ہندوستان کے عوام کو ہمارا پیام پہنچائیں کہ ہم دوستی اور امن چاہتے ہیں۔" شوفر کی گفتگو سے متاثر خاموش ہم اپنے کمروں کو چلے گئے' میرے ذہن کے افق پر رہ رہ کر ڈاکٹر کا وہ جملہ ابھرتا "دنیا میں عید کی رات جتنی خودکشیاں ہوتی ہیں کبھی اور نہیں ہوتیں"۔ بار بار موتے کا خیال آنے لگتا۔ "کیا تمہیں ہماری یہ عید پسند ہے" اس کا آنسو چھپا کر کونٹر پر چلا جانا سب ایک بار جاگ اٹھتا۔ اس کا سوال اور اس کے آنسو اب کسی تشریح کے محتاج نہ تھے۔

طبیعت میں تھکن تھی' دیر سے اٹھا' صبح اداس اداس سی نظر آرہی تھی' ناشتہ کے ارادے سے موتے کے کیفے میں گیا' دروازہ بند تھا تشویش شروع ہوگئی موتے کبھی اس وقت دروازہ بند تو نہیں رکھتی تھی۔

تین دن کیفے بند رہا۔ عید ختم ہوگئی' کاروبار شروع ہوگئے سڑکوں اور گلی کوچوں کی ویرانی جاتی رہی مگر موتے کا کیفے بند تھا میں نے یہ واردات اور دوستوں کو سنائی وہ کیا کرتے سن کر چپ چاپ ہو جاتے۔

یکم جنوری کو ہم سمرنگ پہاڑ پر سال نو منانے کے لئے صبح صبح ہوٹل سے نکلے سردی غضب کی تھی گھر کی چھتیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھ پر بھی برف کی تہ جمی ہوئی تھی۔ تنگ دھڑنگ درختوں کی تیز ٹیڑھی شاخیں آسمان کو تک رہی تھیں' جب موتے کے کیفے کے پاس سے گزرا تو دروازہ کھول کر بے تحاشہ اندر چلا گیا' اندھیرا اندھیرا تھا' باورچی خانہ میں بتی جل رہی تھی' میری خوشی کی اور حیرت کی انتہا نہ تھی کہ موتے زندہ ہے میں نے اونچی آواز میں بے صبری سے کہا "اتنے دنوں سے تو کہاں تھی موتے" اس نے کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہا "سوپ گرم گرم ہے پیتے جاؤ" نہ گرم کوٹ تھا نہ جوتا نہ شوہر تھا نہ بیٹا' موتے تین دن تک کمرے میں بند پڑی رہی' نرس اور جرنلسٹ پھر نہیں ملے۔

"زبیر رضوی نے گیت بھی لکھے ہیں نظمیں اور غزلیں بھی' ان سب کے فنی تقاضے جدا جدا ہیں لیکن میرے خیال میں ان کے یہاں قدر مشترک وہ لے اور ترنگ ہے جو گیتوں میں سیتی غزلوں میں تغزل اور نظموں میں کیف بنتی ہے۔"

احتشام حسین

لہر لہر ندیا گہری

زبیر رضوی کا پہلا مجموعہ کلام

قیمت:۔ ۳ روپے

۱۹۵۷ - ترکمان گیٹ - دہلی - ۶

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری جدید ذہن کی نمائندہ شاعری ہے

کاغذی پیرہن کے بعد نظموں اور غزلوں کا دوسرا مجموعہ

نیا عہد نامہ

قیمت:۔ چار روپے ۵۰ پیسے

ناشر:۔ انڈین بک ڈپو - علی گڑھ

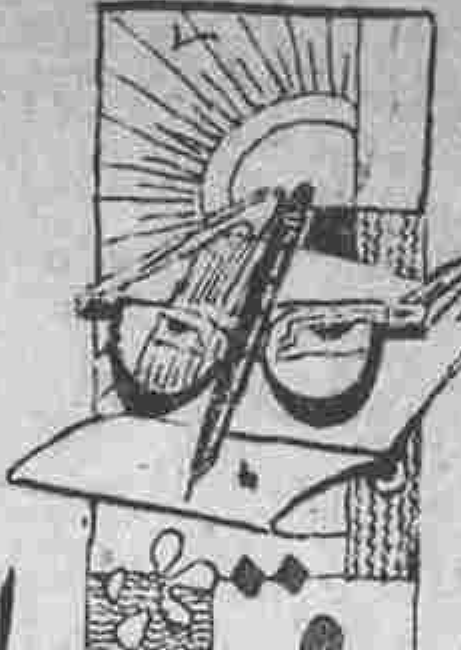

قلم

(پہلا حصہ)

مخدوم محی الدین

امن عالم اور دنیا کے مزدوروں کی عالمگیر تحریک کے سلسلہ میں مجھے ۹ر مارچ ۱۹۵۳ء سے ۲۹ر جولائی ۱۹۵۵ء تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں (کہیں ایک بار اور کہیں ایک سے زائد بار) جانے، رہنے سہنے لوگوں سے ملنے جلنے اور دوست بنانے کا موقع ملا۔ مجھے آرزو ہی رہ گئی کہ سمندری سفر کروں۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ میل کا سفر ہوائی ہی رہا۔ اس سفر کی بیشتر یادیں اب بھی دل کو تڑپاتی ہیں۔ کچھ نقوش تو اتنے گہرے ہیں کہ باوجود مرورِ زمانہ کے مٹنے کا نام نہیں لیتے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی سفر کی داستان چھڑ جاتی ہے تو ہزاروں تصویروں کا

ہجوم پوری تفصیل کے ساتھ سامنے کھڑا ہوکر تقاضہ کرتا ہے کہ "ہم بولیں گے"۔ کوئی کہاں تک روکے؟ اچھا ہے کہ دل کا یہ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ (مخدوم)

• صاحب قلم رنگا چاری (آرٹسٹ) تلنگانہ کی جدوجہد میں گرفتار بھی ہوا اور مارا بھی گیا مگر اس کا قلم پراگ میں آج تک زندہ ہے جو نہ کبھی گرفتار ہوا اور نہ کسی نے اسے گولی مار کر ختم کیا۔ اس یاد میں بوڈاپسٹ کے مزدوروں کی نشانی ایک اور قلم، میری زندگی کے انمول خزانوں میں سے ایک بڑے جتن سے ہندوستان میں محفوظ ہے۔

۔ ۱۹۴۷ء — حیدرآباد میں رضاکار دورِ حکومت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہم روپوش تھے ساتھیوں سے تا وقتیکہ کام نہ ہو، ملنا جلنا بھی ناممکن تھا۔ ایک رات (غالباً برسات کی رات تھی) رنگا چاری میرے پاس آیا، ہندر (؟) کے ساتھ ضروری کام ہے۔ ملاقات سے ہم بے حد مسرور تھے۔ کمرے کی مدھم روشنی میں ہم لوگ چائے بناتے جاتے اور پیتلی پیالوں میں پیتے جاتے تھے۔ بغیر دودھ کے چائے اور باتیں، باتیں، باتیں۔

ان دنوں فیوچک کی خود نوشتہ یادداشت "پھانسی کے سائے میں" (NOTES FROM GALLOWS) شاید ہندوستان میں آ گئی تھی۔ مگر ہمارے ڈینوں تک نہیں آئی تھی۔ مگر کیرالا کے ایک ساتھی

نے اس کے جستہ جستہ ٹکڑے "ٹائپ کر کے" "ایک جگہ" مجھے دیئے تھے۔ میں نے رنگا چاری کو فیوچک کے بارے میں جتنا معلوم تھا کہا۔ میرے "ڈن" (Den) کی مدھم روشنی میں کئی بار رنگا چاری کے جوان چہرے پر میں نے عجیب و غریب قسم کی چمک دمک دیکھی۔ وہ بھی فیوچک کی زندگی "آزمائش اور کامیاب۔ بے مثال موت سے مسرور اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

بادل گھرے ہوئے تھے مگر بارش تھم چکی تھی۔ مرغ بانگ دے رہے تھے۔ چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مگر روشن دان سے باہر اجالا ابھر رہا تھا۔ رنگا چاری کو سورج نکلنے سے پہلے ہی میرے پاس سے چلا جانا تھا۔ اس نے کاغذات کو اپنے تھیلے میں حفاظت سے رکھا۔ برساتی اوڑھی مسکراتے ہوئے مگر کسی قدر غمزدہ انداز میں کہا "اچھا کامریڈ! اب چلتے ہیں۔" جانے سے پہلے اس نے اپنا قلم (پارکر) یہ کہتے ہوئے مجھے دیا "رکھئے" ان دنوں میرے پاس قلم نہیں تھا۔ "فیوچک کی یاد میں" ـــــ وہ چلا گیا...... میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ قلم ہمیشہ میرے ساتھ رہتا۔ بہت دنوں تک پتہ نہیں چلا کہ رنگا چاری کہاں ہے؟ پولیس ایکشن ہوا پھر بھی معلوم نہ ہو سکا اس کا کیا ہوا؟ جیلوں میں بھی وہ گرفتار ہوا اور پنجابی رجمنٹ نے گولی کا نشانہ بنا دیا ـــــ قلم میرے لئے اور بھی عزیز ہو گیا

۱۹۵۱ء میں ایک رات روپوشی کے ہی عالم میں ہم دو ساتھی ملے۔ میں اور راج ـــــ میرے "ڈن" پر ـــــ صبح میں نے قلم غائب پایا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں نے کوریر کے ذریعہ راج کے پاس چٹھی بھیجی کہ میرا قلم واپس بھجوا دو۔ تین دن کے بعد خبر ملی کہ راج گرفتار ہو گئے۔ دل بیٹھ گیا۔ راج بھی گیا اور قلم بھی۔ ان دنوں گرفتاری کے بعد زندگی کا بہت کم بھروسہ تھا۔ چھٹے دن اطلاع ملی کہ قلم گوپال کے پاس ہے۔ میں نے گوپال کو لکھا دوسرے دن خبر ملی کہ گوپال بھی گرفتار ہو گیا۔ راج، گوپال اور قلم کا صدمہ ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ میں خود دھر لیا گیا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں اننو کے پاس سے قلم مل گیا جو گرفتاری سے پہلے گوپال نے مجھے دینے کے لئے دیا تھا۔ نہ پوچھئے کس قدر مسرت ہوئی۔ رنگا چاری اور فیوچک سے دوبارہ ملاقات کی مسرت ـــــ یورپ کے سفر میں بھی قلم میرا رفیق رہا۔

بوڈاپسٹ میں عالمی امن کی کونسل کی میٹنگ ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء سے ہونے والی تھی۔ ہندوستانی نمائندوں میں میں بھی ایک تھا۔ ہمارے ڈیلیگیشن میں ڈاکٹر موگھے، انکار ناتھ ٹھاکر اور ہندوستان کی کئی ممتاز ہستیاں تھیں۔

ہم لوگ ۹ مارچ کو بمبئی سے اڑے۔ قاہرہ، روم سے زیورک پہنچے۔ زیورک میں ایک دن ٹھہر کر ۱۱ کو پراگ پہنچے پراگ یورپ کے خوبصورت اور قدیم شہروں میں سے ہے جو وسط یورپ میں تہذیب و تمدن، علم و فن، صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ مجھے اس دن ویانا جانا تھا۔ ویانا سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کیلئے ۱۲ کو بوڈاپسٹ پہنچنا تھا ـــــ پراگ والے اپنے شہر کو پیارے سو میناروں والا شہر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چیکوسلواکیہ کی مزدوروں کی انجمن کو میرے وہاں آنے کے پہلے ہی سے اطلاع ملی تھی۔ پراگ کے ہوائی اڈے سے آکر ہم سب ہندوستانی ایک ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اونچا پورا نوجوان چشمہ لگائے ہوئے تیز تیز قدم

اٹھائے ہوٹل کا شیشہ دار دروازہ کھول کر داخل ہوا اور متجسس نگاہوں سے ہم سب ہندوستانیوں پر نظر ڈالنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اس سے ملاقات کی اور فوراً میں مزدوروں کے کلب "شاہی محل" کی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ میرے چیک ساتھی کا نام ہولب تھا۔ جو چیک ٹریڈ یونین کونسل (ROH) کے بین الاقوامی محکمہ کا نگراں تھا۔

میرے چیک ساتھی نے ایک گھنٹہ میں موٹر کے ذریعہ شہر کی سیر کروائی اور ہم مزدوروں کے کلب (شاہی محل پر قدیم ہوٹل ہے جو کسی زمانے میں صرف چیک سرمایہ داروں کے لئے مخصوص تھا اب یہ مزدوروں کا کلب ہے) میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے پہنچ گئے۔ اس شام مجھے براتس لاوا جانا تھا اور وہاں سے دیانا

کلب کا طعام خانہ عورت مرد مزدوروں سے بھرا ہوا تھا۔ میزیں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں۔ طعام خانے کے ایک گوشے میں ناچ اور سنگیت کاروں کی جگہ تھی۔ ایک بڑا سا چبوترا تھا جو اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ کلب کی سکریٹری ایک معمر عورت نے اسٹیج پر سے کچھ کہا۔ کھانے کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ہولب نے حاضرین سے تعارف کرایا۔ میرا اسٹیج پر آنا تھا کہ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے میری زندگی میں یورپ آنے کا یہ پہلا موقع اور پھر بھی ایک کمیونسٹ ملک میں جہاں مزدور طبقہ حکمراں طبقہ ہے، جو امن اور سوشلزم کی تعمیر کر رہے ہیں، جو ہندوستان سے پرخلوص دوستانہ تعلقات کو اور بھی مستحکم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ رفیقانہ استقبال اور تعظیم نے مجھے جذبات سے مغلوب کر دیا۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں مگر بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مسرت اور رفاقت کے آنسو۔ ہولب نے کان میں کہا کچھ دو لفظ بول کر "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" سناؤ (ہولب مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس نظم سے بھی واقف تھا) میں نے مختصر سی تقریر کی۔ ہندوستان اور چیکوسلواکیہ کی مشترکہ تمناؤں اور مقاصد آزادی، امن اور سوشلزم کا ذکر کیا۔ اس سلسلے میں فیوچک کے بارے کہا کہ یہ بین قومی ہیرو، ہندوستان کے مزدور طبقہ کے جانبازوں کے لئے کس طرح جوانمردی، ثابت قدمی اور قربانی کا نمونہ رہا ہے۔ میں نے رنگا چاری کا بھی تذکرہ کیا۔ نظم بھی سنا دی۔ تالیاں ہی کم نہیں ہوتیں، لوگوں کے چہرے وفورِ محبت سے اور بھی سرخ ہو گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے رنگا چاری کا دیا ہوا قلم جیب سے نکالا اور کہا "فیوچک اور رنگا چاری کی یاد میں، ہندوستان اور چیکوسلواکیہ کی ہم مقصد جدوجہد کی یادگار میں ایک قلم بطور تحفہ قبول ہو" اس پر ایک اور ریلا نعروں، تالیوں کا بہت دیر تک جاری رہا۔ کھانے کے فوراً بعد ہی ہولب اور میں اسٹیشن چلے گئے ــــ

دیانا سے ہوتے ہوئے میں بوڈاپسٹ پہنچا۔ امن کونسل میں شرکت کی روزانہ دنیا بھر کر نمائندے کسی نہ کسی کارخانے، کلب، کھیت میں جاتے تھے۔ رات میں تھیٹر جاتے۔ اوپیرا دیکھتے ہیں۔ مجھے بھی شہر کے کئی کارخانوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ بحث مباحثے اور دونوں ملکوں، ہندوستان، مزدور تحریک کے تجربات، معلومات کا تبادلہ ہوتا۔ ایک یونین میں اس کے صدر اور سکریٹری اور دوسرے کارکن افراد نے تفصیل سے ہندوستان کے بارے

پوچھتے رہے۔ بڈاپسٹ کی گلی گلی میں سڑکوں، ہوٹل، کونسل ہال کے سامنے، تھیٹر، کارخانہ، کمیٹ غرض کہ ہر جگہ محبت بھری نظروں، مسکراہٹوں کا طوفان تھا۔

ایک دن صبح ابھی میں اپنے کمرے ہی میں تھا کہ میری ترجمان آگینی نے آکر مجھ سے کہا کہ نیچے چلو تمہارے لئے مزدوروں کا ایک ڈیلی گیشن ملنے آیا ہے۔ ایسی ملاقات میرے لئے بالکل نئی تھی۔ بڈاپسٹ کے قیام میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر اس طرح دل کو تسلی دی کہ شاید کسی کارخانے میں آنے کی دعوت دینے آئے ہوئے ہوں۔ پھر بھی میں نے آگینی سے کہا کہ ہندوستان ڈیلی گیشن کے سکریٹری رمیش سے ملکر طے کرلو۔ پروگرام بنانے کا انتظام رمیش کے ذمے ہے۔ آگینی نے اصرار کیا۔ آ میں چلوں۔ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے لونج میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ بڑے ہال میں لوگ حسب معمول صوفوں پر ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہیں۔ کچھ کھڑے ہیں۔ سٹیلمین، وائٹرز آجا رہے ہیں۔ ایسی ہجوم میں ایک جگہ چھ عورتیں قطار بنا کر کھڑی ہیں۔ آگینی مجھے ان کے پاس لے گئی۔ ان میں سے ایک جو ڈیلی گیشن کی لیڈر تھی، آگے بڑھی اور ایک کیس مجھے پیش کیا۔ یہ کہہ کر کہ فیکٹری کے مزدوروں نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔ کیس میں ایک فونٹن پن اور ایک پنسل تھی۔ میں کچھ دیر تو چپ رہا۔ خوشی، حیرت، استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پھر میں نے کہا: "فیکٹری کی یونین کو گئے تو کئی دن ہو گئے!" پھر لیڈر نے کہا: "بات یہ ہوئی آپ سے یونین کے دفتر میں بات چیت کے بعد ہم نے فیکٹری کے مزدوروں سے آپ کی ملاقات کی رپورٹ کی اور رنگا چاری کے اس قلم کے واقعہ کا بھی ذکر کیا جو آپ نے پراگ کے مزدوروں کو بطور یادگار دے دیا ہے۔ یہ سن کر بڈاپسٹ فیکٹری کے مزدوروں نے کہا، تو پھر کامریڈ کے پاس اب کوئی قلم نہیں ہے۔ یہ قلم انھیں لے جا کر دو اسی بنا پر یہ قلم آپ کی خدمت میں بطور تحفہ نذر ہے۔"

پھر ایک بار میں مغلوب ہوگیا۔ اپنے آپ کو سنبھال کر میں نے شکریہ ادا کیا۔

"شاذ نہ واعظ ہے نہ طبیب، وہ تو ایک عاشق ہے جو شاعرانہ آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا ہے اور دردمند دل سے محسوس کرتا ہے۔ احساس اور جذبے کو نقش اور نغمے کی شکل میں دنیا کو واپس کرتا چلا جا رہا ہے۔"
مخدوم محی الدین

تراشیدہ

صفحات:- ۲۱۶
قیمت:- پانچ روپے

شاذ تمکنت کا پہلا مجموعۂ کلام

نیشنل بک ڈپو۔ حیدرآباد۔ اے پی

اجنبی

(دوسرا حصہ)

مخدوم محی الدین

پراہا۔ ۱۱ر جون ۵۳ء

● پردیس میں اپنے یورپ کے کسی سرمایہ دار ملک میں ایسا ہی حادثہ پیش آتا تو کیا ہوتا؟ زبان نہ آئے، جیب میں پائی نہ ہو اور آپ رات کے ۱۲ بجے ایک اجنبی شہر میں پہنچیں تو کیا ہو؟

ٔبلب کی ایک ادا مجھے بہت پسند آئی کہ ٹکٹ بھی دیا اور توشہ بھی ساتھ کر دیا۔ پراگ سے برائس لاوا ریل کے ذریعہ کوئی آٹھ گھنٹوں کا سفر ہے۔ بلب نے کہا کہ ٹرین برائس لاوا رات میں ۱۲ بجے پہنچے گی۔ اسٹیشن پر (ROH) کا نمائندہ مجھے لینے کے لیے موجود ہوگا۔ میں نے احتیاطاً اس ساتھی کا نام، حلیہ، دفتر کا پتہ ٹیلیفون نمبر بھی لے لیا۔

انجن سے لے کر آخری ڈبے تک، گلیاری ہے لوگ اس سرے سے اس سرے تک آ جا سکتے ہیں۔ صوفوں کی طرح گداز نشستیں، ڈبہ بھرا ہوا مگر بھیڑ نہیں ہے۔ گلیاری میں کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ ڈبوں میں سگریٹ پینا منع ہے، سگریٹ نوشی کے لیے الگ کمرے ہیں۔ چلتی ہوئی ٹرین، بدلتے ہوئے مناظر، سبزہ زار، راستے میں کئی شہر، صابون کا شہر، جوتوں کا شہر، شکر کا شہر سب صنعتی شہر۔

مسافر بہ ظاہر میری موجودگی سے کسی تجسس کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میرے بازو میں دو مرد تھے، سامنے دو مرد اور ایک لڑکی، لڑکی گردن نیوڑھائے لمبی لمبی سلائیوں سے اون بُن رہی تھی، مرد کتاب پڑھ رہے تھے یا باتیں کر رہے تھے دبی آواز میں۔

ہم سب ایک دوسرے کی زبان سے نابلد تھے لڑکی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتی تھی، کچھ لوگوں نے مجھ سے کچھ پوچھا، لڑکی مترجم کا کام کرتی رہی۔ وہ قانون کی طالب علم تھی۔ آٹھ گھنٹے باتوں باتوں میں کٹ گئے۔ بارہ بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی ہیں، لوگ سامان سنبھال رہے ہیں۔ اگلا اسٹیشن برائس لاوا ہے۔ میرا دل ایک نئے ساتھی سے ملنے اور ایک نئے شہر کو دیکھنے کے اشتیاق سے معمور تھا۔

گاڑی کی کھڑکی میں سے میری نظروں نے سارے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا، آنکھیں ایک پست قد، گٹھیلے نوجوان

کی متلاشی تھیں جو کسی قدر رشتہ چاہ دیکھتا ہے۔ شلاز۔ میرا ذہن بار بار اس نام کو دہرا رہا تھا۔ لوگ ٹرین سے اتر کر چلے گئے۔ کپڑوں کا بکس لئے ہوئے کچھ دیر پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ گاڑی جا چکی تھی، پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا گیٹ بند ہو رہا تھا، شلاز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں باہر آ گیا۔ رات کے بارہ بج کر دس منٹ پر مطلع ابر آلود، ہلکی ہلکی سردی سنسان سڑک، سامنے ٹرام آئی۔ مسافروں کو لے کر کھڑکھڑاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

ایک اجنبی تن تنہا، بے زبان بے زر بکس لئے سلواکیہ کے سب سے بڑے شہر برٹس لاوا کی سڑک پر چپ چاپ کھڑا تھا۔ گھپ اندھیرے میں آسمان کو بے بسی کے عالم میں تک رہا ہے کیا کیا جائے پریشانی ضرور تھی۔ مگر اطمینان بھی تھا۔ یہ کوئی سرمایہ دار دیس کا شہر لندن یا پیرس تو نہیں ہے جس کی بے مہری کے قصے سن چکا ہوں مگر کہاں جائیں، رات کہاں گزرے .... طلب صاحب کی طرز مہمان نوازی پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔

اندھیرے میں سے ایک جسم حرکت ہوا دکھائی دیا۔ اس شخص نے آ کر ہمدردانہ انداز میں کچھ پوچھا، کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ میرے لئے یہ مشکل کہ کس زبان میں اپنی رفتار کو سمجھاؤں۔ سڑک کی روشنی میں جب اس کا چہرہ ذرا صاف دکھائی دیا تو میں نے پہچانا کہ وہ تو میرا ہم سفر ہے جو ٹرین میں میری بغل کی نشست پر بیٹھا تھا۔ زبان کی دیوار کو توڑتے ہوئے اس نے دو لفظ انگریزی میں بولے، میں نے کچھ اشاروں اور کچھ انگریزی کی مدد سے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی کوشش کی، (ROH) کا نام پتہ ٹیلیفون نمبر لکھ کر بتایا۔ کچھ سکنڈ خاموش رہنے کے بعد اس نے میرا بکس اٹھا لیا اور کہا "Come" "چلو" "ٹرام" "ہوم" (گھر) "ٹیلیفون" "سی" یعنی دیکھئے۔ میں نے اس تقریر کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا (Good) یعنی اچھا۔

آخری ٹرام۔ ٹرام میں سوار ہو کر ہم ایک جگہ اتر گئے، بکس اٹھائے ہوئے ہم دونوں چپ چاپ گھر تک چلتے گئے۔ وہ آگے میں پیچھے، رات کا سناٹا، کشادہ گلیاں، پکے مکانات، شاداب درختوں سے ڈھکے ہوئے، ہلکی ہلکی سردی اس اڈونچر میں مجھے اب لطف آنے لگا تھا مگر شلاز کے خلاف طرح طرح سے غصہ بھی آ رہا تھا۔

گھر پہنچ گئے، گیٹ، صحن، برآمدہ، دروازہ کھلا تو کشادہ سجا ہوا کمرہ، قالین کا فرش، صوفے، دیواروں پر کچھ تصویریں، آتش دان، مینٹل پیس پر فوٹو، چھوٹی چھوٹی مورتیاں، پردے، جھالر، ٹیلیفون۔

کمرے کی تیز روشنی میں میزبان دوست کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا، وہ ایک خوش رو شائستہ نوجوان تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔ وہ بجلی کا مزدور تھا، ہم دونوں نے مسکرا کر مصافحہ کیا۔ اس کی بیوی اور بچہ بغل کے کمرے میں سو رہے تھے۔ اس نے پوچھا "TEA" چاء؟ گردن ہلا کر جلدی سے کہا "Good" یعنی ہاں۔ وہ بغل کے کمرے میں گیا اور بہت جلد واپس آ کر ٹیلیفون ملاتا رہا۔ ہر وقت منٹ کے بعد وہ مایوسی سے کہتا "No" یعنی جواب ندارد۔ سفید گون پہنے ہوئے اس کی بیوی کمرے میں آئی، اس نے تعارف کرایا، اس کی آنکھوں میں نیند سے بیدار ہونے کے آثار، اور چہرے پر اچنبھا اور خوشی کے جذبات تھے۔ وہ باورچی خانے میں

چائے بنانے چلی گئی۔ چال میں انبساط تھا۔

میزبان دوست کے ناکام کوشش پر اب مجھے رحم آنے لگا تھا۔ بغیر بات چیت کئے کئی بار ڈائل پر بس کی انگلیاں حرکت کرتی رہیں۔ میرے جی میں کئی بار آیا کہ کہوں "کامریڈ اب زیادہ تکلیف نہ کرو۔ دو بج رہے ہیں رات کی رات یہیں ٹھہر جانے میں ہرج ہی کیا ہے۔ صبح دیکھا جائے گا۔ قالین یا صوفہ آرام کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ مگر یورپ کی ریت رسم الگ ہے۔

بھابھی کشتی میں چائے کی تین پیالیاں لئے آگئی۔ ہم تینوں نے چائے پی، اشاروں اور انگریزی لفظوں کی مدد سے ہم بات چیت کرتے جاتے تھے اور ہنستے بھی جاتے تھے۔ بھابھی اندر گئی اور اپنے بچہ کو لاکر دکھایا۔ سال ڈیڑھ سال کا ننھا، موٹا تازہ خوشرنگ بچہ، ہندوستانی چچا کو دیکھ رہا تھا اور یہی عجیب عالم میں وہ اس کی زندگی کا بہت اہم اور عجیب واقعہ تھا۔ پیار سے ہم بچوں کو چومنے کے عادی ہیں، مگر ادھر یہ حرکت کچھ اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ میں نے بچے کے سامنے صرف چٹکی بجائی اور ٹھوڑی کو پیار سے چھوا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ مجھے گھور رہا تھا۔ ماں باپ بہت خوش تھے۔ بھابھی بچہ کو لئے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی سونے کے لئے۔ میں نے میزبان ساتھی سے کہا "اب چلو کسی ہوٹل میں، کوشش فضول ہے۔

ڈینوب کے کنارے ایک شاندار ہوٹل میں داخل ہوئے۔ استقبالی کمرے میں پورٹیر کے کوئی اور نہ تھا۔ میزبان دوست نے اس سے میرا قصہ کہہ دیا اور وہ صبح کام پر جانے سے پہلے مل کر خبر لینے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور صبح وہ آیا بھی۔ میں کمرے کی چابی لے کر لفٹ کے ذریعہ تیسری منزل پر ایک کمرے میں پہنچ گیا۔ نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ ملائم، گداز، صاف ستھرے گرم بستر میں پڑا رہا۔ بھوک اور پریشانی۔ ملب کا دیا ہوا توشہ نکالا۔ روٹی گوشت کھایا نہیں گیا۔ بوتل کھول کر پانی پینے کی کوشش کی، کھارا سوڈا۔ وہ بھی رکھ دیا۔ کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ لفٹ کے اندر ہی تپائی پر بیٹھے بیٹھے ٹانگیں پھیلائے گردن لٹکائے ٹوپی آنکھوں پر ڈالے عنٹ سو رہا تھا۔ میں نے وقت دیکھا ½۵ ہی بجے ہیں۔ ٹیلیفون آپریٹر کے آنے میں اور ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا کہ لاکھ مزدور راج سہی، نظم و نسق بھی تو ایک چیز ہے۔ فرض کرو کسی سے کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا تو ہوٹل کا بل کون دے گا، اور کھانے کا کیا ہوگا۔ لفٹ والے بڑے میاں کو میں نے جگا دیا۔ بوڑھے نے خمار آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر اشارے سے پوچھا "کیوں نیند نہیں آئی کیا؟" اور ایک گر بتایا کہ جب تک پیٹ میں شراب نہ ہو نیند کہاں آتی ہے۔ موٹی موٹی انگلیاں اس نے میرے پیٹ میں ٹھونسی۔ میں نے اشارے سے تین انگلیاں بتائیں یعنی چلو تیسری منزل پر۔

بڑی بے چینی سے گھنٹہ بھر کمرے میں گزارا۔ نیچے آیا تو چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کمرے کھل رہے تھے لوگ سیڑھیوں، لفٹ اور لاونج میں آجا رہے تھے۔ ٹیلیفون کا لڑکا بھی آچکا تھا۔ میں نے اپنا نمبر دے دیا۔ سلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی علاقائی کانفرنس کے ڈیلیگیٹس اسی ہوٹل میں مقیم تھے۔ دن نکل گیا، ریل پیل اور ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہنگامے

میں ایک اجنبی کبھی ادھر کبھی ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ ہر پانچ دس منٹ کے بعد ٹیلیفون پر خبر لیتا رہا۔ جواب ندارد۔ اب تو میں نے فیصلہ کر لیا۔ اور گھنٹہ آدھا گھنٹہ دیکھ کر پراگ کو ٹیلیفون کو جلب صاحب سے پوچھ لیا کہ جناب' واہ"

ٹھیک آٹھ بجے ٹیلیفون کے لڑکے نے ایک کرسی بتا کر کہا کہ یہاں سے ہو نہیں میں کرسی پر بیٹھے دروازے پر نظریں گاڑھے اجال الغیب کا منتظر بیٹھا رہا۔ ٹھیک ۹ بجے شلاز گول ترچھی ٹوپی لگائے بھاری کوٹ پہنے تیزی سے میری طرف بڑھا اور خندہ پیشانی سے بغل گیر ہو کر مجھے اٹھا لیا اور چومنے لگا۔ بغیر اسکا لحاظ کئے کہ میں کسقدر غصہ میں ہوں "چلو ناشتہ کر لیں" اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا۔ میں نے کہا "جناب آپ رات کہاں تھے؟" شلاز نے اس انداز میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کہا "جب تم رات میں براٹس لاوا کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے تھے میں گھر میں مزے کی نیند سو رہا تھا" اور خراٹے بھرنے کی آواز منہ سے نکال کر ہنسنے لگا۔ جواب نہیں اس شخص کا بھی میں نے دل ہی دل میں کہا۔ شلاز نے کہا "میرے آنے کی اطلاع اسے اب ہی آٹھ بجے دفتر میں ملی۔ کلرک نے رات میں پیام نہیں پہنچایا کیوں کہ وہ اس کام پر نیا ساتھی ہے۔ چھریرے بدن کا نوجوان ڈرائیور تھا۔ ہم تینوں نے مل کر ایک ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا اگرم گرم بہت دوست بن گئے اور صرف باتیں کرتے رہے۔ ڈرائیور ساتھی نے اپنے بچے اور بیوی کی تصویر دکھائی اور کہا کہ اب وہ شام میں انجینئرنگ کی جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

چیکوسلواکیہ اور آسٹریا کی سرحد تک، شلاز مجھے آسٹریا اور سوویت کی مشترک چوکی میں لے گیا۔ وہاں ایک سفید بالوں والی عورت ساتھی ڈبلیو ایف ٹی یو (دنیا کی مزدوروں کی انجمن) کی طرف سے مجھے لینے کے لئے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ایک دوسرے سے رخصت ہونے کا لمحہ بھی آ پہنچا۔ گو تھوڑی دیر کی دوستی تھی مگر سب دل گرفتہ تھے کہ اب جدا ہونا ہے مصافحہ کیا بغل گیر ہوئے۔ شلاز نے تو کسی قدر ضبط سے کام لیا۔ مگر ڈرائیور ساتھی کی آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے ——— موٹر کے ذریعہ میں ویانا چلا گیا۔

١٩٥٧ء

"شہریار کی نظموں اور غزلوں میں پہلی خوبی جو مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ یہ طویل کلامی کے عیب سے پاک ہیں ——— ان نظموں میں جو احساس کی تلخی کے پیچھے دوڑنے کی جو کوشش ہے وہ انہیں معنویت عطا کرتی ہے" آل احمد سرور

شہریار کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

اسم اعظم

قیمت: تین روپے

صفحات: ۱۱۲

انڈین بک ہاؤس۔ محمد علی روڈ۔ علی گڑھ

چاندنی چوک کا ایک کھڑا مشاعرہ

مخدوم محی الدّین

نہ تو میں وگیان بھون کے اس مشاعرہ کا ذکر کر رہا ہوں جس میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شریک ایشیائی یوروپی اور لاطینی امریکی شاعروں نے حصہ لیا تھا اور نہ سپرو ہال کے اس اردو مشاعرہ کا ذکر، اس وقت مقصود ہے جس میں علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے شعرا کے تاجکستان کے ترسون زادہ ازبک کی زلفیہ خانم، ترکمانستان: جبار جبار قفقاز اور روس کے شاعروں نے اپنی نظمیں سنا کر اقبال کے اس مصرعے کی تفسیر کی تھی کہ "زبانِ محبت نہ ترکی نہ تازی". میں تو اس یادگار مشاعرہ کا ذکر چاہتا ہوں جو پنجابی اور اردو کا مشاعرہ تھا جس میں کل پانچ چھ لوگ شریک تھے جو کسی ہال میں نہیں بلکہ سرِ راہ ہوا تھا. جہاں بیٹھنے کے لیے نہ کرسیاں صوفے تھے اور نہ فرش نہ مسند، بلکہ صرف زمین تھی، نہ کوئی اہتمام تھا نہ کوئی اعلان ہی ــــ بلکہ یہ مشاعرہ محض "حادثہ" اور وہ بھی ایک حسین حادثہ تھا

• چاندنی چوک ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء کی شام پرانی دلّی کے "ٹاؤن ہال کی فضا پھولوں اور انسانی دلوں کی رفاقت کی مہک سے بوجھل ہے. ایشیائی ادیبوں کی تقریب ابھی ابھی ختم ہوئی ہے سیلون، برما، روس، چین، ازبک، تاجک، انگریز، امریکی پاکستانی، ہندوستانی ادیب، اہالیانِ دلّی کے جمگھٹ میں سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے ہیں. مونیکا فلیٹن (انگریز ادیبہ) لنڈ رد (امریکن ادیبہ) اور زلفیہ خانم (سوویت) ہاتھ میں ہاتھ لیے سب ایک ساتھ چل رہے ہیں. یہاں کوئی سرد جنگ نہ تھی بلکہ ساری فضا یگانگت اور انسانی یک دلی کے جذبے سے معمور تھی ــــ نیاز حیدر کی "مجذوبانہ" ہیئت نے بیرونی مہمانوں کو اپنی طرف خاص طور سے متوجہ کر لیا ہے. مونیکا ٹیپ سے چپک کے

نیاز سے ملتی ہیں۔

سبھرلا نے اشارے سے ہمیں روکا اور شرما نے مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنی اونچی آواز میں کہا: گھر چل کر چاۓ پئیں گے، ٹھہر جاؤ سبھرلا ابھی آتی ہے" میں اور نیاز حیدر، دیوار سے لگ کر الگ کھڑے رہے۔ مجمع چھٹ جانے کے بعد ہم برجیکوں میں سے ہوتے ہوئے ٹاؤن ہال کے کمپونڈ میں آ گئے۔ ہم دونوں کی چال میں بڑی تمکنت اور مزاج میں ایک گونہ اطمینان پایا جا رہا تھا۔ اس احساس سے کہ آج دنیا کے کاروبار کسی قدر مرضی اور ضرورت کے مطابق چل رہے ہیں۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ چمن میں دور پنجابی کی شاعرہ امرتا پریتم اور پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر شان دکھائی دیئے۔ دور ہی دور سے سلاموں کا تبادلہ ہوا۔ میں اور نیاز حیدر نے چاندنی چوک کی بھیڑ کو چیرتے، موٹروں، تانگوں، آٹو رکشا اور سائیکلوں کے ہجوم سے بچتے بچاتے سڑک کو پار کیا۔ جہاں ایک چاۓ خانے کے سامنے مشہور کمیونسٹ لیڈر یگ دت شرما، ہمارے منتظر تھے۔

امرتا پریتم کی شاعری کے تعلق سے وابستہ بہت سی یادیں، بجلی کی طرح افق پر چمکیں۔ خاص طور سے ۱۹۴۷ء کا وہ زمانہ یاد آیا جب کہ ہم آزاد ہوئے۔ ملک کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔ اُدھر پاکستان، اِدھر بھارت بنا۔ فسادات کا خونی ورق نظروں کے سامنے آیا۔ اس تاریکی میں امرتا کی لافانی نظم "وارث شاہ" کا لازوال اثر جو آج تک دل و دماغ پر مسلط ہے، صیقل ہو گیا۔ "وارث شاہ قبر سے اُٹھو" "کتاب عشق کا ورق کھول" ایسے ہی خیالات کی کڑیاں میرے دماغ میں مل جل کر ایک زنجیر میں بنتی ہی جا رہی تھیں۔ بے خیالی کے عالم میں شرما اور نیاز حیدر کے ساتھ میں سڑک سے گزر کر ایک تھرڈ کلاس چاۓ خانہ میں گیا۔ ہم لوگ کچھ سکون، کچھ خاموشی اور ایک ایسا گوشہ چاہتے تھے جہاں بیٹھ کر اطمینان سے چاۓ پر بات چیت کر سکیں۔ پرانی دلّی کے ان چاۓ خانوں کا یہ ماحول پسند نہ آیا۔ شرما نے کہا کہ تم دونوں کمپونڈ میں جا کر انتظار کرو میں سواری اور کچھ کھانے کی چیزیں لاتا ہوں گھر چلیں گے .... سبھرلا منتظر ہو گی۔
(سبھرلا ان کی بیوی ہیں)

امرتا اور پروفیسر ہرنام سنگھ شان واپسی تک چمن ہی میں کھڑے ہوئے تھے اب ہم دو سے چار ہو گئے اور ٹاؤن ہال کے پورٹیکو کے سامنے تھے۔ چاندنی چوک کی سڑک کی روشنی ہلکا اجالا پیدا کر رہی تھی۔ ٹرافک کی جھنجھناہٹ پس منظر کا کام کر رہی تھی۔ ہم سب اس غیر متوقع ملاقات سے بے حد خوش تھے۔ امرتا نے ہمارا اور شان صاحب کا تعارف کرایا۔ پروفیسر شان نے کہا آپ سے میں پہلے ہی متعارف ہو چکا ہوں۔ جب آپ دونوں حضرات جا رہے تھے تو امرتا نے کہا کہ دو شاعر ہیں۔ جب میں نے پوچھا کہ اُردو کے شاعر؟ تو امرتا نے کہا تھا۔ "شاعر تو اُردو ہی کے ہوتے ہیں" اس پرخلوص ہمت افزائی اور انکسار نے ان دونوں دوستوں کی عظمت میرے دل میں اور بھی بڑھا دی۔ اس تھوڑے سے وقت سے جو ہمیں اتفاقی طور پر مل گیا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ کسی ایک نے نہیں بلکہ چاروں نے بے ساختہ یہ خواہش کی کہ کچھ سنا اور سنایا جائے۔ میں نے امرتا سے کہا کہ "وارث شاہ" والی نظم سناؤ۔ امرتا کی خواہش تھی۔ پہلے ہم سنائیں۔

نیاز حیدر سے میں نے کہا "تشنگی سنا ڈالو" ۔ چار درویش حلقہ بنائے دنیا و مافیہا سے بے خبر، اشتیاق سے تشنگی سن ہی جا رہے تھے۔ ایک اونچا پورا چوڑا چکلا، پولیس انسپکٹر خاکی وردی پہنے ہوئے جس کے سینے پر کارتوس کی پیٹی لگی ہوئی پستولوں کو

لٹک رہا تھا۔ چمن کی طرف سے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہمارے حلقے کی طرف آتا چلا گیا۔ میری الجھن بڑھنے لگی اس وقت اس پولیس والے کا یہاں کیا کام ہے؟ وہ آیا اور حلقے میں آگیا، ڈٹ کر کھڑا رہا۔ غصے اور ناراضگی میں ہم اس ناخواندہ مہمان سے کہنے والے ہی تھے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ پولیس آفیسر نے مسکراتے کہا۔ "میں شعر سننے آیا ہوں۔ میرا نام گل جند ہے۔ میں پٹھان ہوں، پولیس چوکی ماڈل ٹاؤن کا انچارج"۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے یا شربت پئیں۔ ہم نے کہا پانی پلا دیجیے۔ اس نے چائے اور پانی منگوایا۔ میرے دل کا شک پھر بھی دور نہیں ہوا۔

نیاز حیدر نے اپنی نظم "تشنگی" سنانا شروع کی۔ بکھرے بکھرے ہوئے پریشان بال، چوڑی دار پاجامہ، گرم ناسی رنگ کا کرتا اور کاسنی رنگ کی شال، زمانے کی بے مروتی اور اس کے اپنے لاابالی پن نے نیاز کی صحت پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہوئے اپنے مخصوص جذبیہ انداز میں نظم سنانے لگا۔ ہاتھوں کی جنبش چہرے کے اتار چڑھاؤ سے شعر کے معنیٰ و مفہوم کو واضح بھی کرتا جا رہا تھا۔ ہم سب پر محویت طاری تھی۔ امرتا دبی زبان میں کبھی آنکھوں سے اور کبھی گردن کے اشارے سے داد دیتی ہے۔ شان کی داد بلند آواز میں تھی۔ گل جند گرجدار آواز میں "واہ واہ" کہتا۔ ہم سب کے ہاتھوں میں چائے کے گلاس تھے۔ شرما بھی آکر حلقے میں مل گئے تھے، مگر چپ تھے۔ وہ ہمارے لیے تانگہ لے کر آئے تھے، گھر چلنے کے لیے۔ شرما نے جب یہ حال دیکھا تو پیسے دے کر تانگہ واپس کر دیا۔

امرتا نے جب کہا میں انتظار سناؤں۔ میں نے کھل کر جی سے وہ نظم سنائی۔ جیسے ملنی چاہیے ویسے داد نہیں ملی۔ نیاز کو جب کوئی ٹکڑا بے حد پسند آتا تو "کیا بات کہی ہے چاچا بابا!" کہہ کر چائے کا گلاس اوپر اٹھاتا اور سب گلاسوں سے ٹکراتا۔ امرتا نے کہا "وارث شاہ" سے پہلے دو غزلیں سناتی ہوں۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

امرتا نے مطلع سنایا (پنجابی) "میں آج اپنے دل کے زخموں کو کھولتی ہوں لے لے ٹانکوں کا دھاگا واپس کرتی ہوں" دل کے زخموں کو کھولنا ہماری شاعری کا عام خیال ہے مگر کسی نے آج تک دھاگے واپس کرنے کا خیال نہیں باندھا تھا۔ احساس کی اس مخصوص شدت نے ہم سب کو بے حد متاثر کیا۔ شرما صاحب تانگہ لوٹا دینے کے بعد اب کی بار موٹر لائے ہمارے لیے، گھر چلنے کے لیے جب ہمارا یہ حال دیکھا تو پیسے دے کر ٹیکسی کو بھی واپس کر دیا اور حلقے میں شامل ہو گئے۔ شان پنجابی سے انگریزی اور اردو میں ساتھ ساتھ حسب ضرورت ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ امرتا پریتم دھیمی مگر پختہ آواز میں اپنی غزلیں سناتی گئیں اور ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ چائے کے گلاس بلند ہوتے اور ٹکراتے رہے۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ امرتا نے آخر میں وہ نظم بھی سنا دی جس کے سننے کے لیے میں نو برس سے منتظر تھا۔

وارث شاہ قبر سے اُٹھ
کتابِ عشق کا ورق کھول
پنجاب کی ایک بیٹی کے دکھ نے
ہیر کا نغمہ لکھوایا
آج کتنی بیٹیاں ہیں جن کے غم اور دکھ کی انتہا نہیں

دشمنوں نے پنجاب کو کاٹ ڈالا

رگ رگ میں زہر کے ٹانکے لگا کر منہ بند کر دیا ہے

پانچ ندیوں میں آج زہر بہتا ہے

جھولے ٹوٹ گئے

تکلیاں چپ ہیں

....

وارث شاہ قبر سے اُٹھ

کتابِ عشق کا ورق کھول

ابھی نظم کے تاثر سے ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک موٹر سیکل پر سوار ایک سکھ بزرگ آگئے۔ امرتا کو لینے کے لیے۔ امرتا نے کہا اسے ریڈیو اسٹیشن جانا ہے وہ اِدھر چلی گئی اور اُدھر گل چند پٹھان نے کہا "چلو چوکی میں بیٹھ کر ے پر" مذاقاً کہا۔ "نہ چلوگے تو گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔"

پولیس کی چوکی میں جانا ہم میں سے اکثروں کے لیے نیا نہیں تھا۔ مگر اس دفعہ کا رنگ ہی اور تھا۔ گرفتاری، جرم، بیان، ضمانت، حوالات، پہرا، جیل کی یادیں لیے ہوئے، ہم گل چند پٹھان انچارج پولیس چوکی ٹاؤن کے ہال کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کوئی پلنگ پر کوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہم لوگ اس ماحول سے جلد سے جلد نکل جانا چاہتے تھے۔ مگر پٹھانی خلوص سے مفر بھی نہ تھا۔ گل چند نے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی ایک پھٹی سی کتابوں کا ایک پلندہ نکالا۔ اپنی شعر سے دلچسپی کا سکہ ہم پر بٹھا رہا تھا۔ اُردو میں سینما کے گانے غزلوں کے انتخابات تھے۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم چاؤ پیئیں اور کہا "یہاں آئے ہو تو چاندنی چوک کی "نمی کی جلیبی" کھائے بغیر کیسے جاسکتے ہو۔" نمی کی جلیبی کھائی اور چاؤ پی، جب چوکی سے باہر آئے تو اندھیرا اتر چکا تھا۔ چاندنی چوک کی ہماہمی، ٹرافک کا شور سنائی دیا۔ گل چند نے دعوت دی کہ ہم اپنے احباب کے ساتھ دوسرے دن آئیں۔ سینما دیکھیں گے۔ قطب چلیں گے۔ امی نے کہا، شرما، نیاز احمد اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ میں نے کہا "مسٹر لاجی سے معافی چاہ لینا"

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم

بہر سو رقص بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

بازیافت

ڈاکٹر مغنی تبسم کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ عنقریب شائع ہوگا۔

ناشر:- مکتبۂ صبا۔ حیدر آباد-۱

بگھی کے پیچھے چھوکرا

مخدوم محی الدین

"میرے بچپن میں کوئی بچپن ہی نہ تھا"

(چیخوف)

دھرم ونت ہائی اسکول میرے بچپن کی قدیم درسگاہ ہے۔ اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مجتبیٰ رادے پرشاد صاحب نے بہت دن پہلے اپنے مدرسہ کے رسالے کے لیے پیام مانگا تھا۔ میں اس وقت ان کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ ذیل کے مضمون کو اسی دیرینہ مطالبہ کی تکمیل سمجھتا ہوں۔

(مخدوم)

● اب سے ۳۹ برس پہلے سنہ ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کی فتح کا جشن منایا جا رہا ہے ہجوم سے انگریز بادشاہ سلامت کی درازیٔ عمر کے لیے دعائیں منگوائی جا رہی ہیں۔ دھرم ونت ہائی اسکول کے کشادہ دالان، پیش دالان کے سامنے صحن میں مدرسہ کے سب بچے قطاریں بنا کر کھڑے ہیں۔ بڑے بچے پیچھے ہیں، چھوٹے بچے آگے ہیں۔ کشن اور گلاب اور میں اگلی صف میں ہیں۔ ان دنوں شاید ہم پہلے درجے میں پڑھتے ہوں گے۔ مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر بچہ کو کاغذ کا بنا ہوا جماعت کی ہلبیڈ سائز کا ایک ایک یونین جیک دیا جا رہا ہے

ہمارے ہیڈ ماسٹر جوشی اور کلاس ٹیچر مولوی جعفر علی بہت مصروف ہیں۔ ان دونوں سے ہم سب بچوں کی روح کانپتی تھی بے رحم بید کی "سزا" عام تھی۔

کشن لال کسی دولت مند سیٹھ کا لڑکا تھا گورا چٹا صحت مند مگر ضرورت سے زیادہ موٹا۔ دوپہر کی چھٹی میں وہ اپنے دوستوں کو چبینا اور چرنک کی نارنگیاں کھلایا کرتا تھا۔ دوسرا سیاہ فام بچہ گلاب تھا۔ گولیاں کھیلنے، چھرے سے گنّا کاٹنے کے مقابلوں میں اپنے محلے کے بچوں میں سب سے پار تھا اس لیے مجھے اس پر رشک بھی آتا تھا۔ گلاب کے تعلق سے میرے ذہن میں راز اور اسرار کی فضا چھائی رہتی تھی، اس کی ماں طوائف تھی جو گھانسی میاں بازار میں حضرت مسکین شاہ صاحب قبلہ

کے مکان سے قریب رہتی تھی۔ ان دنوں میں چھپا دروازہ میں رہتا تھا۔ جہاں اب ہائی کورٹ ہے گلاب اور میں کبھی کبھی مل کر بھی کھیلتے تھے۔

اپنی قطار میں میں نے دیکھا کہ بچے مٹھائی کھا رہے ہیں اور ان کے سینے پر یونین جیک لگا ہوا ہے۔ میں نے جھنڈا تو لیا مگر دماغ میں اپنے چچا کا یہ قول چکر لگا رہا تھا کہ "انگریز ہمارا دشمن ہے"۔ میرے مشفق چچا والد کے انتقال کے بعد میرے سرپرست اور میرے معلم تھے وہ نیک دل، کنبہ پرور، مذہبی آدمی تھے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے نفرت اور وطن سے محبت کا سبق انھوں نے ہی مجھے پڑھایا تھا۔ میں نے سب سے پہلے انقلاب روس اور لینن کا نام اپنے چچا کی زبان ہی سے سنا تھا۔ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے کہ چچا نے ایک رات دسترخوان پر سب عورتوں، بچوں کو بالشویک انقلاب کی خبر سنائی تھی وہ خوشی اور جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ روس میں بالشویکوں نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا ہے، مساوات آگئی ہے اب کوئی امیر و غریب نہیں، سب برابر ہو گئے ہیں۔ اور سب ایک دسترخوان پر مل کر کھاتے ہیں اس وقت میرے ننھے دماغ میں اس انقلاب کی ماہیت تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر ذہن میں اس خیال کی عجیب و غریب تصویر سی تھی کہ سب لوگ جب ایک دسترخوان پر کھاتے ہوں گے تو وہ دسترخوان کتنا بڑا ہوتا ہوگا؟

ان سارے خیالات ہی کا اثر تھا کہ یوں محسوس ہوا گویا انگریز کا جھنڈا کرتے پر لگانا سخت ترین گناہ کرنا ہے میں نے آنکھ بچا کر چپکے سے جھنڈا زمین پر گرا دیا اور اس پر پاؤں رکھ دیا، دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں مولوی جعفر علی اور جوشی نہ دیکھ لیں۔ مگر دل میں ہمت بھی تھی کہ اچھا کام کیا ہے کشن اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا اور تقویت ہوئی۔

ہم نے جھنڈے کے بارے میں ایک بات بھی نہ کی ہم سب کے ساتھ مٹھائی کھاتے رہے۔ وہ کشن اور گلاب معلوم نہیں اب کہاں ہیں، مگر یہ ہماری سیاسی جہاد کی بسم اللہ تھی۔

چھپا دروازہ سے یاقوت پورہ کے دروازہ سے قریب دھرم ونت ہائی اسکول تک روزانہ پیدل جانا ہوتا، اس زمانہ میں بسیں تھیں نہ بیکلیں نہ رکشا، موٹریں بھی بہت کم دکھائی دیتی تھیں۔ سڑکوں پر ہاتھی، اونٹ، بیل کی رتھیں، شکرمیں، جھٹکے، ٹانگے اور بگھیاں دکھائی دیتی تھیں۔

امیروں کے بچے بگھیوں میں آتے، ایک گھوڑے کی بگھی بعض زیادہ امیر ہوں تو دو گھوڑوں کی بگھی، کوچوان کے ساتھ ایک اور نوکر سامنے بیٹھا ہوا اور پیچھے دو جوان باضابطہ وردی میں کھڑے ہوئے "ہٹو بچو" کی آوازیں لگاتے تھے امیر بچوں کی حفاظت کرتے تھے ان سے کم مقدرت بچے جھٹکوں میں آتے کچھ بچے پیدل آتے جاتے تھے۔ پیدل بچے ایسی بگھیوں کی کھوج میں رہتے جس کے پیچھے جوان نہ کھڑے ہوں، لپک کر پیچھے کے تختہ پر سینے کے نیچے ہاتھ رکھ کر پاؤں اٹھا کر لٹک جاتے، راستے کے بچوں کا اس وقت فرض عین ہوتا کہ کوچوان کو پکار کر آگاہ کریں "بگھی کے پیچھے چھوکرا"، کوچوان سامنے سے اپنا لمبا چابک بیٹھے بیٹھے اس زور سے چلاتا کہ لٹکے ہوئے بچے کبھی مار سے بچ جاتے کبھی زد میں آکر اتر کر بھاگ جاتے۔ میرے لئے بھی ایسی سواری عام تھی۔

مدرسہ پیدل جانا حفظانِ صحت کے اصول کے تحت نہیں تھا بلکہ قلاشی کا نتیجہ تھا۔ غریب بچے کو اس سے تھکن ضرور ہوتی مگر خود اعتمادی کے علاوہ ایک فائدہ ایسا بھی تھا جو بیچارے امیر بچوں کو نصیب نہ تھا اور وہ تھا زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع۔

شیر دل کی کمان کی بغل میں حلوائی کی دکان پر کورے کٹوروں میں گرم گرم میٹھا دودھ ٹکڑے صرف پیدل بچے ہی پی سکتے تھے بگھی والے بچے اس لطف سے محروم تھے۔ یا ہم سوکھے حوض پر کونے والی پتنگ کی دکان پر رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھا کرتے گھنٹوں دیکھتے مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ بگھی والے اسے صرف دیکھتے للچاتے گزر جاتے۔

اس زمانے میں محلہ محلہ اکھاڑے تعلیم اور پہلوان ہوتے تھے۔ محلہ پرستی کا جذبہ جارحانہ شکل میں شہر بھر میں پھیلا ہوا تھا جب کوئی بچہ ہمارے محلہ میں آجاتا تو اس سے ہمارے محلے کی "چلکنی مٹی" کا نعرہ لگوائے بغیر نہیں چھوڑتے اگر شکرا ہوتا تو ہمیں مار پیٹ کر بھاگ جاتا ورنہ ہار ماننی پڑتی۔ دوسرے محلے میں ہماری ایسی ہی گت بنتی۔ مدرسہ جاتے ہوئے اکثر ان محلوں سے گزرنا پڑتا تھا جو سواری والے بچوں کو نصیب نہ تھا۔

چڑی مار لمبے لمبے بانسوں کی انی پر لیسا لگا کر چڑیاں پکڑتے تو دلچسپ معلوم ہوتا۔ رنگ برنگ کی مینائیں، طوطے، شکرے، باز، بہری، تیتر، بٹیر اور کبوتروں کا نظارہ پیدل آتے جاتے ہو جاتا۔ راستوں پر بندر ریچھ کا تماشہ، سانپ کا ناچنا ایسی دلچسپیاں تھیں جن کی وجہ سے بعض اوقات ...... مدرسہ جانے میں دیر ہو جاتی اور سزا بھگتنی پڑتی۔

تحصیلی کمان اور سوکھے حوض کے بیچ میں ایک جادوگر ڈیرہ لے کر بیٹھتا تھا اور مردہ لوگوں کی روحوں کے درشن کراتا تھا اس کا بڑا شہرہ تھا۔ بھیڑ بہت رہتی تھی۔ میرے بچپن کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے مرحوم والد کو دیکھوں جن کا کوئی نقشہ میرے ذہن میں نہ تھا۔ گھر والوں نے مجھے پیسے نہیں دیئے ورنہ وہ تماشہ بھی دیکھ لیتا۔

۳۹ سال بعد جب میں دیکھتا ہوں تو چمپا دروازہ سے اسکول تک کا راستہ کچھ زیادہ نہیں بدلا سوائے اس کے کہ وہ چمپا دروازہ نہیں رہا۔ ہائی کورٹ کے کھنڈر میں ندی کے رخ پر قریب ہی میں ایک مندر ہے جس کے صبح و شام کے گھنٹوں کی آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے۔ وہیں قریب کسی بزرگ کا مزار ہے جہاں عقیدت مند آتے جاتے پیسے سلام اور نذرانہ ادا کرتے تھے ہیں۔ کبھی کبھی مجاور "بن گمر" خود ان کی راکھ سے ان کے ماتھے پر تلک لگاتا اور زبان پر تبرک رکھتا تھا۔ یہیں سے کچھ قدم فاصلہ پر چمپا دروازہ تھا۔ پتھر کی مضبوط فصیل میں چھوٹا سا دروازہ جس کے باہر کلال خانہ (سیندھی خانہ) تھا۔ جہاں کا چاکنہ اتنا مشہور تھا کہ اس کے شوق میں لوگ دور دور سے آتے تھے۔

ندی میں اتنا پانی ہوتا تھا کہ فیلخانے کے ہاتھی گھنٹوں کی گھن گھن آواز اور سرخ جھول کے ساتھ آتے ندی میں نہاتے اور سونڈ سے پانی پھینکتے تھے یہ منظر اکیلے بچہ کے لئے بہت دلچسپ تھا۔ راتوں میں یکایک شور اٹھتا پولیس کی سیٹیوں کا۔ ان سیٹیوں سے دل میں بے سہارا پن کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ مجھے نفرت تھی ان آوازوں سے۔ یہ سیٹیاں یا تو اس وقت بجتی تھیں جب اعلیٰ حضرت کی سواری نکلتی تھی یا پھر کوئی ہاتھی مست ہو کر لوگوں کو روندتا پھرتا تھا۔ عجب دہشت کا عالم

ہوتا پھر کوئی اونٹ لایا جاتا اور وہ اونٹ بدمست ہاتھی کا کان دانتوں میں پکڑ لیتا اور ہاتھی کی ساری مستی اتر جاتی بھیگی بلی بن کر فیل خانہ میں لے جایا جاتا مگر شاہی سواری کا کوئی علاج نہ تھا۔

صبح شام ہائی کورٹ بنانے والے مزدوروں ہی میں رہنا ہوتا تھا۔ پتھر توڑتے ہوئے مزدوروں کا دڑی لگا کر بڑی بڑی بھاری بھرکم سلوں کو ڈھونے والے مزدور ہزاروں کی تعداد میں گھر کے اطراف رہتے تھے۔ سفید پتھر لال پتھر گنبدوں کے پتھر، دیواروں اور جالیوں کے پتھر، کمانوں کے پتھر، چھنچھن چھنچھن، ٹھن ٹھن ٹھن ٹھن کی ہزاروں آوازیں ایک ساتھ اٹھتیں، مزدوروں کے ہتھوڑوں اور آریوں کے ٹکراؤ کی آوازیں ایک عجیب آرکسٹرائی کیفیت پیدا کرتی تھیں دھوپ، بارش، سردی کوئی موسم ہو کام نہیں رکتا تھا جب مزدور ہتھوڑا اٹھا کر پتھر پر لگی ہوئی آری کو پوری طاقت سے مارتا تو اس کے شیشمی رنگ کے بازوؤں کی بنی ہوئی مچھلیاں تھرک تھرک جاتی تھیں، میں گھنٹوں یہ منظر دیکھتا......... تا وقتیکہ میرے میزبان کی دوسری بیوی جن کے ہاں میں مقیم تھا چلا چلا کر نہ بلاتی "ارے بابا سودا لانا ہے نل سے پانی بھرنا ہے"

وہ ایسا زمانہ تھا کہ ایک بڑے پیسے میں ناشتہ ہو جاتا کرتا تھا۔ نئے پل کے پاس مغل کا ہوٹل تھا مغل کا ہوٹل بجلی کی روشنی میں بھلا معلوم ہوتا تھا، بڑے بڑے قد آدم آئینے اور دیواروں پر جگہ جگہ گوری گوری خوبصورت ولایتی میموں کی رنگین تصویریں بڑی جاذب نظر ہوتیں، ایک پیسہ کی تھوڑی روٹی، دو پیسے کی نہاری ایک بچہ کے لئے کافی ہو جاتی دو وقت کے مدرسوں کے زمانے میں "لنچ" کا مسئلہ کافی اہم بن جاتا تھا، دوپہر کا کھانا نہیں ملتا تھا، اکثر بچے مدرسے کے باغ میں نارنگی مولسری سپاری اور کھجور کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر توشہ دان کھولے کھانا کھایا کرتے، ایک بچہ جس کا نام یاد نہیں بعض وقت مجھے اپنے ساتھ کھلا لیتا مگر عموماً چھٹی ہی میں مدرسہ سے باہر سیر کرنے چلا جاتا۔

یاقوت پورہ کے دروازہ کے باہر ایک کلال خانہ تھا جو دن رات آباد رہتا تھا گوشت کباب اور کلیجی بھونے کی مہک راستہ پر پھیل جاتی تھی میں اکثر اس راستہ پر پایا جاتا، کئی چکر کاٹ کر مہک کا لطف اٹھاتا اور یہی تھا میرا "لنچ"۔

۱۹۵۷ء

ایک منفرد ماہنامہ

ماہنامہ پیکر حیدرآباد

جنوری کے اواخر سے پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرے گا

صفحات (۱۰۰) قیمت :- ۸۰ پیسے - زر سالانہ ۹ روپے

مدیران :- اعظم راہی ، اندیشہ ، حسن فرخ

ماہنامہ پیکر - ۶۲ ۲/۲ ہ - ہیوسی ٹاؤن - مشیر آباد - حیدرآباد - ۲۰

رُوداد جشنِ مخدوم

مردہ پرستی کے اس دور میں روایتوں کی تمام زنجیروں کو توڑ کر پچھلے دنوں پرستارانِ اُردو نے جس شاندار پیمانے پر "جشنِ مخدوم" منایا۔ وہ زندگی کی پرستش کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ ان تقاریب میں جو ۱۰ر اور ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو دکن کے تاریخی شہر حیدرآباد میں منائی گئیں۔ حیدرآباد کے ممتاز شہریوں، ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ بیرونِ حیدرآباد کے سرکردہ ادیبوں نے بے حد دلچسپی لی۔ اور اُن میں بیشتر نے شرکت بھی کی۔

پیلا دوشالہ کی تقریب

جشن مخدوم کی تقاریب سے ایک دن پہلے ۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء کی شب کو دیوڑھی.... صارم جنگ میں ایک نجی محفل "پیلا دوشالہ" منعقد کی گئی۔ جس کے داعی مخدوم کے بہت پرانے دوست ظفر الحسن کے بھائی مُنظر الحسن تھے۔ اس میں مخدوم کے سبھی عقیدت مندوں اور دوست احباب نے شرکت کی۔ اس تقریب میں مخدوم محی الدین کو ایک پیلا دوشالہ پیش کیا گیا۔ اور فائن آرٹس اکیڈمی کے آرٹسٹوں نے مخدوم کی نظم "پیلا دوشالہ" قوالی کی صورت میں پیش کی۔ محفل کی صدارت بیگم عبدالوحید خان نے کی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا۔

"پیلے دوشالے کا واقعہ مخدوم صاحب کے کالج کے زمانے کا ایک اہم واقعہ ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے انوکھے انداز میں منظوم کیا ہے۔ اس جلسے کو چار چاند لگ جاتے اگر مخدوم کے اصحاب یعنی میر حسن صاحب وغیرہ کی طرف سے اُن صاحب کو بھی مدعو کیا جاتا جن کا دوشالہ جہاں تک مجھے علم ہے۔ مخدوم صاحب اور میر حسن صاحب نے بڑی صفائی سے اڑا لیا تھا۔"

اپنی سادگی اور پُرکاری کے لحاظ سے یہ محفل نہایت شگفتہ اور پُرلطف رہی۔

افتتاحی اجلاس

"جشن مخدوم" کا آغاز ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۶ء ۵ بجے شام سروجنی دیوی ہال رام کوٹ میں افتتاحی اجلاس سے ہوا۔ سجاد ظہیر نے جو دلی سے خصوصی طور پر تشریف لائے تھے اس اجلاس کی صدارت کی۔

مکتبۂ صبا

۷، انجمن درگاہ حیدر آباد دکن سے حاصل کیجئے

انجمن ترقی اردو حیدر آباد کی مطبوعات

گوتم بدھ	(طویل نظم)	فضل الرحمن	۱/۰
چنگیز	(ڈراما)	〃	۲/۰
سقراط	(〃)	〃	۱/۲۵
چراغِ منزل	(مجموعہ کلام)	شاہد صدیقی	۲/۰
پاسِ گریباں	(〃)	سلیمان اریب	۲/۵۰
زبان اور علم زبان		پروفیسر سروری	۷/۰
یادگار فرحت		ڈاکٹر غلام یزدانی	۲/۰
تلگو ادب کی تاریخ		راما نج راؤ زینت ساجدہ	۳/۰
تلگو اردو لغت		گوپال کرشنا راؤ	۳/۵۰
اردو لغت		ڈاکٹر راما راؤ	
رخسارِ سحر	(مجموعہ کلام)	خورشید احمد جامی	۲/۰
نیا انسان	(منظوم ڈراما)	فضل الرحمن	۱/۰
لہر لہر ندیا گہری	(مجموعہ کلام)	زبیر رضوی	۳/۰
نقشِ آذر	(〃)	راشد آذر	۲/۰
کلپنا	(〃)	اختر عادل	۱/۰
غزل اور مسائل	(تنقید)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/۰
اجلی پرچھائیاں	(افسانے)	اقبال متین	۴/۵۰
نظامی گنجوی	(تحقیق)	رضیہ اکبر حسین	۳/۵۰

ان کے علاوہ

کاروانِ وطن	(مجموعہ کلام)	تلوک چند محروم	۷/۵۰
بہارِ طفلی	(بچوں کی نظمیں)	〃	۲/۵۰
بیکراں	(مجموعہ کلام)	جگن ناتھ آزاد	۴/۵۰
اردو		〃	/۵۰
جامِ صہبا	(مجموعہ کلام)	ابو الخیر صبا	۲/
کیفِ صبا		〃	۱/۵۰

مکتبۂ صبا کی مطبوعات

گلِ تر	(مجموعہ کلام)	مخدوم محی الدین	۱/۵۰

بچتی اسکیمیں سبھی کے لئے ہیں!

ان سے ملئے

شری ریاض احمد

آپ پڑھے سمجھدار آدمی ہیں۔ مستقبل میں پڑنے والی ضرورتوں کو کیسے پورا کیا جا سکتا ہے یہ آپ بخوبی جانتے ہیں۔ آپ ہر مہینے ایک سو روپے والا نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ دس برس بعد آپ کو بڑی باقاعدگی سے ۱۰۰ روپے ماہانہ ملنے لگیں گے، جن سے اپنے بڑے کام سنوار سکیں گے۔

شریمتی ٹی۔ ایس۔ سندرم

آپ سوچ سمجھ کر گھر گرہستی چلاتی ہیں۔ کفایت آپ کا زیور ہے۔ آپ کو اپنی آمدنی میں گزارا کرنا آتا ہے۔ آپ کا ایک اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتہ کھلا ہے۔ اس میں آپ ہر مہینے دس روپے جمع کرتی ہیں۔ پندرہ برس بعد آپ ۲۰۰۰ روپے لیں گی۔ اس رقم سے انہیں اپنی لاڈلی بیٹی کے بیاہ میں مدد ملے گی۔

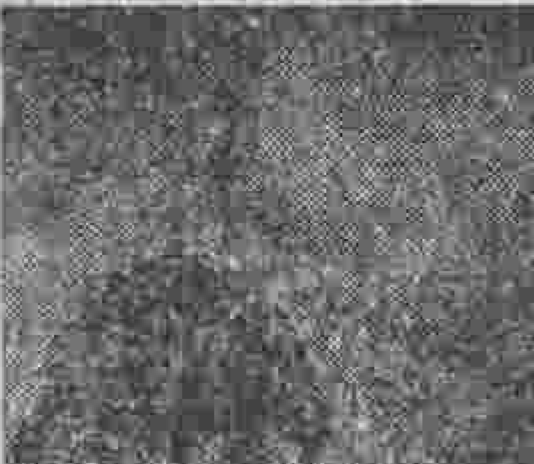

ننھے تپن گھوش

کو اپنے سیونگز بینک کھاتے پر بڑا ناز ہے۔ وہ ہر مہینے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اپنے پیسوں کی لاتے ہیں۔ بچہ جیب خرچ سے کچھ رقم ضرور جمع کرتا ہے۔ بچت کی اچھی عادت وہ ابھی سے ڈال رہا ہے۔

تین مختلف لوگوں کی تین مختلف ضرورتیں قومی بچتی اسکیمیں پوری کرتی ہیں

ایسا اور دوسری بچتی اسکیموں کے بارے میں قریبی ڈاک گھر سے پوچھ تاچھ کریں

قومی بچت آرگنائزیشن

DA 66/725

R. N. 3461/57. SABA—MONTHLY Regd No. H

Gram. "TRYONCE"

Phone: Res. Gopal Sharma 47[illegible]; S. Kareem 471[illegible]; Office: 473[illegible]

Neel Kamal Transport Company

FLEET OWNER TRANSPORT CONTRACTOR

H. O. 15-7-573-75 BEGUM BAZAR,

HYDERABAD-12. A. P.

BRANCHES:

BOMBAY, BANGALORE, SECUNDERABAD, MADRAS, VIJAYAWADA.

Associates: All over South India, M. P., Maharashtra.

OUR REGULAR SERVICE:

FROM BOMBAY TO ALL STATIONS IN ANDHRA.

FROM HYDERABAD TO BANGALORE AND
ONWARD TO SOUTHERN STATES
FULL LOADS ACCEPTED ALL OVER INDIA
PROMPT DELIVERY-CLAIM SETTLEMENT ON THE
SPOT IS OUR MAIN POLICY.